بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بھٹو خاندان
اور
قومی سیاست

حضرت مولانا ابو عمار
زاہد الراشدی

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

عنوان : بھٹو خاندان اور قومی سیاست
تالیف : مولانا ابو عمار زاہد الراشدی
مرتب : ناصر الدین خان عامر
مجموعہ : اپریل ۲۰۲۴ء
ناشر :
اشاعت :

﴿ابواب﴾

- ذوالفقار علی بھٹو کا دورِ سیاست
  - بھٹو دور کے حالات و واقعات
  - بھٹو دور کی متحرک چند شخصیات
  - بھٹو دور کی قومی خدمات
  - قومی سیاست بھٹو کے حوالے سے
- بے نظیر بھٹو کا دورِ سیاست
- آصف علی زرداری اور بلاول بھٹو کا دورِ سیاست

فہرست

☆ پیش لفظ........24

ذوالفقار علی بھٹو کا دورِ سیاست

بھٹو دور کے حالات و واقعات........25

☆ ذوالفقار علی بھٹو کا "اسلامی سوشلزم" کا نعرہ........26

☆ سیاسی مسائل کو سیاسی بنیادوں پر طے کیجئے!........28

- ۱۹۵۳ء کی تحریکِ ختم نبوت........28
- صوبائی خود مختاری کا مسئلہ........29
- پیپلز پارٹی کے اربابِ اختیار سے گزارش........30

☆ وفاقی وزیر داخلہ اور گورنر بلوچستان کا طرزِ سیاست........31

- قادیانیت کے تحفظ میں مگن خان عبدالقیوم خان........31
- پاکستان اور بھارت کی کنفیڈریشن کے خواہشمند نواب اکبر خان بگٹی........32

☆ لاٹھی گولی کی سرکار نہیں چلے گی........33

- جمہوری عمل کی بجائے تشدد پسندی........33
- صلاحیتوں کا منفی استعمال........33

☆ انتظامیہ کو سیاسی جنگ میں فریق نہ بنائیے!........35

☆ حنیف رامے صاحب! اشتراکیت نہیں، اسلام کی ضرورت ہے........37

- سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام کا موازنہ........37
- استحصال کا خاتمہ صرف اسلامی نظام میں........38

☆ گورنر بلوچستان اکبر خان بگٹی کا "تاریخی میزانیہ"........40

☆ مری میں صدر بھٹو کے ساتھ جاری مذاکرات 41
☆ بلوچستان کی صورتحال اور قادیانیوں کی سرگرمیاں 43
☆ جمہوری حکومت کی ''ایک سالہ کارگزاری'' 44
☆ زندہ باد مولانا شمس الدین! 46
☆ متحدہ جمہوری محاذ کو یکطرفہ نصیحت 47
☆ متحدہ جمہوری محاذ کی پیش قدمی 48
☆ مولانا مفتی محمود کے خلاف وائٹ پیپر 51
- قتل کے مقدمات واپس لینے کا الزام 51
- اسلحہ کے لائسنس جاری کرنے کا الزام 51
☆ چوہدری ظہور الٰہی کی اسلحہ سپلائی مقدمہ میں گرفتاری 53
☆ وطن دشمن تنظیموں پر پابندی کا آرڈیننس 54
- اصولی طور پر آرڈیننس کی حمایت 54
- ماضی کے تجربات کے حوالے سے خدشات 54
- موجودہ حکومت کا سیاسی انتقام 55
☆ اسلام کا سیاسی نظام: مفتی محمود کا موقف اور پریس کی رپورٹنگ 57
☆ مذاکرات کا جال اور وعدے، بھٹو صاحب کی سیاسی تکنیک 59
☆ کیا بلوچستان یونہی جلتا رہے گا؟ 61
- کیا پیپلز پارٹی کو ووٹ نہ دینا جرم ہے؟ 61
- حکمرانوں سے رحم کی گزارش 62
☆ ''یومِ محاسبہ'': بھٹو حکومت کے دو سال 63
- سقوطِ مشرقی پاکستان کے المیہ سے صرفِ نظر 63
- ملک میں امن وانصاف کی صورتحال 64
☆ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو سے ''سُنی ریاست'' کا مطالبہ 65
- متفقہ یادداشت 65
  - مطالبہ نمبر ا: متعلقہ نصاب دینیات 66

o مطالبہ نمبر ۲: متعلقہ ماتمی جلوس شیعہ 69
o مطالبہ نمبر ۳: سنی اوقاف بورڈ 70
o مطالبہ نمبر ۴: متعلقہ نشریات ریڈیو وٹیلی ویژن 70
o مطالبہ نمبر ۵: متعلقہ مسئلہ ختمِ نبوت 71
☆ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے اسباب کیا تھے؟ 73
• غیر ملکی مداخلت اور بھٹو صاحب کا اعتراف 73
• حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کی اشاعت کا مطالبہ 74
☆ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ پر ایک نظر 75
• ۱۹۷۴ء میں رپورٹ کی تیاری 75
• ۲۰۰۰ء میں رپورٹ کی اشاعت 75
• رپورٹ کے چند اہم نکات 76
☆ مسلم سربراہ کانفرنس لاہور ۱۹۷۴ء 79
• کانفرنس کے انتظامات کا جائزہ 79
• کانفرنس کے حوالے سے تحفظات 80
• کانفرنس میں مسئلہ کشمیر کا جائزہ لینے کا مطالبہ 82
• مسلم سربراہ کانفرنس لاہور کا بخیر و خوبی اختتام 84
☆ بھٹو صاحب! تقسیمِ ہند کی معقولیت سے انکار؟ 87
☆ بلوچستان، ایک لمحہ فکریہ! 89
• بلوچستان کی سیاسی صورتحال کا نقشہ 89
• جنرل یحییٰ خان کے کردار کا اعادہ؟ 90
☆ بلوچستان کی صورتحال، میاں محمد حسن شاہ کی باتیں 92
☆ بھٹو صاحب! بلوچستان امن و انصاف مانگتا ہے 94
☆ بھٹو صاحب کا "اعلانِ بلوچستان" 97
☆ ڈپٹی اسپیکر بلوچستان اسمبلی مولانا سید شمس الدین کی شہادت 99
• شہید کی سیٹ پر ضمنی انتخاب 99

- ذوالفقار علی بھٹو سے ملاقات کا قصہ 101

☆ آزاد کشمیر کی سیاسی صورتحال 103
- تحریکِ آزادئ کشمیر سے صَرفِ نظر 103
- مسئلہ کشمیر اور بھٹو صاحب 104
- علماء کشمیر کی سیاسی قوت 105
- آئندہ انتخابات اور امکانات 105

☆ بھارت کا ایٹمی دھماکہ! 107

☆ قادیانی مسئلہ: وزیر اعظم بھٹو کی تقریر پر مفتی محمود کے ارشادات 109

☆ ولی خان، مسٹر بھٹو اور افغانستان 111

☆ بھٹو صاحب کی طرف سے آزاد کشمیر کو پاکستان کا صوبہ بنانے کی تجویز 114

☆ سقوطِ مشرقی پاکستان کے ذمہ دار جنرل یحییٰ خان کی رہائی! 115

☆ جناب وزیر اعظم! تشدد سے مسئلہ حل نہیں ہوگا 116

☆ ۱۹۷۱ء کے ہنگامی حالات، آخر کب تک؟ 118

☆ پاکستان، امریکی مفاد کی کڑی؟ 120

☆ پارلیمنٹ کا فیصلہ اور قادیانیوں کے عزائم 122

☆ جداگانہ شیعہ تعلیمی نصاب کے مطالبہ کی منظوری 124

☆ ''قادیانی مسئلہ حل ہو چکا ہے'': بھٹو صاحب کے ارشاد کا جائزہ 125
- اسلامیانِ پاکستان کے مطالبات 125
- مطالبات کے سلسلہ میں معروضی صورتحال 125

☆ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کا دورۂ گوجرانوالہ 128
- قائدِ عوام کے استقبال کی تیاریاں 128
- وفود کی ملاقات کا معاملہ 129
- پولیس، سکیورٹی فورس اور عوام کی آنکھ مچولی 130

☆ سردار عبد القیوم خان کی صدارت سے برطرفی 132
- ''انا ولا غیری'' کا عملی منشور 132

- سیاسی صورتحال پر سردار صاحب کے تبصرے 132
- "شملہ معاہدہ" کے خفیہ مقاصد! 134

☆ بھٹو صاحب کے سیاسی حربے اور متحدہ جمہوری محاذ کی دو سالہ جدوجہد 135

- محاذ کا مقصدِ قیام اور مساعی 135
- حکمران پارٹی اور آزاد کشمیر 136
- قائدِ حزبِ اختلاف مولانا مفتی محمود کا اعلان 137

☆ کچھ آزاد کشمیر کے بارے میں 138

- آزاد کشمیر کی دینی قیادت اور محکمۂ قضا 138
- آزاد کشمیر میں پیپلز پارٹی کا قیام اور وزارت کی رسہ کشی 139

☆ اسلام پر رحم کیجئے! 141

- اسلام، سوشلزم اور چچا سام 141
- جمعیت علماء اسلام کا بروقت کردار 142
- مفادات کی جنگ کے لیے اسلام کا عنوان! 143

☆ جمعیت علماء اسلام کے "نظامِ شریعت کنونشن" کے اہم گوشے 144

☆ تحریکِ واگزاریٔ مسجد نور گوجرانوالہ 148

- نوید انور نوید ایڈووکیٹ کا انتقال 148
- مسجد نور میں جمعیت علماء اسلام کا کُل پاکستان نظامِ شریعت کنونشن 149
- پیپلز پارٹی حکومت کا مسجد نور کو اوقاف کی تحویل میں لینے فیصلہ 149
- مسجد نور کی واگزاری کی تحریک 150
- مولانا مفتی محمود کی آمد اور حمایت کا اعلان 151
- تحریک کے راہنماؤں کی گرفتاریاں اور جیل 152
- سپرنٹنڈنٹ جیل کی طرف سے رعایت 153
- دیگر مکاتبِ فکر کی طرف سے حمایت 153
- قومی پریس کی حمایت 153
- مدرسہ میں دورۂ تفسیر القرآن کا آغاز 154

☆ زیڈاے سلہری صاحب!اپوزیشن ناکام نہیں ہے!....................................156
• ملک کا سیاسی منظر نامہ....................................156
• قائدِ حزبِ اختلاف مولانا مفتی محمود کا چیلنج....................................158
• بھٹو کا موازنہ ایوب اور یحییٰ سے....................................158
• متبادل قیادت کے فقدان کا معاملہ....................................158
☆ جیلوں کے نظام میں اصلاح کی ضرورت....................................160
• جرائم کی بیخ کنی اور اسلامی قوانین....................................161
• جیل میں اخلاقی تربیت....................................162
• مدتِ حوالات کس شمار میں؟....................................163
• بارکوں میں گنتی کا مسئلہ....................................163
• حوالاتیوں سے بیگار نہ لی جائے....................................164
• قیدیوں کی مشقت....................................165
• بہتر کلاس کا استحقاق....................................165
• کھیلوں کا انتظام....................................165
☆ شیعہ سنی فسادات کون کرانا چاہتا ہے؟....................................167
☆ جمعیت کا دورِ حکومت اور خان محمد حنیف خان کا ارشاد....................................170
☆ ملک محمد اختر صاحب! مذہب سے چڑ کیوں؟....................................172
☆ آئندہ انتخابات اور وزیر داخلہ خان عبدالقیوم خان....................................173
☆ وفاقی وزیر جناب کوثر نیازی اور دینی مدارس....................................174
☆ وزیراو قاف رانا اقبال احمد خان کی کسک....................................176
☆ کینیڈا کی طرف سے ایٹمی مواد کی فراہمی کا مسئلہ اور وفاقی وزیر اطلاعات....................................177
☆ عبدالحفیظ پیرزادہ کے انتخابی حریف مولانا محمد زکریا کی گرفتاری....................................179
☆ بھٹو صاحب! مذاکرات کس بات پر؟....................................180
☆ مسٹر بھٹو کی کرسی کا تحفظ....................................181
• صدر مملکت فضل الٰہی چودھری کی آئین سے "وفاداری"....................................181

• بلوچستان پیپلزپارٹی کے خازن کا اعتراف اور مطالبہ........182
• احتجاجی مظاہرین کو گولی مارنے کی دھمکی........182
☆ خانہ جنگی کی سازش؟........184
☆ عبوری حکومت سے گزارش........186
☆ ولی خان اور پنجاب، چودھری ظہور الٰہی کی نظر میں........187
☆ ملتان میں مزدوروں کی شہادت........189
☆ قبائلی علاقوں سے انصاف کیا جائے!........190
☆ ۱۹۷۷ء کی فیڈرل سکیورٹی فورس کا واقعہ........191
☆ "تاشقند کا راز"........192
☆ جمعیت علماء اسلام، بھٹو کی پھانسی اور پیپلز پارٹی........193
☆ بھٹو دور کی چند یادیں........195
• امریکہ، برطانیہ کا جانشین........195
• پاکستان قومی اتحاد اور جنرل محمد ضیاء الحق کا مارشل لاء........195
• تحریک نظامِ مصطفیٰؐ اور اس کا پس منظر........197
• تحریک کے چند واقعات........199
• مولانا مفتی محمودؒ اور جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم........202
• علمائے پاکستان کا سیاسی و تحریکی کردار........203
• کچھ جمعیت علماء اسلام کی دھڑے بندی کے بارے میں........204
• نظریاتی سیاست سے صَرفِ نظر........205
☆ سقوطِ مشرقی پاکستان: ایک غلط فہمی کا ازالہ........207

بھٹو دور کی چند متحرک شخصیات........209

☆ مسلمانانِ ہند کی تقسیم کا قضیہ اور مولانا مفتی محمودؒ........210
• قیامِ پاکستان سے پہلے جمعیت علماء ہند اور مجلسِ احرارِ اسلام کا موقف........210
• مسلم لیگی راہنما چودھری خلیق الزمان مرحوم کا اعتراف........211
• قیامِ پاکستان کے بعد جمعیت علماء اسلام اور مجلسِ احرارِ اسلام کا موقف........211

- o حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی ہدایت 211
- o امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کا عزم 212
- o مولانا ابوالکلام آزادؒ کا طرزِ عمل 212
- • شیخ مجیب الرحمٰن مرحوم سے مفتی محمودؒ اور ولی خان مرحوم کی ملاقات 212
- • وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کا الزام اور مولانا مفتی محمودؒ کا جواب 213

☆ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ سے مولانا مفتی محمودؒ تک 215

☆ مولانا مفتی محمودؒ کی آئینی جدوجہد اور اندازِ سیاست 218
- • ۱۹۵۶ء کا آئین 218
- • ۱۹۷۳ء کا آئین 219
- • انتخابات ۱۹۷۰ء کے بعد کا بحران 219
- • سادگی، دیانت اور اصول کی سیاست 220

☆ مولانا مفتی محمودؒ اور سیاسی اخلاقیات 222
- • "شملہ معاہدہ" کے سلسلہ میں بھٹو مرحوم پر اعتماد 222
- • معاصر بزرگ کے بارے میں لب کشائی سے انکار 222
- • دورۂ بھارت کے دوران پاکستان کے داخلی حالات پر گفتگو سے گریز 223
- • سیاسی اختلافات میں وضعداری 224

☆ مولانا مفتی محمودؒ کی پارلیمانی سیاست 225
- • صوبہ سرحد کی سیاست 225
- • وفاق کی سیاست 226

☆ مولانا مفتی محمودؒ کی وزارتِ اعلیٰ کا دور 227
- • سرحد حکومت کے اسلامی اقدامات 227
- • شراب کے مسئلہ پر وفاقی اور صوبائی حکومت کی خط و کتابت 228

☆ حضرت عثمان غنیؓ کے جلسہ میں بھٹو مرحوم کا تذکرہ 230
- • مولانا مفتی محمودؒ اور ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی بذلہ سنجی 230
- o "کچھ لو اور کچھ دو" پر ایک لطیفہ 230

o پچاس نمازوں پر بھٹو صاحب کا تبصرہ 231
• حضرت عثمانؓ اور ان کا مال 232
☆ مولانا مفتی محمودؒ اور ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی ظرافت 234
☆ باشندگانِ وطن کی کفالت کا نظام: مفتی محمودؒ اور بھٹو مرحوم کا موقف 236
☆ بھٹو دور میں شرعی عدالتوں کا قیام 238
☆ ۱۹۷۰ء کی سیاسی صورتحال اور جمعیت علماء اسلام 240
☆ مولانا مفتی محمودؒ کی وفات، ایک درخشاں قومی عہد کا خاتمہ 242
• ایک سُرخرُو قومی کردار 242
• تعلیم و تربیت 243
• اساتذہ و اکابر 244
• برطانوی استعمار کا دور 244
• جیّد و باکردار عالمِ دین اور فقیہ النفس مفتی 244
• ہمہ جہت اور قابلِ رشک شخصیت 245
• ملکی سیاست کا بے نیاز کردار 246
• اربابِ فہم و ادراک کی جوہر شناسی 246
• نفاذِ اسلام کے لیے پارلیمانی اور سیاسی جدوجہد 246
• پاکستان کی سالمیت کا تحفظ 248
• وزارتِ اعلیٰ کا عہدہ 249
• مفتی صاحبؒ کے بعد کیا ہو گا؟ 250
☆ حضرت مولانا شاہ احمد نورانیؒ: ایک وضعدار دینی و قومی راہنما کی وفات 252
• جمعیت علماء پاکستان کا پس منظر 252
• جمعیت کی صدارت کا منصب 253
• خاندانی اور روحانی پس منظر 254
• مولانا مفتی محمودؒ کی رفاقت 254
• انتخابات ۱۹۷۷ء کے ''پاکستان قومی اتحاد'' میں کردار 255

- ایک وضعدار اور سادہ منش عالمِ دین 255
- افغانستان اور طالبان کی پشت پناہی 256

☆ ولی خان مرحوم اور ماضی کی چند یادیں 257
- ولی خان مرحوم کے دو لطیفے 257
- ولی خان مرحوم اور مولانا مفتی محمودؒ کی سیاسی رفاقت 258
- قوم پرست، محبِ وطن اور دین پسند لیڈر 259

☆ چودھری ظہور الٰہی شہید اور ماضی کی چند یادیں 260
- ایک معتمد و مخلص مسلم لیگی راہنما 260
- صوبوں کی یکجہتی کا علمبردار پنجابی سیاستدان 260

☆ نواب محمد اکبر خان بگٹی مرحوم اور ماضی کی چند یادیں 262
- ۱۹۷۰ء کے سیاسی حالات 262
- مولانا مفتی محمودؒ اور بلوچستان 263
- چودھری ظہور الٰہی مرحوم اور بلوچستان 263
- ڈپٹی اسپیکر بلوچستان اسمبلی مولانا شمس الدینؒ کی شہادت 264
- بگٹی مرحوم کا جمعیت کے ساتھ رفاقت کا دور 264
- بگٹی مرحوم اور بلوچ قومیت 265
- بگٹی مرحوم کا قتل: ظلم اور ناعاقبت اندیشی 265

☆ خطیبِ اسلام مولانا محمد اجمل خانؒ اور ماضی کی چند یادیں 266
- ”خطیبِ اسلام“ کا لقب 266
- مولانا مرحوم کے نمایاں اوصاف 267
- بھٹو دور میں مولانا مرحوم اور راقم الحروف کی گرفتاری 268
  - مارشل لاء عدالت میں گستاخئ قرآن کریم پر ردعمل 268
  - مولانا مفتی محمودؒ کا دفاع 269

☆ الحاج سید امین گیلانیؒ کی وفات اور ماضی کی چند یادیں 271
- جنرل محمد ایوب خان مرحوم کا دور 271

- ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کا دور 272

☆ حضرت مولانا نور محمد شہیدؒ اور ماضی کی چند یادیں 274
- فلسطین کے لیے دس ہزار کے لشکر کا وعدہ 274
- بھٹو صاحب کا استقبال جمعیت کے پرچموں کے ساتھ 274
- جہادِ افغانستان پر تصنیف 274

☆ پروفیسر غفور احمد مرحوم اور ماضی کی چند یادیں 276
- انتخابات ۱۹۷۰ء میں جماعتِ اسلامی کے رکن قومی اسمبلی 276
- دستور ساز اسمبلی میں کردار 276
- قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کی جدوجہد 277
- تحریکِ نظامِ مصطفیٰؐ میں حصہ 277

☆ قاری نور الحق قریشی ایڈووکیٹؒ اور ماضی کی چند یادیں 279

☆ میاں اسماعیل ضیاء مرحوم اور ماضی کی چند یادیں 281
- مولانا مفتی عبد الواحدؒ اور مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ کی دوستی 281
- مولانا عبد القیوم ہزاروی کے ہاں پہلی ملاقات 282
- میاں محمود علی قصوری مرحوم سے مراسم 282
- رفاقت اور رقابت کے ادوار 282
- میاں اسماعیل ضیاء مرحوم اور ماڈل ٹاؤن گوجرانوالہ کی مسجد مکرم 284

☆ رانا نذر الرحمٰن مرحوم اور ماضی کی چند یادیں 285
- بھٹو مرحوم کا اسلامی سوشلزم کا نعرہ 285
- مرکزی جمعیت علماء اسلام کا فتویٰ اور جمعیت علماء اسلام کا موقف 285
- ۱۹۷۰ء کی دہائی کی سیاست 286

☆ تحریکِ ختمِ نبوت کے سرگرم کردار 288

☆ حکومت اور قومی اتحاد کے درمیان ڈیڈلاک اور سعودی سفیر 290

بھٹو دور کی قومی خدمات 291

☆ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم: مخالفین کا خراجِ عقیدت 292

- قومی سیاست کا انمٹ کردار 292
- بھٹو مرحوم کی سیاسی زندگی کا آغاز 292
- پیپلز پارٹی اور جمعیت علماء اسلام کی کشمکش 293
- بھٹو مرحوم کی قومی خدمات 293
  - o ایٹمی قوت اور دستورِ پاکستان 294
  - o مسئلہ قادیانیت کا پارلیمانی حل 294

☆ استعمار کا جال توڑنے کی کوشش 296

☆ پاکستان میں قادیانیت کا ہدف، بھٹو مرحوم کی نظر میں 297

☆ مسئلہ قادیانیت: بھٹو مرحوم کا مفتی محمودؒ سے سوال 299

☆ مسئلہ قادیانیت کا حل: بھٹو مرحوم کا تاریخی کارنامہ 300

☆ قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا پارلیمانی فیصلہ 302
- ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی مدبرانہ حکمتِ عملی 302
- قومی اسمبلی کی اکیس روزہ کاروائی 302
- "ملتِ اسلامیہ کا متفقہ موقف" 303
- وزیر قانون جناب عبدالحفیظ پیرزادہ کے ریمارکس 303
- قومی اسمبلی کی مذکورہ کاروائی کی اشاعت 304
- مولانا اللہ وسایا کی "احتسابِ قادیانیت" 305

☆ قادیانی فیصلہ: بھٹو مرحوم کے احساسات 306

☆ ووٹر فارم سے مذہب کا خانہ اور عقیدۂ ختمِ نبوت کے حلف نامہ کا خاتمہ 307
- قادیانیوں کو مسلمانوں میں شامل کرنے کا اقدام 307
- بھٹو مرحوم کے دور سے چلے آنے والا اندراج 307

☆ قومی اقلیتی کمیشن میں قادیانیوں کی نمائندگی کا معاملہ 308

☆ دینی مدارس کی اسناد کا معاملہ اور بھٹو مرحوم 309

☆ جمعہ کی چھٹی اور شراب پر پابندی کے اقدامات 311

☆ بھٹو مرحوم، جنرل مشرف اور قادیانی جماعت 313

☆ ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور ایٹمی پروگرام 315
☆ پاکستان اسٹیل ملز کا پس منظر 316
☆ ریڈ کراس کی بجائے ہلال احمر: صدارتی کابینہ کا فیصلہ 318

قومی سیاست بھٹو کے حوالے سے 319

☆ پاکستان کے سیاسی طبقات 320
- جاگیردار، بیوروکریٹس اور جرنیلوں کی تکون 320
- اقتدار کی دوڑ میں صنعتکار طبقہ کی شمولیت اور اس کا ردعمل 320
- جنوبی ایشیا میں استعماری قوتوں کا ایجنڈا 321
- شخصِ واحد میں اختیارات کے ارتکاز کا تصور 321
- میاں محمد نواز شریف کا اندازِ سیاست اور اس کا انجام 322
- دینی جماعتوں سے توقعات 323

☆ قومی سیاست کی چند یادیں 324
- جنرل ضیاء الحق مرحوم اور پاکستان قومی اتحاد 324
- چودھری ظہور الٰہی مرحوم سے مولانا مفتی محمودؒ کا سوال 325
- اسٹیبلشمنٹ کی شکار تین عوامی تحریکیں 325
  - ۱۹۴۷ء کی پاکستان مسلم لیگ 325
  - ۱۹۷۰ء کی پاکستان پیپلز پارٹی 326
  - ۱۹۷۷ء کا پاکستان قومی اتحاد 326
- عملی سیاست سے کنارہ کشی کیوں؟ 327

☆ پاکستان پر عالمی دباؤ: ذوالفقار علی بھٹو مرحوم اور میاں محمد نواز شریف 328
- عالمی قوتوں کی توقعات اور مایوسی 328
- پاکستان کی اسلامی حیثیت اور عالمی ایجنڈا 330

☆ ضیاء الحق مرحوم، بھٹو مرحوم اور میاں محمد نواز شریف 332
☆ استنبول اعلامیہ 334
☆ جنرل مشرف کی مجوزہ سیاسی اصلاحات، تاریخ کے آئینے میں 336

- اقتدار پر قبضے کا کھیل 336
- فردِ واحد میں اختیارات کے ارتکاز کا تصور 336
- مستقبل کا متوقع نقشہ 338
- اسلامی نظام کی ضرورت 338

☆ امریکی کانگریس کا ناشتہ اور انڈونیشیا کے مسلم راہنما 340
- سرد جنگ کے ماحول میں غیر جانبدارانہ عالمی بلاک کی تشکیل اور انجام 340
- موجودہ دور کا انڈونیشیا: مسیحی مشنریاں، مشرقی تیمور، قادیانیت 342
- مشرقِ وسطیٰ کے لیے امریکی ایجنڈا 342

☆ ۱۹۷۷ء کی تحریکِ نظامِ مصطفیٰؐ اور جناب حامد میر 344
☆ جمعیت علماء اسلام اور قومی سیاست 347
- "قراردادِ مقاصد" کی منظوری 347
- قادیانی مسئلہ 347
- جنرل محمد ایوب خان کا دور 347
- جنرل محمد یحییٰ خان کا دور اور سقوطِ مشرقی پاکستان 349
- ذوالفقار علی بھٹو کا دور 349

بے نظیر بھٹو کا دورِ سیاست

☆ اسلام کی تشریح اور پیپلز پارٹی 353
☆ مسز بے نظیر زرداری اور علماء کرام 355
☆ پیپلز پارٹی کے مستقبل کے عزائم، منشور کے آئینے میں 356
☆ اسلامی جمہوری اتحاد اور پاکستان پیپلز پارٹی 358
☆ عورت کی حکمرانی اور مولانا فضل الرحمٰن کا موقف 359
☆ پیپلز پارٹی کے عزائم اس کی پالیسیوں کے آئینے میں 363
☆ جہادِ افغانستان: ولی خان اور بے نظیر بھٹو کی مہم 364
☆ عورت کی سربراہی اور مولانا فضل الرحمٰن 365

☆ محترمہ بے نظیر بھٹو کی "شریعت" 366
☆ جمہوری ممالک کی ایسوسی ایشن اور وزیر اعظم بے نظیر بھٹو 367
☆ مولانا قاضی عبد اللطیف پر بغاوت کا مقدمہ؟ 368
☆ وفاق اور صوبوں کی کشمکش کا افسوسناک پہلو 369
☆ پاکستان میں اسلامی قوانین اور وزیر اعظم بے نظیر بھٹو 370
☆ نو تشکیل شدہ اسلامی نظریاتی کونسل کو وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کی ہدایت 371
☆ ایک اور "دینِ الٰہی"؟ 373
☆ عورت کی سربراہی اور میاں محمد نواز شریف 374
• مذہبی جماعتوں نے مسلم لیگ کا ساتھ کیوں نہیں دیا 374
• مذہبی جماعتوں کا اصل قصور 375
☆ گلگت بلتستان: سردار عبد القیوم اور بے نظیر بھٹو 379
☆ فوجی افسران کی گرفتاری اور سرکاری موقف 381
• گرفتاریوں کے متعلق قیاس آرائیاں 381
• وزیر اعظم بے نظیر بھٹو اور وزیر دفاع آفتاب شعبان میرانی کے بیانات 382
• قوم کو اعتماد میں لینے کی ضرورت 382
• گرفتار شدگان کی دینداری اور حب الوطنی 383
• فوج کے نظام پر سوالیہ نشان 383
• اپوزیشن راہنماؤں کا موقف اور مطالبہ 383
☆ وزیر اعظم بے نظیر بھٹو اور اسلامی انقلاب 385
☆ آزاد کشمیر کے مفتی صاحبان کی ملازمت سے فراغت 386
☆ بے نظیر حکومت کی برطرفی اور احتساب و انتخاب کا چکر 388
☆ صدر محترم محمد رفیق تارڑ کی داڑھی 390
☆ خدمت کمیٹیاں: نازی پارٹی یا پاسدارانِ انقلاب؟ 391
• مفتی محمودؒ، بھٹو مرحوم اور ہٹلر کی سوانح حیات 391
• وزیر اعظم میاں محمد نواز شریف کی خدمت کمیٹیاں 391

☆ محترمہ بے نظیر بھٹو! معاملات کو گڈمڈ نہ کریں............394
- ایٹمی معاہدہ سی ٹی بی ٹی پر دستخط کی حمایت............394
- افغانستان اور مالاکنڈ میں اسلامی اقدامات کی مخالفت............394
- مغربی فکر و فلسفہ کی نمائندگی............395

☆ مذہب اور ریاست: محترمہ بے نظیر بھٹو کا موقف............397
- مغربی دنیا اور مسلم دنیا کی تاریخ کا موازنہ............398
  - o اصلی آسمانی تعلیمات صرف اسلام کے پاس ہیں............398
  - o مسلم دینی قیادت نے ہمیشہ عوامی جدوجہد کا ساتھ دیا ہے............398
  - o مسلمانوں کے ہاں سائنس مذہبی مسلّمات کی مؤید ہے............398
- محترمہ بے نظیر بھٹو کی خام خیالی............399

☆ سرحد اسمبلی کا شریعت بل، حکومتی کیمپ اور محترمہ بے نظیر بھٹو............400
- متحدہ مجلسِ عمل افغان طالبان کے نقشِ قدم پر؟............400
- ”شریعت بل“ کی منظوری پر وفاقی حکومت کا ردعمل............402

☆ حدود آرڈیننس کے خاتمہ کی مہم میں پیپلز پارٹی کی شرکت............404

☆ میاں نواز شریف اور بے نظیر بھٹو کا میثاقِ جمہوریت............405
- اقتدار کی رسہ کشی............405
- بانئ پاکستان قائدِ اعظمؒ کا عزم اور وعدہ............405
- سیاسی ڈھانچے پر مسٹر اور مولوی کا اصولی اتفاق............406
- پاور پالیٹکس کی عملداری............406
- میثاق جمہوریت کی ضرورت کیوں پیش آئی؟............407
- آزمائش شرط ہے!............407

☆ محترمہ بے نظیر بھٹو کا المناک قتل............409
- محترمہ سے ایک ملاقات کا قصہ............410
- متحدہ علماء کونسل کا پس منظر............410
- ایک مسلّمہ قومی راہنما سے محرومی............411

- حملہ کا واقعہ اور اس کا تجزیہ 412
- ذمہ دار کون؟ 413
- مرحومہ کے جانشین کا انتخاب 413
- ملک کی سیاسی صورتحال اور جنرل پرویز مشرف کا مستقبل 414
- نوسالہ جلاوطنی کے بعد وطن واپسی 415
- اظہارِ اختلاف کا ناجائز اور مذموم طریقہ 416

☆ خلافتِ عثمانیہ اور بے نظیر بھٹو مرحومہ 417

آصف علی زرداری اور بلاول بھٹو کا دورِ سیاست

☆ بلاول بھٹو زرداری سے دو گزارشات 419
- خاندانی سیاست کی روایت 419
- جناب اعتزاز احسن کا استحقاق 419
- نام میں ''بھٹو'' کا اضافہ 420
- بلاول زرداری بھٹو سے گزارشات 421
  - o بھٹو مرحوم کے ورثہ کو پیشِ نظر رکھیں 421
  - o اسلامی معلومات اسلامی ذرائع سے حاصل کریں 422

☆ پاکستان پیپلز پارٹی کا قادیانی امیدوار 424

☆ نومنتخب وزیر اعظم جناب یوسف رضا گیلانی کو در پیش چیلنجز 426

☆ بھٹو مرحوم کے وارث اور قادیانیت 430

☆ سزائے موت کے قیدیوں کو عمر قید کی سزا 432

☆ عدلیہ کی بحالی اور وکلاء کی تحریک اور مرحومہ بے نظیر بھٹو 433

☆ ''وار آن ٹیرر'' کی قانونی و اخلاقی پوزیشن کا سوال 434
- نومنتخب صدر جناب آصف علی زرداری: خدشات اور امیدیں 434
- ''دہشت گردی'' کی تعریف؟ 435
- خودکش حملوں کا معاملہ 436

☆ آصف علی زرداری، منتخب آئینی صدر 437
• جنرل پرویز مشرف اور آصف علی زرداری میں موازنہ 437
• بیرونی ایجنڈا آگے بڑھانے کے محرکات 439
☆ بلوچستان میں شرعی عدالتیں: پیپلز پارٹی کا مستحسن اقدام 441
• مقدمات کی بھرمار کے باعث شام کی عدالتوں کی تجویز 441
• شرعی عدالتیں، ملک بھر کی ضرورت 442
☆ سوات میں معاہدۂ امن اور شرعی نظامِ عدل 443
• سوات کے عوام کا مقدمہ 443
• عوامی نیشنل پارٹی کا کردار، مولانا سمیع الحق کی نظر میں 445
• ایم کیو ایم کے جناب الطاف حسین سے گزارش 445
☆ اٹھارہویں آئینی ترمیم کے حوالے سے چند گزارشات 446
• آئینی ترمیم پر ایک نظر 446
• دستور کی اسلامی حیثیت برقرار رہنے پر اطمینان 447
• عوامی مسائل کے حوالے سے تحفظات 447
• اسلامی دفعات پر عملداری کا معاملہ 448
• صدر اور وزیر اعظم کے اختیارات میں توازن اور قومی خود مختاری 449
☆ گورنر پنجاب سلمان تاثیر کا قتل 450
• چند عوامی سوالات 450
• پاکستان میں سیکولر نظریات کے پرچار کا معاملہ 451
• واقعہ کا پس منظر اور پیش منظر 452
☆ تحفظِ ناموسِ رسالتؐ: شکریہ پیپلز پارٹی 454
• ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کا کریڈٹ 454
• پاکستان پیپلز پارٹی کے رجحانات اور سرگرمیاں 454
• تحفظِ ناموسِ رسالتؐ: وزارتِ قانون کی سمری 455
☆ صدر مملکت کا ارشاد اور مبینہ دہشت گردی کے اصل اسباب 458

• عالمی قوتوں کی دھاندلی اور مغالطہ 458
• صدر جناب آصف علی سے گزارش 459
☆ خواتین کے حقوق کا بل 460
• جنرل پرویز مشرف کے دور میں "حدود آرڈیننس" میں ترامیم 460
• حقوقِ نسواں کے حوالے سے تمام قوانین پر نظرِ ثانی کی ضرورت 461
• خواتین کے حوالے سے معاشرتی رویوں کی اصلاح کی ضرورت 461
☆ مواخذہ سے استثنا اور اسلامی تعلیمات 462
• عوامی بدگمانی کے حوالے سے سنتِ نبویؐ 462
• مواخذہ سے استثنا اور سنتِ نبویؐ 463
• "چاہِ یوسف کی صدا" 464
☆ سزائے موت کا مسئلہ: پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ کا موقف 465
• سزائے موت ختم کرنے کے سلسلہ میں اقوامِ متحدہ کی قرارداد 465
• سزائے موت، اسلامی تعلیمات کی روشنی میں 466
• پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان مسلم لیگ (ن) کا موقف 467
• لاہور کے ممتاز وکلاء کا بیان 468
☆ اسلامی نظریاتی کونسل: پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کے راہنماؤں کا مطالبہ 469
• دستورِ پاکستان ۱۹۷۳ء کے تحت کونسل کا قیام اور مقاصد 469
• کونسل کی سفارشات کے مطابق قانون سازی کا مطالبہ 470
• کونسل کے خلاف افسوسناک مہم 470
☆ دستورِ پاکستان: بلاول بھٹو اور شاہد اللہ شاہد کے بیانات پر ایک نظر 471
• انتہا پسندانہ موقف سے گریز کی ضرورت 471
• دستورِ پاکستان کی اسلامی حیثیت 471
• دستور کی تعبیر اور اطلاق پر تحفظات 472
o "قراردادِ مقاصد" کی دستوری حیثیت 472
o "شریعت بل" میں قرآن و سنت کی بالادستی کے حوالے سے استثنا 473

☆ پاکستان پیپلز پارٹی گکھڑ کا تحفظِ ختمِ نبوت سیمینار............475
- میاں محمد طفیل مرحوم کے خاندان سے مراسم............475
- صوبائی صدر جناب قمر الزمان کائرہ کی پر مغز گفتگو............476
- بھٹو مرحوم کا جرأتمندانہ کردار............478
- پاکستان پیپلز پارٹی کا کریڈٹ اور ذمہ داری............479

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

سر شاہنواز بھٹو مرحوم کا خاندان سندھ کی سیاست میں ایک متحرک خاندان کے طور پر متعارف چلا آرہا ہے، ان کا دور تو میں نے نہیں دیکھا البتہ ان کے فرزند ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے خاندان کے سیاسی کردار سے ملک کے دیگر شہریوں کی طرح میرا واسطہ بھی چلا آرہا ہے، مجھے جب سیاست وصحافت کے کوچہ سے آشنائی ہوئی تو وہ صدر محمد ایوب خان مرحوم کی حکومت میں وزیر خارجہ تھے۔ ان کے بعد محترمہ بے نظیر بھٹو مرحومہ کا دورِ اقتدار دیکھا اور اب ان کے نواسے بلاول بھٹو کی وزارتِ خارجہ کا دور بھی دیکھ لیا ہے۔ اس دوران بھٹو خاندان کے سیاسی کردار، پالیسیوں اور اقدامات کے حوالہ سے مسلسل لکھتا رہا ہوں اور جب تک عملی سیاست میں متحرک رہا ہوں سیاسی فورم پر بھی ان کے بارے میں اظہارِ خیال کرتا رہا ہوں۔

یہ فرزندِ عزیز حافظ ناصر الدین خان عامر کا حسنِ ذوق ہے کہ اس نے دیگر عنوانات و موضوعات کی طرح اس حوالہ سے بھی میرے بہت سے مضامین اور تبصروں کو اس کتاب میں محفوظ کر دیا ہے جو ہو سکتا ہے پاکستان کی سیاسی و دینی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے مفید ثابت ہو، اللہ تعالیٰ اس کاوش کو قبول فرمائیں اور ہمیں دین و ملت اور ملک و قوم کی خدمت کی مسلسل توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

ابو عمار زاہد الراشدی
خطیب مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ
۲۱ ستمبر ۲۰۲۳ء

ذوالفقار علی بھٹو کا دورِ سیاست

بھٹو دور کے حالات و واقعات

ذوالفقار علی بھٹو کا ’’اسلامی سوشلزم‘‘ کا نعرہ

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ ۔۔ اپریل ۲۰۰۴ء)

کم و بیش پینتیس برس پہلے کی بات ہے۔ میرا طالب علمی کا زمانہ تھا۔ لکھنے پڑھنے کا ذوق پیدا ہو چکا تھا۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھنے کے بعد ’’اسلامی سوشلزم‘‘ کا نعرہ لگا کر ملکی سیاست میں ہلچل پیدا کر دی تھی۔ قومی اخبارات اور دینی جرائد میں اسلام، جمہوریت اور سوشلزم کے حوالے سے گرما گرم بحث جاری تھی اور اسی ضمن میں جاگیرداری نظام، زمینداری سسٹم، مزارعت اور اجارہ پر زمین دینے کے جواز اور عدمِ جواز پر بہت کچھ لکھا جا رہا تھا۔ اسلامی سوشلزم کے نعرے کی بنیاد پر مسٹر بھٹو مرحوم کے خلاف مختلف دینی حلقوں کی طرف سے طعن و فتویٰ کا آغاز ہو چکا تھا جو بالآخر ایک سو تیرہ اکابر علماء کرام کے اس فتویٰ پر منتج ہوا جس میں اسے کفر قرار دے دیا گیا تھا۔

جمعیت علماء اسلام پاکستان کی سیاسی قیادت اس وقت حضرت مولانا مفتی محمودؒ اور حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ کے ہاتھ میں تھی۔ ان کی راہنمائی میں جمعیت علماء اسلام پاکستان نے کفر کے اس فتویٰ سے کھلم کھلا اختلاف کیا اور یہ موقف اختیار کیا کہ اگرچہ ’’اسلامی سوشلزم‘‘ کی اصطلاح درست نہیں ہے اور سوشلزم کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے لیکن اگر کوئی شخص یا گروہ مزدوروں، کسانوں اور محنت کشوں کے جائز حقوق کے لیے آواز اٹھاتا ہے، جاگیردارانہ و سرمایہ دارانہ نظام کی مخالفت کرتا ہے، اور اس کے لیے اسلامی تعلیمات کی بالادستی سے منحرف نہیں ہے، البتہ وہ اپنی جدوجہد کو ’’اسلامی سوشلزم‘‘ سے تعبیر کرتا ہے، تو اسے تعبیر کی غلطی کہا جائے گا، اسے اس غلطی پر تنبیہ کی جائے اور سمجھایا جائے گا لیکن اس پر کفر کا فتویٰ عائد کرنا درست نہیں ہے۔ اس پر بعض حلقوں کی طرف سے جمعیت علماء اسلام کے راہنماؤں کو ’’سوشلسٹ علماء‘‘ کا خطاب بھی دیا گیا اور ۱۹۷۰ء کے الیکشن تک یہ معرکہ خوب گرم رہا۔

اس پس منظر میں راقم الحروف نے مزارعت اور بٹائی کے عنوان پر ایک تحقیقی مضمون لکھا جو ہفت روزہ ’’ترجمان اسلام‘‘ لاہور میں قسط وار شائع ہوا۔ حصہ اور بٹائی پر زمین کاشت کے لیے دینے کے جواز پر حضرت امام ابو حنیفہؒ اور ان کے صاحبین حضرت امام ابو یوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ کا اختلاف مشہور ہے۔ صاحبین مزارعت اور بٹائی کے جواز کے قائل ہیں جبکہ حضرت امام ابو حنیفہؒ اسے ناجائز قرار دیتے ہیں۔ میں نے دونوں طرف کے دلائل کا مطالعہ کیا اور خاصی محنت کی جس میں بعض نادر کتابوں کے لیے خانقاہ سراجیہ کندیاں شریف میں بھی ایک دو روز کے لیے حاضری دی اور وہاں کے معروف کتب خانہ سے

استفادہ کیا۔ اس مطالعہ کے دوران مجھے حضرت امام ابو حنیفہؒ کے دلائل زیادہ وزنی معلوم ہوئے اور بعض اکابر احناف کی ایسی تصریحات بھی نظر سے گزریں کہ اس مسئلہ میں دلائل امام صاحبؒ کے ساتھ ہیں اور صاحبین کے موقف پر فتویٰ مصلحتِ عامہ کی وجہ سے دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کی بنیاد پر میں نے یہ موقف اختیار کیا کہ دلائل بھی امام صاحبؒ کے ساتھ ہیں اور آج کے دور کی مصلحتِ عامہ کا تقاضا بھی یہ ہے کہ جاگیردارانہ سسٹم کا زور توڑ کر غریب کسانوں کو تحفظات فراہم کیے جائیں، اس لیے آج کے دور کے لیے حضرت امام ابو حنیفہؒ کا موقف زیادہ قرینِ مصلحت اور قابلِ عمل ہے اور علماء کرام کو بٹائی اور مزارعت کے جواز کا فتویٰ دینے کے بجائے امام صاحبؒ کے موقف کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

میرا موقف آج بھی یہی ہے اور اگرچہ اجتہاد یا افتاء کی اہلیت نہ رکھنے کی وجہ سے عمل اسی پر کرتا ہوں اور مسئلہ بھی لوگوں کو وہی بتاتا ہوں جو صاحبین کے موقف کے مطابق جمہور فقہاء احناف کا مفتیٰ بہ قول ہے لیکن علمی اور تحقیقی طور پر امام صاحبؒ کے موقف کو ہی راجح اور آج کے دور کی ضروریات سے ہم آہنگ سمجھتا ہوں۔

جمعیت علماء اسلام پاکستان کے آرگن ہفت روزہ ''ترجمان اسلام'' لاہور میں اس مضمون کا شائع ہونا تھا کہ ہر طرف شور مچ گیا۔ ''سوشلسٹ علماء'' کا خطاب تو ہمیں مل ہی چکا تھا، یہ کہا جانے لگا کہ یہ مضمون سوشلزم کی حمایت کے لیے اور سوشلسٹوں کو تقویت پہنچانے کے لیے لکھا گیا ہے بلکہ بعض انتہائی ذمہ دار بزرگوں نے میری طالب علمانہ حیثیت کو دیکھتے ہوئے یہ تبصرہ بھی فرمادیا کہ یہ مضمون اس کا لکھا ہوا نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے والد محترم شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم نے یہ مضمون لکھا ہے اور اسے بیٹے کے نام سے شائع کرادیا ہے۔ حالانکہ نہ حضرت والد صاحب مدظلہ کا یہ موقف تھا اور نہ ہی مضمون کی اشاعت سے قبل انہیں اس کا کوئی علم تھا، لیکن زبانوں کو کون بند کر سکتا ہے؟ اس لیے چہ میگوئیوں کا سلسلہ جاری رہا۔

میری یہ خواہش تھی کہ کوئی صاحب طعن و تشنیع کی زبان اور نفسیات سے ہٹ کر اس مضمون کا علمی طور پر جواب لکھیں اور دلائل کا رد کریں تاکہ اگر میری کوئی استدلال کی غلطی ہے تو مجھ پر واضح ہو لیکن یہ خواہش پوری نہ ہوئی اور طعن و تشنیع کا سلسلہ کچھ دیر جاری رہ کر بات ٹھنڈی پڑ گئی۔......

سیاسی مسائل کو سیاسی بنیادوں پر طے کیجئے!

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور ـــ ۲۵ مئی ۱۹۷۳ء)

یہ ہمارے ملک کی بدنصیبی ہے کہ حکمرانوں نے ہمیشہ سیاسی مسائل اور عوام کے جائز تقاضوں کو جمہوری اور سیاسی بنیادوں پر طے کرنے کی بجائے تشدد کے استعمال کو ترجیح دی ہے۔ وہ بزعم خویش یہ سمجھتے رہے ہیں کہ اقتدار کی قوت اور کرسی کا دبدبہ آج کے جمہوری دور میں بھی سیاسی استحکام کی ضمانت دے سکتا ہے۔ مگر ربع صدی کے تجربہ نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ تشدد کے ذریعہ سیاسی اور جمہوری مسائل کو حل کرنے کی کوشش کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔

۱۹۵۳ء کی تحریکِ ختمِ نبوت

پاکستان میں سب سے پہلے جس جمہوری، عوامی اور دینی تحریک کو تشدد کے ذریعہ دبایا گیا وہ ۱۹۵۳ء کی تحریکِ ختمِ نبوت تھی۔ پاکستان کے مسلمان عوام کا یہ مطالبہ بالکل جائز اور منصفانہ تھا کہ قادیانی امت کو مسلمانوں سے الگ غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے اور کلیدی عہدوں پر فائز قادیانیوں کو ان کے مناصب سے الگ کر دیا جائے۔ اس مطالبہ کی مذہبی بنیادوں کے ساتھ ساتھ اس کے سیاسی محرکات و عوامل بھی بالکل واضح تھے مگر اس منصفانہ مطالبہ کو قبول کرنے کی بجائے قوت کے اندھادھند استعمال سے اس آواز کو دبا دینے کی راہ اختیار کی گئی۔ نتیجتاً یہ تحریک وقتی طور پر دب تو ضرور گئی مگر اس کے محرکات و اسباب ابھی تک بدستور اسی طرح موجود ہیں بلکہ ان عوامل کی قوت میں پہلے سے کہیں زیادہ اضافہ ہو چکا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آزاد کشمیر اسمبلی میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی قرارداد منظور ہوتے ہی پاکستان کے مختلف حصوں میں جلسوں اور جلوسوں پر پابندی عائد کر دی گئی اور متحدہ جمہوری محاذ سے یہ تحریری ضمانت مانگی گئی کہ اس کے جلسوں میں فرقہ وارانہ جذبات کو ہوا نہیں دی جائے گی۔ پابندیوں کا یہ سلسلہ ایوانِ اقتدار کی طرف سے اس بات کا واضح اعتراف ہے کہ وہ جمہوری مسئلہ جسے ۱۹۵۳ء میں اقتدار کی قوت سے وقتی طور پر دبا دیا گیا تھا، بیس سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود اپنے تمام تر اسباب و محرکات کے ساتھ موجود ہے۔

صوبائی خود مختاری کا مسئلہ

اسی طرح صوبائی خود مختاری کا مسئلہ لیجیے، اس مسئلہ نے ملک میں کیسے کیسے خطرناک بحرانوں کو جنم دیا۔ یہ اسی مسئلہ کی فتنہ سامانیوں کا نتیجہ ہے کہ ملک کا ایک بڑا حصہ ہم سے کٹ کر جدا ہو گیا اور ایک ہی قوم کے دو حصوں کے مابین نفرت و بے اعتمادی کی ایسی خلیج حائل ہو گئی جس کا پاٹنا بظاہر بے حد مشکل دکھائی دے رہا ہے۔ اگر ماضی کے حکمران اس سیاسی مسئلہ کو سیاسی ذرائع سے حل کرتے اور تشدد کا راستہ اختیار نہ کرتے تو صورتحال آج یقیناً مختلف ہوتی۔ اگر سیاسی مذاکرات کے ذریعے مستقل آئین میں صوبائی خود مختاری کی دفعات پر سرحد و بلوچستان جیسے چھوٹے صوبوں کا (جنہیں حق تلفی کا زیادہ خطرہ ہے) اتفاق حاصل ہو سکتا ہے، اور ہوا ہے، تو ملک کے سب سے بڑے صوبے کو سیاسی مذاکرات کے ذریعے مطمئن و متفق کر لینا چنداں مشکل نہ تھا۔ مگر شاید ہمارے حکمرانوں کو سبق ہی یہی پڑھایا گیا ہے کہ کچھ بھی ہو جائے مسائل کو حل کرنے کی بجائے تشدد کے ساتھ دبا دو۔ چنانچہ یہی تشدد تھا جس نے پاکستان کو دولخت کر کے رکھ دیا۔

سابقہ حکمرانوں کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ غیر منتخب اور غیر نمائندہ تھے اس لیے عوام کے جذبات و احساسات کا صحیح اندازہ نہ کر سکے۔ مگر موجودہ حکمران تو عوام کے ووٹوں کے ذریعہ الیکشن کی وادی سے گزر کر کرسیٔ اقتدار تک پہنچے ہیں، اس لیے ان سے یہ توقع بالکل بجا تھی کہ سیاسی مسائل کو یہ حضرات جمہوری اور سیاسی بنیادوں پر سوچیں گے مگر

ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

سندھ میں لسانی فسادات، سرحد و بلوچستان میں رچایا جانے والا غیر جمہوری ناٹک، آزاد کشمیر کی جمہوری حکومت کے خلاف سازش، مخالف سیاسی پارٹیوں کے خلاف بے بنیاد پراپیگنڈہ کی وسیع مہم، غداری اور وطن دشمنی کے مہمل فتوؤں کا آزادانہ استعمال، اظہار رائے پر قدغن، ڈی پی او اور دفعہ ۱۴۴ کا اندھا دھند استعمال، بے تحاشا سیاسی گرفتاریاں اور نظر بندوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک، قومی پریس پر ظالمانہ دباؤ، مخالف پارٹیوں کے جلسوں میں پیپلز گارڈ کی غنڈہ گردی اور فائرنگ، مساجد و مدارس میں بے جا مداخلت، اور ریڈیو وٹی وی اور ٹرسٹ کے اخبارات کے ذریعہ سرکاری پارٹی کے حق میں یکطرفہ پراپیگنڈہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ حکومت نے سابقہ حکومتوں کی غلطیوں سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا اور پیپلز پارٹی کے ارباب اختیار بھی سیاسی اور جمہوری مسائل کو سیاسی بنیادوں پر طے کرنے کی بجائے تشدد اور دباؤ کی پالیسی کو ترجیح دیتے ہیں۔

پیپلز پارٹی کے ارباب اختیار سے گزارش

کس قدر حیرت کی بات ہے کہ جمہوریت کے نام پر ووٹوں کے ذریعے برسر اقتدار آنے والے آج غیر جمہوری اقدامات اور ظالمانہ تشدد کے چیمپئن بنے ہوئے ہیں۔ تشدد اور دباؤ کی یہ پالیسی کس قدر غیر مؤثر ہے، ہم ماضی کے شواہد سے اس بات کو بخوبی واضح کر چکے ہیں۔ اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ حکمران جماعت خود بھی اس پالیسی کے ثمرات سے کسی حد تک آگاہ ہے، جیسا کہ وفاقی وزیر قانون جناب عبدالحفیظ پیرزادہ نے سندھ لاء کالج میں طلبہ اور اساتذہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے:

> "نوجوان نسل میں مایوسی، بے چینی اور تشدد کے رجحانات کی وجہ یہ ہے کہ استحصال کو جنم دینے والے نوآبادیاتی نظام کے تحت نوجوانوں کو اپنا مستقبل تاریک دکھائی دیتا ہے۔ انہوں نے کہا، ناانصافیوں اور مشکل حالات کی وجہ سے غریب لوگوں کو مسلسل مصائب کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور اس کے نتیجہ میں لوگ "آزاد بلوچستان" اور "سندھ دیش" جیسے نعرے لگاتے ہیں۔ انہوں نے ملک سے تشدد، مایوسی اور بے چینی کو دور کرنے کی ضرورت پر زور دیا اور کہا کہ اس قسم کے نعرے لگانے والوں کو طاقت کے بل پر دبانے کی بجائے ان کے مسائل کا صحیح حل ڈھونڈنا چاہیے"۔ (روزنامہ امروز، لاہور۔ ۲۰ مئی ۱۹۷۳ء)

وفاقی وزیر قانون اور صدر مملکت ذوالفقار علی بھٹو کے معتمد ساتھی کی حیثیت سے جناب پیرزادہ صاحب کے اس اعتراف حقیقت کو ہم خوش آئند سمجھتے ہیں اور حکمران پارٹی سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ غیر جمہوری اقدامات واپس لے کر اور تشدد و دباؤ کی پالیسی ترک کر کے ملک کی سیاسی پارٹیوں کو اعتماد میں لے گی اور امن و استحکام کی بحالی کی طرف قدم اٹھا کر قوم کو مایوسی، بے چینی اور خلفشار کے بھنور سے نجات دلائے گی۔

وفاقی وزیرِ داخلہ اور گورنر بلوچستان کا طرزِ سیاست

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — یکم جون ۱۹۷۳ء)

قادیانیت کے تحفظ میں مگن خان عبدالقیوم خان

یوں محسوس ہوتا ہے کہ صدر ذوالفقار علی بھٹو نے خان عبدالقیوم خان کو وزیر داخلہ بنایا ہی اس لیے ہے کہ وہ ملک کی جمہوری قوتوں اور عوامی صوبائی حکومتوں کو سبوتاژ کرنے کے لیے مسلسل سازشیں کرتے رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خان موصوف کی تمام سرگرمیوں کا محور یہی مقصد رہا۔ حتیٰ کہ جب سندھ کے لسانی فسادات پورے عروج پر تھے، لسانی عصبیت کا جنون مسلمان کے ہاتھوں مسلمان کا گلا کٹوانے میں مصروف تھا اور پورا سندھ خون میں نہایا ہوا تھا، خان موصوف سندھ میں وزیر داخلہ کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کی بجائے سرحد کی جمہوری حکومت کے خلاف تقریروں اور الزام تراشی میں مصروف تھے۔ اس ''مشن'' سے ان کی لگن ملاحظہ فرمایئے کہ بلوچستان اور سرحد کی آئینی، جمہوری اور اکثریتی حکومتوں کو جب تک غیر جمہوری طور پر سبکدوش نہیں کر دیا گیا، وہ چین سے نہیں بیٹھے۔

مگر سرحد و بلوچستان میں اپنے مقصد میں کامیابی کے بعد ان کو یہ بیکاری راس نہ آئی اور وہ اپنے لاؤ لشکر سمیت آزاد کشمیر کی منتخب جمہوری حکومت کے خلاف ریشہ دوانیوں کے محاذ پر آ دھمکے اور آج آزاد کشمیر کا خطہ خان عبدالقیوم خان کی ''فنی مہارت'' کا شاہکار بنا ہوا ہے۔ صدر آزاد کشمیر کو قادیانیت کی تبلیغ کی ممانعت کرنے اور قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے جرم میں استعفیٰ دینے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ عبد القیوم خان، خورشید میر اور یوسف بچ کی ثلیث آزاد کشمیر کی عوامی حکومت کو سبکدوش کر کے قادیانیت کا تحفظ کرنے کا تہیہ کر چکی ہے اور پاکستان کے ان نادان دوستوں کو اس بات کی بھی پروا نہیں رہی کہ آزاد کشمیر کی حکومت کے خلاف پاکستان کی وزارتِ داخلہ و امور کشمیر کی اس کھلم کھلا مداخلت سے عالمی رائے عامہ کے سامنے مسئلہ کشمیر کو کس قدر نقصان پہنچے گا اور آزاد کشمیر حکومت کی آزاد پوزیشن کس حد تک مشکوک ہو کر رہ جائے گی۔ ہم اس مداخلت کی پرزور مذمت کرتے ہیں اور سردار عبدالقیوم خان کو یقین دلاتے ہیں کہ تحفظِ ناموسِ رسالتؐ اور آزادیٔ کشمیر کی مہم میں پاکستان کے غیور عوام ان کے ساتھ ہیں۔

پاکستان اور بھارت کی کنفیڈریشن کے خواہشمند نواب اکبر خان بگٹی

لندن میں بیٹھ کر پاکستان اور بھارت کی کنفیڈریشن کے منصوبے پیش کرنے والے نواب اکبر بگٹی جب سے بلوچستان کے گورنر بنے ہیں، صوبہ کی اکثریتی سیاسی پارٹیوں اور عوامی قوتوں کے خلاف مسلسل ریشہ دوانیوں میں مصروف ہیں۔ ان صاحب نے "نیپ جمعیت" (نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت علماء اسلام) کے اکثریتی پارلیمانی گروپ کو اقلیت میں تبدیل کرنے کے لیے جو پاپڑ بیلے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اکثریتی گروپ کے ارکان کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے لالچ، دباؤ، دھمکی حتیٰ کہ منت سماجت کے حربے بھی استعمال کیے، مگر ان کی آرزو کسی طرح بَر نہ آئی اور اقلیتی گروپ کو کرسیٔ اقتدار پر مسلط کرنے کے بعد بھی اس نامسعود مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ہر طرف سے ناکام ہو کر بگٹی صاحب نے مینگل اور مری قبائل کے علاقوں میں سوچی سمجھی اسکیم کے تحت گڑبڑ کرا کے فوجی ایکشن کے لیے راہ ہموار کی اور مرکزی وزیرداخلہ مسٹر عبدالقیوم خان سے ملی بھگت کر کے اپنے اقتدار کو تحفظ دینے کی راہ نکالی۔ بگٹی قبیلہ کے اس نواب نے اپنی کرسی کو بچانے کے لیے آج بلوچستان کے غیور عوام پر سنگینیں تان رکھی ہیں اور بلوچستان میں فوج کشی کے بعد حالات لحظہ بہ لحظہ دگرگوں ہوتے جا رہے ہیں۔

ہم مرکزی حکومت سے صرف اتنی گزارش کریں گے کہ خدا کے لیے ایک نواب کی کرسی کو بچانے کے لیے پورے ملک کو داؤ پر نہ لگائیں۔ بیرونی طاقتیں پاکستان کو ختم کرنے کے لیے گھات میں بیٹھی ہیں، انہیں بہانہ فراہم نہ کریں۔ اکبر بگٹی کا اقتدار ملک کے وجود و سلامتی سے زیادہ اہم نہیں ہے۔ بلوچستان میں اکثریتی حکومت کا قیام ایک سیاسی مسئلہ ہے اور سیاسی مسئلہ کو فوج کے ذریعہ حل کرنے کا انجام آپ مشرقی پاکستان میں دیکھ چکے ہیں۔ بلوچستان کے مسئلہ کا واحد حل یہ ہے کہ وہاں سے فوج واپس بلائی جائے، بگٹی صاحب کو رخصت دی جائے، اور "نیپ جمعیت" کے اکثریتی پارلیمانی گروپ کی آئینی و جمہوری حکومت کو بحال کیا جائے۔

لاٹھی گولی کی سرکار نہیں چلے گی

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۸ جون ۱۹۷۳ء)

ملتان اور لاہور میں ''متحدہ جمہوری محاذ'' کے عام جلسوں کو ناکام بنانے کے لیے جو حربے اختیار کیے گئے وہ تشدد اور فسطائیت کی دنیا میں نئے نہیں۔ قافلۂ جمہوریت کو اس سے قبل بھی امتحان و آزمائش کے اس موڑ سے بارہا گزرنا پڑا اور اب بھی یہ راہ متحدہ جمہوری محاذ کے رہنماؤں کے لیے جانی پہچانی گزر گاہ ہے۔

جمہوری عمل کی بجائے تشدد پسندی

دراصل لیاقت باغ کے خونی المیہ کے بعد سے ہی یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ حکمران طبقہ نے اصول، شرافت اور جمہوری عمل کی بساط لپیٹ دی ہے اور اب وہ اپنے اقتدار کے تحفظ کے لیے عوام کو اعتماد میں لے کر سیاسی جنگ لڑنے کی بجائے بندوق کی نالی اور کرایہ کے غنڈوں پر بھروسہ کرے گا۔ جگہ جگہ دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ، ڈی پی او کے اندھادھند استعمال، متحدہ جمہوری محاذ کے رہنماؤں کی گرفتاریوں اور اپوزیشن کے جلسوں میں غنڈہ گردی نے اس امر کی تصدیق کر دی تھی۔ اور رہی سہی کسر ملتان اور لاہور میں متحدہ جمہوری محاذ کے جلسوں کو ناکام بنانے کی خاطر پولیس، وفاقی سکیورٹی فورس اور پیپلز گارڈ کے ''عوامی'' مظاہروں سے پوری ہو گئی ہے۔

ملتان اور لاہور میں جو کچھ ہوا وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ سب کچھ سوچی سمجھی اسکیم کے تحت ہوا اور پورے صوبہ بلکہ مرکزی انتظامی مشنری کو متحدہ محاذ کے جلسوں کی ناکامی کے لیے مصروف کر دیا گیا۔ اور جلسوں کی ناکامی کے بعد منائی جانے والی خوشیوں سے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ گویا ہماری بہادر پولیس، وفاقی سکیورٹی فورس اور پیپلز گارڈ متحدہ محاذ کے جلسوں کو نہیں بلکہ دشمن کے کسی بڑے حملے کو پسپا کر کے آئی ہیں، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

صلاحیتوں کا منفی استعمال

کس قدر افسوس کی بات ہے کہ جو دماغ اور قوت امنِ عامہ کی بحالی، غنڈہ گردی، جرائم کے انسداد اور جمہوری عمل کے تحفظ کے لیے خرچ ہونی چاہیے تھی، اسے سیاسی غنڈہ گردی کے فروغ اور جمہوری اقدار کی پامالی کی خاطر استعمال کیا جا رہا ہے۔ ہم اس سے قبل بھی ان کالموں میں یہ بات عرض کر چکے ہیں کہ

تشدد کے ذریعہ جمہوری تحریک کو روکنے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اگر ہمارے حکمران یہ سمجھتے ہیں کہ وہ لاٹھی اور گولی کے ذریعہ قافلۂ جمہوریت کی راہ روک سکیں گے تو یہ ان کی خام خیالی ہے، وہ اس خواب سے جتنی جلدی بیدار ہو جائیں ان کے حق میں بہتر ہوگا۔ حکمران پارٹی کو اس ملک میں سیاسی جنگ لڑنے کا خاصا تجربہ ہے اور وہ سیاسی راستوں سے ہی اس مقام پر پہنچی ہے تو پھر اسے سیاسی میدان میں آنے سے ہچکچاہٹ کیوں ہے؟ اقتدار پر کسی کو دوام نہیں، یہ کسی کا وفادار نہیں، کوئی عقلمند اس پر بھروسہ نہیں کرتا کہ اقتدار آتا ہے تو جانے کے لیے۔

ہماری اپنے حکمرانوں سے صرف یہ گزارش ہے کہ سیاسی عمل کی سیڑھی کو درمیان سے نہ ہٹاؤ ورنہ ایوب خان کی طرح بلندی سے چھلانگ لگانا پڑ گئی تو اس مینار پر دوبارہ چڑھنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہو جاؤ گے۔ آؤ اور اخلاقی جرأت سے کام لے کر سیاسی عمل کو بحال کرو۔ متحدہ جمہوری محاذ اور دیگر اپوزیشن پارٹیوں کو آزادی کے ساتھ اظہار رائے کا موقع دو اور خود بھی عوام میں آکر اپنی پالیسیوں اور طرز عمل کی وضاحت کرو۔ عوام کو اعتماد میں لو اور اس بات کا فیصلہ انہی پر چھوڑ دو کہ حکومت اور اپوزیشن میں سے کون سچا ہے اور کون جھوٹا۔

اس موقع پر ہم متحدہ جمہوری محاذ کے باہمت رہنماؤں کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے حوصلہ، تدبر اور جرأت کے ساتھ تحریکِ جمہوریت کو سنبھالا دیا ہے اور قافلۂ جمہوریت آج پھر ان عظیم قائدین کی پر خلوص راہنمائی میں اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ قافلہ جلد اپنی منزل مقصود تک پہنچے گا اور تشدد اور فسطائیت کا ہر وار اس قافلہ کے حوصلہ کے لیے مہمیز ثابت ہوگا، ان شاء اللہ العزیز۔

انتظامیہ کو سیاسی جنگ میں فریق نہ بنائیے!

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۱۵ جون ۱۹۷۳ء)

انتظامیہ کا کام ہوتا ہے کہ ملک میں قانون و آئین کی بالادستی کا تحفظ کرے، امن و امان بحال رکھے اور غیر جانبداری کے ساتھ نظم و نسق چلائے۔ اس فرض کی صحیح ادائیگی کے لیے ضروری ہے کہ انتظامیہ ملک میں سیاسی وفاداریوں سے لاتعلق ہو کر اپنے کام سے کام رکھے اور جہاں کوئی بات اسے قانون کے خلاف نظر آئے، اس کے خلاف بلا جھجک کارروائی کرے۔ جن جمہوری ممالک میں انتظامیہ اپنے فرائض کو سیاسی عمل سے الگ تھلگ رکھتی ہے وہاں سیاسی عمل بھی جمہوری اقدار کا حامل ہے اور انتظامیہ کو فرائض کی کماحقہ ادائیگی میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آتی۔ مگر بدنصیبی سے ہمارے ہاں یہ قصہ نہیں ہے۔

پاکستان میں سیاسی مقاصد کی خاطر انتظامیہ کو اس بے دردی کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے کہ اب تو سرکاری پارٹی اور انتظامیہ مشینری کے درمیان فرق کرنا مشکل دکھائی دے رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ تو انتظامیہ اپنے فرائض کی تکمیل میں مستعد ہے اور نہ ہی سیاسی عمل "اقتدار کے ڈنڈے" کے سائے سے نجات حاصل کر سکا ہے۔ چوری، ڈاکہ، زنا، اغوا، اسمگلنگ، غنڈہ گردی اور ذخیرہ اندوزی جیسے سنگین جرائم کے روز افزوں اضافہ کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ انتظامیہ مجرموں کے خلاف کارروائی کرتے وقت سیاسی مصلحتوں کا شکار ہو جاتی ہے اور بیشتر مجرم اپنی سیاسی وابستگیوں کے باعث قانون کی گرفت سے بچ نکلتے ہیں۔

یہی حال سیاسی عمل کا ہے۔ ضمیر کی آواز کے اظہار اور سیاسی اختلاف رائے کو آج بھی انتظامیہ کے زیر عتاب آنے کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ اور بہت سے افراد انتظامیہ کی ناراضی کا خطرہ مول نہ لیتے ہوئے ضمیر کی آواز کو دبائے رکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اور جو مردانِ حُر اِس خطرہ سے بے نیاز ہو کر حق و صداقت کی آواز پر لبیک کہتے ہیں، انتظامیہ ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔

بلوچستان میں غیر آئینی حکومت کی حمایت نہ کرنے کی پاداش میں جمعیۃ کے قائدین اور ممبران اسمبلی مولانا شمس الدین اور مولانا صالح محمد کو ایک اسسٹنٹ کمشنر کی طرف سے خوفناک نتائج کی دھمکی اور پھر ان کی رہائش پر مسلح حملہ۔ اور گوجرانوالہ، وزیر آباد ریلوے اسٹیشن پر متحدہ جمہوری محاذ کے راہنماؤں پر فائرنگ اور پتھراؤ کے بارے میں پیپلز گارڈ کی شکایت پر ان سے تعاون نہ کرنے کے الزام میں گورنر پنجاب کی طرف سے ڈپٹی کمشنر، ایس ایس پی اور سٹی انسپکٹر پولیس کی جواب طلبی (اگر یہ واقعہ درست ہے تو) اس سلسلہ کی تازہ ترین اور افسوسناک مثالیں ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ہم حکمرانوں سے درخواست کریں گے کہ خدا کے لیے انتظامیہ کو سیاسی جنگ میں فریق نہ بنائیں اور اسے بلا جھجھک اپنا فرض ادا کرنے دیں۔ ورنہ ملک سیاسی اور انتظامی طور پر جس خوفناک انارکی کی طرف بڑھ رہا ہے اس کی ذمہ داری سے آپ اپنے آپ کو محفوظ نہیں رکھ سکیں گے۔ خدا ہمارے حکمرانوں کو سمجھ عطا فرمائے، آمین۔

حنیف رامے صاحب! اشتراکیت نہیں، اسلام کی ضرورت ہے

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۲۲ جون ۱۹۷۳ء)

پنجاب کے وزیر خزانہ جناب محمد حنیف رامے نے صوبائی اسمبلی میں سمال انڈسٹریز کارپوریشن بل پر بحث کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ پاکستان کے حالات کا اولین تقاضا ہے کہ ہم سودی نظام سے نجات حاصل کریں، اور حکومت سود سے پاک اقتصادی نظام رائج کرنے کا ارادہ رکھتی ہے، مگر موجودہ سرمایہ دارانہ و جاگیردارانہ نظام میں سود سے چھٹکارا ممکن نہیں، اس کے لیے ضروری ہے کہ موجودہ معاشی نظام سے گلوخلاصی کرا کے اشتراکی نظام رائج کیا جائے۔ حنیف رامے صاحب نے اس سلسلہ میں کارل مارکس فریڈرک، اینگلز اور لینن کے حوالہ سے اشتراکیت کا ذکر کرتے ہوئے جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کا سب سے پہلا سوشلسٹ قرار دیا۔

جہاں تک رامے صاحب کے اس ارشاد کا تعلق ہے کہ پاکستان کے حالات کا اولین تقاضا سودی نظام سے نجات حاصل کرنا ہے، ہم اس سے سو فیصد متفق ہیں اور اس لحاظ سے ہمیں خوشی ہوئی ہے کہ برسرِ اقتدار طبقہ کے ایک ذمہ دار فرد نے اس حقیقت کا برملا اعتراف کیا ہے جس پر علماء حق قیامِ پاکستان سے اب تک مسلسل زور دیتے آئے ہیں۔ یہ اعتراف جرأتمندانہ بھی ہے اور حوصلہ افزا بھی۔ ہم رامے صاحب کے اس خیال سے بھی متفق ہیں کہ موجودہ سرمایہ دارانہ وجاگیردارانہ نظام کی موجودگی میں سود سے گلو خلاصی مشکل ہے۔ سود کے خاتمہ کے لیے ضروری ہے کہ پورے اقتصادی ڈھانچہ کو از سر نو انقلابی تبدیلیوں کے ساتھ مرتب کیا جائے۔

سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام کا موازنہ

مگر معزز وزیر خزانہ کے اس فرمان سے اتفاق مشکل ہے کہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کی جگہ کارل مارکس اور لینن کے اشتراکی نظام کا نفاذ ناگزیر ہے۔ اور نہ ہم ان کی طرف سے کارل مارکس کے حوالہ سے جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو ''سوشلسٹ'' قرار دے سکتے ہیں۔ ہمارے نزدیک کارل مارکس اور لینن کے ساتھ آقائے نامدار علیہ السلام کا ذکر بھی ختمی مرتبت کی توہین ہے چہ جائیکہ ان کے درمیان فکری مناسبت کی قدریں تلاش کی جائیں، العیاذ باللہ۔

اشتراکی نظام عالمِ انسانیت کے مسائل کا حل نہیں اور رامے صاحب کا یہ کہنا غلط ہے کہ اشتراکی نظام میں ''محنت'' کو بنیادی درجہ حاصل ہے اور سرمایہ داری کی گنجائش نہیں۔ کیونکہ اشتراکیت تو سرمایہ داری کی ایسی گھناؤنی شکل ہے جس میں محنت، سرمایہ کے دباؤ سے آزادی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ فرق صرف یہ ہے کہ

- سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ انفرادی طور پر محنت کا استحصال کرتا ہے،
- مگر اشتراکیت میں وہی سرمایہ اجتماعیت اور حکومت کے ڈنڈے سے مسلح ہو کر محنت پر مسلط ہو جاتا ہے، اور پھر محنت کار کا جو حشر ہوتا ہے اس کا سوشلسٹ ممالک خصوصًا روس کی رجعتِ قہقہری سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

محنت کار کی جو سرمایہ دارانہ نظام میں حیثیت ہے وہی اشتراکی نظام میں ہے، بلکہ اس سے بھی بدتر، کیونکہ اشتراکی نظام میں حکومت سرمایہ دار کا فرض انجام دیتی ہے اور اس کے ہاتھ میں لاء اینڈ آرڈر کا ڈنڈا بھی ہوتا ہے، اس لیے اس نظام میں تو محنت کار کے لیے آزادی کے ساتھ سانس لینے کی بھی گنجائش نہیں رہتی۔ ہمارے نزدیک سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت ایک ہی سکے کے دورخ ہیں اور محنت کار کی محنت کا دونوں ہی استحصال کرتے ہیں۔ ایک انفرادی شکل میں اور دوسرا اجتماعی طور پر۔

استحصال کا خاتمہ صرف اسلامی نظام میں

استحصال کے خاتمہ اور محنت و سرمایہ کے درمیان توازن کی ضمانت دنیا میں صرف ایک نظام دیتا ہے اور وہ ہے ''اسلام''۔ حضرت محمد عربیؐ، صدیق اکبرؓ، فاروق اعظمؓ، عثمان غنیؓ، حیدر کرارؓ، صحابہ کرامؓ، عمر بن عبدالعزیزؒ اور سلف صالحینؒ کا اسلام۔ جس اسلام نے دنیا میں حقوق کی مساوات کی مثال قائم کی اور جس کے عملی نفاذ کا دور دنیائے انسانیت کی تاریخ کا حاصل ہے۔ اسلام نے سرمایہ اور محنت کے حقوق متعیّن کر کے ان کے درمیان ایسا توازن قائم کیا ہے جس سے دونوں کے مابین نزاع کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا ہے۔

اسلام سرمایہ دار اور محنت کار کے درمیان نفرت پیدا کر کے اور انہیں آپس میں لڑا کر طبقاتی تقسیم کے بہانے ایک گروہ کو ہمیشہ کے لیے دوسرے پر مسلط کرنے کا روادار نہیں۔ بلکہ وہ باہمی الفت و محبت، صلح و آشتی اور ادائیگیٔ حقوق کے ماحول میں اجتماعی زندگی کی گاڑی چلانے کی عملی مثال پیش کرتا ہے۔ اس کے نزدیک نہ ''سرمایہ''، شرافت و عزت اور عظمت کی دلیل ہے اور نہ ''محنت''۔ بلکہ وہ کردار کو عظمت کی دلیل قرار دیتا ہے۔ انسانی اخلاق و کردار سے اگر عثمان غنیؓ، عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور زبیر بن عوامؓ جیسے مالدار

وابستہ ہوں تو اسلام ان کی عظمت کے گن گاتا ہے۔ اور اگر بلالؓ، صہیبؓ، وحشیؓ، عمارؓ، خبیبؓ اور زیدؓ جیسے محنت کار اخلاق و کردار کی اس راہ پر گامزن ہوں تو اسلام ان کی زندگی کو انسانی زندگی کی معراج قرار دیتا ہے۔ اصل بات سرمایہ یا محنت کی نہیں بلکہ انسانی بھائی چارہ، باہمی حقوق کی صدقِ دل سے ادائیگی، اور ظلم و بے انصافی کی راہ سے گریز ہے۔ اور اس کی ضمانت نہ سرمایہ دارانہ نظام دیتا ہے اور نہ اشتراکی نظام۔ اس کا ضامن صرف اسلام ہے۔

اس لیے ہم اربابِ اقتدار سے گزارش کریں گے کہ آپ ''آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا'' والی بات نہ کریں۔ اگر آپ صدقِ دل سے ملک میں سرمایہ دارانہ نظام کی جگہ منصفانہ اور عادلانہ نظام نافذ کرنا چاہتے ہیں تو وہ عادلانہ نظام اشتراکیت نہیں، اسلام ہے۔ آؤ اور حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہؒ کے حکیمانہ فلسفہ کی بنیاد پر فرنگی سامراج کے ساختہ پرداختہ سرمایہ دارانہ نظام کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا سچا، عادلانہ اور منصفانہ نظام نافذ کرنے کی بات کرو، پھر دیکھو کہ خدا کی رحمتیں اور برکتیں کس طرح پاکستان پر نازل ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس راہ پر گامزن ہونے کی توفیق دیں، آمین۔

گورنر بلوچستان اکبر خان بگٹی کا ''تاریخی میزانیہ''

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور ـــ ۶ جولائی ۱۹۷۳ء)

گورنر بلوچستان جناب نواب محمد اکبر خان بگٹی اپنے تمام تر دعاویٰ کے باوجود صوبائی اسمبلی کا بجٹ اجلاس بلانے کی ہمت نہیں کر سکے، اور گورنر کو براہ راست بجٹ کی منظوری کا اختیار دینے کے لیے صدر محترم کو عبوری آئین میں ترمیم کرنا پڑی۔ اس طرح نواب صاحب نے ''خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ'' کے مصداق اسے ''تاریخی میزانیہ'' کا خطاب بھی مرحمت فرما دیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ میزانیہ یقیناً ''تاریخی'' ہے کہ صوبائی اسمبلی کی موجودگی میں اس کا اجلاس بلائے بغیر گورنر صاحب نے از خود بجٹ پیش کیا اور از خود اس کی منظوری بھی دے دی۔ جمہوریت کی تاریخ میں شاید اس انوکھے واقعہ کی مثال نہ مل سکے۔ مگر ہم جمہوریت کے اس قتلِ عام اور عوام کے منتخب ایوان کی کھلم کھلا توہین کی مذمت کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہمارے نزدیک یہ نہ صرف صوبائی اسمبلی بلکہ عبوری آئین اور جمہوری اقدار کی بھی توہین ہے۔

حیرانگی کی بات ہے کہ صدر ذوالفقار علی بھٹو ایک طرف تو مری میں اپوزیشن راہنماؤں کے ساتھ جمہوریت کی بحالی اور سیاسی اقدار کے تحفظ کے لیے مذاکرات فرما رہے ہیں، اور وزیر قانون کے ارشاد کے مطابق تمام قومی مسائل کو جمہوری طریقوں سے حل کرنے کا اصولی فیصلہ ہو گیا ہے، مگر دوسری طرف بلوچستان میں جمہوریت کے ساتھ اس بیہودہ مذاق اور عوامی نمائندگان کی توہین کے عمل کو بھی ان کی عملی سرپرستی حاصل ہے۔ آخر یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا اور بلوچستان میں عوام کے منتخب نمائندوں کو ان کے حقوق سے کب تک محروم رکھا جائے گا؟

حال ہی میں ایک حکم میں کہا گیا تھا کہ اسمبلی کے ارکان کے فرائض کی ادائیگی میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بن سکے گی۔ کیا نواب بگٹی کی ہٹ دھرمی بلوچستان اسمبلی کے ارکان کی ادائیگیٔ فرض میں رکاوٹ نہیں؟ بہر حال نواب بگٹی کا سالانہ بجٹ از خود پیش کرنا اس بات کا کھلم کھلا ثبوت ہے کہ وہ اور ان کی خود ساختہ غیر جمہوری کابینہ صوبائی اسمبلی کا اعتماد حاصل کرنے میں قطعاً ناکام ہو چکی ہے، اس لیے انہیں اپنی کابینہ سمیت گورنر کے عہدہ سے الگ ہو جانا چاہیے۔

مری میں صدر بھٹو کے ساتھ جاری مذاکرات

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۶ جولائی ۱۹۷۳ء)

ان دنوں مری میں صدر مملکت جناب ذوالفقار علی بھٹو اور اپوزیشن کے پارلیمانی قائدین کے مابین اہم قومی مسائل پر مذاکرات کا سلسلہ جاری ہے۔ تادمِ تحریر ان مذاکرات کی تفصیلات منظر عام پر نہیں آئیں، البتہ وفاقی وزیر قانون جناب پیرزادہ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ ان مذاکرات میں اصولی طور پر تمام اہم مسائل کو سیاسی و جمہوری بنیادوں پر افہام وتفہیم کے ذریعے طے کرنے کا فیصلہ ہوگیا ہے، اور تفصیلات طے کرنے کے لیے مذاکرات جاری رہیں گے۔

ہم نے ان کالموں میں بارہا اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ ملک کے اہم قومی مسائل کو حکومت اور اپوزیشن کے درمیان محاذ آرائی کی بنیاد نہیں بننا چاہیے اور نہ ہی اس وقت ملک کسی قسم کی محاذ آرائی کا متحمل ہے۔ بلکہ حکومت کا فرض ہے کہ وہ اہم مسائل طے کرتے وقت جمہوری اصولوں کا دامن نہ چھوڑے، اپوزیشن کو اعتماد میں لے کر افہام وتفہیم کے ساتھ قومی مسائل کا حل تلاش کرے، اور سیاسی مسائل کو سیاسی بنیادوں پر طے کیا جائے۔ کیونکہ اگر سیاسی مسائل کے حل کے لیے غیر جمہوری ذرائع اختیار کیے جائیں تو نتیجہ انتشار، باہمی بداعتمادی اور بے یقینی کے سوا کچھ نہیں نکلتا، جیسا کہ ہم مشرقی پاکستان میں اس سے بھی زیادہ تلخ نتائج کا سامنا کر چکے ہیں۔ کچھ عرصہ سے حکومت اور اپوزیشن کے مابین محاذ آرائی، اپوزیشن کی جمہوری سرگرمیوں کو نت نئے ہتھکنڈوں سے کچلنے اور سرحد و بلوچستان میں غیر جمہوری اقدامات کے باعث بے یقینی کی جو فضا قائم ہو چکی تھی اس سے ہر شہری پریشان تھا اور ابھی تک اس غیر یقینی صورتحال کے بادل چھٹنے نہیں پائے۔

ان حالات میں صدر مملکت کی طرف سے اپوزیشن راہنماؤں کو مذاکرات کی دعوت اور مذاکرات کے پہلے دور میں تمام مسائل کو جمہوری بنیادوں پر حل کرنے کا اصولی فیصلہ یقیناً حوصلہ افزا اور خوش آئند ہے۔ یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ اگر ان راہنماؤں نے حوصلہ، تدبر اور رواداری سے کام لیا تو جلد باہمی اعتماد کی فضا بحال ہو جائے گی اور عوام بے یقینی کی کیفیت سے نجات پا سکیں گے۔

چونکہ مذاکرات جاری ہیں اس لیے ہم سرِدست مذکورہ بالا گزارشات کے سوا کچھ عرض نہیں کر سکتے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان مذاکرات کے نتائج کو ملک و ملت کے حق میں بہتر بنائیں اور ہمارے

راہنماؤں کو مل جل کر قوم کی کشتی کو بھنور سے نکال کر ساحل پر لگانے کی توفیق و ہمت عطا فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

بلوچستان کی صورتحال اور قادیانیوں کی سرگرمیاں

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور ۔۔۔ ۲۷ جولائی ۱۹۷۳ء)

بلوچستان اپنے جغرافیائی محلِ وقوع اور دیگر گوناگوں خصوصیات کے باعث کافی عرصہ سے اندرونی و بیرونی سازشوں کی مذموم مساعی کی آماجگاہ بنا ہوا ہے، اور آج بھی سازشی قوتیں تمام وسائل کے ساتھ بلوچستان کے امن کو اپنے مقصد کی بھینٹ چڑھانے کے لیے سرگرمِ عمل ہیں۔

۱۹۵۲ء کی بات ہے، قادیانی گروہ کے سربراہ مرزا بشیر الدین محمود نے بلوچستان کو قادیانی علاقہ قرار دینے کے منصوبے کا اعلان کیا تھا، اور ۱۹۵۳ء کی تحریکِ ختمِ نبوت کے محرکات میں یہ منصوبہ بھی شامل تھا۔ لیکن پاکستان کے غیور مسلمانوں نے اس گروہ کے تمام منصوبوں کو خاک میں ملا دیا اور علماء کی بروقت جدوجہد سے قادیانی سازشوں کے تاروپود بکھر کر رہ گئے۔

غالباً مرزا بشیر الدین کے فرزند مرزا ناصر احمد کو اپنے باپ کا منصوبہ ابھی نہیں بھولا اور شاید یہی وجہ ہے کہ بلوچستان میں "نیپ جمعیۃ" حکومت کے خاتمہ کے بعد یہ محسوس کر کے کہ بلوچستان میں دیندار عوام اور علماء کی واحد نمائندہ تنظیم جمعیت علماء اسلام اس وقت مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے عتاب کا شکار ہے، اور یہ دیکھ کر کہ بلوچستان میں بیرونی دلچسپیاں دن بدن اضافہ پذیر ہیں، مرزا ناصر احمد نے باپ کے ۲۱ سالہ پرانے خواب کی تعبیر کے لیے فضا کو سازگار اور ہموار سمجھ لیا۔ ورنہ فورٹ سنڈیمن (ژوب) کے علاقہ میں یکایک ہزاروں کی تعداد میں قادیانی ترجمہ قرآن کریم اور مسلمانوں کے اجماعی عقائد کے خلاف لٹریچر کی کھلم کھلا تقسیم اور مسلمانوں کو مشتعل کر کے خانہ جنگی کی آگ بھڑکانے کا اور کیا مقصد ہو سکتا ہے؟

ایسے وقت میں جبکہ بلوچستان کی سیاسی صورتحال غیر یقینی اور غیر مستحکم ہے اور حکمران پارٹی اور بلوچستان کی نمائندہ جمہوری جماعتوں کے درمیان اعتماد کی فضا سوچی سمجھی اسکیم کے تحت ختم کر دی گئی ہے، قادیانی گروہ کا بلوچستان کی سرزمین کو اپنی سرگرمیوں کا محور بنانا محلِ نظر ہے۔ ہم حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ قادیانیوں کی سرگرمیوں کا محاسبہ کیا جائے اور بلوچستان میں اس سلسلہ میں گرفتار شدگان کو رہا کر کے وہاں کی نمائندہ جماعتوں کو اعتماد میں لیتے ہوئے اس خطہ کو سازشوں کا شکار ہونے سے بچایا جائے۔

جمہوری حکومت کی ''ایک سالہ کارگزاری''

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۱۰ اگست ۱۹۷۳ء)

۱۔ قائدِ جمعیت علماء اسلام حضرت مولانا مفتی محمود صاحب نے قومی اسمبلی میں جمعیت علماء اسلام بلوچستان کے امیر مولانا شمس الدین کی گمشدگی کے بارہ میں تحریکِ التواء پیش کرتے ہوئے اس خدشہ کا اظہار کیا ہے کہ شاید حکومت نے مولانا موصوف کو شہید کر دیا ہے، اسی لیے انہیں ان کے گھر سے گرفتار کرنے کے باوجود ان کے بارے میں مسلسل لاعلمی ظاہر کی جارہی ہے۔

۲۔ بلوچستان نیشنل عوامی پارٹی کے راہنما ڈاکٹر عبد الحیٔ بلوچ ایم این اے نے پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے انکشاف کیا ہے کہ یحییٰ حکومت نے امریکہ سے اذیت رسانی کے جو آلات منگوائے تھے، موجودہ حکومت انہیں سیاسی قیدیوں پر استعمال کر رہی ہے جس کے نتیجہ میں نیشنل عوامی پارٹی کے پانچ کارکن جیل میں ذہنی توازن کھو بیٹھے ہیں۔

۳۔ کراچی میں تحریکِ استقلال کے دفتر پر سینکڑوں حملہ آوروں نے اس وقت حملہ کر کے سارا نظام درہم برہم کر دیا جب کہ تھوڑی دیر بعد تحریک کے سربراہ کارکنوں سے خطاب کرنے والے تھے۔ اور جب نوجوانوں نے اس کاروائی کی مزاحمت کی تو پولیس نے حملہ آوروں کو روکنے کی بجائے مزاحم نوجوانوں کو ننگا کر کے ان پر لاٹھیاں برسائیں۔

۴۔ بلوچستان سے ہمارے نمائندہ خصوصی کی رپورٹ کے مطابق بگٹی حکومت نے سیاسی مخالفین کا راشن تک بند کر رکھا ہے۔ دیہات میں راشن لے جانے کی ممانعت ہے، جگہ جگہ چیکنگ پوسٹیں قائم ہیں، پردہ دار خواتین تک کی جامہ تلاشی ہوتی ہے، اور ایک سیر آٹا لے جانے کی بھی اجازت نہیں دی جاتی۔ خصوصاً دیہاتی عوام کو سخت ترین پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

۵۔ جمعیت علماء اسلام پنجاب کے راہنما مولانا منظور احمد چنیوٹی کو گرفتار کر لیا گیا ہے، جبکہ جھنگ کے خطیب مولانا محمد فاروق کو طلب کر کے ڈپٹی کمشنر صاحب متنبہ فرما چکے ہیں کہ وہ حکومت کے خلاف کچھ نہ کہیں اور سیاسی تقریریں نہ کریں۔

یہ ہے ایک جھلک اس پارٹی کے کارناموں کی جو عوامی جمہوریت کے نام پر انتخابات لڑ کے برسرِ اقتدار آئی ہے اور جس کے منشور کے سرورق پر یہ درج ہے کہ ''جمہوریت ہماری سیاست ہے''۔

صدر مملکت نے گزشتہ روز قومی اسمبلی میں وفاقی حکومت کی ایک سالہ کارگزاری کی رپورٹ پیش کی ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ صدر صاحب اس میں یہ تفصیل بھی عوام کو بتاتے کہ اس سال پولیس کے تشدد سے کتنے شہری ہلاک ہوئے، کتنے سیاسی کارکنوں کے خلاف مقدمات قائم کیے گئے، کتنے لیڈر گرفتار ہوئے، متحدہ جمہوری محاذ کے کتنے جلسوں کو درہم برہم کیا گیا، اپوزیشن اور خصوصاً "نیپ جمعیۃ" کے ساتھ کتنی بار وعدے کر کے خلاف ورزی کی گئی، اور ارکانِ اسمبلی کے ضمیر خریدنے کے مقدس کام پر کتنی رقم خرچ ہوئی؟ آخر یہ "عظیم کارگزاری" بھی تو آپ ہی کی ہے، رپورٹ پیش کرنے لگے تھے تو اسے مکمل ہی کر لیتے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہدایت مرحمت فرمائے۔

زندہ باد مولانا شمس الدین!

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور ـــ ۳۱ اگست ۱۹۷۳ء)

خدا خوش رکھے جمعیت علماء اسلام بلوچستان کے جواں سال سربراہ برادرِ مکرم مولانا سید شمس الدین کو کہ انہوں نے اس نازک دور میں اسلاف کی عظیم روایات کی پاسداری کا مقدس فریضہ سرانجام دیا جبکہ بڑے بڑے ''پیرانِ پارسا'' اقتدار کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہو چکے ہیں، اور زر وسیم کی دلربائی اور ہوسِ اقتدار کی حدت کے سامنے ''زہد وورع'' کے پرانے اور زنگ آلود قفل بھی پگھل کر رہ گئے ہیں۔

مولانا سید شمس الدین نے گورنر بگٹی کی قید سے رہائی کے بعد کراچی میں مختلف تقریبات سے خطاب کرتے ہوئے اپنی گرفتاری کی جو تفصیلات بتائی ہیں ان کی مختصر رپورٹ ہمارے نمائندہ خصوصی کے قلم سے آپ اسی شمارہ میں ملاحظہ فرمارہے ہیں۔ اندازہ لگائیے کہ دباؤ اور لالچ کا وہ کونسا حربہ ہے جو اس مرد قلندر کو پھسلانے کے لیے آزمایا نہیں گیا۔ وزارتِ اعلیٰ اور منہ مانگی رقم تک کی پیشکش کی گئی مگر زرِ وسیم کی چمک دمک، وزارتِ اعلیٰ کا جاہ وجلال اور زنجیروں کی جھنکار اس مرد مجاہد کے پائے استقلال میں لرزش پیدا نہ کر سکی، اور اس نے دولت واقتدار کو ٹھکرا کر قید کی تنہائیوں کو آباد کیا۔ شاہ ولی اللہؒ، شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ اسماعیلؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، شیخ الہندؒ، شیخ مدنیؒ، مولانا آزادؒ اور شیخ لاہوریؒ کی تابندہ روایات کو سینے سے لگایا۔ اپنوں کے ہاتھوں چرکے کھانے والے کارکنوں کے زخمی دلوں کو سہارا بخشا۔ اور آج وہ لالچ اور دباؤ کی قوتوں کو شکست فاش دے کر بلوچستان کے جواں ہمت اور غیور علماء وکارکنوں کی راہنمائی کے لیے پھر میدانِ عمل میں موجود ہیں۔

یہاں اگر مولانا سید شمس الدین کے والدِ محترم حضرت مولانا محمد زاہد صاحب مدظلہ کا ذکر نہ کیا گیا تو بخل ہوگا، جن کی سرپرستی اور پشت پناہی نے مولانا شمس الدین کے حوصلہ اور جرأت کو دوچند کر دیا۔ ان کی رہائی کے لیے گورنر بگٹی کے ساتھ ملاقات سے انکار کر کے علماء حق کے وقار کو قائم رکھا۔ اور یہ ثابت کر دیا کہ حق کے پرستار آج کے دور میں بھی حق وصداقت پر سب کچھ نچھاور کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ ہم اس عظیم باپ اور عظیم بیٹے کو سلام پیش کرتے ہیں اور اللہ رب العزت کی بارگاہ میں دست بدعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ مولانا شمس الدین کی استقامت اور حوصلہ کو قائم ودائم رکھیں اور ہم سب کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق بخشیں، آمین یارب العالمین۔

متحدہ جمہوری محاذ کو یکطرفہ نصیحت

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور ــــ ۳۱ اگست ۱۹۷۳ء)

متحدہ جمہوری محاذ کی طرف سے حکومت کی غیر جمہوری پالیسیوں اور غیر آئینی اقدامات کے خلاف سول نافرمانیوں کی تحریک پر اربابِ اقتدار اور ان کے ہمنوا سخت جزبز ہیں اور عوام کی توجہ اپوزیشن کی تحریک سے ہٹانے کے لیے سیلاب سے پیدا شدہ صورتحال سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے یکطرفہ اور بے بنیاد پراپیگنڈہ کیا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ محاذ میں شامل جماعتِ اسلامی نے بھی سول نافرمانی سے پیچھا چھڑانے کے لیے اس سہارے کو غنیمت جانا ہے حالانکہ اس سارے افسانے کی حقیقت مغالطہ آفرینی کے سوا کچھ نہیں۔ سیلاب سے ملک میں جو تباہی و بربادی پھیلی ہے وہ یقیناً المناک ہے اور کوئی باشعور شہری ایسا نہیں جس نے اس قیامتِ صغریٰ پر دل کی گہرائی میں غم محسوس نہیں کیا، ملک میں ہر آنکھ اشکبار اور ہر دل حزیں ہے۔ متحدہ جمہوری محاذ کے راہنما اور کارکن اس رنج والم میں برابر کے شریک ہیں۔

سوال یہ ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ محاذ کے راہنما اس حادثۂ عظمیٰ کے باوجود سول نافرمانی جیسی انتہائی تحریک پر مجبور ہوئے؟ ہمیں یقین ہے کہ اگر حکومت اس تباہی و بربادی کے موقع پر سیاسی انتقام سے باز رہتی، محاذ کے رہنماؤں کی گرفتاریاں نہ کی جاتیں، ریڈیو اور ٹی وی سے محاذ کے محبِ وطن راہنماؤں کے خلاف سب وشتم کا سلسلہ روک دیا جاتا، اور وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کم از کم سیلاب زدہ عوام کے اجتماعات میں ہی اپوزیشن کے قائدین پر الزام تراشی سے باز رہتے تو محاذ کی مرکزی مجلسِ عمل کا فیصلہ یقیناً اس سے مختلف ہوتا۔ لیکن جب حکومت اپنے آپ کو رواداری پر آمادہ نہیں کر سکی اور اس نے اپوزیشن کے خلاف انتقامی کاروائیوں اور کردار کش پراپیگنڈہ ختم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تو اسے اپوزیشن سے بھی رواداری کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔

ہم ناصحین سے عرض کریں گے کہ محاذ کے فیصلہ پر نکتہ چینی کرنے کی بجائے اس کی وجوہات کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ اسباب کو قائم رکھتے ہوئے نتائج کو کوسنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟

متحدہ جمہوری محاذ کی پیش قدمی

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور ــــ ۲۱ ستمبر ۱۹۷۳ء)

گورنر پنجاب نے متحدہ جمہوری محاذ کی ۲۴ روزہ کامیاب تحریک کے بعد دفعہ ۱۴۴ کے خاتمہ کا اعلان کر دیا ہے۔ اس دوران محاذ کے کارکنوں کو جن حالات میں جدوجہد جاری رکھنا پڑی ان پر ذرا سرسری نظر ڈال لیجئے:

- ریڈیو اور ٹی وی نے محاذ کے راہنماؤں کی کردارکشی اور کارکنوں کی تذلیل کی مہم مسلسل جاری رکھی۔
- پریس ٹرسٹ کے اخبارات نے حقِ نمک ادا کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔
- سرکاری پارٹی کے کارکنوں نے محاذ کے جلسوں اور جلوسوں میں دل کھول کر غنڈہ گردی کی۔
- محاذ میں شامل جماعتوں کے چیدہ چیدہ راہنماؤں کو گرفتار کر کے تحریک کو روکنے کی ناکام کوشش کی گئی۔
- سیاسی جماعتوں کے دفاتر پر چھاپے مار کر ان کی کارکردگی معطل کرنے کا پروگرام بنایا گیا۔
- پولیس نے جبر وتشدد کا کوئی حربہ باقی نہ چھوڑا جو ان غریب کارکنوں پر آزمایا نہ ہو۔ خصوصاً ملتان پولیس نے توظلم وتشدد کی انتہا کر دی کہ گرفتاریاں پیش کرنے والے کارکنوں کو سرِعام تشدد کا نشانہ بنایا، ان کی داڑھیاں نوچیں، انہیں ننگا کر کے پیٹا، برف پر مسلسل لٹایا اور غنڈوں اور بدمعاشوں کی طرح ان پر جیل کے معروف ''لتر'' برسائے۔ جمعیۃ کے دفتر پر چھاپہ مار کر ریکارڈ اور فون اٹھا کر لے گئی۔ مدرسہ قاسم العلوم میں گھس کر طلباء کے لیے تیار شدہ کھانا چٹ کر گئی۔ اور جمعیۃ کے راہنما حضرت مولانا عبدالقادر قاسمی کی گرفتاری میں ناکامی پر ان کی اہلیہ اور معصوم بچے کو پکڑ لیا اور تھانے میں بٹھائے رکھا۔
- لاہور پولیس کا رویہ بھی اس سے کچھ مختلف نہ تھا۔ اس نے کارکنوں کی تذلیل وتحقیر کے ساتھ ساتھ ان پر چوری اور جیب تراشی کے مقدمات قائم کیے۔ بے پناہ تشدد کے علاوہ انہیں کئی کئی روز تھانوں میں بٹھائے رکھا۔ اور کئی کارکنوں کو رات کے وقت دور دراز جنگلوں میں لے جا کر چھوڑ دیا۔

- جھنگ پولیس نے جمعیۃ کے کارکن حفیظ الدین کی گرفتاری کے لیے ان کے والد اور بھائیوں کو یرغمال کے طور پر بند کیے رکھا۔
- سیاسی محاذ پر بھی تحریک کو پوری طرح نشانہ مشق بنایا گیا اور اسے سیاسی غلطی ظاہر کرنے میں پورا زور صرف کیا گیا۔
- سیلاب کے بہانے تحریک کو بے وقت قرار دینے میں حکمران پارٹی کے ڈھنڈورچیوں کا بعض نام نہاد اپوزیشن پارٹیوں نے بھی ساتھ دیا۔ حتیٰ کہ جماعتِ اسلامی نے بھی یہی راگ الاپنے میں عافیت سمجھی۔
- متحدہ جمہوری محاذ میں شامل جماعتوں کے محبِ وطن راہنماؤں کو ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت حراست میں لے کر ان کی ناقابلِ انکار حب الوطنی کو چیلنج کیا گیا۔
- ملک بھر میں عموماً اور بلوچستان میں خصوصاً خوف و ہراس پھیلا کر عوام کو بددل کرنے اور بلوچستان میں فوجی کاروائی کا عمل تیز کر کے قبائل کو خانہ جنگی کی آگ میں دھکیلنے کی مذموم سعی کی گئی۔
- ''مذاکرات'' کا خوشنما لیبل پھینک کر محاذ کے راہنماؤں کو شکار کرنے اور عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی گئی۔

مگر ان میں سے کوئی حربہ حکمرانوں کے کام نہ آیا اور بالآخر انہیں متحدہ جمہوری محاذ کے حوصلہ، تدبر، جرأت اور استقامت کے سامنے سپر انداز ہونا پڑا۔ محاذ کے کارکنوں نے ہر ظلم اور حوصلہ شکنی کا خندہ پیشانی سے سامنا کر کے یہ ثابت کر دیا کہ وہ مشکل سے مشکل حالات میں بھی حق و انصاف کی جنگ لڑنے کی ہمت رکھتے ہیں۔ آمریت و فسطائیت جس گھناؤنی شکل میں پاکستان پر پنجے گاڑنا چاہتی ہے اور قومی وحدت و سلامتی اور ملی افکار و نظریات کو سبوتاژ کرنے کے لیے اس کے جو عزائم ہیں ان کے پیشِ نظر جمہوری محاذ کی یہ جدوجہد یقیناً جہاد ہے۔ بلکہ آقائے نامدار سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے جابر سلطان کے سامنے حق بات کہنے کو ''افضل الجہاد'' قرار دیا ہے۔ موجودہ دور میں افضل الجہاد یہی ہے کہ پاکستان کی سالمیت اور قومی وحدت کو چیلنج کرنے اور غریب عوام کے جمہوری حقوق کی طرف ظلم کا ہاتھ اٹھانے والی قوت کی کلائی مروڑ دی جائے۔

ہم اس کامیاب پیش قدمی پر محاذ کے راہنماؤں کو ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں اور عوام کے جمہوری حقوق کی خاطر مصائب جھیلنے والے غیور کارکنوں کو سلام پیش کرتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ان کارکنوں

کی قربانیاں بہت جلد رنگ لائیں گی اور پاکستان میں آمریت کے کھنڈرات پر جمہوری و اسلامی حقوق کی عمارت بلند ہو کر رہے گی۔

مولانا مفتی محمود کے خلاف وائٹ پیپر

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۳ء)

سرحد کے وزیر اعلیٰ جناب عنایت اللہ گنڈاپور کو جب سے وزارتِ اعلیٰ کی کرسی پر ٹکایا گیا ہے وہ کچھ عجیب سے احساس کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان کے لیے مصیبت یہ ہے کہ جس مسند پر وہ حضرت مولانا مفتی محمود صاحب جیسی قدآور سیاسی شخصیت کو دیکھ چکے ہیں اس پر خود بیٹھتے ہوئے انہیں ارد گرد خلا سا محسوس ہو رہا ہے۔ اور شاید اسی خلا کو پر کرنے کے لیے وہ ''مفتی صاحب کی بدعنوانیوں کے قرطاسِ ابیض'' کا سہارا لینے پر مجبور ہوئے ہیں۔

اس قرطاسِ ابیض کا ڈھنڈورا کئی ماہ سے اس انداز سے پیٹا جا رہا تھا کہ گویا یہ وائٹ پیپر کوئی شعلہ ہوگا جو پشاور سے اٹھے گا اور دیکھتے ہی دیکھتے مفتی محمود کے سیاسی کردار کی صاف و شفاف سفید چادر کو سیاہ دھوئیں کی لپیٹ میں لے لے گا۔ لیکن جن حضرات نے اس قرطاسِ ابیض کا بنظرِ انصاف مطالعہ کیا ہے، ان کے لیے اس کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں کہ اس میں سرحد کی جمہوری حکومت کو بدنام کرنے کے لیے حقائق کو توڑ موڑ کر انتہائی فریب کاری کے ساتھ عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔ حتیٰ کہ مفتی صاحب کے عظیم کارناموں کو بھی بدعنوانی کا نام دے کر اخلاقی دیوالیہ پن کا ثبوت فراہم کیا گیا ہے۔

قتل کے مقدمات واپس لینے کا الزام

مثلاً قرطاس ابیض میں سب سے بڑا الزام یہ لگایا گیا ہے کہ مفتی صاحب کے حکم پر سرحد کی مختلف عدالتوں سے قتل کے چھ سو سے زائد مقدمات واپس لیے گئے۔ مگر گنڈاپور صاحب اپنے مطلب کی بات بیان کر کے باقی حصہ ہضم کر گئے ہیں۔ جبکہ اصل قصہ یہ ہے کہ حضرت مفتی صاحب نے عدالتوں کو ہدایت کی تھی کہ قتل کے جن مقدمات میں شرعی قوانین کے مطابق فریقین آپس میں صلح کر لیں وہ مقدمات واپس لے لیے جائیں۔ یہ مقدمات اسی حکم کے تحت واپس لیے گئے اور اس طرح حضرت مفتی صاحب کے حکم پر سرکاری طور پر چھ سو سے زائد مقدمات کا فیصلہ شرعی قانون کے مطابق ہوا۔

اسلحہ کے لائسنس جاری کرنے کا الزام

اسی طرح دوسرا بڑا الزام یہ ہے کہ مفتی صاحب نے اسلحہ کے چھیالیس ہزار لائسنس جاری کیے۔ یہ الزام بھی محض فریب کاری ہے۔ اسلحہ کے مذکورہ لائسنس ضرور جاری ہوئے لیکن یہ بدعنوانی کیسے بن گئی؟

صوبائی حکومت نے دیکھا کہ صوبہ میں اسلحہ کم و بیش ہر شخص کے پاس موجود ہے اور زیادہ تر بغیر لائسنس کے ہے۔ اس پر صوبائی حکومت نے یہ پالیسی اختیار کی کہ اسلحہ کے لائسنس فراخدلی سے دیے جائیں تاکہ لوگ غیر قانونی اسلحہ رکھنے کی بجائے لائسنس حاصل کریں اور اس طرح جرائم کی تفتیش میں بھی آسانی رہے۔

کم و بیش یہی حال دیگر الزامات کا ہے جو گنڈاپور صاحب نے اس وائٹ پیپر میں درج کیے ہیں۔ الغرض یہ قرطاس ابیض جھوٹ، مکر و فریب اور بے بنیاد الزامات کا ایسا مجموعہ ہے جو گنڈاپور وزارت کی سیاسی کورفہمی اور اخلاقی دیوالیہ پن کا زندہ ثبوت ہے۔

چوہدری ظہور الٰہی کی اسلحہ سپلائی مقدمہ میں گرفتاری

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۱۶ نومبر ۱۹۷۳ء)

بلوچستان کی صوبائی حکومت نے متحدہ جمہوری محاذ کے راہنما اور قومی اسمبلی کے رکن چوہدری ظہور الٰہی کو اس الزام میں گرفتار کر لیا ہے کہ وہ بلوچستان میں شرپسندوں کو اسلحہ سپلائی کر رہے ہیں۔ اور ان کے ایک معتمد چوہدری محمد شریف کو بلوچستان میں اسلحہ لے جاتے ہوئے پکڑ لیا گیا ہے۔ وزیر اعلیٰ جام غلام قادر کے بیان کے مطابق چوہدری محمد شفیع کو کوہلو سے بالاڈھکہ (بلوچستان) اسلحہ لے جاتے ہوئے گرفتار کیا گیا (امروز ۱۷ نومبر ۱۹۷۳ء)۔ مگر چوہدری صاحب کے فرزند محمد اکرم نے لاہور میں پریس کانفرنس سے گفتگو کرتے ہوئے اس بات کو غلط قرار دیا اور بتایا کہ چوہدری محمد شفیع کو شادمان کالونی لاہور میں گرفتار کیا گیا اور گرفتار کرنے والی پولیس پارٹی کی قیادت لاہور پولیس کے معروف افسر سردار عبدالوکیل کر رہے تھے۔ (نوائے وقت ۱۸ نومبر ۱۹۷۳ء)

غیر قانونی اسلحہ کی سپلائی کے نام پر کھڑا کیا جانے والا یہ اسکینڈل کوئی نیا نہیں، اس سے قبل بھی اپوزیشن قائدین کو بدنام کرنے اور انہیں مقدمات کی زنجیروں میں جکڑنے کے لیے اس قسم کے کھڑاگ رچائے گئے ہیں۔ ابھی زیادہ دیر نہیں گزری کہ اسلام آباد میں عراقی سفارتخانہ سے روسی اسلحہ کی برآمدگی کا اعلان سن کر ساری قوم ششدر رہ گئی۔ اور پھر اس اسلحہ کو ملک بھر میں اسپیشل گاڑیوں کے ذریعہ گھمایا گیا اور اپوزیشن پارٹیوں کے خلاف پروپیگنڈا کی مہم تیز تر کر کے اس فضا سے بلوچستان و سرحد کی صوبائی جمہوری حکومتوں کو سبوتاژ کرنے کے لیے بھرپور فائدہ اٹھایا گیا۔ مگر اس غیر ملکی اسلحہ کے بارے میں ابھی تک عوام بے خبر ہیں اور حکومت اس سے بھرپور سیاسی فوائد حاصل کر چکنے کے بعد مسلسل مہر بلب ہے۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ نیا اسلحہ اسکینڈل بھی صرف اس لیے کھڑا کیا گیا ہے تاکہ اپوزیشن قائدین کے خلاف بے بنیاد پروپیگنڈا کا کوئی نیا سلسلہ شروع کر کے وفاقی اور صوبائی سطح پر ہونے والی اہم سیاسی تبدیلیوں پر اپوزیشن کے اثرانداز ہونے کے امکانات کو کم سے کم کیا جا سکے۔

وطن دشمن تنظیموں پر پابندی کا آرڈیننس

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۳۰ نومبر ۱۹۷۳ء)

صدر مملکت جناب فضل الٰہی چوہدری نے ایک آرڈیننس جاری کیا ہے جس کے تحت وفاقی حکومت کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ملکی مفاد کے منافی سرگرمیوں میں حصہ لینے والی تنظیموں پر پابندی لگا سکتی ہے اور افراد کو سزا دے سکتی ہے۔ ملکی مفاد کے منافی سرگرمیوں کے ضمن میں:

- ایک سے زائد قومیتوں کے پرچار،
- فرقہ وارانہ جذبات ابھارنے،
- علاقائی سالمیت اور خود مختاری میں رخنہ ڈالنے،
- لسانی، نسلی اور علاقائی بنیادوں پر تفریق پیدا کرنے،
- اور ملک کے کسی حصہ کی علیحدگی کی کوششوں

کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ اس آرڈیننس کے تحت ایسی سرگرمیوں میں ملوث افراد کو سات سال، ان کی مدد کرنے والوں کو پانچ سال، اور ایسی تنظیموں کی رکنیت برقرار رکھنے والے افراد کو دو سال تک قید اور جرمانہ کی سزا دی جا سکتی ہے۔

اصولی طور پر آرڈیننس کی حمایت

اصولی طور پر اس آرڈیننس سے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں، بلکہ اگر اس کے ذریعہ سیاسی فوائد کے حصول اور سیاسی مخالفین کے خلاف بے جا انتقامی کاروائیوں کے خدشات سے صَرفِ نظر کرنا ممکن ہوتا تو ہم اس آرڈیننس کا پرجوش خیر مقدم کرتے۔ ملکی سالمیت کا تحفظ ملک کے ہر شہری کا مقدس فریضہ ہے اور ملک کو توڑنے یا نسلی، علاقائی اور لسانی بنیادوں پر ایسی تفریق پیدا کرنا جس سے ملکی استحکام کو خطرہ لاحق ہو، یقیناً ملک و قوم کے مفاد کے منافی اور سنگین نوعیت کی غداری ہے جسے کسی صورت گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ اس لحاظ سے یہ آرڈیننس انتہائی خوش آئند اور ناگزیر ہے۔

ماضی کے تجربات کے حوالے سے خدشات

لیکن ماضی کا تجربہ شاہد ہے کہ پاکستان میں ہمیشہ حکومت سے اختلاف کو غداری، حکمرانوں کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرنے کو وطن دشمنی اور سیاسی میدان میں حکمران جماعت کا مقابلہ کرنے والی جماعتوں کی

سرگرمیوں کو ملکی مفاد کے منافی قرار دیا گیا ہے۔ ہر حکمران نے اپنے مخالفین کو ملک دشمن کہا ہے اور اپوزیشن سرگرمیوں کو کچلنے کے لیے ہمیشہ بغاوت اور غداری کے سنگین الفاظ کا سہارا لیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ یہ سنگین اور انتہائی الفاظ، جو سیاسی کفر کے مترادف ہیں، آج پاکستان میں اپنے مفہوم سے عاری ہو چکے ہیں اور شاید اس ملک میں ایک دو کے سوا کوئی ایسا سیاسی راہنما نہ ہو جسے کسی نہ کسی حکومت سے غدار اور وطن دشمن کا خطاب نہ مل چکا ہو۔

موجودہ حکومت کا سیاسی انتقام

اگر بات ماضی کی حکومتوں تک محدود ہوتی تو بھی تھوڑی دیر کے لیے اسے نظر انداز کیا جاسکتا تھا۔ مگر موجودہ حکومت، جو ووٹوں کے ذریعہ عروسِ اقتدار سے ہمکنار ہوئی ہے، اس نے تو اس معاملہ میں سابقہ حکومتوں کو بھی مات کر دیا ہے اور سیاسی انتقام کے لیے ایسے ایسے حربے استعمال کیے ہیں کہ اس کے دو سالہ دورِ اقتدار کے مقابلہ میں گزشتہ ربع صدی کے سیاسی مظالم ہیچ نظر آتے ہیں۔

- سرحد و بلوچستان کے عوام پر پیپلز پارٹی کو ووٹ نہ دینے کے جرم میں غیر نمائندہ حکومتیں مسلط کرنا،
- بلوچستان کے عوام کو جمہوری حقوق دینے کی بجائے ان پر فوجی کاروائی،
- متحدہ جمہوری محاذ کے جلسوں میں مسلح کاروائی کا اہتمام،
- اپوزیشن رہنماؤں پر قاتلانہ حملے،
- اپوزیشن رہنماؤں اور کارکنوں کے خلاف جھوٹے مقدمات،
- ڈی پی او کے تحت محبِ وطن رہنماؤں کی گرفتاریاں،
- ریڈیو، ٹی وی اور ٹرسٹ اخبارات کے ذریعہ اپوزیشن جماعتوں کے خلاف مذموم و مکروہ کردار کش پروپیگنڈا،
- خود وزیراعظم کا اپوزیشن لیڈروں کے خلاف انتہائی گھٹیا اور بازاری زبان استعمال کرنا،
- عوام کے منتخب نمائندوں کو جیلوں میں ٹھونسنا،
- سیاسی قیدیوں پر شرمناک تشدد اور غیر انسانی و غیر اخلاقی سلوک،
- اور ضمنی انتخابات میں اندھا دھند سرکاری مداخلت،

یہ سب امور حکمران پارٹی کی سیاسی ہوس اور اپوزیشن کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کی خواہش کا نتیجہ ہے۔ اس پس منظر میں جب ہم مذکورہ آرڈیننس کو دیکھتے ہیں تو ہمارے لیے ان خدشات کو نظر انداز کرنا

بے حد مشکل ہو جاتا ہے کہ ملک کے دوسرے قوانین کی طرح اس قانون کو بھی سیاسی انتقام کے لیے بطور حربہ استعمال کیا جائے گا اور حکمران پارٹی اس طرح اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کی راہ ہموار کرے گی۔ خدا کرے کہ یہ خدشات غلط ہوں اور یہ آرڈیننس سیاسی انتقام کا حربہ بننے کی بجائے ملکی استحکام و سالمیت کے تحفظ کا ضامن بنے۔

اس کے ساتھ ہی ہم وفاقی حکومت سے یہ استدعا کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ ان افراد کے خلاف بھی مقدمات چلائے جائیں اور انہیں قوم کے سامنے بے نقاب کر کے جلد از جلد کیفر کردار تک پہنچایا جائے جن کی مذموم سازشوں کے باعث وطنِ عزیز دولخت ہوا اور بہادر افواج کو بھارت جیسے دشمن کے سامنے ہتھیار ڈالنا پڑے، تاکہ قوم یہ یقین کر سکے کہ یہ آرڈیننس واقعی ملکی استحکام کے لیے نافذ کیا گیا ہے۔

اسلام کا سیاسی نظام: مفتی محمود کا موقف اور پریس کی رپورٹنگ

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور ــــ ۷ دسمبر ۱۹۷۳ء)

قائد جمعیت علماء اسلام حضرت مولانا مفتی محمود صاحب نے گزشتہ روز گکھڑ میں اخباری نامہ نگاروں سے گفتگو کرتے ہوئے ملکی مسائل پر سیر حاصل تبصرہ کیا جس کی مفصل رپورٹ قارئین آئندہ شمارہ میں ہمارے وقائع نگار خصوصی کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں گے۔ اس موقع پر مولانا مفتی محمود نے قومی پریس پر عائد پابندیوں کا بھی ذکر فرمایا اور اخبار نویسوں پر زور دیا کہ وہ اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے صحیح رپورٹنگ کیا کریں اور محض حکومت کو خوش کرنے کے لیے سیاسی قائدین کے بیانات کو توڑ موڑ کر نہ پیش کریں۔

خیال تھا کہ شاید اس مجلس کی رپورٹنگ کے بارے میں ہی اخبار نویس کچھ ذمہ داری کا احساس کریں گے، مگر دوسرے دن روزنامہ امروز دیکھنے کا موقع ملا تو یہ توقع نقش بر آب ثابت ہوئی۔ نامہ نگار کے حوالہ سے امروز نے مفتی صاحب کی طرف یہ الفاظ منسوب کیے کہ

> ”یہ ضروری نہیں کہ خلفاء راشدین کی پیروی کی جائے، کیونکہ ملکی حالات کے مطابق اسلامی سیاسی نظام میں ردوبدل کیا جاسکتا ہے۔“

حالانکہ مفتی صاحب نے یہ الفاظ قطعاً نہیں فرمائے، قصہ صرف اتنا ہے کہ ایک نامہ نگار نے سوال کیا کہ اسلام وحدانی طرزِ حکومت چاہتا ہے یا وفاقی؟ مفتی صاحب نے جواب دیا کہ یہ انتظامی مسئلہ ہے جس کے بارے میں اسلام اجازت دیتا ہے کہ حالات کے تحت جو صورت مناسب ہو اختیار کر لی جائے۔ مفتی صاحب نے فرمایا کہ اسلام میں جو امور قطعی ہیں ان میں ردوبدل کی گنجائش نہیں لیکن جن امور میں اسلام نے کوئی قطعی حکم نہیں دیا ان میں حالات کے تحت جو صورت مناسب ہو اختیار کی جاسکتی ہے۔ اس کی وضاحت میں مفتی صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ اگر سربراہِ حکومت حضرت صدیق اکبرؓ یا حضرت عمرؓ جیسا عادل شخص ہو تو میں اس بات کی حمایت کروں گا کہ اس کو جتنے زیادہ سے زیادہ اختیارات دیے جاسکتے ہیں دیے جائیں کیونکہ اس سے اختیارات کے غلط استعمال کی توقع نہیں۔ لیکن اگر حکومت کی باگ ڈور ایوب خان، یحییٰ خان اور بھٹو جیسے افراد کے ہاتھ میں ہو تو میں کہوں گا کہ ان کے اختیارات کو جس قدر ہو سکے محدود کر دو تاکہ یہ لوگوں پر ظلم نہ کر سکیں۔

کتنے تعجب کی بات ہے کہ مفتی صاحب کے ان ارشادات کو اس طرح توڑ موڑ کر پیش کیا گیا کہ اس کا مفہوم ہی بدل کر رہ گیا ہے۔ دراصل قومی پریس خصوصاً ٹرسٹ کے اخبارات کی ہم پر یہ کوئی نئی نوازش نہیں، اس سے قبل بھی ہمیشہ اپوزیشن خصوصاً جمعیت علماء اسلام اور نیشنل عوامی پارٹی کے راہنماؤں کو بدنام کرنے کے لیے اس قسم کے حربے استعمال کیے گئے ہیں۔

ابھی حال ہی میں روزنامہ نوائے وقت نے، جو بظاہر اپوزیشن کا ترجمان کہلاتا ہے، لیاقت آباد کے نامہ نگار کے حوالہ سے ایک خبر میں کہا ہے کہ مفتی صاحب اور خان عبدالولی خان نے چشمہ میں کارکنوں کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہم قومی اسمبلی کی رکنیت سے مستعفی ہو جائیں گے۔ حالانکہ گزشتہ اڑھائی برس سے مفتی صاحب چشمہ نہیں گئے۔

جس ملک میں قومی پریس کا یہ کردار ہو اور اخبار نویس اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے بجائے مفادات کے چکر میں الجھ کر رہ جائیں اور ان کا قلم حقائق و واقعات کی نقاب کشائی کرنے کی بجائے آمریت کی مدح سرائی اور حق گو قائدین کی کردارکشی کے لیے وقف ہو جائے، اس ملک میں جمہوری اقدار و روایات اور اسلامی اخلاق و آداب کی ترویج کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے؟ ہم صحافی بھائیوں سے مؤدبانہ گزارش کریں گے کہ کسی منصب پر کوئی ہمیشہ نہیں رہتا اور حق و صداقت کے اظہار کے بغیر آپ اپنی ذمہ داریوں سے عند اللہ و عند الناس سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ اس لیے اگر آپ حق کا ساتھ دینے کی ہمت نہیں پاتے تو کم از کم جھوٹ اور بہتان تراشی سے تو پرہیز کریں۔

مذاکرات کا جال اور وعدے، بھٹوصاحب کی سیاسی تکنیک

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور ــــ ۱۴ دسمبر ۱۹۷۳ء)

گزشتہ دنوں وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے قائدِ جمعیت حضرت مولانا مفتی محمود سے قومی اسمبلی کے چیمبر میں چالیس منٹ تک بات چیت کی جس میں وزیر قانون پیرزادہ بھی شریک ہوئے۔ اس گفتگو کی تفصیلات معلوم نہیں ہوسکیں مگر دوسرے روز "متحدہ جمہوری محاذ" کی قرارداد منظرعام پر آئی جس میں اعلان کیا گیا ہے کہ جب تک حکومت "مری مذاکرات" میں کیے گئے وعدے پورے نہیں کرتی اس سے مذاکرات نہیں کیے جائیں گے۔ اس قرارداد سے مترشح ہوتا ہے کہ بھٹوصاحب نے مفتی صاحب سے ملاقات کے دوران اپوزیشن کو مذاکرات کی دعوت دی جسے محاذ نے مسترد کر دیا۔

بھٹوصاحب کی یہ تکنیک ہے کہ وہ سیاسی گالیوں کی بوچھاڑ اور مقدمات و داروگیر کی یلغار کے بعد مذاکرات کی بات چیت چھیڑ دیتے ہیں تاکہ اپنے خلاف محاذ آرائی کے زور کو کم کرسکیں۔ پھر مذاکرات کی میز پر فراخدلی سے وعدے فرما لیتے ہیں۔ اور جونہی انہیں نیچے سے "سب اچھا" کی رپورٹ مل جاتی ہے وہ سب وعدے وعید بھلا کر اپنے کام میں مگن ہو جاتے ہیں۔ بھٹوصاحب کے سابقہ سیاسی وعدے اور مذاکرات ان کی اس تکنیک کا واضح ثبوت ہیں۔

بھٹوصاحب نے مذاکرات کی یہ دعوت مسترد ہونے کے بعد ایک نیا راستہ اختیار کیا اور قومی اسمبلی اور سینٹ کے ارکان کو ڈنر پر مدعو کر لیا۔ اس خیال سے کہ اپوزیشن کے ارکان آئیں گے، کچھ رسمی سی گفتگو ہوگی اور دنیا کو یہ تاثر دیا جاسکے گا کہ گفت وشنید کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ مگر اپوزیشن نے اس چال کو سمجھتے ہوئے ڈنر کا بھی بائیکاٹ کر دیا جس پر بھٹوصاحب نے یوں اظہار افسوس کیا ہے کہ

> "اگر حزب مخالف کے ارکان اس ڈنر میں شرکت کرتے تو اس سے حزبِ اختلاف اور حزبِ اقتدار دونوں کو ایک دوسرے سے رابطہ قائم کرنے کا موقع فراہم ہوتا اور یہ ملاقات ان کے آئندہ مذاکرات اور قومی مسائل پر بحث کے لیے حرفِ اول ثابت ہوسکتی تھی۔ انہوں نے کہا میں اس ڈنر میں حزبِ اختلاف سے ملاقات کا زبردست خواہشمند تھا۔ اگر مسئلہ صرف اپنی ہی پارٹی اور حکومت میں شریک پارٹیوں کے ارکان کی دعوت کا ہوتا تو وہ آج دوبارہ ان ارکان کو یہاں آنے کی ہرگز تکلیف نہ دیتے کیونکہ وہ چند روز قبل ان کے اعزاز میں دعوت دے چکے ہیں۔" (روزنامہ امروز، لاہور۔ ۱۵ دسمبر ۱۹۷۳ء)

وزیراعظم بھٹو نے اس ڈنر سے خطاب کرتے ہوئے اپوزیشن پر یہ الزام بھی لگایا ہے کہ وہ ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کر رہی ہے اور جمہوریت اور ہٹ دھرمی ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔

محترم بھٹو صاحب سے عرض ہے کہ ہٹ دھرمی کا مظاہرہ اپوزیشن نہیں بلکہ حکمران پارٹی کر رہی ہے۔ اپوزیشن کا موقف تو بالکل واضح او راصولی ہے کہ آپ نے مری مذاکرات کے دوران اپوزیشن سے جو وعدے کیے تھے ان پر عمل کیا جائے، پھر باقی امور کے لیے مزید مذاکرات ہو سکتے ہیں، کیونکہ جب تک سابقہ مذاکرات کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا مزید مذاکرات قطعًا بے سود ہیں۔ اس لیے اگر آپ صدقِ دل سے جمہوری اقدار کی سربلندی اور اپوزیشن کا تعاون چاہتے ہیں تو مری مذاکرات کے فیصلوں پر عملدرآمد کر کے اپوزیشن کی طرف دستِ تعاون بڑھانے میں پہل کیجیے۔ لیکن اگر ان مذاکرات کا مقصد ''نشستند و گفتند، خوردند و برخاستند'' کے بعد دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنا ہے تو یاد رکھیے کہ اپوزیشن اس ڈھونگ میں حصہ دار نہیں بنے گی۔

کیا بلوچستان یونہی جلتا رہے گا؟

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۱۴ دسمبر ۱۹۷۳ء)

بلوچستان پاکستان کا وہ بدقسمت خطہ ہے جہاں کے عوام کو فرنگی سے آزادی ملنے کے بعد بھی سنگینوں کے منحوس سائے سے نجات نہیں مل سکی اور قیامِ پاکستان کے چھبیس سال بعد بھی وہ اپنے حقوق، آزادی اور تحفظ کی جنگ میں مصروف ہیں۔ اس بدنصیب خطہ کو رسمی آزادی ملنے کے ربع صدی بعد سیاسی حقوق ملے اور وہاں کے عوام کو یہ حق دیا گیا کہ وہ اپنی قیادت اور حکومت آزادی کے ساتھ اپنے ووٹوں کے ذریعہ منتخب کر سکتے ہیں۔ مگر جب بلوچستان کے عوام نے رائے دہی کا جمہوری حق استعمال کیا اور اپنے نمائندے منتخب کیے تو ان کے فیصلہ کو پسِ پردہ زنجیریں ہلانے والی قوتیں برداشت نہ کر سکیں۔ چنانچہ نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت علماء اسلام کو سرحد و بلوچستان کی نمائندہ جماعتیں تسلیم کر لینے اور ۹ ماہ تک صوبائی حکومتیں ان کو سونپے رکھنے کے بعد ان صوبوں کو منتخب حکومتوں سے محروم کر دیا گیا۔

کیا پیپلز پارٹی کو ووٹ نہ دینا جرم ہے؟

آخر بلوچستان اور سرحد کے عوام کا قصور اس کے سوا کیا ہے کہ انہوں نے گزشتہ الیکشن میں روٹی، کپڑا اور مکان کے نعرے سے فریب کھانے کے بجائے حقیقت پسندی کی راہ اختیار کی اور پیپلز پارٹی کے طوفانی سیلاب میں بہہ جانے کی بجائے جمعیت علماء اسلام اور نیشنل عوامی پارٹی کو اپنی نمائندگی کے لیے منتخب کیا، اور جب پی پی پی کو پورے ملک پر بلاشرکت غیرے مسلط ہونے کا شوق چرایا تو سرحد و بلوچستان کے عوام نے اس ہوس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ کیا پیپلز پارٹی کو ووٹ نہ دینا جرم ہے؟ کیا حکمرانوں کی ہاں میں ہاں نہ ملانا غداری ہے؟ کیا آمریت اور فسطائیت کے سامنے سینہ سپر ہو جانا بغاوت ہے؟ کیا عوام کے سینوں پر گولیاں برسانے والے ہاتھ کو پکڑ لینا وطن دشمنی ہے؟ اگر نہیں تو پھر آخر بلوچستان کے عوام سے وہ کونسا جرم سرزد ہوا ہے جس کی پاداش میں ان کے سینوں کو گولیوں سے چھلنی کیا جا رہا ہے؟

بلوچستان میں گزشتہ دس ماہ سے آگ و خون کی جو ہولی کھیلی جا رہی ہے اس سے ہر محب وطن شہری کو تشویش اور پریشانی لاحق ہے۔ اور عوام یہ سوچنے پر مجبور ہو چکے ہیں کہ کیا مظلوم بلوچستان یونہی جلتا رہے گا؟ کیا فرنگی اقتدار کا مردانہ وار مقابلہ کرنے والے غیور اور بہادر بلوچستانی عوام کے خلاف خود مسلمانوں کی سنگینیں اس طرح تنی رہیں گی؟

حکمرانوں سے رحم کی گزارش

ہم اپنے حکمرانوں سے اسلام، پاکستان اور خود ان کے نعرۂ جمہوریت کے نام پر گزارش کریں گے کہ خدا کے لیے مظلوم بلوچستان پر رحم کرو۔ وہاں کے عوام پر زندگی کا دائرہ اس قدر تنگ نہ کرو کہ المیہ مشرقی پاکستان کے زخم ایک بار پھر تازہ ہو جائیں۔ بلوچستان پاکستان کا حصہ ہے، وہاں کے عوام پاکستان کے محبِ وطن شہری ہیں۔ ملک میں ان کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ پنجاب اور سندھ کے عوام کا ہے۔ اگر خدانخواستہ تمہاری ہٹ دھرمی اور ہوسِ اقتدار کے باعث ملک کی سلامتی کو کوئی نقصان پہنچا تو خود اس کے نتائج سے نہیں بچ سکو گے۔

''یومِ محاسبہ'': بھٹو حکومت کے دو سال

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۲۸ دسمبر ۱۹۷۳ء)

حکمران پارٹی نے اقتدار کے دو سال مکمل ہونے پر ۲۰ دسمبر کو ''یومِ محاسبہ'' کے نام سے سالگرہ منائی ہے۔ اس روز اخبارات و جرائد نے خاص نمبر شائع کیے، ریڈیو و ٹی وی سے خصوصی پروگرام نشر کیے گئے، نیشنل سنٹرز میں اجتماعات ہوئے اور خود وزیر اعظم نے راولپنڈی میں ایک بڑا جلسۂ عام منعقد کیا جس میں ملک کے مختلف حصوں سے کثیر تعداد میں حکمران پارٹی کے کارکن شریک ہوئے۔

اگرچہ یہ سارے انتظامات دو سالہ کارکردگی کے محاسبہ کے عنوان سے کیے گئے تھے لیکن حسبِ توقع ''سب اچھا ہے'' کی رسمی صدا کے سوا اس نقار خانے میں کچھ بھی سنائی نہیں دیا اور اس انبوہ کثیر میں کسی صاحب کو توفیق نہیں ہوئی کہ وہ دو سال کی کارکردگی پر تنقیدی نظر ڈالے اور پارٹی کے ذمہ دار قائدین کو ان کی کوتاہیوں سے آگاہ کر کے صحیح مشورہ دے۔

سقوطِ مشرقی پاکستان کے المیہ سے صرفِ نظر

دو سال کا یہ عرصہ اس لحاظ سے انتہائی اہمیت کا حامل ہے کہ پاکستان کا بڑا حصہ الگ ہو جانے کے بعد ماضی کی غلط سیاست سے پیچھا چھڑا کر بچے کھچے ملک کو متحد اور محفوظ رکھنے کے لیے باہمی رواداری اور اعتماد کے ساتھ ایک نئے نظام کی بنیاد رکھی جا سکتی تھی۔ مگر جب اس نقطۂ نظر سے گزشتہ دو سال پر نگاہ ڈالتے ہیں تو سوائے مایوسی کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ دو سال قبل جب پیپلز پارٹی برسر اقتدار آئی تھی اس وقت ملک کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے اسباب واضح کر کے ان کے اثرات سے باقی ماندہ پاکستان کو محفوظ رکھنے کے لیے انتظامات کیے جائیں اور ان غلط پالیسیوں اور نقصان دہ منصوبہ بندیوں کو خیرباد کہہ دیا جائے جن کے نتیجہ میں دنیا کی سب سے بڑی مسلم مملکت دولخت ہو کر رہ گئی۔ مگر انتہائی حیرت، تعجب اور افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ

- حکمران پارٹی نے ان دو برسوں میں اس اہم ترین قومی مسئلہ کی طرف کوئی توجہ نہیں دی،
- المیہ مشرقی پاکستان کے اسباب و علل سے ابھی تک پردہ نہیں اٹھایا جا سکا،
- پاکستان کو توڑنے والا ہاتھ ہنوز پردۂ غیب میں ہے،
- ملک کے باقی ماندہ حصوں کو متحد رکھنے کے لیے کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی،

- بلکہ چھوٹے صوبوں میں نمائندہ حکومتوں کی بجائے اپنی مرضی کی حکومتیں مسلط کر کے، وہاں کے لاتعداد سیاسی کارکنوں کو جیلوں میں ٹھونس کر، فوج کو سیاست میں ملوث کر کے، اور اظہار رائے کا حق سلب کر کے سیاسی محرومی کے احساسات کو یقین میں بدلنے کی بتدریج کوشش جاری ہے،
- اور ملک کے دو حصوں کے درمیان منافرت بڑھانے اور المیہ سقوط ڈھاکہ پر منتج ہونے والی پالیسیاں بدستور حیطۂ عمل میں ہیں۔

ملک میں امن وانصاف کی صورتحال

یہی وجہ ہے کہ ملک کے مستقبل جیسے نازک اور اہم مسئلہ کے بارے میں بے یقینی کے سائے عوام کے ذہنوں پر لرز رہے ہیں۔ اس اہم ترین قومی مسئلہ کے علاوہ ملک و قوم کے مفاد کے دیگر مسائل بھی ابھی تک حل طلب ہیں بلکہ پہلے سے بھی زیادہ الجھ چکے ہیں۔

- گرانی آسمان سے باتیں کر رہی ہے،
- انصاف ناپید ہے اور آئین و قانون ''عوامی قوت'' کے خوف سے کونوں میں دبکے بیٹھے ہیں،
- جان و مال اور آبرو کے تحفظ کا احساس پہلے کی بہ نسبت زیادہ کمزور پڑ چکا ہے،
- رشوت، سرخ فیتہ اور اقرباپروری کا عفریت قوم کو تگنی کا ناچ نچا رہا ہے،
- پولیس، سرکاری دفاتر اور محکموں کے چال چلن میں کوئی فرق نہیں آیا،
- فوج ابھی تک سیاست کے نشہ سے پیچھا نہیں چھڑا سکی،
- قومی پریس، ریڈیو، ٹی وی اور دیگر ابلاغ عامہ کے ذرائع ''سب اچھا'' کی رٹ لگانے پر مجبور ہیں،
- سیاسی مخالفین کو انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بنانے کی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی،
- جھرلو اور دھاندلی کے ذریعہ الیکشن جیتنے کے حربے اسی طرح موجود اور برسرِعمل ہیں،
- اور نمائندوں کے ضمیر خرید کر رائے عامہ کا اسی طرح مذاق اڑایا جا رہا ہے۔

ان حالات میں حکمرانوں کو ''سب اچھا'' کی لوری سنا کر قوم و ملک کے مسائل سے غافل کرنا اور اقتدار و خوشامد کے نشہ میں مدہوش کر دینا کسی محب وطن اخبار یا لیڈر کا کام نہیں ہو سکتا۔ خدا جانے ہمارے قومی پریس اور اقتدار پرست سیاستدانوں کو کب ہوش آئے گا۔

وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو سے ''سُنی ریاست'' کا مطالبہ

(روزنامہ اسلام، لاہور — ۲۴ اکتوبر ۲۰۱۴ء)

......۱۹۷۳ء میں اس وقت کے وزیراعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کو ایک ہزار سنی علماء کرام کی طرف سے ''سنی مطالبات'' کے عنوان سے ایک عرضداشت پیش کی گئی تھی جو تحریکِ خدامِ اہلِ سنت پاکستان کے امیر حضرت قاضی مظہر حسین نور اللہ مرقدہ نے اس وقت کے حالات کے تناظر میں تحریر فرمائی تھی۔ اور اس پر مولانا غلام غوث ہزارویؒ، مولانا عبد الحقؒ، مولانا شاہ احمد نورانیؒ، مولانا مفتی محمد حسین نعیمیؒ، مولانا حافظ عبد القادر روپڑیؒ، مولانا عبد الستار تونسویؒ، مولانا سید حامد میاںؒ، مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ، ڈاکٹر اسرار احمدؒ، مولانا محمد اجمل خانؒ، مولانا عزیز الرحمٰن جالندھری، مولانا تاج محمودؒ، اور مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ سمیت تمام سنی مکاتبِ فکر کے ایک ہزار کے لگ بھگ علماء کرام نے دستخط کیے تھے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ ان دونوں متفقہ دستاویزات کو آئندہ جدوجہد کی بنیاد بنایا جائے اور پاکستان کو دستوری طور پر ''سنی ریاست'' قرار دینے کے مطالبہ کے ساتھ منظم محنت کا آغاز کیا جائے۔ عاشورہ محرم الحرام کے بعد اس سلسلہ میں وسیع مشاورت کا اہتمام کیا جا رہا ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ سردست ۱۹۷۳ء کی مذکورہ متفقہ یادداشت کا متن قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے جو اس وقت تحریکِ خدامِ اہلِ سنت کے چکوال کے دفتر نے کتابچہ کی صورت میں ایک ہزار علماء کرام کے ناموں کے ساتھ شائع کیا تھا:

متفقہ یادداشت

بخدمت جناب ذوالفقار علی بھٹو، وزیراعظم اسلامی جمہوریہ پاکستان۔

سلام مسنون! عرض آنکہ پاکستان میں سنی مسلمانوں کی بہت غالب اکثریت پائی جاتی ہے۔ لیکن باوجود اس کے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پاکستان کے قریبًا ۲۵ سالہ طویل دور میں اصحاب اقتدار عمومًا اقلیتی فرقوں کی ناحق دلجوئی اور ناز برداری کی خاطر، بلکہ اپنے مخصوص شخصی اور سیاسی مصالح و مفادات کے تحت سنی اکثریت کے حقوق کو نظر انداز بلکہ پامال کرتے رہے ہیں۔ جس کے نتیجہ میں یہ عظیم اسلامی شاندار تاریخی کارناموں کی وارث قوم (سنی مسلمان) ہر پہلو سے انتہائی پستی اور بدحالی میں مبتلا ہو چکی ہے۔ اب چونکہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا جدید آئین منظور ہو کر ۱۴ اگست ۱۹۷۳ء سے نافذ ہو چکا ہے۔

اس لیے سوادِ اعظم (مسلمانان اہل السنت والجماعت) کے ملکی اور ملی حقوق کے تحفظ کی خاطر ہم بعض اہم مطالبات پیش خدمت کر رہے ہیں، جو درج ذیل ہیں:۔

مطالبہ نمبر ۱: متعلقہ نصاب دینیات

(۱) سرکاری یا نیم سرکاری تعلیمی اداروں کے نصاب دینیات میں صرف سنی عقائد و احکام پر مشتمل دینیات کی تعلیم نافذ کی جائے جو بحیثیت اکثریت ان کا اسلامی اور جمہوری حق ہے۔ اور جو دوسرے جمہوری ممالک کے مروّجہ دساتیر اور تعامل سے بھی ظاہر ہے۔ مثلاً آئرلینڈ کے دستور میں یہ الفاظ موجود ہیں:

"مملکت وہاں کے شہریوں کی غالب اکثریت کے عقیدہ کے محافظ کے طور پر اپاسٹامک اور رومن چرچ کی خاص حیثیت تسلیم کرتی ہے"۔

اسی طرح ناروے کی دستور یہ میں درج ہے کہ

"ایونیجیلیکل لوتھرن مذہب مملکت کا پبلک مذہب رہے گا۔ اس مذہب کے پیروکاروں کے لیے لازمی ہوگا کہ وہ اپنے بچوں کی پرورش اسی مذہب کے مطابق کریں۔ جینورٹس کو برداشت نہیں کیا جائے گا، بادشاہ ہمیشہ ایونیجیلیکل لوتھرن مذہب کا پیرو ہوگا۔"

(بحوالہ روزنامہ نوائے وقت، راولپنڈی ۱۱ مئی ۱۹۷۳ء)

اور خصوصاً اپنے پڑوسی ملک ایران کے نصاب تعلیم کی مثال بھی ہمارے لیے زبردست حجت ہے۔ کیونکہ وہاں حکومت کی طرف سے سرکاری تعلیمی اداروں میں صرف شیعہ اثناعشریہ کی دینیات کی تعلیم کا انتظام ہے۔ سنی دینیات کو نصاب تعلیم میں شامل نہیں کیا جاتا۔ لہٰذا پاکستان کے تعلیمی نصاب میں بھی صرف سنی اکثریت کی دینیات کا نفاذ ہونا چاہیے۔ نہ یہ کہ شیعہ اقلیت کو سنی اکثریت کے مساوی درجہ دے دیا جائے۔

(۲) سنی دینیات کا انتظام حکومت کی طرف سے اہلِ سنت کے علمائے محققین کے مشورہ سے کیا جائے جس میں عقیدہ ختمِ نبوت اور کمالات رسالت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ کے علاوہ رحمت للعالمین، خاتم النبیین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فیض یافتہ مقدس جماعت (صحابہ کرامؓ) کے حالات، بالخصوص خلفائے راشدین حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان ذوالنورینؓ اور حضرت علی المرتضیٰؓ، حضرت امام حسنؓ، حضرت امام حسینؓ۔ ازواج مطہرات حضرت خدیجۃ الکبریٰ، حضرت عائشہ صدیقہؓ، اور حضرت حفصہؓ وغیرہ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک صاحبزادوں حضرت قاسمؓ، طاہرؓ، طیبؓ، اور بنات رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ، حضرت ام

کلثومؓ، اور خاتون جنت حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کا تذکرہ، تعلیم کا ضروری جز ہونا چاہیے۔ اور سنی دینیات کے معلّم بھی صرف سنی اساتذہ ہونے چاہئیں۔

(۳) شیعہ وغیرہ اقلیتی فرقوں کو آئین پاکستان کی حسب ذیل دفعہ کے تحت ان کے مخصوص مذہبی اداروں میں ان کی مذہبی تعلیم کا حق دیا جاسکتا ہے کہ

"کسی مخصوص مذہبی گروہ کو اس گروہ کے طلبہ کے لیے مذہبی تعلیم کا بندوبست کرنے کی اجازت ہوگی اور انہیں اس سلسلے میں منع نہیں کیا جاسکے گا۔ اور وہ اپنے قائم کردہ تعلیمی اداروں میں ایسا کرنے کے لیے بالکل آزاد ہوں گے۔" (آئین پاکستان دفعہ ۲۲ شق ۳ نمبر ا)

اور آئین کی مندرجہ شق سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے کہ سرکاری تعلیمی اداروں میں اکثریت کی دینیات کا انتظام ہوگا۔ اور اقلیتی فرقے اپنے مخصوص اداروں میں اپنی مذہبی تعلیمات کا انتظام کرنے کے مجاز ہوسکتے ہیں۔

(۴) شیعہ اقلیتی فرقہ کی طرف سے ان دنوں میں پھر یہ مطالبہ کیا جارہا ہے: (ا) کراچی کے اجلاس منعقد ۳۰ ستمبر ۱۹۷۲ء میں "سنی شیعہ نصاب کمیٹی کے فیصلہ کے مطابق سنی شیعہ مشترکہ نصاب نافذ کیا جائے۔" (ب) "اس مشترکہ نصاب کے مرتب ہونے تک ۱۹۷۰ء میں بارہ رکنی بورڈ کی منظور کردہ دینیات کی کتابیں پڑھانے کا حکم دیا جائے۔"

حالانکہ نصاب تعلیم کی یہ دونوں صورتیں اہلِ سنت کے اسلامی اور جمہوری حقوق کے خلاف ہیں۔ علاوہ ازیں اس سلسلہ میں یہ بھی گزارش ہے کہ کراچی کے اجلاس منعقدہ ۳۰ ستمبر ۱۹۷۲ء میں سنی شیعہ نصاب کمیٹی نے جو یہ فیصلہ کیا ہے کہ "سنی و شیعی عقائد و عبادات کے ابواب تو جدا جدا ہوں گے، لیکن دینیات کی کتاب ایک ہوگی، کلاس بھی ایک ہوگی، استاد بھی ایک ہوگا، اور امتحان بھی ایک ہوگا۔"

یہ ایک مضحکہ خیز تجویز ہے جو اہلِ سنت کے لیے کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں ہے، کیونکہ

ا۔ مشترکہ نصاب کی اس مجوزہ صورت میں شیعہ اقلیتی فرقہ کو سنی غالب اکثریت کے ساتھ مساوی درجہ پر رکھا گیا ہے۔

۲۔ مجوزہ صورت میں استاذ اور کلاس ایک ہونے کی وجہ سے سنی اساتذہ پر اپنے عقیدہ و ایمان کے خلاف دینیات کی تعلیم لازمی قرار پاتی ہے، اسی طرح سنی طلبہ کو ایک ہی کلاس میں شیعہ دینیات پڑھنی پڑے گی اور بلا ضرورت اپنے عقیدہ و ایمان کے خلاف کسی دوسرے مذہب کی تعلیمات چونکہ ناقابلِ برداشت ہوتی ہیں، اس لیے اس سے تعلیم و تعلم کا اصلی مقصد ہی فوت ہوجائے گا۔

۳۔ علاوہ ازیں نصاب تعلیم کی مروجہ صورت آئین پاکستان کی حسب ذیل دفعہ کے تحت بے اثر اور کالعدم ہوجاتی ہے کہ

''کسی شخص کو جو کسی تعلیمی ادارے میں زیر تعلیم ہو ایسی مذہبی تعلیم حاصل کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکے گا، اور نہ کسی مذہبی رسم میں شرکت کے لیے کہا جائے گا، نہ مذہبی عبادت کرنا ہوگی، اگر یہ ہدایات اس کے اپنے مذہب کی بجائے کسی اور مذہب سے متعلق ہوں۔'' (دفعہ ۲۲ نمبر ۱)

اسی طرح متبادل صورت میں شیعہ کا یہ مطالبہ بھی مسترد کر دینا چاہیے کہ ۱۹۷۰ء کے بارہ رکنی بورڈ کی منظور کردہ دینیات کی کتابیں پڑھانے کا حکم دیا جائے''۔ کیونکہ جب سرکاری تعلیمی اداروں میں جمہوری اصول کے تحت صرف سنی اکثریت کی دینیات کا نفاذ ضروری ہے تو پھر شیعہ دینیات کے داخل نصاب ہونے کا مسئلہ ہی ختم ہوجاتا ہے۔

(۵) شیعہ دینیات کا مطالبہ اس لیے بھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتا کہ سنی عقائدِ اصول اور شیعی عقائدِ اصول میں تضاد پایا جاتا ہے۔ چنانچہ سنی دینیات میں جن امور کا اثبات ضروری ہے، شیعہ دینیات میں ان میں سے اکثر امور کی نفی پائی جاتی ہے۔ مثلاً سنی دینیات میں خلفائے راشدین حضرت ابوبکرؓ صدیق، حضرت عمرؓ فاروق، حضرت عثمانؓ ذوالنورین اور حضرت علیؓ المرتضیٰ کو بالترتیب برحق خلفاء تسلیم کرنا ضروری ہے۔ لیکن اس کے برعکس شیعہ دینیات میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلیفہ بلافصل ماننا ان کے ایمان کی بنیاد ہے اور ان کی اذان میں بھی حضرت علی المرتضیٰؓ کے لیے خلیفۂ بلافصل کے الفاظ ادا کیے جاتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علی ہی خلیفہ برحق ہیں۔ اور نعوذ باللہ خلفائے ثلٰثہ حضرت ابوبکرؓ صدیق، حضرت عمرؓ فاروق، اور حضرت عثمانؓ ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہم حضرت علیؓ کی خلافت کو غصب کرنے والے ہیں، اور کسی درجہ میں بھی ان کے نزدیک برحق خلیفہ نہیں ہیں۔ تو کیا حکومت کے لیے ان دونوں متضاد عقائد و نظریات کی سرپرستی تعلیمی اداروں میں جائز اور معقول ہو سکتی ہے؟

(۶) سنی شیعہ مشترک نصاب ہو یا جداگانہ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ سرکاری تعلیمی اداروں میں متضاد و متخالف عقائد و نظریات کی تعلیم کی بنا پر سنی و شیعہ طلبہ میں مذہبی مباحثات کا سلسلہ شروع ہوجائے گا جس سے اساتذہ بھی متاثر ہوں گے اور تعلیمی نظام میں انتشار پیدا ہو کر فرقہ وارانہ فساد و منافرت کا باعث بن جائے گا۔

(۷) اگر شیعہ اقلیتی فرقہ کی دینیات کو کسی صورت میں بھی داخل نصاب ہونے کا حق دیا جائے تو اس کے بعد مرزائی، عیسائی اور ہنود تک مذہبی اقلیتوں کو بھی ان کی دینیات کو داخل نصاب کرنے کا حق دینا پڑے گا۔ جس کی وجہ سے خود حکومت سخت مشکلات میں مبتلا ہو جائے گی۔ لہٰذا مذکورہ وجوہات کی بنا پر ہمارا یہ مبنی بر حق مطالبہ ہے کہ سنی اکثریت کے اسلامی اور جمہوری حقوق کے پیش نظر سرکاری تعلیمی اداروں میں صرف سوادِ اعظم اہلِ سنت کی دینیات کو ہی داخل نصاب کیا جائے اور شیعہ اقلیتی فرقہ کی طرف سے ان کی دینیات کو داخلِ نصاب کرنے کے مطالبات کو مسترد کر کے اہلِ سنت کی عظیم اکثریت کو مطمئن کیا جائے۔

مطالبہ نمبر ۲: متعلقہ ماتمی جلوس شیعہ

شیعہ اقلیتی فرقہ کے ماتمی جلوسوں پر پابندی لگا دی جائے اور ان کے مخصوص مذہبی رسوم و شعائر کی ادائیگی کو ان کے امام باڑوں اور ان کی عبادت گاہوں میں محدود کر دیا جائے۔ کیونکہ

(۱) حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے سلسلہ میں شیعوں کے جو ماتمی جلوس نکالے جاتے ہیں وہ مذہب شیعہ کے اصول کے تحت بھی عبادت میں شمار نہیں ہو سکتے۔ اور اگر وہ ان کو عبادت قرار دینے پر مصر ہیں تو عبادت کے لیے ان کو اپنی عبادت گاہیں استعمال کرنی چاہئیں نہ کہ عام شاہراہیں اور گلی کوچے۔

(۲) مروجہ ماتمی جلوس سوادِ اعظم اہلِ سنت کے عقیدہ کے تحت ناجائز اور حرام ہیں۔ لہٰذا اقلیتی فرقہ کو یہ حق نہیں ملنا چاہیے کہ ان کے ایسے مذہبی رسوم و مظاہر جو سنی سوادِ اعظم کے نزدیک ناجائز ہیں، اہلِ سنت کے گھروں کے سامنے، ان کی مساجد اور ان کے دینی مدارس کے سامنے، ان کی گلی کوچوں میں ادا کیے جائیں۔ یہ طریق عبادت صریح اشتعال انگیزی پر مبنی ہے جس کی وجہ سے دن بدن باہمی منافرت بڑھتی جا رہی ہے۔ اور باوجود سنی مسلمانوں کے صبر و تحمل کے ہر سال محرم و چہلم کے ماتمی جلوسوں کی وجہ سے متعدد مقامات پر فرقہ وارانہ فسادات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اسی بنا پر ایران جیسے ملک میں بھی شیعی ماتمی جلوسوں کی اس طرح اجازت نہیں ہے۔ حالانکہ وہاں کا سرکاری مذہب شیعہ اثنا عشری ہے۔ لہٰذا اسلامی اور جمہوری حقوق کے تحفظ کی خاطر ہمارا یہ پرزور مطالبہ ہے کہ ماتمی جلوسوں کے سابقہ لائسنس بالکل منسوخ کر دیے جائیں، تاکہ ان ماتمی جلوسوں کی بنا پر جو فرقہ وارانہ فسادات رونما ہوتے رہتے ہیں، ان کا بالکلیہ انسداد ہو سکے۔

مطالبہ نمبر ۳: سنی اوقاف بورڈ

اہلِ سنت کے اوقاف کے لیے علیحدہ سنی اوقاف بورڈ قائم کر دیا جائے اور سنی اوقاف کی آمدنی شرعی ضوابط کے تحت سنی مفادات پر صرف کی جائے اور ان کی نگرانی اور انتظام کے لیے بھی صرف سنی افسران متعین کیے جائیں۔

مطالبہ نمبر ۴: متعلقہ نشریات ریڈیو و ٹیلی ویژن

(۱) ریڈیو اور ٹیلی ویژن بہترین ذرائع ابلاغ ہیں، لیکن عام طور پر ان کے ذریعے جو گانے بجانے وغیرہ کے پروگرام نشر کیے جاتے ہیں، وہ ساری قوم کے لیے عموماً، اور نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے خصوصاً مذہبی اور اخلاقی لحاظ سے تباہ کن ثابت ہو رہے ہیں، اور اب جبکہ آئینِ پاکستان میں یہ دفعہ رکھ دی گئی ہے:

> ”پاکستان کے مسلمانوں کو اس قابل بنانے کے لیے اقدامات کیے جائیں گے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر زندگیوں کو اسلام کے بنیادی نظریے اور اصولوں کے مطابق ڈھال لیں، اور قرآن پاک اور سنتِ نبویؐ کی روشنی میں زندگی کے مطالب کو اچھی طرح سمجھ لیں“۔ (آئین دفعہ ۳۱)

اسلامی طرز زندگی اس بنا پر ضروری ہے کہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ کتاب و سنت کے خلاف ان مخرب اخلاق پروگراموں پر بالکل پابندی لگا دی جائے تاکہ پاکستان کے نوجوان مسلمان طاؤس و رباب کی بجائے شمشیر و سناں ہاتھ میں لے سکیں۔

(۲) ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر جو مذہبی اور تبلیغی پروگرام نشر کیے جاتے ہیں وہ عموماً شیعہ اقلیتی فرقے کے عقائد و نظریات کے تحت ہوتے ہیں اور خصوصاً محرم اور چہلم کی نشریات سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان ایک شیعہ اسٹیٹ ہے۔ سوادِ اعظم اہلِ سنت کے عقائد کے خلاف شہادت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر شامِ غریباں کے پروگرام اور ماتم اور سینہ کوبی اور ذوالجناح اور زنجیر زنی کے مناظر بذریعہ ٹیلی ویژن دکھائے جاتے ہیں، جو کتاب اللہ، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آئمہ اہل بیت کے ارشادات و اعمال کے بھی خلاف ہیں۔ اہلِ سنت کے جذبات ان کے ذریعہ مجروح کیے جاتے ہیں۔ لہٰذا ہمارا یہ اہم مطالبہ ہے کہ شیعہ اقلیتی فرقہ کے ان پروگراموں پر بالکل پابندی لگا دی جائے۔

(۳) ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ جہاں شیر خدا حضرت علیؓ المرتضیٰ، حضرت امام حسنؓ، حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے فضائل و مناقب نشر کیے جاتے ہیں وہاں دیگر خلفائے راشدین حضرت ابوبکر

صدیقؓ، حضرت عمرؓ فاروق اور حضرت عثمانؓ ذوالنورین اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر اصحاب مثلاً سیف اللہ حضرت خالد بن ولیدؓ، فاتح ایران حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، فاتح مصر حضرت عمرو بن العاصؓ، امین امت حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ، کاتب وحی حضرت امیر معاویہؓ وغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے حالات و کمالات کو بھی قوم کے سامنے پیش کیا جائے، جنہوں نے محبوب خدا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست فیضان حاصل کیا اور رضائے الٰہی کی قرآنی سند حاصل کی۔ جو رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک ماانا علیہ واصحابی کے تحت مابعد کی امت کے لیے معیار حق ہیں۔ جن کی تاریخی جانبازیوں اور مجاہدانہ قربانی سے طاغوتی طاقتیں سرنگوں ہوئیں۔ قیصر و کسریٰ کے ایوانوں میں زلزلہ پیدا ہوا، روم و ایران مفتوح ہوئے، پرچم اسلام بلند ہوا، نور توحید سے بر و بحر روشن ہوئے، اور جن کے ذریعہ قرآن حکیم کی عظیم پیشگوئی ''غلبہ اسلام''تکمیل پذیر ہوئی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

(۴) جملہ اصحاب و اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و ناموس کو قانونی تحفظ دیا جائے، اور جو شخص کسی صحابی کی بھی توہین کا مرتکب ہو اس کو عبرت ناک سزا دی جائے۔

مطالبہ نمبر ۵: متعلقہ مسئلہ ختم نبوت

کتاب اللہ، ارشادات رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور تعامل صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی روشنی میں تمام امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ کا یہ اجماعی عقیدہ ہے کہ سرور کائنات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی پیدا نہیں ہوگا۔ اگر کوئی آدمی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پیدا ہونے والا نبوت و رسالت کا دعویٰ کرے تو وہ دائرہ اسلام سے خارج اور قطعی کافر ہے اور اس کو ماننے والے بھی قطعی کافر ہیں۔ اسی بنا پر فرنگی دور کے مدعی نبوت مرزا غلام احمد قادیانی آنجہانی کو تمام علمائے امت نے کافر قرار دیا ہے۔ اور اس کو نبی یا مجدد ماننے کو بھی کافر کہا ہے۔

علاوہ ازیں اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین جدید میں بھی صدر مملکت اور وزیراعظم کے حلف نامہ میں عقیدہ ختم نبوت کو بایں الفاظ لازمی قرار دیا گیا ہے کہ:

> ''میں قسم کھاتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں، اور خدا پر میرا یقین کامل ہے، اور اس کی کتاب قرآن پاک پر جو کہ آخری کتاب ہے، آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر (جن پر خدا کی رحمت ہو) جن کے بعد کوئی رسول نہیں آئے گا، قیامت کے دن پر، رسول کی سنت و حدیث پر، قرآن پاک کے احکامات پر''۔ (آئین پاکستان تیسری شیڈول حلف صدر دفعہ ۴۲)

لیکن باوجود اس کے مرزائی گروہ کے افراد اسلام کے نام پر ملک کی اہم کلیدی آسامیوں پر متمکّن ہیں اور اس وجہ سے عروج و اقتدار حاصل کر رہے ہیں۔ حالانکہ وہ مذہبی اور سیاسی اعتبار سے کسی طرح بھی اسلام اور پاکستان کے وفادار نہیں بن سکتے۔ آزاد کشمیر اسمبلی کے حالیہ اس فیصلے کے ردعمل میں کہ "مرزائی غیرمسلم اقلیت ہیں" مرزائیوں کی طرف سے شائع کردہ ٹریکٹ بعنوان "احمدیوں کے بارے میں آزاد کشمیر اسمبلی کی قرارداد تجزیہ اور حقیقت حال" اور ربوہ کے ڈکٹیٹر مرزا ناصر احمد کے مطبوعہ خطبہ روزنامہ "الفضل" مورخہ ۱۳ مئی ۱۹۷۳ء میں انہوں نے اپنے ناپاک عزائم کو آشکارا کر دیا ہے۔ اور ۲۵ لاکھ مسلح مرزائیوں کی طاقت کے بل بوتے پر خونی انقلاب لانے کی دھمکی بھی دے دی ہے۔ اس بنا پر مرزائیت کے بارے میں ہمارا یہ کم از کم بنیادی مطالبہ ہے کہ:

(۱) مرزائیوں کو صراحتاً غیرمسلم اقلیت قرار دیا جائے۔

(۲) ان کو کلیدی آسامیوں سے فوری طور پر ہٹا دیا جائے۔

(۳) مرزا ناصر کے خطبہ اور مذکورہ ٹریکٹ کو ضبط کر کے ان کے خلاف سخت کاروائی کی جائے، اور ملک و ملت کے خلاف مرزائیوں کے ناپاک عزائم اور ان کی گہری سازشوں کا بالکلیہ سدباب کر دیا جائے۔

اللہ تعالیٰ پاکستان اور مسلمانانِ پاکستان کو اندرونی اور بیرونی دشمنوں کی شر سے محفوظ رکھیں اور دینِ اسلام کو غلبہ عطا فرمائیں، آمین، والسلام۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے اسباب کیا تھے؟

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۱۸ جنوری ۱۹۷۴ء)

غیر ملکی مداخلت اور بھٹو صاحب کا اعتراف

وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو نے عید الاضحیٰ سے چند روز قبل ایک غیر ملکی جریدہ کو انٹرویو دیتے ہوئے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ پاکستان کافی عرصہ سے غیر ملکی مداخلت کا نشانہ بنا ہوا ہے اور خصوصاً بلوچستان غیر ملکی سازشوں اور مداخلت کی زد میں ہے۔

اس سے قبل بھٹو صاحب نے متعدد بار اس مداخلت کے وجود سے انکار کیا ہے بلکہ ایک بار تو یہاں تک فرمایا کہ بلوچستان میں غیر ملکی مداخلت کا قصہ ہم صرف اخبارات میں پڑھتے ہیں۔ مگر اب ان کے اس اعتراف کے بعد یہ امر شک و شبہ سے بالاتر ہو چکا ہے کہ بلوچستان میں غیر ملکی عناصر نے سازشوں کے جال پھیلا رکھے ہیں اور پاکستان کو مزید تقسیم کرنے اور تباہ کر دینے کے لیے خفیہ ہاتھ برسرِ عمل ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ

- اس غیر ملکی مداخلت کا سرچشمہ کہاں ہے اور وہ کونسی طاقت پاکستان دشمنی میں اس حد تک آگے بڑھ گئی ہے کہ اسے دولخت کر دینے کے بعد بھی اسے چین نہیں آیا اور اب اس کے مزید حصے کرنے کی بات ہو رہی ہے؟
- اور پھر پاکستان میں وہ کون سے عناصر ہیں جو اس غیر ملکی مداخلت کے آلۂ کار بن کر اپنے وطن عزیز کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتے ہیں؟

غیر ملکی سازشوں کے وجود کو تسلیم کر لینے کے بعد یہ سوال اور زیادہ اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے اسباب کیا تھے؟ وہ کونسا خفیہ ہاتھ ہے جس نے پاکستان کے اس بڑے حصے کو اس سے الگ کر دیا؟ اور اندرون ملک وہ کونسا طبقہ ہے جس نے ملک کو دو حصے کرنے کی اس مذموم سازش میں غیر ملکی مداخلت کاروں کا ہاتھ بٹایا؟ کیونکہ اس امر سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں کہ مغربی پاکستان کے حصے بخرے کرنے میں انہی عناصر کو دلچسپی ہو سکتی ہے جن کے ہاتھ اس سے پہلے مشرقی پاکستان کے خون سے رنگے ہوئے ہیں اور جو پاکستان کی پہلی تقسیم میں کامیابی حاصل کر لینے کے بعد دوسری تقسیم کی طرف دو چند جرأت کے ساتھ قدم بڑھا رہے ہیں۔ اس لیے قومی سلامتی کے نقطۂ نظر سے یہ بات ناگزیر ہو چکی ہے کہ

سقوطِ ڈھاکہ کے مضمرات کو منظرِ عام پر لایا جائے اور المیۂ مشرقی پاکستان کے پس پردہ کارفرما خفیہ ہاتھ کو بے نقاب کیا جائے، تاکہ عوام ان عناصر سے خبردار ہو سکیں جو وطنِ عزیز کے اعضاء کو ایک ایک کر کے الگ کرنے کے درپے ہیں۔

حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کی اشاعت کا مطالبہ

وزیراعظم بھٹو نے اپنے دورِ صدارت میں چیف جسٹس جناب حمود الرحمٰن کی سرکردگی میں سقوطِ مشرقی پاکستان کے اسباب و علل کا جائزہ لینے کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا تھا جس نے سیاسی راہنماؤں، فوجی قائدین اور دیگر متعلقہ افراد کے تفصیلی بیانات قلمبند کرنے کے بعد رپورٹ تیار کر لی ہے۔ اس کمیشن کی تحقیقاتی مساعی کے نتائج کو خفیہ نہیں رہنا چاہیے، یہ پورے ملک کی سلامتی اور قومی تحفظ کا مسئلہ ہے۔ اس کے بارے میں قوم کو اعتماد میں نہ لینا اور قومی سطح پر ان خطرات سے نمٹنے کی بجائے محض پارٹی کی بنیاد پر فیصلے کر لینا ملک و قوم کو مزید دشواریوں سے دوچار کر سکتا ہے۔

اسی لیے قائدِ جمعیت علماء اسلام حضرت مولانا مفتی محمود صاحب مدظلہ اور دوسرے اپوزیشن لیڈر بار بار یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ حمود الرحمٰن کمیشن کی رپورٹ کو گواہوں کے بیانات سمیت شائع کیا جائے تاکہ عوام کو معلوم ہو سکے کہ ان کے وطنِ عزیز کا قاتل کون ہے؟ اس رپورٹ اور گواہوں کے بیانات کی اشاعت سے تقسیمِ پاکستان کے اسباب، خفیہ عوامل اور غیر ملکی سازشوں کے بے نقاب ہونے کے علاوہ اپوزیشن خصوصاً نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت علماء اسلام کے بارے میں سرکاری پارٹی اور اس کے حواریوں کے اس پروپیگنڈا کا وزن بھی معلوم ہو جائے گا جس کے ذریعہ اپوزیشن قائدین کی حب الوطنی کو مسلسل چیلنج کیا جا رہا ہے۔

ہم بھٹو صاحب سے گزارش کریں گے کہ اگر وہ پاکستان میں غیر ملکی مداخلت کے وجود کو تسلیم کرنے میں واقعی سنجیدہ ہیں تو انہیں اس سازش کو بے نقاب کرنا چاہیے اور المیۂ سقوطِ ڈھاکہ کے بارے میں عدالتی تحقیقات کے نتائج کو منظرِ عام پر لا کر عوام اور اپوزیشن کو اعتماد میں لیتے ہوئے ملک کو غیر ملکی مداخلت کے ہولناک نتائج سے بچانے کے لیے مثبت اقدامات کرنے چاہئیں، کیونکہ اس کے بغیر قومی و ملکی سلامتی کے تحفظ کا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ پر ایک نظر

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ ــــ جنوری ۲۰۰۱ء)

حکومت نے آخر کار "حمود الرحمٰن کمیشن" کی رپورٹ کا ایک اہم حصہ عوام کی معلومات کے لیے کیبنٹ ڈویژن کی لائبریری میں رکھ دیا ہے اور اس کے اقتباسات قومی اخبارات میں شائع ہونا شروع ہو گئے ہیں۔

۱۹۷۴ء میں رپورٹ کی تیاری

۱۹۷۱ء میں ملک سے مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور بنگلہ دیش کے قیام کے بعد مغربی پاکستان کے باقی ماندہ حصے میں قائم ہونے والی بھٹو حکومت نے عوامی مطالبہ پر اس وقت کے سپریم کورٹ آف پاکستان کے سربراہ جسٹس حمود الرحمٰن مرحوم کی سربراہی میں ایک اعلیٰ سطحی عدالتی کمیشن قائم کیا تھا جس میں پنجاب ہائی کورٹ کے چیف جسٹس جناب جسٹس انوار الحق مرحوم اور سندھ بلوچستان ہائی کورٹ کے سربراہ جسٹس طفیل علی عبد الرحمٰن مرحوم بھی شامل تھے۔ کمیشن کے ذمہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے اسباب و عوامل کی نشاندہی اور اس کے ذمہ دار افراد کے تعین کے ساتھ ساتھ اس سلسلہ میں ضروری کارروائی کے لیے سفارشات اور تجاویز پیش کرنا تھا۔ کمیشن نے دو سو سے زیادہ افراد کے بیانات اور ستر کے لگ بھگ شہادتیں قلمبند کرنے کے بعد اپنی رپورٹ پیش کر دی تھی جو "ٹاپ سیکرٹ" قرار دے دی گئی اور ملک کے عوام کو اس کی تفصیلات کا علم نہ ہو سکا۔

۲۰۰۰ء میں رپورٹ کی اشاعت

مختلف حلقوں کی طرف سے اس رپورٹ کی اشاعت کا مسلسل مطالبہ کیا جاتا رہا، مگر اس رپورٹ کے بعد ملک میں قائم ہونے والی کسی حکومت نے بھی اس مطالبہ پر توجہ نہ دی۔ حتیٰ کہ اس رپورٹ کے کچھ حصے مبینہ طور پر چوری ہوئے اور بھارت کے بعض اخبارات نے گزشتہ دنوں انہیں شائع کر دیا۔ جس پر اس رپورٹ کی اشاعت کا مطالبہ ایک بار پھر منظر عام پر آیا اور وزیر داخلہ جناب معین الدین حیدر کی سربراہی میں ایک کمیٹی نے رپورٹ کا از سرِ نو جائزہ لے کر اس کے ایک حصے کی اشاعت کی سفارش کر دی، جس پر اسے کیبنٹ ڈویژن کی لائبریری میں عوام کے مطالعہ کے لیے رکھ دیا گیا ہے۔

اخباری اطلاعات کے مطابق رپورٹ کے آٹھ حصوں میں سے صرف دو حصے "اوپن" کیے گئے ہیں جبکہ باقی چھ حصے بدستور "صیغہ راز" میں ہیں اور اس کے مندرجات کو خارجہ تعلقات کے "حساس امور" قرار دے کر حسب سابق ناقابلِ اشاعت کے زمرے میں رکھا گیا ہے۔ تاہم جو حصہ شائع ہوا ہے وہ بھی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے اور اس نے ان تمام شبہات، خدشات اور الزامات کی تصدیق کر دی ہے جو اس عظیم سانحہ کے حوالہ سے اس وقت کی فوجی و سیاسی قیادت اور نوکر شاہی کے بارے میں عوامی حلقوں میں وقتاً فوقتاً سامنے آتے رہے ہیں۔

رپورٹ کے چند اہم نکات

روزنامہ جنگ لاہور، نوائے وقت لاہور اور اوصاف اسلام آباد نے ۳۱ دسمبر ۲۰۰۰ء کے شماروں میں حمود الرحمٰن کمیشن کی رپورٹ کی جو تفصیلات شائع کی ہیں ان میں سے چند اہم نکات درج ذیل ہیں:

- جنرل یحییٰ خان، جنرل عبد الحمید خان، جنرل پیرزادہ، جنرل مٹھا اور ان کے رفقاء نے ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو صدر محمد ایوب خان مرحوم کو اقتدار سے ہٹانے کی سازش کی جس پر ان کے خلاف کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے۔
- جنرل یحییٰ خان سمیت ۱۵ اعلیٰ فوجی افسران اپنی نااہلی، کرپشن، بدعنوانی اور بدکرداری کی وجہ سے تقسیم ملک کے ذمہ دار ہیں، ان کا کورٹ مارشل کیا جائے۔
- ان فوجی افسران نے اپنے مشترکہ مفاد کی خاطر سیاسی جماعتوں پر دباؤ ڈالنے اور انہیں دھمکانے کے علاوہ روپے پیسے کا لالچ دے کر انتخابات کے نتائج اپنے حق میں کرانے کی کوشش کی۔
- پاکستان پیپلز پارٹی کے سربراہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے منتخب اسمبلی میں عوامی لیگ کا سیاسی طور پر مقابلہ کرنے کی بجائے ڈھاکہ میں ۳ مارچ کو بلائے جانے والے اجلاس کا بائیکاٹ کیا اور اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لیے ڈھاکہ جانے والے ارکان اسمبلی کی ٹانگیں توڑ دینے کی دھمکی دے کر انتہائی غیر جمہوری طرز عمل کا مظاہرہ کیا۔
- مسٹر بھٹو نے دو اکثریتی جماعتوں کی تھیوری اور "گرینڈ کولیشن" کی تجویز پاکستان کے وفاق کو بچانے کے لیے نہیں بلکہ کنفیڈریشن کے لیے پیش کی۔
- لیفٹیننٹ جنرل عمر نے سیاسی جماعتوں کو قومی اسمبلی کا اجلاس جلد بلانے کی مخالفت کرنے پر اکسایا۔

- ڈھاکہ میں بلایا جانے والا قومی اسمبلی کا اجلاس غیر معینہ عرصہ کے لیے ملتوی کرنے پر عوامی لیگ نے سول نافرمانی شروع کر دی جو اس قدر بھرپور تھی کہ جنرل ٹکا خان مشرقی پاکستان کا گورنر مقرر ہو کر ڈھاکہ پہنچے تو انہیں حلف اٹھانے کے لیے کوئی جج میسر نہیں تھا۔
- یحییٰ خان نے عوامی لیگ کے سربراہ شیخ مجیب الرحمٰن پر دباؤ ڈالا کہ وہ دستور سازی اور چھ نکات کو نظر انداز کر کے حکومت سازی میں پیپلز پارٹی سے تعاون کریں۔
- شیخ مجیب الرحمٰن واجبی سطح کے لیڈر تھے، چھ نکات ان کے مرتب کردہ نہیں تھے اور نہ ہی ان میں اتنی اہلیت و صلاحیت تھی، بلکہ یہ چھ نکات جو ملک کے سب سے بڑے سیاسی تنازعہ کی بنیاد بنے مشرقی پاکستان کے ینگ سی ایس پی افسران کے ایک گروپ نے مرتب کیے تھے اور انہیں بیرونی عوامل کی پشت پناہی حاصل تھی جنہوں نے ان چھ نکات کی تشہیر اور مشرقی پاکستان کے عوام کو ان کے حق میں تیار اور متحرک کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔
- تین مارچ کو ڈھاکہ میں عوامی لیگ کے احتجاجی جلسہ پر فوج کی فائرنگ سے ہزاروں افراد ہلاک و زخمی ہوئے۔
- ۲۵ مارچ کو فوج نے ڈھاکہ میں آدھی رات کو پوزیشن سنبھال کر فوجی ایکشن شروع کیا جس کے نتیجے میں پچاس ہزار کے لگ بھگ افراد جاں بحق ہوئے۔
- جنرل یحییٰ خان اور ان کے ساتھی جرنیلوں کا اکثر وقت عورت اور شراب کے ساتھ مصروف گزرتا تھا اور اس مقصد کے لیے راولپنڈی صدر میں صدر یحییٰ خان کا ذاتی بنگلہ بدکاری کا اڈہ بن گیا تھا۔
- رپورٹ میں ایک درجن سے زائد عورتوں کی فہرست اور کوائف دیے گئے ہیں جن کے شب و روز یحییٰ خان اور ان کے ساتھی جرنیلوں کے ساتھ گزرتے تھے اور وہ دوسری عورتیں بھی سپلائی کرتی تھیں۔
- یحییٰ خان اکثر اوقات رات سات آٹھ بجے ڈنر کے بہانے ایوانِ صدر سے نکلتے اور صبح واپس آتے۔
- صدر یحییٰ خان نے صدارتی آفس میں جانا بھی ترک کر رکھا تھا اور بھارت کے ساتھ جنگ کے دوران جی ایچ کیو کے آپریشن روم میں وہ صرف دو تین بار گئے۔
- نومبر ۱۹۷۱ء میں عین حالت جنگ کے دوران یحییٰ خان نے گورنر ہاؤس لاہور میں تین روز ملکہ ترنم نور جہاں کے ساتھ بسر کیے۔

- جنرل نیازی پان سمگل کرتے تھے، رشوت لیتے تھے اور رقاصاؤں کے گھروں میں جاتے تھے۔
- بریگیڈیر حیات اللہ نے مقبول پور کے محاذِ جنگ میں عورتیں بنکرز اور مورچوں میں طلب کر لیں۔
- بریگیڈیر جہانزیب ارباب نیشنل بینک کی سراج گنج شاخ سے ایک کروڑ پینتیس لاکھ روپے لوٹنے کی واردات میں اپنے دوسرے چھ فوجی افسر ساتھیوں سمیت ملوث ہیں۔
- جی ایچ کیو نے جنرل نیازی کو بھارتی فوج کے سامنے ہتھیار ڈالنے کا حکم نہیں دیا، یہ فیصلہ جنرل نیازی کا ذاتی تھا۔

یہ ہے وہ ایک ہلکا سا خاکہ اس پس منظر کا جو مملکت خداداد پاکستان کے دو حصوں میں بٹ جانے اور سقوطِ ڈھاکہ جیسے عظیم ملی سانحہ کا باعث بنا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہم نے اس سے کیا سبق حاصل کیا؟ اور ۱۹۷۱ء کے بعد ربع صدی سے زائد عرصہ میں مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے، اس طرح کے اسباب و عوامل کو روکنے اور حالات کو بہتر بنانے کے لیے کیا اقدامات کیے؟ کیا ایسا تو نہیں کہ ہم نے "جرم" اور "مجرم" دونوں پر پردہ ڈال کر خود کو اندرونی و بیرونی سازشوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے اور حالات کی اصلاح کے لیے سقوطِ ڈھاکہ جیسے کسی اور سانحہ کا انتظار کر رہے ہیں؟

مسلم سربراہ کانفرنس لاہور ۱۹۷۴ء

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور ـــ ۲۵ جنوری ۱۹۷۴ء)

کانفرنس کے انتظامات کا جائزہ

آئندہ ماہ لاہور میں مسلم ممالک کے سربراہوں کی تاریخی کانفرنس منعقد ہونے والی ہے جس کی تیاریاں پورے جوش و خروش کے ساتھ جاری ہیں اور اسلامی سیکرٹریٹ کے سیکرٹری جنرل جناب حسن التہامی گزشتہ روز کانفرنس کے انتظامات کا جائزہ لینے کے لیے پاکستان پہنچ چکے ہیں۔ انہوں نے اسلام آباد ایئرپورٹ پر اخباری نمائندوں سے گفتگو کے دوران مسلم سربراہ کانفرنس کی اہمیت واضح کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

> ”لاہور میں منعقد ہونے والی اسلامی کانفرنس کے بعد عالم اسلام کی شیرازہ بندی بین الاقوامی تعلقات میں مؤثر کردار ثابت ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ اسلامی سربراہ کانفرنس میں ہم عالمی سیاست میں اپنے کردار کا تعین کریں گے اور اسے زیادہ واضح طریقے پر پیش کریں گے۔ علاوہ ازیں یہ بھی فیصلہ کیا جائے گا کہ باوقار امن کے قیام میں مسلمان ممالک انسانیت کی کس طرح معاونت کر سکتے ہیں۔ انہوں نے توقع ظاہر کی کہ اگلے چند برسوں میں اسلامی ملکوں کی یہ جتھے بندی دنیائے ارضی میں امیر ترین ہوگی۔ انہوں نے کہا، یہ انتہائی ضروری ہے کہ ہم ابھی سے یہ سوچیں اور اس بارے میں منصوبہ تیار کریں کہ ہم اپنے تیل کے ذرائع آمدن میں کس طرح اضافہ کر سکتے ہیں، اور پھر اسلامی دنیا کی اقتصادی امداد کے لیے اس آمدن کو کس طرح روبہ عمل لا سکتے ہیں تاکہ ہم غیر ممالک کے بنکوں کے رحم و کرم پر نہ رہیں۔“ (بحوالہ امروز لاہور۔ ۲۱ جنوری ۱۹۷۴ء)

جناب حسن التہامی نے، جو مصر کے ایک ممتاز دانشور ہیں، جن زریں خیالات اور مبارک عزائم کا اظہار کیا ہے ان سے کسی مسلمان کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ عالمی استعمار نے گزشتہ چند صدیوں سے عالم اسلام کا شیرازہ منتشر کرنے اور ملت اسلامیہ کو اسلام سے بیگانہ کر کے سامراج کا ذہنی غلام بنانے کے لیے جو پاپڑ بیلے ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں۔ استعمار یہ بات اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ دنیا میں ملت اسلامیہ ہی ایک ایسی قوت ہے جو سامراجی عزائم اور استعماری سازشوں کے لیے حقیقی خطرہ بن سکتی ہے، اور جس کے

ہوتے ہوئے دنیا پر چودھراہٹ قائم کرنے اور مظلوم اقوام پر تسلط جمانے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے گا۔ اس لیے استعمار نے سب سے پہلے عالم اسلام پر ہاتھ صاف کیا۔ مسلم ممالک پر استعماری قبضہ کے فکری، سیاسی اور اقتصادی نتائج کو دیکھتے ہوئے یہ بات بخوبی محسوس کی جا سکتی ہے کہ سامراج نے ان محاذوں پر ملت اسلامیہ کو اپنا دست نگر بنانے کی کوششوں میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ یہ الگ بات ہے کہ برصغیر میں ولی اللٰہی تحریک اور مشرقِ وسطیٰ میں جمال عبد الناصر مرحوم کی انقلابی جدوجہد کے سامنے استعمار کے قدم نہ جم سکے اور ان تحریکات کے مسلسل جہد وعمل کے نتیجہ میں آج دنیا بھر کے مسلمان ملت اسلامیہ کی شیرازہ بندی، استعمار سے نجات، اور عالم اسلام کی ترقی و فلاح کے مقدس جذبہ سے سرشار ہیں۔

ہمارے نزدیک مسلم سربراہ کانفرنس میں عالم اسلام کے راہنماؤں کو سامراج کے اقتصادی و سیاسی تسلط سے پیچھا چھڑانے کے ساتھ ساتھ ملت اسلامیہ کو سامراج کی فکری غلامی اور تہذیبی و ثقافتی بالادستی سے نجات دلانے اور اسلام کے عادلانہ نظام کو عملی زندگی میں نافذ کرنے کے امکانات کا بھی جائزہ لینا چاہیے۔ کیونکہ اسلامی افکار و نظریات، تہذیب و ثقافت اور نظام و دستور کی بنیادیں مضبوط کیے بغیر عالم اسلام کا اتحاد بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔

اگر مسلم حکومتوں کے سربراہ تاریخ کے اس نازک مرحلہ پر وقت کی نبض پر ہاتھ رکھ کر حیران و سرگردان ملت اسلامیہ کو اس کی حقیقی منزل کی طرف گامزن کرنے میں کامیاب ہو گئے تو یہ ان کا ایسا عظیم کارنامہ ہو گا جو نہ صرف دنیا کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل ثابت ہو گا بلکہ اللہ رب العزت کی بے پایاں رحمتیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصی دعائیں و شفقتیں ان کے شامل حال ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ ہمارے راہنماؤں کو صحیح فیصلہ کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

کانفرنس کے حوالے سے تحفظات

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — یکم فروری ۱۹۷۴ء)

مسلم سربراہ کانفرنس لاہور کے بارے میں اپنے جذبات، تاثرات اور توقعات کا اظہار ہم گزشتہ اشاعت میں کر چکے ہیں۔ ہماری دلی خواہش ہے کہ یہ گزارشات عالم اسلام کے قائدین تک پہنچیں اور مسلم سربراہ کانفرنس اسلام کی سربلندی و نفاذ اور عالم اسلام کے اتحاد و ترقی کے لیے صحیح طور پر کوئی ٹھوس

لائحہ عمل تیار کر سکے۔ اس وقت ہم کانفرنس کے انتظامات کے سلسلہ میں کچھ امور کی طرف حکومت کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔

یہ اعزاز اسلامیان پاکستان کے لیے باعث صد افتخار ہے کہ اس عظیم کانفرنس کی میزبانی کا شرف پاکستان کو حاصل ہو رہا ہے اور دنیائے اسلام کے مسلم قائدین ملت اسلامیہ کے مسائل پر غور و خوض کے لیے ہمارے گھر تشریف لا رہے ہیں۔ یہ سعادت ہمارے لیے موجب مسرت و انبساط ہونے کے ساتھ ساتھ ہمیں ان ذمہ داریوں کی طرف بھی متوجہ کرتی ہے جو اس کانفرنس کی کامیابی، پاکستان کے وقار کے تحفظ اور معزز مہمانوں کے شایان شان خیر مقدم کے لیے ہم پر عائد ہوتی ہیں۔

ایسے مواقع پر بظاہر معمولی سی باتیں بھی بسا اوقات بڑی بڑی غلط فہمیوں کا باعث بن جاتی ہیں اور وقتی بے احتیاطی کے بدنتائج انتہائی خطرناک حالات کو جنم دے سکتے ہیں۔ اس لیے پوری احتیاط اور توجہ کے ساتھ کانفرنس کے انتظامات اور اس کے ماحول کا اس انداز سے جائزہ لینا چاہیے کہ کوئی پہلو ایسا نہ باقی رہ جائے جو کانفرنس کی کامیابی یا پاکستان کے قومی وقار پر اثر انداز ہو سکتا ہو۔ یہ گزارشات ہم اس لیے کر رہے ہیں کہ کانفرنس کے انتظامات اور اس سے قبل ملک کی ذہنی فضا کو ہموار کرنے کے سلسلے میں کچھ ایسی باتیں سامنے آئی ہیں جن کے بارے میں ہم پوری دیانت داری کے ساتھ یہ سمجھتے ہیں کہ ان سے کانفرنس کے ماحول پر کچھ اچھا اثر نہیں پڑے گا اور یہ باتیں ہمارے لیے نیک نامی کی بجائے مسلم قائدین کو پاکستان سے بدظن کرنے کا موجب بن سکتی ہیں۔

- مثلاً یہ اڑتی سی خبر کہ مسلم قائدین کی ضیافت کے لیے لاہور کے مشہور ''شیزان ہوٹل'' کو ٹھیکہ دیا جا رہا ہے جو قادیانیوں کا ہے۔ ہمارے نزدیک اگر یہ بات درست ہے تو اسے کانفرنس کو سبوتاژ کرنے کی سازش کے سوا اور کوئی عنوان نہیں دیا جا سکتا۔ اس لیے کہ قادیانیوں کے بارے میں عرب عوام اور قائدین کے جذبات مخفی نہیں۔ سعودی عرب، مصر، شام اور لیبیا میں قادیانی جماعت صرف اس لیے خلاف قانون ہے کہ ان ممالک کے عوام اس حقیقت کو سمجھ چکے ہیں کہ قادیانی ٹولہ استعمار کا خود کاشتہ پودا ہے اور عالم اسلام میں استعمار کے لیے جاسوسی کے فرائض سرانجام دے رہا ہے۔ نیز حیفہ اسرائیل میں قادیانی سنٹر بھی عرب راہنماؤں کی نگاہوں سے اوجھل نہیں۔ ان حالات میں ایک قادیانی ہوٹل کے ذریعہ مسلم سربراہوں کی ضیافت کا اہتمام انتہائی معنیٰ خیز ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ کیا شاہ فیصل، صدر انور سادات، صدر حافظ الاسد اور کرنل قذافی اس صورتحال پر خوش ہوں گے اور کیا شیزان ہوٹل اتنی عظیم کانفرنس میں رازداری کے تقاضوں کے لیے چیلنج ثابت نہ ہو گا؟

- اسی طرح حکومت کا یہ اعلان بھی محل نظر ہے کہ اس کانفرنس کے موقع پر مسلم سربراہوں کو ''عوامی میلہ'' دکھایا جائے گا۔ کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ عالم اسلام کے اہم مسائل پر غور وخوض کی خاطر جمع ہونے والے مسلم سربراہوں کا قیمتی وقت ہم بھنگڑے اور ناچ گانے میں ضائع کریں گے اور یہ بتائیں گے کہ ایسے وقت میں جبکہ دنیائے اسلام شدید کرب و ابتلاء کی کیفیت سے دوچار ہے، ہماری خرمستیوں اور رنگ رلیوں میں کوئی فرق نہیں پڑا۔
- اس کے علاوہ ہم اس تاثر کا اظہار بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ مسلم سربراہ کانفرنس سے قبل پاکستان کے کثیر الاشاعت ماہنامہ اردو ڈائجسٹ میں عالم اسلام کے بطل جلیل اور عربوں کے محبوب قائد جمال عبد الناصر مرحوم کے خلاف بے بنیاد الزامات پر مشتمل سلسلہ وار مضامین کا آغاز بھی کانفرنس کے خلاف کسی سازش کی کڑی ثابت ہوسکتا ہے۔ یہ ماہنامہ اس سے قبل بھی عرب کاز اور مرحوم ناصر کے خلاف ہرزہ سرائی کی مہم میں علماء حق اور عرب دوست عوام کے ہاتھوں منہ کی کھا چکا ہے اور اب پھر اس کی طرف سے مسلم سربراہ کانفرنس کے موقع پر اس مذموم مہم کا آغاز خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔

ہم حکومت سے گزارش کریں گے کہ ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے کانفرنس کے انتظامات اور اس سے قبل رائے عامہ کی بیداری کے لیے قومی پریس کے کردار کا بھرپور جائزہ لیا جائے اور اس سلسلہ میں تمام سیاسی جماعتوں کو اعتماد میں لیا جائے تاکہ پوری قوم اجتماعی طور پر اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوسکے۔

کانفرنس میں مسئلہ کشمیر کا جائزہ لینے کا مطالبہ

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۱۵ فروری ۱۹۷۴ء)

قائدِ جمعیۃ علماء اسلام حضرت مولانا مفتی محمود نے سکھر میں اخباری نمائندوں سے گفتگو کرتے ہوئے اس امر پر زور دیا ہے کہ مسلم سربراہ کانفرنس میں عالمِ اسلام کے دیگر مسائل کے ساتھ ساتھ مسئلہ کشمیر پر بھی غور کیا جائے۔ ادھر معروف کشمیری راہنما میر واعظ مولانا محمد فاروق نے بھی کانفرنس کے ایجنڈے میں مسئلہ کشمیر کو شامل کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔

مسئلہ کشمیر قیامِ پاکستان کے بعد سے اب تک پاکستان اور ہندوستان کے درمیان مسلسل کشیدگی کا باعث چلا آرہا ہے اور دو سے زائد بڑی جنگوں کا محرک بن چکا ہے۔ اور اس سے نہ صرف برصغیر اور ایشیا

بلکہ پوری دنیا کے امن کو خطرہ لاحق ہے۔ اس لیے مسلم سربراہ کانفرنس کے موقع پر اس مسئلہ کو اہمیت نہ دینا حقائق سے آنکھیں موند لینے کے مترادف ہوگا۔ کشمیر کا مسئلہ دراصل ایک سازش کے تحت جنم دیا گیا ہے۔ برٹش سامراج نے برصغیر کی تقسیم کے بعد دونوں حصوں کو ایک دوسرے سے لڑائے رکھنے اور اس خطہ کے عوام میں نفرت اور عداوت کی آگ گرم رکھنے کی غرض سے اس مسئلہ کو جنم دیا تھا۔

تقسیم کے مسلّمہ اصولوں سے انحراف کرتے ہوئے گورداسپور کے ہندو اقلیت کے علاقہ کو ہندوستان میں شامل رکھ کر ہندوستان کو کشمیر کے لیے راستہ دینے کی غرض اس کے سوا کچھ نہیں تھی کہ کشمیر کی وادی کو بھارت کے تسلط میں دے دیا جائے تاکہ نوزائیدہ پاکستان اپنی فلاح و ترقی کی طرف توجہ دینے کی بجائے تمام تر قوت اس مسئلہ پر خرچ کرتا رہے، اور دنیائے اسلام کا سب سے بڑا ملک ہونے کی حیثیت سے عالمِ اسلام کے اتحاد اور ملتِ اسلامیہ کی سربلندی کے لیے اپنا کردار ادا نہ کر سکے۔ اس سلسلہ میں قادیانی سازشوں اور سرحدات کے تعین میں ظفر اللہ خان کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ تقسیمِ ہند کے بعد یہ مسئلہ دو ملکوں کے درمیان مستقل نزاع و فساد کی بنیاد بن گیا جس کی وجہ سے پاکستان جیسا غیر ترقی یافتہ ملک اپنے محدود وسائل کا معتدبہ حصہ دفاع کے لیے مختص کرنے پر مجبور ہے۔

آج صورتحال یہ ہے کہ کشمیر دو حصوں میں بٹا ہوا ہے اور دونوں حصوں کے عوام کا آپس میں رابطہ معطل ہے۔ مقبوضہ کشمیر پر بھارت کا شکنجہ روز بروز سخت ہوتا جا رہا ہے اور اقوامِ متحدہ میں کشمیری عوام کے لیے خود ارادیت کا حق تسلیم کر لینے کے بعد بھی بھارت ان مظلوم مسلمانوں کو یہ حق دینے پر آمادہ نہیں۔ بے شمار کشمیری نوجوان جیلوں میں محبوس ہیں۔ ربع صدی سے کشمیر کو انتخابی نعرے کے طور پر استعمال کرنے والے پاکستانی لیڈروں کی منافقت اور بدعملی نے کشمیری عوام کو حوصلہ دلانے کی بجائے ان کی مایوسیوں میں اضافہ کیا ہے۔ اور اب انہیں موجودہ صورتحال پر قناعت کا سبق دینے کے ساتھ ساتھ درپردہ اس کے انتظامات بھی کیے جا رہے ہیں۔ آج کشمیر کی نئی پود ایک طرف کشمیری عوام کی قربانیوں اور دوسری طرف بھارت کے ظلم و تشدد، اقوامِ متحدہ کے جمود اور پاکستانی حکمرانوں کی دورُخی کو دیکھ کر یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ کیا ہمیں اپنی منزل کے تعین اور راستہ کی جدوجہد میں ان سہاروں سے بے نیاز تو نہ ہونا پڑے گا۔

ہم عالمِ اسلام کے راہنماؤں سے درخواست کریں گے کہ کشمیر کے چالیس لاکھ مسلمان بھائیوں کو بے یقینی کی اس کیفیت سے نجات دلائیں اور ان کو حقِ خود ارادیت سے بہرہ ور کرنے کے لیے اپنا پورا اثر و رسوخ استعمال کریں تاکہ کشمیر کے مسلمان بھی عالمِ اسلام کے اتحاد کی مقدس جدوجہد میں اپنا رول ادا کر

سکیں۔ اور پاکستان پہلے سے زیادہ توانائی اور استحکام کے ساتھ عالمِ اسلام کے تعمیری مشن میں شریک ہو سکے۔

مسلم سربراہ کانفرنس لاہور کا بخیر و خوبی اختتام

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور ــ یکم مارچ ۱۹۷۴ء)

مسلم سربراہوں کی سہ روزہ لاہور کانفرنس متعدّد کھلے اور بند اجلاسوں، طویل بحث و تمحیص اور قائدین کی تقاریر کے بعد قراردادوں، فیصلوں اور اعلانِ لاہور کے اجرا کے ساتھ بخیر و خوبی اختتام پذیر ہوگئی۔ ”لاہور کانفرنس“ کے بارے میں جن توقعات کا اظہار کیا جاتا رہا ہے وہ کہاں تک پوری ہوئی ہیں، اس کا اندازہ کانفرنس کے اعلانات سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ تاہم یہ بات انتہائی اطمینان بخش ہے کہ تمام مسلم راہنماؤں نے اخوت و محبت کے ماحول میں عالمِ اسلام کے مسائل کا جائزہ لیا، ایک دوسرے کی مشکلات کو سمجھنے کی کوشش کی اور باہمی ارتباط کے مختلف پہلوؤں پر غور و خوض کیا۔

مسلم قائدین کا اس انداز سے مل بیٹھنا ہی اتحاد عالم اسلام کی طرف ایک اہم قدم ہے اور اس سے یقیناً ملت اسلامیہ کو ایک پلیٹ فارم پر منظم دیکھنے کے خواہشمند حضرات کی حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔ مسلم قائدین کے ارشادات سے یہ بات بھی بخوبی محسوس ہوتی ہے کہ ملت اسلامیہ کی مشکلات کے حقیقی اسباب و علل اور عالم اسلام کے بنیادی مسائل اب مسلم سربراہوں پر زیادہ اوجھل نہیں رہے۔ مسلم قائدین کی تقاریر میں:

- امپیریلزم اور کمیونزم کے جواب میں اسلام کا ذکر،
- دو بڑے بلاکوں کے تسلط سے آزاد ”تیسری دنیا“ کا تصور،
- ملتِ اسلامیہ کی عظمتِ رفتہ کی بحالی کا عزم،
- اتحاد و اخوت کی منزل کی جانب گامزن ہونے کا جذبہ،
- اور مظلوم اتحاد و ممالک کی حمایت کا اعلان

ہمارے اس خیال کو تقویت بخشتا ہے اور ہمارے نزدیک یہ کانفرنس کا خوش آئند ترین پہلو ہے۔ اس نقطۂ نظر سے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ لاہور کانفرنس نے مسلم راہنماؤں کو عالم اسلام کے مسائل کو سمجھنے اور ایک دوسرے کی مشکلات سے آگاہ ہونے کا موقع فراہم کیا ہے۔ اور اس کے نتیجہ میں ملتِ اسلامیہ کے باہمی ربط و تعاون اور وحدت و اخوت کی بنیادیں اور زیادہ مضبوط ہوں گی۔

کانفرنس کے اس افادی پہلو پر اظہارِ مسرت کے ساتھ ہم ان امور کا ذکر بھی ضروری سمجھتے ہیں جن کے بارے میں ہماری رائے یہ ہے کہ اگر ان پر معقول توجہ دی جاتی تو کانفرنس کی افادیت دو چند ہو سکتی تھی۔ مثلاً:

۱. عالم اسلام پر استعماری قبضہ کے فکری، سیاسی، معاشرتی اور معاشی اثرات سے گلوخلاصی کی طرف قدم بڑھائے بغیر اتحاد عالم اسلام کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ بعض راہنماؤں نے اپنی تقاریر میں اس کی طرف اشارات کیے ہیں جو یقیناً خوش آئند ہیں مگر یہ اہم حقیقت عمل کی متقاضی تھی۔

۲. مسئلہ کشمیر بھی فلسطین کی طرح لاکھوں مسلمانوں کی مظلومیت کا مسئلہ ہے۔ کانفرنس کے ایجنڈا اور اعلانات میں اس کی عدم موجودگی عالمی سطح پر بہت سی غلط فہمیوں کا باعث بن سکتی ہے۔ اگر مسلم قائدین دنیا بھر کی مظلوم اقوام کے زمرے میں کشمیر کے ساٹھ لاکھ مسلمانوں کو بھی شامل سمجھ لیتے تو یہ بات ان مظلوموں کے قافلۂ حریت کے لیے حدی کا کام دے سکتی تھی۔

۳. کانفرنس کے موقع پر حکومت کی طرف سے حزب اختلاف کو مکمل طور پر نظر انداز کر دینے کو بھی کم از کم الفاظ میں "انتہائی نامناسب اور نامعقول" ہی کہا جا سکتا ہے۔ حزب اختلاف ایک جمہوری ملک میں متبادل قیادت سمجھی جاتی ہے۔ ایسے اہم قومی مسئلے کے سلسلہ میں خصوصاً بیرونی مہمانوں کی آمد پر حزب اختلاف کو نظر انداز کرنے سے نہ صرف یہ کہ بین الاقوامی سطح پر حکومت پاکستان کے "جمہوری رویہ" کی نقاب کشائی ہوئی ہے بلکہ کانفرنس کے شرکاء بھی حزب اختلاف کے جہاندیدہ راہنماؤں کے مفید مشوروں سے محروم رہے ہیں، جو یقیناً دین وملت کے لیے بہتر مشورے دیتے۔

۴. اس موقع پر ہم حکومت پنجاب کے اس غیر جمہوری حکم کی مذمت کیے بغیر نہیں رہ سکتے جس کے تحت کانفرنس سے قبل پریس کے مالکان کو چند "خاص عنوانات" پر لٹریچر کی اشاعت سے روک دیا گیا تھا۔ اس پابندی کے نتیجہ میں "ترجمان اسلام" کا خصوصی نمبر اس لیے اشاعت سے رہ گیا کہ اس میں ملک وملت کے خلاف حکومت کے ایک "محبوب۔۔۔" کی سازشوں سے پردہ اٹھایا گیا تھا۔ اسی طرح مجلسِ تحفظِ ختمِ نبوت پاکستان بھی "المتنبیٔ القادیانی" کے نام سے اپنا عربی کتابچہ شائع نہ کر سکی جسے مجلس کے زعماء بیرونی مہمانوں میں تقسیم کرنا چاہتے تھے۔ حتیٰ کہ مشہور شاعر ابوالاثر حفیظ جالندھری کو بھی یہ شکایت ہے کہ ان کی ایک نظم کا عربی ترجمہ صرف اس لیے اشاعت سے روک دیا گیا کہ اس میں "یہود ونصاریٰ" کی مذمت موجود تھی۔

۵. ہم نہیں سمجھ پائے کہ پاکستان کی سیاسی و مذہبی جماعتوں کو معزز مہمانوں سے دور رکھنے اور پاکستانی عوام کو مہمانوں تک اپنے دلی جذبات پہنچانے سے روکنے میں کانفرنس کی کامیابی کا کونسا راز پنہاں تھا۔

بہرحال ان تمام شکایات کے باوجود ہم کانفرنس کے فیصلوں اور مسلم راہنماؤں کے اس اتحاد کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ان فیصلوں پر عمل کرنے اور اتحاد عالم اسلام کی خاطر صحیح سمت قدم اٹھانے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یا الہ العالمین۔

بھٹو صاحب! تقسیمِ ہند کی معقولیت سے انکار؟

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور —۸ فروری ۱۹۷۴ء)

وزیراعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو نے گزشتہ روز لاہور میں اخباری نمائندوں سے گفتگو کرتے ہوئے یہ عجیب و غریب انکشاف فرمایا ہے کہ ”پاکستان مذہبی ملک نہیں ہے“ اور یہ کہ ”کسی ملک کے سیکولر ہونے سے اس کے اسلامی مزاج میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ (روزنامہ مشرق لاہور۔ یکم فروری ۱۹۷۴ء)

خدا جانے مذہب کے نام سے بھٹو صاحب کی اس جھجک کا پس منظر کیا ہے، حالانکہ اس حقیقت سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں کہ پاکستان مذہب کے نام پر ”لا الٰہ الّا اللہ“ کا نعرہ لگا کر قائم کیا گیا تھا۔ اور جن لوگوں نے پاکستان کے قیام کے لیے بے پناہ قربانیاں دیں ان کے پیشِ نظر صرف یہی مقصد تھا کہ پاکستان اسلام کے لیے بن رہا ہے جہاں اسلام کی حکمرانی ہوگی، قرآن و سنت کا بول بالا ہوگا اور ہم اپنے مذہب کے مطابق آزادی سے زندگی بسر کر سکیں گے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی اور تحریکِ پاکستان کے علمبردار ایک ہاتھ میں قرآن کریم اور دوسرے ہاتھ میں حدیث پکڑ کر اسے پاکستان کا قانون و آئین بنانے کا اعلان نہ کرتے تو یہ پاکستان کبھی معرض وجود میں نہ آتا۔

پھر برصغیر کی تقسیم کی منطقی بنیاد بھی صرف مذہب ہے۔ اگر مذہب کو درمیان سے ہٹا دیا جائے تو تقسیمِ ہند کی کوئی معقول وجہ متعیّن نہیں کی جا سکتی۔ آخر برصغیر کے دوسرے باشندوں کے ساتھ ہمارا کیا اختلاف تھا جس کی بنا پر ہم علیحدگی پر مجبور ہوئے؟ رنگ، نسل، زبان اور جغرافیہ کے رشتے تو ان کے ساتھ آج بھی قائم ہیں جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جب برصغیر کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کی بنیاد صرف مذہب ہے تو پاکستان کی مذہبی حیثیت سے انکار کو تقسیمِ ہند کی معقولیت سے انکار کے سوا اور کیا عنوان دیا جا سکتا ہے۔

پاکستان کے نظریاتی اور مذہبی ریاست ہونے سے گزشتہ چھبیس برس میں کسی نے انکار نہیں کیا۔ حتیٰ کہ مرحوم لیاقت علی خان، جن کی طرف بھٹو صاحب نے ”پاکستان مذہبی ملک نہیں ہے“ کا جملہ منسوب کیا ہے، انہوں نے خود دستور ساز اسمبلی میں ”قراردادِ مقاصد“ منظور کرائی جو دستور سازی کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور خود بھٹو صاحب نے اسے آئین کا دیباچہ بنایا ہے۔ اس قراردادِ مقاصد کا ابتدائیہ ملاحظہ فرمائیں:

”چونکہ تمام کائنات کا اقتدارِ اعلیٰ صرف خداوند تعالیٰ کی عظیم ذات کو حاصل ہے اس لیے جو اختیارات اپنی حدود میں رہ کر پاکستان کے عوام نے استعمال کرنے ہیں وہ ان کے پاس خداوند

تعالیٰ کی طرف سے مقدس امانت ہیں اور پاکستان کے عوام کی مرضی ہے کہ وہ ایسا نظام بنائیں:

- جس میں ریاست تمام اختیارات اور طاقت کا استعمال عوام کے نمائندوں کے ذریعے کرے،
- جس میں جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور معاشرتی انصاف کے اصولوں کا اسلام کے احکامات کے مطابق پاس کیا جائے گا،
- جس میں مسلمان اس قابل ہوں گے کہ اپنی زندگیوں کو انفرادی و اجتماعی دائروں میں اسلام کی ہدایات اور ضروریات کے مطابق ڈھال سکیں، وہ ہدایات جن کا پتہ قرآن پاک اور سنتِ نبویؐ سے ملتا ہے۔"

اور اب تو خود بھٹو صاحب کے پیش کردہ آئین میں یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ:

- پاکستان کا سرکاری مذہب اسلام ہوگا،
- قرآن و سنت کے خلاف کوئی قانون نافذ نہیں ہوگا،
- اور پہلے سے نافذ قوانین کو بتدریج اسلام کے مطابق بنایا جائے گا۔

الغرض تحریکِ پاکستان کی نظریاتی جدوجہد، قراردادِ مقاصد اور آئین کی واضح تصریحات اس امر کا اعتراف کرتی ہیں کہ پاکستان ایک نظریاتی مذہبی ریاست ہے اور ہمیں یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ اس سلسلہ میں ابہام پیدا کرنا قیامِ پاکستان کے بنیادی مقاصد کے منافی ہے۔

بلوچستان، ایک لمحہ فکریہ!

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور ــــ ۱۵مارچ ۱۹۷۴ء)

گورنر بلوچستان خان احمد یار خان نے ایک بیان میں فرمایا ہے کہ وزیراعظم بھٹو بے پناہ مصروفیات کے باعث وعدہ کے مطابق ۲۵ فروری کو بلوچستان کی صورتحال کے بارے میں کسی فیصلہ کا اعلان نہیں کر سکے، اب وہ یکم اپریل تک یہ اعلان کر دیں گے۔ گورنر نے یہ بھی کہا ہے کہ نیپ (نیشنل عوامی پارٹی) لیڈروں کے خلاف مقدمات سابق گورنر اکبر بگتی کی سفارش پر قائم کیے گئے تھے۔

ادھر ہفت روزہ ''ندائے بلوچستان'' کوئٹہ کے مطابق سابق گورنر اکبر بگتی نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ نیپ لیڈروں کے خلاف جھوٹے مقدمات قائم کیے گئے تھے تاکہ ان کی نشستیں خالی قرار دے کر ان کی جگہ پیپلز پارٹی کے ارکان کو صوبائی اسمبلی کے لیے ''منتخب'' کرایا جا سکے۔ بگتی صاحب نے ضمنی انتخابات میں پیپلز پارٹی کی دھاندلیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان زبردست دھاندلیوں کو دیکھتے ہوئے انہیں الیکشن کی بجائے سلیکشن کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔

بلوچستان کے سابق اور موجودہ گورنروں کے ان بیانات کے علاوہ صوبائی وزیر صحت میاں محمد حسن شاہ کے ساتھ جمعیت علماء اسلام گوجرانوالہ کے کارکنوں کی گفتگو کی اس رپورٹ کا ذکر بھی نامناسب نہ ہوگا جو ''ترجمانِ اسلام'' کے اسی شمارہ میں شائع ہو رہی ہے۔ یہ تینوں حضرات ''نیپ جمعیت'' حکومت کی برطرفی کے بعد بلوچستان کی سیاسی حکمتِ عملی میں بھٹو صاحب کے شریکِ کار کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی آراء و تاثرات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

بلوچستان کی سیاسی صورتحال کا نقشہ

خان احمد یار خان، اکبر خان بگتی اور میاں محمد حسن شاہ کی ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بلوچستان کی سیاسی صورتحال کا جو نقشہ سامنے آتا ہے اسے ہم مختصراً یوں بیان کر سکتے ہیں کہ:

- بھٹو صاحب بلوچستان اسمبلی میں ''نیپ جمعیت'' پارلیمانی پارٹی کی اکثریت کو ختم کرنے میں ناکام رہے ہیں اور اس کا اعتراف مری مذاکرات میں خود بھٹو صاحب بھی کر چکے ہیں۔

- مری، مینگل، بزنجو اور بگتی قبائل کی جمہوری جدوجہد کو طاقت کے بے پناہ استعمال کے باوجود دبایا نہیں جاسکا اور صوبہ کی غیر آئینی حکومت کو سنگینوں کے سائے کے بغیر اپنا وجود تک موہوم دکھائی دے رہا ہے۔
- ارکانِ اسمبلی کو لالچ کے ذریعہ ورغلانے میں مکمل ناکامی کے بعد ان پر جھوٹے مقدمات چلا کر ان کی نشستوں کو جبراً خالی کیا جارہا ہے۔ اکبر بگتی (جن کے دور میں یہ مقدمات قائم ہوئے تھے) کے اعتراف حقیقت کے بعد ان مقدمات کے بے بنیاد ہونے میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔
- جبراً سیٹیں خالی کرانے کے بعد جو انتخابات کرائے جارہے ہیں، زبردست دھاندلیوں کے باعث ان کی حیثیت سلیکشن سے زیادہ کچھ نہیں۔
- بھٹو صاحب بلوچستان کے سیاسی حل کے بارے میں بار بار وعدوں کے باوجود فیصلہ کا اعلان کرنے میں ٹال مٹول سے کام لے رہے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاید انہیں اس فیصلہ کے لیے کسی "خاص وقت" کا انتظار ہے۔

جنرل یحییٰ خان کے کردار کا اعادہ؟

بلوچستان کی اس صورتحال کا جب ہم ۱۹۷۱ء کے مشرقی پاکستان میں یحییٰ خان کی حکمتِ عملی سے موازنہ کرتے ہیں تو ان دونوں میں امتیاز کرنا ہمارے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔ اور ان کی حیرت انگیز مماثلت سے جنم لینے والا یہ کربناک تاثر بار بار ذہن کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے کہ ۱۹۷۱ء کا مشرقی پاکستان اور ۱۹۷۴ء کا بلوچستان کہیں کسی ایک ہی نازنین کی اٹھکیلیوں کا شکار تو نہیں؟ ذرا ۱۹۷۱ء کے مشرقی پاکستان کی تلخ یاد تھوڑی دیر کے لیے ذہن میں تازہ کیجیے:

- "ادھر تم ادھر ہم" کا نعرہ،
- اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کرنے والوں کی ٹانگیں توڑ دینے کا اعلان،
- عوام کے انتخابی فیصلہ کو مسترد کر کے فوجی حل کا اقدام،
- منتخب ارکان اسمبلی کی رکنیت ختم کر کے ضمنی انتخابات کے نام سے ریوڑیوں کی تقسیم،
- سیاسی حل سے بار بار انکار اور فوجی طاقت کے اندھا دھند استعمال پر اصرار،
- اور سلامتی کونسل میں سیاسی حل کی بحث کے موقع پر بھٹو صاحب کو کسی "خاص وقت" کا انتظار۔

کیا ۱۹۷۱ء کا مشرقی پاکستان انہیں تلخ یادوں سے عبارت نہیں؟ ان تلخ یادوں کے ساتھ اب بلوچستان میں بھٹو صاحب کی حکمت عملی پر ایک بار پھر نگاہ ڈال لیجئے اور سوچئے کہ آخر بلوچستان کو ۱۹۷۱ء کے مشرقی پاکستان کے نقش قدم پر چلنے پر کیوں مجبور کیا جا رہا ہے؟

اس موقع پر ہم بھٹو صاحب سے کچھ عرض کرنا تو لاحاصل سمجھتے ہیں، البتہ ملک کے سنجیدہ سیاسی حلقوں سے یہ ضرور گزارش کریں گے کہ وہ مسئلہ بلوچستان کی نزاکت کا احساس کریں اور اس کے جمہوری اور سیاسی حل کو قدم بہ قدم پیچھے دھکیلنے والے ہاتھ کو اس وقت سے پہلے پکڑ لیں جب یہ سیاسی حل بھی ہماری دسترس سے باہر ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ وہ دن ہمیں نہ دکھائیں، آمین یارب العالمین۔

بلوچستان کی صورتحال، میاں محمد حسن شاہ کی باتیں

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۱۵ مارچ ۱۹۷۴ء)

۵ مارچ کا قصہ ہے کہ راقم الحروف کو علامہ محمد احمد صاحب لدھیانوی جنرل سیکرٹری متحدہ جمہوری محاذ گوجرانوالہ، قاری محمد یوسف عثمانی صاحب نائب امیر جمعیۃ شہر گوجرانوالہ، اور ڈاکٹر غلام محمد صاحب مبلغ جمعیۃ ضلع گوجرانوالہ کی معیت میں جمعیۃ کے علاقائی تربیتی کنونشن کے لیے فیصلز ہوٹل جی ٹی روڈ گوجرانوالہ کے ہال کی بکنگ کی غرض سے ہوٹل جانے کا اتفاق ہوا۔ ہوٹل کے صدر دروازے پر سیاہ رنگ کی کار اور اس پر قومی پرچم دیکھ کر خیال ہوا کہ شاید اندر کوئی عوامی وزیر ہوٹل کو شرف قدوم سے نواز نے تشریف لائے ہیں۔ ہم ہوٹل کے اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ بلوچستان کے "عوامی مولانا" اور وزیر صحت حضرت مولانا میاں محمد حسن شاہ صاحب دامت برکاتہم اپنے ڈرائیور اور ایک نوعمر بچے کی معیت میں تشریف فرما ہیں اور کھانا تناول کر رہے ہیں۔ ہم کھانے میں خلل اندازی ناپسند کرتے ہوئے ہال کی بکنگ کے سلسلہ میں مینیجر صاحب سے گفتگو کے بعد ایک طرف بیٹھ گئے کہ اختلافات اپنے مقام پر سہی چلو مل تو لیں، آخر مہمان ہیں۔

میاں صاحب کھانے سے فارغ ہوئے تو ہم لوگ قریب آ گئے۔ مصافحہ اور سلام دعا کے بعد ہم نے چائے کی دعوت دے دی جو انہوں نے کچھ تامل کے بعد قبول فرمالی۔ ظہر کی نماز کا وقت ہو چکا تھا، میاں صاحب نے چائے سے قبل وضو کر لیا اور ہوٹل والوں نے نماز کے لیے مصلیٰ کا انتظام بھی کر دیا۔ وضو کے بعد میاں صاحب چائے کی میز پر تشریف لائے تو علامہ محمد احمد صاحب لدھیانوی نے بلوچستان کی صورتحال کے بارے میں ایک سوال کے ساتھ گفتگو کا آغاز کر دیا جو بلوچستان میں امن وامان کی صورتحال کے بارے میں تھا۔

میاں صاحب نے فرمایا کہ بلوچستان میں امن وامان کی صورتحال "قابو" میں تو ہے مگر فوج کے زور سے۔ فوج کی تعداد میاں صاحب نے پہلے چار ڈویژن اور پھر سات ڈویژن بتائی اور کہا کہ اسی وجہ سے کچھ امن وامان ہے ورنہ مری، مینگل اور بزنجو بڑے تیز قبیلے ہیں، ان کو قابو کرنا مشکل ہے۔

علامہ صاحب نے دوسرا سوال یہ کیا کہ عطاء اللہ خان مینگل، غوث بخش بزنجو اور خیر بخش مری کو کیوں گرفتار کیا گیا ہے؟

میاں صاحب نے بتایا کہ انہوں نے خود جیل پسند کی ہے، ہم نے تو ان سے کہا تھا کہ آؤ ہمارے ساتھ مل کر مخلوط حکومت بنالو مگر مینگل نے کہا کہ اسمبلی میں ہماری اکثریت ہے اس لیے ہم حکومت بنائیں گے ورنہ پہاڑوں میں رہ کر لڑیں گے۔ اب اس کے بعد انہیں گرفتار کرنے پر ہم مجبور ہیں، ویسے مینگل بہت بہادر اور زور آور ہے، وہ کسی سے نہیں ڈرتا، وہ جیل میں بھی خوش ہے اور جیل کو جیل نہیں سمجھتا اور کہتا ہے کہ مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں۔ میاں صاحب نے گفتگو بڑی احتیاط سے فرمائی مگر آخر سچی بات تھی جسے وہ چھپا نہ سکے اور عطاء اللہ مینگل کو خراجِ تحسین پیش کیے بغیر نہ رہ سکے۔

اس کے بعد قاری محمد یوسف صاحب نے سوال کیا کہ حضرت سنا تھا کہ بلوچستان میں دو ماہ میں شریعت نافذ ہوگی، اس کا کیا بنا اور کب بلوچستان میں شرعی نظام کے نفاذ کی توقع ہے؟

میاں صاحب نے فرمایا کہ ابھی حالات قابو میں نہیں اور ہنگامی صورتحال ہے اس لیے سرِدست کچھ نہیں ہوسکتا۔ ہم جلدی اس کے لیے کوشش کریں گے اور کوثر نیازی صاحب نے ہم سے شریعت کا وعدہ کر رکھا ہے۔

میاں صاحب نے یہ عذر تو کر دیا مگر انہیں یہ باور نہ رہا کہ اس مجلس میں وہ "نیپ جمعیۃ" حکومت پر اسلامی اصلاحات نافذ نہ کرنے کی وجہ سے بے دینی کا فتویٰ دے چکے ہیں۔ خیر میاں صاحب "نیپ جمعیۃ" حکومت پر اعتراض اور اپنی حکومت کی طرف سے عذر پیش کرنے سے فارغ ہوئے تو میں نے سوال کر دیا کہ حضرت یہ ارشاد فرمائیے کہ جمعیۃ کی مرکزی قیادت سے آپ کا کیا جھگڑا ہے؟

میاں صاحب فرمانے لگے کہ مفتی صاحب کسی کی بات نہیں مانتے۔ میں نے عرض کیا کہ مفتی صاحب تو شوریٰ کی بات کرتے ہیں، آپ کو بھی شوریٰ کی بات کرنی چاہیے۔ مگر اس بات کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

علامہ محمد احمد صاحب نے ایک اور سوال یہ کیا کہ حضرت آپ مینگل حکومت پر تو اعتراض کرتے ہیں کہ اس نے شراب پر پابندی نہیں لگائی، تو کیا آپ کی حکومت نے شراب بند کر دی؟

میاں صاحب نے فرمایا بھئی! ابھی تو قصہ ڈانواں ڈول ہے، میں نے تو "اس" سے کہا تھا مگر "اس" نے کہا کہ ہمیں تو یہ بھی پتہ نہیں کہ شام تک ہماری وزارت رہتی ہے یا نہیں، اس لیے ہم کیا کر سکتے ہیں۔ اس وقت حالات درست نہیں، جب درست ہوں گے اور مینگل سے بات ہو جائے گی تو پھر ہم سب کچھ کریں گے۔

یہ باتیں جاری تھیں کہ شاید چھٹی حس نے میاں صاحب کو خبردار کر دیا، چنانچہ وہ ہوٹل میں نماز ادا کیے بغیر عجلت میں گاڑی پر سوار ہو کر عدم لاہور ہو گئے۔......

بھٹو صاحب! بلوچستان امن و انصاف مانگتا ہے

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور ــــ ۵ اپریل ۱۹۷۴ء)

بلوچستان نیشنل عوامی پارٹی کے راہنما جناب احمد نواز بگٹی گزشتہ روز لاہور تشریف لائے اور پارٹی ورکروں کے اجتماع سے خطاب کے علاوہ ایک مقامی روزنامہ کو انٹرویو بھی دیا جس میں انہوں نے بلوچستان کے سیاسی حل کے بارے میں وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی طرف سے متوقع اعلان، بلوچستان کی سیاسی صورتحال اور مسئلہ بلوچستان کے صحیح حل کے سلسلہ میں چند فکر انگیز باتیں کی ہیں۔ بلوچستان کی نازک صورتحال اور وزیراعظم بھٹو کے متوقع اعلان کے پیشِ نظر بگٹی صاحب کے ان خیالات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اس لیے ان کے خطاب اور انٹرویو کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

۱. وزیراعظم بھٹو بلوچستان کے اسیر راہنماؤں کو پیغامات بھجوا رہے ہیں اور کوئی سمجھوتہ کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ہمارے ساتھی سمجھتے ہیں کہ یہ سمجھوتہ پاکستان کے مفاد کے منافی ہوگا اس لیے بھٹو صاحب کی اس پیشکش کو مسترد کر دیا گیا ہے۔

۲. ہم نے ہتھیار اٹھا کر پہاڑوں کا رخ اس لیے کیا ہے کہ ہم پر اظہارِ خیال اور رابطۂ عوام کے تمام دروازے بند کر دیے گئے ہیں۔ اگر آج ہمیں کوئی بتا دے کہ مسلح جدوجہد کے سوا کوئی دوسرا راستہ کھلا ہے تو ہم ہتھیار پھینک دیں گے۔ بلوچستان کی حالت یہ ہے کہ عوام کے منتخب نمائندوں کو عوام کی نمائندگی سے روک دیا گیا ہے اور ہر جمہوری طریقہ کار کو ختم کر کے بے بس کر دیا گیا ہے۔

۳. بلوچستان کے سیاسی مسئلہ کا حل صرف سیاسی ہو سکتا ہے۔ اور ضروری ہے کہ کسی قسم کی مصالحت اور سمجھوتے سے قبل (۱) نیشنل عوامی پارٹی کے اسیر راہنماؤں کو رہا کیا جائے، (۲) ان کی حکومت کو جوں کا توں بحال کیا جائے اور (۳) فوج کو واپس بلا لیا جائے۔ اگر سیاسی حل تلاش نہ کیا گیا تو ہم ہتھیار نہیں ڈالیں گے۔

۴. پنجاب کے عوام حالات کی نزاکت کا احساس کریں کیونکہ مسٹر بھٹو کہتے ہیں کہ جب تک پنجاب میرے ساتھ ہے، سرحد، سندھ اور بلوچستان میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ہم اہلِ پنجاب کو ہتھیار اٹھانے کو نہیں کہتے لیکن وہ ملک میں جمہوریت کی بحالی کے لیے تو جدوجہد کریں۔ پنجاب کے اس رویہ کی وجہ سے مسٹر بھٹو اپنے بنائے ہوئے آئین کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔

۵. نیشنل عوامی پارٹی پر سرداری نظام کے تحفظ کا الزام قطعاً بے بنیاد ہے۔ کیونکہ صرف دو سردار عطاء اللہ خان مینگل اور خیر بخش مری نیپ میں ہیں، باقی ماندہ سردار تو پیپلز پارٹی کے حامی ہیں۔ اگر ہماری جدوجہد کا مقصد اپنی سرداریوں کا تحفظ ہوتا تو ہم یقیناً پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کرتے، اس طرح کوئی ہمیں ہاتھ بھی نہ لگا سکتا تھا۔

۶. سرداروں پر سڑکوں کی تعمیر کا مخالف ہونے کا الزام بھی غلط ہے، وہ کیسے سڑک کی تعمیر کے مخالف ہوسکتے ہیں، کیا انہیں سفر کرنا نہیں ہوتا؟

۷. بلوچستان میں نئے انتخابات کی بات کی جاتی ہے لیکن ایسا صرف بلوچستان میں کیوں؟ پورے ملک میں نئے انتخابات ہوسکتے ہیں۔ اگر ہم ۱۹۷۰ء کے انتخابات کو قبول کرتے ہیں تو وزیراعظم ایسا کیوں نہیں کرتے؟

۸. میری رائے میں افغانستان کے صدر داؤد خان جیسے ہی اپنا اقتدار مستحکم کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے وہ پاکستان کے خلاف اپنی مہم تیز کر دیں گے۔ اس ضمن میں وہ سرحد پار بلوچستان میں انتہا پسند عناصر کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ انہیں یہ کامیابی اس لیے حاصل ہوگی کہ بلوچستان اب ایک ایسا صوبہ ہے جہاں کے عوام کے سیاسی حقوق غصب کیے جا چکے ہیں اور جنہیں ظلم اور متشددانہ کاروائیوں کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔ وزیراعظم بھٹو نے خود کہا ہے کہ بلوچستان میں فوج ملک کے دشمنوں کے خلاف لڑ رہی ہے۔ ایسے ماحول میں وہاں کے عوام کا کابل کا حامی اور ایران کا مخالف ہونا قدرتی امر ہے۔ افغانستان کے اس پروپیگنڈا میں شدت آجائے گی کہ بلوچ عوام کو گزشتہ چھبیس برس کے دوران ان کے سیاسی حقوق نہیں ملے، بلوچ عوام اگر افغانستان کے ساتھ ہاتھ ملا لیں تو پٹھان اور بلوچوں کو برابر کے حقوق ملیں گے۔ افغانستان کا یہ پراپیگنڈا کارگر ثابت ہوگا۔ بلوچستان نیشنل عوامی پارٹی کی قیادت کا جیلوں میں بند ہونا اس ملک کے لیے سب سے بڑا المیہ ہے۔ ان راہنماؤں کی عدم موجودگی میں قیادت لازمی طور پر نوجوان اور انتہا پسند عناصر کے ہاتھوں میں چلی جائے گی جن سے سمجھوتہ کرنا یا انہیں راہ راست پر لانا تقریباً ناممکن ہوگا۔

۹. ہم اس اسمبلی کو تسلیم نہیں کرتے جس میں ہماری اکثریت ڈنڈے کے زور اور دیگر ذرائع استعمال کر کے ختم کی گئی ہے۔ مولوی شمس الدین کو شہید کر دیا گیا ہے۔ گل خان نصیر، عطاء اللہ مینگل، خیر بخش مری اور دوست محمد جبیل میں ہیں۔ مسٹر عبدالرحمٰن کو مفرور قرار دیا جا چکا ہے۔ ڈنڈے کے زور اور ڈرا دھمکا کر قائم کی گئی اکثریت کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اگر وزیراعظم بھٹو ۱۹۷۰ء کے عام

انتخابات کی بنیاد پر مرکز، پنجاب اور سندھ میں اپنی اکثریت کے بل بوتے پر حکومت کے حق کو جتاتے ہیں تو انہیں ان انتخابات کے نتیجہ میں قائم شدہ ہماری اکثریت کو بھی تسلیم کرنا چاہیے۔

۱۰. افغانستان کے ساتھ بلوچستان نیشنل عوامی پارٹی کے رابطے کی افواہیں بھی بے سروپا ہیں۔ ہمارا افغانستان کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ ہمارا مستقبل تو پاکستان اور اس کی سالمیت کے ساتھ وابستہ ہے، اس کے سوا ہمارا کوئی مستقبل نہیں۔

(بحوالہ نوائے وقت لاہور۔۱۶اپریل ۱۹۷۴ء)

احمد نواز بگٹی صاحب کے ان واضح ارشادات کے بعد بلوچستان کی صورتحال کے بارے میں اور کسی وضاحت کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ ہم وزیراعظم بھٹو سے گزارش کریں گے کہ بلوچستان امن وانصاف کا طلبگار ہے۔ بلوچستان کے عوام کو الزامات کے تیروں، تشدد کی ضربوں اور گولیوں سے چھلنی کرنے کی بجائے ان کے زخموں پر مرہم رکھیے۔ انہیں انصاف اور امن دیجئے، اپنے متوقع اعلان میں بلوچستان کے مظلوم عوام کو محبت اور اعتماد کے ساتھ ان کے انسانی، جمہوری وآئینی حقوق کی بحالی کا مژدہ سنائیے۔ اس میں آپ کی نیک نامی ہے اور یہی ملکی سالمیت کے تحفظ اور قومی استحکام کی واحد بنیاد ہے۔

اب دیکھیے وزیراعظم کا ''اعلانِ بلوچستان'' بلوچ عوام کو امن وانصاف کی نوید دیتا ہے یا بھٹو صاحب کی مخصوص سیاسی حکمتِ عملی پر نیا خوشنما لیبل ثابت ہوتا ہے۔

بھٹوصاحب کا ''اعلانِ بلوچستان''

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور ـــ ۱۹ اپریل ۱۹۷۴ء)

وزیراعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو نے ۱۳ اپریل کو بالآخر وہ اعلان کر ہی دیا جس کا قوم کو گزشتہ پون سال سے انتظار کرایا جا رہا تھا اور جس کے بارے میں وسیع پراپیگنڈا کے ذریعہ اس قدر سسپنس پیدا کر دیا گیا تھا کہ (ملک کے سنجیدہ سیاسی حلقوں کے سوا) اعلانِ تاشقند کی طرح اعلان بلوچستان بھی عوام کی توجہات کا مرکز اور اخبارات و رسائل میں موضوع بحث بن چکا تھا۔ اور خود وزیراعظم نے اس کے بارے میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اس اعلان سے تمام حلقے مطمئن ہو جائیں گے۔ لیکن اس قدر زور و شور اور جوش و خروش کے بعد جب دو روزہ بلوچستان سرکاری کانفرنس کے اختتام پر یہ ''اعلان بلوچستان'' ظہور پذیر ہوا تو ہمارے اس خدشہ نے حقیقت کا روپ دھار لیا جس کا اظہار ہم گزشتہ شمارہ میں کر چکے ہیں کہ

''اب دیکھیے وزیراعظم کا ''اعلان بلوچستان'' بلوچ عوام کو امن و انصاف کی نوید دیتا ہے یا بھٹو صاحب کی مخصوص سیاسی حکمت عملی کا نیا خوشنما لیبل ثابت ہوتا ہے۔''

بھٹو صاحب نے اس اعلانِ بلوچستان میں جو کچھ فرمایا، اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱. بلوچستان میں فوجی کارروائی ہو رہی ہے اور پہلی بار سرکاری طور پر اس کا اعتراف کیا گیا ہے۔

۲. سول انتظامیہ جب تک تشفی کے ساتھ ''ترقیاتی کاموں'' کی ذمہ داریاں سنبھال نہیں لیتی، فوج یہ خدمات سرانجام دیتی رہے گی۔ البتہ ۱۵ مئی سے سول انتظامیہ کے لیے کی جانے والی فوجی کارروائیاں بند کر دی جائیں گی۔

۳. جو لوگ سنگین کارروائیوں میں ملوث نہیں ان کو رہا کر دیا جائے گا اور جو گھروں سے باہر چلے گئے ہیں ان کو عام معافی دے دی جائے گی۔

۴. بلوچستان میں سرداریوں اور قدامت پسند روایات کی خاصی ''اصلاح'' ہو چکی ہے اور اس طرح عوام کی فلاح و بہبود کا پہلا مرحلہ مکمل کر لیا گیا ہے۔

بھٹو صاحب کے اس اعلان کو بغور ملاحظہ کیا جائے تو الفاظ کے گورکھ دھندے اور بھٹو صاحب کی سیاسی ذہانت کے مظاہرہ کے سوا اس میں کچھ بھی نہیں ملتا۔ اس اعلان میں بڑی چابکدستی سے بلوچستان کی اصل صورتحال کو پس پردہ رکھ کر فوجی کارروائی کو جواز مہیا کرنے کے لیے بوگس اور بے بنیاد دلائل کو حسین الفاظ کا

جامہ پہنا دیا گیا ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس طرح بلوچستان کا مسئلہ حل ہو جائے گا؟ اور اس نازک مسئلہ کے الجھے رہنے کی صورت میں جن خدشات کا اظہار کیا جا رہا ہے، ان کا راستہ بند ہو جائے گا؟

بھٹو صاحب کی سیاسی زیرکی اور چابکدستی میں کلام نہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ اس خصوصیت کو ہر مسئلہ کا حل سمجھنے لگ گئے ہیں۔ اور بدقسمتی سے اقتدار کی کرسی پر بیٹھ کر بھٹو صاحب اپنی تمام تر خصوصیات کے باوجود عقلِ کُل کے تصوراتی جال کا شکار ہونے سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکے۔ ورنہ مسائل کا حل کچھ مشکل نہیں، خصوصاً بلوچستان کا مسئلہ تو بالکل واضح ہے اور اسی قدر اس کا حل بھی آسان ہے۔ مگر اس کے لیے بھٹو صاحب کو عقلِ کُل کے خوشنما خول اور پارٹی بازی کی سیاست کے دائرہ سے کچھ دیر کے لیے باہر تشریف لانا ہوگا۔

بلوچستان کا مسئلہ یہ نہیں جسے بھٹو صاحب نے اعلانِ بلوچستان میں باور کرانے کی ناکام کوشش فرمائی ہے۔ بلکہ اس مظلوم صوبہ کے عوام کا مسئلہ یہ ہے کہ انہوں نے ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں ملک کے دوسرے صوبوں کے عوام کی طرح آزادی کے ساتھ اپنی صوبائی قیادت منتخب کی تھی، بھٹو صاحب نے انہیں اس منتخب قیادت سے محروم کر دیا ہے، ان کے نمائندوں کو جیل میں ڈال دیا ہے، اور سنگین و گولی کے زور سے انہیں ۱۹۷۰ء کے عوامی فیصلہ سے انحراف کو تسلیم کر لینے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ لیکن وہ مظلوم عوام اپنے آئینی و جمہوری حق سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہیں ہیں۔ اس صورتحال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے یقیناً بھٹو صاحب کو یہ مسئلہ حل کرنا ہوگا اور بلوچستان کے عوام کو ان کے حقوق لوٹانے ہوں گے۔ ورنہ آئینی، جمہوری اور انسانی حقوق کے جبری تعطل کے فطری ردعمل کی ذمہ داری بھٹو صاحب پر ہوگی۔

ان گزارشات کے بعد ملک کے سیاسی حلقوں سے کی گئی اس گزارش کا ذکر نامناسب نہ ہوگا جو ہم نے ۱۵ مارچ کے شمارہ کی ادارتی معروضات کے اختتام پر کی تھی۔ وہ گزارش یہ تھی:

> ”اس موقع پر ہم بھٹو صاحب سے کچھ عرض کرنا تو لاحاصل سمجھتے ہیں، البتہ ملک کے سنجیدہ سیاسی حلقوں سے یہ ضرور گزارش کریں گے کہ وہ مسئلہ بلوچستان کی نزاکت کا احساس کریں اور اس کے جمہوری اور سیاسی حل کو قدم بہ قدم پیچھے دھکیلنے والے ہاتھ کو اس وقت سے پہلے پکڑ لیں جب یہ سیاسی عمل بھی ہماری دسترس سے باہر ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ وہ دن ہمیں نہ دکھائیں، آمین یارب العالمین۔“

ڈپٹی اسپیکر بلوچستان اسمبلی مولانا سید شمس الدین کی شہادت

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۲۲ مارچ ۱۹۷۴ء)

جمعرات ۱۴ مارچ کی صبح کو ملک بھر میں یہ خبر انتہائی غم کے ساتھ سنی گئی کہ گزشتہ روز کوئٹہ فورٹ سنڈیمن روڈ پر پاکستان کے انتہائی قابلِ احترام عالم باعمل، عظیم سیاسی راہنما، بلوچستان جمعیۃ کے امیر، صوبائی متحدہ جمہوری محاذ کے نائب صدر اور صوبائی اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر حضرت مولانا سید محمد شمس الدین شہید کر دیے گئے، اناللہ واناالیہ راجعون۔ اس اندوہناک سانحہ نے ملک کے دینی و سیاسی حلقوں میں صفِ ماتم بچھا دی ہے۔ مولانا سید شمس الدین جمعیۃ علماء اسلام کے مقتدر راہنما تھے، آپ نے گزشتہ چند سالوں کے دوران دین و ملت کی جو شاندار خدمات سرانجام دیں اس سے علماء حق، جمعیۃ علماء اسلام اور اکابرین جمعیۃ میں انہیں خاص مقام حاصل ہو گیا تھا۔ وہ اپنے افکار و اعمال اور گفتار و کردار سے ایک عہد آفرین شخصیت بن گئے تھے۔ انہوں نے حرص و لالچ اور جاہ و منصب کو پائے حقارت سے ٹھکراتے ہوئے اپنے دینی و سیاسی مسلک کی پختگی کو قائم رکھا اور سیاست کے نازک ترین لمحات میں بھی سپر نہ ڈالی۔ افراط و تفریط کے اس سیاسی سیلاب میں مولانا محمد شمس الدین اپنے عقیدے کی مضبوط چٹان پر، اپنے اکابر حضرت درخواستی مدظلہ، حضرت مولانا مفتی محمود مدظلہ اور حضرت مولانا عبیداللہ انور مدظلہ کے وفادار خادم کی حیثیت سے استقامت کے ساتھ کھڑے رہے۔ اور جیسا کہ اہل حق کے ساتھ ہوتا آیا ہے وہ اسی استقامت اور اسی عقیدے کے تحفظ اور دوام کی خاطر اپنی جان عزیز قربان کر گئے۔......

شہیدؒ کی سیٹ پر ضمنی انتخاب

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۷ امئی ۱۹۷۴ء)

قائدِ جمعیت علماء اسلام حضرت مولانا مفتی محمود نے کوئٹہ میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے خبردار کیا ہے کہ فورٹ سنڈیمن (ژوب) کے ضمنی الیکشن میں سرکاری مداخلت ترک نہ کی گئی تو یہ انتخابات منعقد نہیں ہو سکیں گے۔ ادھر جمعیت علماء اسلام بلوچستان کے جنرل سیکرٹری حاجی محمد زمان خان اچکزئی نے بھی انتباہ کیا ہے کہ انتخاب میں دھاندلیوں کا پوری قوت سے مقابلہ کیا جائے گا اور دھاندلیوں کے ذریعہ سرکاری امیدوار کو کامیاب بنانے کی کوشش کامیاب نہیں ہونے دی جائے گی۔

فورٹ سنڈیمن سے بلوچستان اسمبلی کی یہ سیٹ حضرت مولانا سید شمس الدینؒ کی شہادت سے خالی ہوئی ہے اور مولانا شہیدؒ کے والد محترم حضرت مولانا سید محمد زاہد صاحب مدظلہ اس سیٹ پر جمعیت علماء اسلام کی طرف سے انتخاب لڑ رہے ہیں۔ ابتداءً الیکشن کی تاریخ ۵ مئی مقرر ہوئی تھی لیکن بعد میں الیکشن کمیشن نے اچانک تاریخ تبدیل کر کے ۱۹ مئی مقرر کرنے کا اعلان کر دیا ہے۔

موجودہ حکومت کے دور میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے جس قدر ضمنی انتخابات ہوئے ہیں ان کے پیش نظر شروع سے ہی یہ توقع عبث دکھائی دیتی تھی کہ حکومت اس ضمنی انتخاب میں انصاف اور آئین کے تقاضوں کا پاس کرے گی۔ لائلپور، نارووال، کھاریاں، کوہاٹ، جیکب آباد، شیخوپورہ، لاہور، کوئٹہ اور دیگر مقامات کے ضمنی انتخابات میں جو کچھ ہوا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ حتیٰ کہ ان انتخابات میں ہونے والی کھلم کھلا دھاندلیوں کو دیکھتے ہوئے وزیراعظم بھٹو کے دوست اور ان کے سابق گورنر بلوچستان محمد اکبر خان بگٹی تک نے یہ کہہ دیا تھا کہ یہ الیکشن نہیں سلیکشن ہے۔ اور اب تو حکومت نے الیکشن میں التوا کا اعلان کر کے خود ہی عوام کے ذہنوں میں جنم لینے والے شکوک و شبہات کو تقویت دے دی ہے۔ خصوصاً حاجی محمد زمان خان اچکزئی کا حکومت پر یہ الزام نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ الیکشن کے التوا کے بعد سے ضلع ژوب کی انتظامیہ میں وسیع پیمانے پر ردوبدل کیا جا رہا ہے اور سرکاری ملازمین پی پی پی کے امیدوار کے حق میں کھلم کھلا کام کر رہے ہیں۔

دراصل موجودہ حکومت کی پالیسی ہی یہ ہے کہ اسمبلیوں کے اندر اور باہر اپوزیشن کی آواز کو جس طریقہ سے بھی ممکن ہو دبا دیا جائے تاکہ جلالۃ الملک "انا ولا غیری" کا کوس بجاتے ہوئے پاکستان میں جو چاہیں کر سکیں۔ قومی و صوبائی اسمبلیوں میں اسی مقصد کے لیے عوام کے منتخب نمائندوں کے ضمیروں کا وسیع پیمانے پر بیوپار ہوا۔ اور جس مردِ حق آگاہ نے اس بیوپار میں شریک ہونے سے انکار کیا اس کی سیٹ دوسرے ذرائع سے خالی کرا کے دھاندلی اور جبر کے راستے سے اپنا امیدوار کامیاب کرا لیا گیا۔

فورٹ سنڈیمن کا قصہ بھی کچھ اس سے مختلف نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوبائی اور وفاقی حکومت کے پورے وسائل اس ایک سیٹ کے حصول کے لیے وقف کر دیے گئے ہیں۔ وفاقی و صوبائی وزراء کی فوج ظفر موج فورٹ سنڈیمن جیسے دور دراز علاقے کو "قدوم میمنت لزوم" سے نواز رہی ہے، عوام سے جھوٹے سچے وعدے ہو رہے ہیں، مسائل حل کرنے کا مژدہ سنایا جا رہا ہے، سبز باغ دکھائے جا رہے ہیں، انتظامیہ جو الیکشن کے غیر جانبدارانہ انعقاد کی ذمہ دار ہوتی ہے خود ایک فریق کی حیثیت سے مصروفِ عمل ہے، اور حکومت یہ طے کر چکی ہے کہ اس نے یہ سیٹ بہر صورت و بہر قیمت حاصل کرنی ہے خواہ اس کے لیے کچھ بھی کرنا پڑے۔

ان حالات میں قائد جمعیت حضرت مولانا مفتی محمود کا یہ انتباہ بروقت اور ناگزیر ہے کہ اگر حکومت نے دھاندلی کے ذریعہ سرکاری امیدواروں کو کامیاب کرنے کی کوشش کی تو یہ انتخابات منعقد نہیں ہو سکیں گے۔ اس موقع پر ہم حکومت سے کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے، البتہ ضلع ژوب میں جمعیت علماء اسلام اور متحدہ جمہوری محاذ کے کارکنوں سے یہ ضرور کہیں گے کہ ان کا مثالی نظم ونسق، ناقابلِ شکست اتحاد، پُرخلوص جہد وعمل اور مضبوط قوتِ بازو ہی الیکشن میں سرکاری مداخلت کا صحیح توڑ ثابت ہو سکتی ہے، اس لیے قائدِ جمعیت کے ارشاد پر عمل کرتے ہوئے آگے بڑھیئے اور دھاندلی کے اس فسوں کو پاش پاش کر دیجئے تاکہ اس کے بعد اس راستہ سے کسی شخص کو عوامی نمائندگی غصب کرنے کی جرأت نہ ہو سکے۔

ذوالفقار علی بھٹو سے ملاقات کا قصہ

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۲۴ مارچ ۱۹۷۸ء)

...... مجھے شہید کا بتایا ہوا یہ واقعہ کبھی نہیں بھول سکتا کہ ذوالفقار علی بھٹو جیسے شاطر اور زیرک سیاستدان نے انہیں ملاقات کے لیے بلا کر انہیں اصول پرستی اور ایثار واخلاص کا واسطہ دیا اور کہا کہ آپ جیسے بااصول لوگ میرے ساتھ آجائیں تو میں ملک وقوم کے لیے بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ مگر اس جہاندیدہ سیاستدان کو ۲۹ سالہ نوآموز سیاسی کارکن نے یہ جواب دے کر خاموش کر دیا کہ

> ”بھٹو صاحب! کیا ہم اقتدار کے لیے نیشنل عوامی پارٹی کا ساتھ چھوڑ کر بھی بااصول رہیں گے؟“

سید شمس الدین شہیدؒ کی یہی بے خوفی اور جرأت وجسارت ظلم وجبر کے نظام کو نہیں بھائی اور بالآخر ۱۳ مارچ ۱۹۷۴ء کو جب وہ اپنی سرکاری گاڑی پر کوئٹہ سے فورٹ سنڈیمن جا رہے تھے، مبینہ طور پر ان کے رفیقِ سفر شاہ وزیر نے خل گئی کے مقام پر گولی مار کر انہیں شہید کر دیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ شہید کے المناک قتل پر وقت کے حکمرانوں نے کہا تھا کہ انہیں جمہوریت کے دشمنوں نے قتل کیا ہے اور قاتلوں کو بلا تاخیر کیفر کردار تک پہونچایا جائے گا۔ مگر قاتل ابھی تک قانون کی دسترس سے باہر ہے، تحقیقات کا عمل چار برس گزر جانے کے باوجود معطل ہے اور ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ حکومت ایک صوبائی اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر اور سیاسی جماعت کے صوبائی سربراہ کے مبینہ قاتل کو حراست میں نہیں لے سکی اور قتل کی سازش کا سراغ نہیں لگا سکی۔ شہید کے ورثاء نے عبوری حکومت کے سربراہ جنرل محمد ضیاء الحق سے بھی درخواست کی ہے کہ اس المناک قتل کے مقدمہ کو ازسرِنو انکوائری کی میز پر لایا جائے اور قاتلوں کو گرفتار

کرنے کے ساتھ ساتھ اس سازش کو بھی پوری طرح بے نقاب کیا جائے۔ امید ہے کہ عبوری حکومت اس سلسلے میں جلد کوئی موثر قدم اٹھائے گی۔

آزاد کشمیر کی سیاسی صورتحال

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۲۴ مئی ۱۹۷۴ء)

...... ۱۹۴۷ء کی تحریکِ آزادی کے نتیجہ میں تین اضلاع مظفر آباد پونچھ، اور میرپور پر مشتمل علاقہ میں ''آزاد ریاست جموں وکشمیر'' کی حکومت کا قیام عمل میں لایا گیا تھا اور مقبوضہ کشمیر کی کامل آزادی اس حکومت کا مقصدِ وحید قرار پایا تھا۔ قیامِ حکومت کے بعد سے اب تک متعدد جماعتیں برسرِاقتدار آچکی ہیں اور آزاد کشمیر کی قابلِ ذکر سیاسی جماعتیں مسندِ اقتدار پر فائز رہ چکی ہیں۔ لیکن تحریکِ آزادی کے سلسلہ میں ۱۹۴۷ء کے بعد سے اب تک ''ہنوز روزِ اول است'' والا قصہ ہے۔

تحریکِ آزادیٔ کشمیر سے صرفِ نظر

یہ درست ہے کہ آزاد کشمیر کی ریاستی سیاست کو پاکستانی سیاست سے الگ کر کے دیکھنا مناسب نہیں ہے۔ اور یہ بات بھی تسلیم ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد سے اب تک پاکستان میں جتنی حکومتیں برسرِاقتدار آئی ہیں، کشمیر کی آزادی کے لیے ان کی طرف سے کوئی مؤثر کوشش نہیں کی گئی۔ لیکن آزاد کشمیر کی سابق حکومتیں اور موجودہ حکومت ان مشکلات کے باوجود جذبۂ جہاد کو فروغ دینے، تحریکِ آزادی کو باقی رکھنے اور نئی پود کو ذہنی وعملی طور پر جہادِ آزادی کے لیے تیار کرنے کی خاطر جو کچھ کر سکتی تھی اور جو کچھ انہیں کرنا چاہیے تھا، آزاد کشمیر کی سرزمین میں اس کا بظاہر فقدان نظر آتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی کشمیری لیڈروں کی باہمی سیاسی کشمکش اور کردار پر نگاہ ڈالی جائے تو معاملہ اور زیادہ مایوس کن نظر آتا ہے۔

آزاد کشمیر کے سیاسی راہنماؤں اور جماعتوں نے ہمیشہ اپنے فکری وعملی وسائل کو تحریکِ آزادی کی نشوونما کی خاطر صرف کرنے کی بجائے تین اضلاع کی محدود اختیار والی حکومت کے حصول اور سیاسی اکھاڑ پچھاڑ میں صرف کیا ہے۔ آزاد حکومت کے قیام کے بعد سے اب تک چند ابتدائی ایام کی استثناء کے ساتھ آزاد کشمیر کی مجموعی صورتحال کا تجزیہ کیا جائے تو سوائے مایوسی کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ آزاد کشمیر کے سیاسی راہنما مجھے اس جسارت پر معاف فرمائیں مگر مجھے یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ انہوں نے آزادی کی تحریک کو عملی رنگ دینے کی کوئی متحدہ کوشش نہیں فرمائی اور وہ اب تک آزادیٔ کشمیر کے عظیم مقصد اور ریاستی اقتدار کی سیاست میں فرق ہی نہیں کر سکے۔ ورنہ اگر وہ پارٹی بازی کی سیاست سے بالاتر ہو کر تحریکِ آزادی کو جدید فکری وعملی

خطوط پر منظم کرتے اور اس عظیم مقصد میں باہمی سیاسی رقابت کے جذبات کو حائل نہ ہونے دیتے تو تمام تر مشکلات کے باوجود آج تحریکِ آزادی کی یہ صورت ہرگز نہ ہوتی جو اس وقت دکھائی دے رہی ہے۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ آزاد کشمیر کے سیاسی لیڈر تین اضلاع پر ذہنی لحاظ سے اکتفا کر چکے ہیں اور مقبوضہ کشمیر کی آزادی کو سیاسی نعرے کے طور پر استعمال کر کے تین اضلاع کی ریاست میں کرسیِ اقتدار کا حصول ان کا مقصدِ سیاست اور مقصدِ زندگی ہے۔ ورنہ وہ محض اقتدار کی جنگ کی خاطر تحریکِ آزادی کا یہ حشر ہوتا نہ دیکھ سکتے۔ اس وقت صورتحال یہ ہے کہ نعروں اور جذبات کی دنیا سے ہٹ کر اور پروپیگنڈا کے محاذ سے قطع نظر حقائق و عمل کی دنیا میں تحریکِ آزادی خود اپنے وجود کی تلاش میں ہے۔ ہمیں پاکستانی حکومتوں کی بے عملی بلکہ دوعملی سے بھی انکار نہیں، ہم جانتے ہیں کہ پاکستان کی مفاد پرست حکومتوں نے کشمیر کے مسئلہ کو سرد خانہ کی نذر کرنے کے لیے کیا کچھ کیا ہے۔ لیکن صرف اتنی سی بات سے آزاد کشمیر کے سیاست دان اپنی ذمہ داریوں سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔

مسئلہ کشمیر اور بھٹو صاحب

آج بھی حکومت پاکستان کی پالیسی کشمیر کے بارے میں دوعملی کی پالیسی ہے:

۱۔ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے آزاد کشمیر کے دورہ میں ایک طرف یہ بات کہہ کے آزاد کشمیر کے مظلوم عوام کے جذبات کو مٹھی میں لیا کہ وہ پورے کشمیر میں ہڑتال کی اپیل کر کے اس مسئلہ کو نئے سرے سے زندہ کریں گے،

۲۔ اور دوسری طرف آزاد کشمیر کو صوبہ بنانے کی بات چھیڑ کر نہ صرف عملاً اس مسئلہ کو ختم کرنے کی طرح ڈال دی بلکہ آزاد کشمیر کے عوام کو ایک نئی بحث میں الجھا کر اصل مقصد سے ان کی توجہ ہٹانے کی سعی کی۔

آزاد کشمیر کو صوبہ بنانے کی بات بڑی خوبصورتی سے کہی گئی ہے۔ اس بات کو لوگوں کے حلق سے اتارنے کے لیے دلائل کا لیبل لگایا جا رہا ہے اور "حقائق کو تسلیم کرنے" کے لیے آزاد کشمیر کے عوام کو بڑے منظم طریقے سے ذہنی طور پر تیار کیا جا رہا ہے۔ اگرچہ آزاد کشمیر کی سیاسی پارٹیاں رسمی طور پر اس تجویز کی مخالفت کر رہی ہیں، حتیٰ کہ پیپلز پارٹی کے بعض حلقوں نے بھی اس کے خلاف بیانات دیے ہیں، لیکن اس تجویز کو "حقوق و مفادات، سیاسی مراعات اور حقائق" کے ہتھیاروں کے ساتھ جس طرح مسلح کیا جا رہا ہے اس کے پیشِ نظر یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ آزاد کشمیر کے سیاسی حلقے اس کی مخالفت میں زیادہ دیر تک ثابت قدم رہ سکیں گے، یا یہ مخالفت کسی مرحلہ پر مزاحمت کا روپ دھار سکے گی۔ پھر الیکشن بھی قریب

آ رہے ہیں اور وزیراعظم بھٹو انتخابات سے قبل آزاد کشمیر کے سیاسی مستقبل کے بارے میں کچھ نہ کچھ فیصلہ کر دینا چاہتے ہیں۔ اگر یہ ''کچھ نہ کچھ'' ہو گیا تو پھر تحریکِ آزادی کے مستقبل کے بارے میں کچھ زیادہ سوچ بچار کی ضرورت باقی نہیں رہتی، معاملہ صاف ہو کر سامنے آ جاتا ہے۔

یہی حال ریاست میں اسلامی نظام کے نفاذ کا ہے، کم و بیش ہر حکومت نے ریاست میں اسلامی نظام کے نفاذ کا لوگوں سے وعدہ کیا لیکن مسندِ اقتدار کے حصول کے بعد یہ وعدے سیاسی وعدے ثابت ہوئے، نتیجہ آج بھی پاکستان کی طرح یہ ریاست اسلامی نظام کی برکات سے محروم ہے۔

علماء کشمیر کی سیاسی قوت

یہی وجہ ہے کہ آزاد کشمیر کے علماء کرام کی نمائندہ تنظیم جمعیت علماء آزاد کشمیر، جس نے ہر حکومت کے ساتھ تحریکِ آزادی اور اسلامی نظام کی خاطر مخلصانہ تعاون کیا ہے، اس کے زعماء اب کچھ مایوس سے دکھائی دیتے ہیں۔ اور حالات رفتہ رفتہ انہیں اس فیصلہ کے لیے مجبور کر رہے ہیں کہ وہ اپنا وزن دوسروں کے پلڑے میں ڈالنے کی بجائے اپنا سیاسی وجود تسلیم کرائیں اور دوسری سیاسی جماعتوں سے مطالبات کے چکر میں پڑنے کی بجائے خود اسمبلی میں پہنچ کر اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے عملی اقدامات کریں۔ جمعیت علماء آزاد کشمیر کے زعماء کی اس سوچ کی پشت پر ۲۵ سالہ ماضی کا تجربہ ہے اور وہ شاید اب اپنی راہ خود متعیّن کرنے ہی کا فیصلہ کریں گے۔

بہرحال اس سلسلہ میں یقینی بات قائد جمعیت علماء اسلام پاکستان حضرت مولانا مفتی محمود صاحب کے دورۂ کشمیر کے بعد ہی کہی جا سکتی ہے، البتہ اگر علماء نے یہ فیصلہ کر لیا تو انہیں آنے والے انتخابات میں اپنا سیاسی وجود منوانے کے لیے کچھ زیادہ دقت پیش نہیں آئے گی۔ عوام دوسروں کو اچھی طرح آزما چکے ہیں اور علماء پر ریاستی عوام کا بے پناہ اعتماد خصوصاً پونچھ کے علماء کی سیاسی و ملی خدمات ان کے شاندار سیاسی مستقبل کی غمازی کرتی ہیں۔

آئندہ انتخابات اور امکانات

سالِ رواں کے آخر میں ریاستی اسمبلی اور صدر ریاست کا انتخاب ہونا ہے۔ وزیراعظم بھٹو نے کشمیری لیڈروں کی جو کانفرنس طلب کر رکھی ہے اس میں یہ فیصلہ ہو گا کہ کیا آزاد کشمیر میں صدارتی نظام ہی رہنے دیا جائے یا پارلیمانی نظام رائج کیا جائے۔ نیز آزاد کشمیر کے سیاسی مستقبل کا کس طرح تعین کیا جائے۔ لیکن الیکشن خواہ پارلیمانی نظام کے تحت ہو یا صدارتی نظام کے تحت، بہرحال ہو گا ضرور۔ اور اس کے لیے مختلف سیاسی پارٹیاں میدان عمل میں کودنے کے لیے خم ٹھونک رہی ہیں۔ ریاستی سیاسی جماعتوں میں

۱. آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس جس کے صدر سردار محمد ابراہیم اور قائد سردار عبدالقیوم خان ہیں،
۲. آزاد مسلم کانفرنس جس کے صدر چوہدری نور حسین ہیں، اور
۳. لبریشن لیگ جس کے صدر کے ایچ خورشید خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔

ان کے علاوہ

- پاکستان پیپلز پارٹی بھی ریاست میں قائم ہو چکی ہے۔
- سنا ہے کہ جماعتِ اسلامی بھی بہت جلد ریاست میں اپنے وجود کا اعلان کرنے والی ہے۔
- اور جمعیت علماء آزاد جموں و کشمیر کے زعماء بھی الیکشن میں حصہ لینے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہے ہیں۔

ان حالات میں آئندہ انتخابات یقیناً معرکے کے الیکشن ہوں گے اور اس دفعہ اس میں ریاستی سیاست کی بجائے پاکستانی سیاست کے کارفرما ہونے کے امکانات زیادہ روشن نظر آتے ہیں۔ ویسے تو ریاستی سیاست کا زیادہ تر دارومدار قبائلی سسٹم پر ہے اور ریاستی جماعتیں منشور کی بنیاد پر کم اور برادری سسٹم کی بنیاد پر زیادہ ووٹ حاصل کرتی ہیں۔ لیکن اب شاید سیاسی افکار و خیالات بھی برادری سسٹم کے رجحانات کے ساتھ الیکشن کے عوامل میں شامل ہو جائیں۔ بہر حال اگر جمعیت علماء آزاد کشمیر نے اپنے طور پر یا جمعیت علماء اسلام پاکستان کے ساتھ الحاق کر کے جس صورت میں بھی انتخابات میں حصہ لینے کا اعلان کیا تو یہ آزاد کشمیر کی سیاست میں یقیناً ایک دھماکہ ہو گا جس کے نتائج وسیع اور دور رس ہوں گے۔......

بھارت کا ایٹمی دھماکہ!

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۲۴ مئی ۱۹۷۴ء)

انڈیا نے گزشتہ روز راجستھان کے صحراؤں میں پہلا ایٹمی دھماکہ کیا اور اس طرح امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس اور چین کے بعد ایٹمی طاقتوں کی فہرست میں چھٹے ملک کا اضافہ ہو گیا۔ بھارت کے اس ایٹمی دھماکے پر عالمی رائے عامہ کی طرف سے ملے جلے ردعمل کے اظہار کا سلسلہ جاری ہے۔

پاکستان اور دوسرے بہت سے ممالک نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس دھماکے سے ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے کی جانے والی کوششوں کو نقصان پہنچے گا۔ وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے یہ بھی کہا ہے کہ پاکستان بھارت کے اس اقدام سے مرعوب نہیں ہو گا۔

ایٹم اس دور میں قوت و توانائی کا محور شمار ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس قوت سے بہرہ ور ممالک ہی آج دنیا کے بڑے ممالک سمجھے جاتے ہیں اور عملاً دنیا کی قیادت انہی ممالک کے ہاتھ میں ہے۔ حتیٰ کہ اقوامِ عالم کے مابین عدل و انصاف کے سب سے بڑے علمبردار ادارہ اقوامِ متحدہ میں بھی ایٹمی قوتوں کو خصوصی اور امتیازی مراعات و اختیارات حاصل ہیں۔ ایٹم جہاں قوت و توانائی کا نشان ہے وہاں تباہی و بربادی کا بھی ایک خوفناک ذریعہ ہے۔ اور انتہائی افسوس کی بات ہے کہ تہذیب و امن کی نام نہاد پرچارک بڑی طاقتوں نے اس عظیم قوت کو انسانیت کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لیے استعمال کرنے کی بجائے تباہی اور بربادی کا ذریعہ بنانے کو ترجیح دی ہے۔ نتیجتاً ایٹمی ہتھیاروں کی آج اس قدر بہتات ہو چکی ہے کہ خود ایٹمی طاقتیں دوسری اقوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے بسا اوقات ایٹمی اسلحہ میں تخفیف کی بات کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

بڑی طاقتوں کے اسی دوہرے کردار کے باعث وہ ایٹم جو انسانی ترقی و فلاح میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے آج اس کا نام زبان پر آتے ہی تباہی و بربادی کے ہولناک تصورات ذہنوں میں لرزنے لگتے ہیں گویا ''ایٹم'' اور ''تباہی'' مترادف لفظ ہیں۔ اسی بنا پر بھارت کے اس دعوے کو عالمی رائے عامہ نے کوئی وقعت نہیں دی کہ وہ ایٹمی قوت کو پرامن مقاصد کے لیے استعمال کرے گا کیونکہ اس کی پیشرو ایٹمی قوتوں نے ''پرامن مقاصد'' کے حسین خول اور ''تخفیفِ اسلحہ'' کی خوبصورت اوٹ میں ہی انسان کی ہلاکت و خانماں بربادی کے سامان تیار کیے ہیں بلکہ دن رات ان ہتھیاروں کی تیاری کا سلسلہ جاری ہے۔

ایٹمی طاقتوں میں ایک اور کے اضافے سے عالمی سطح پر کیا تبدیلیاں رونما ہوں گی اور برصغیر میں کونسی اور حقیقتیں تسلیم کی میز پر رونمائی کے لیے تشریف فرما ہوں گے، اس کے بارے میں صورتحال جلد واضح ہو جائے گی۔ سرِدست ہم عالمِ اسلام کے قائدین کو اس طرف توجہ دلانا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ وہ بھی اپنے گردو پیش پر نگاہ ڈالیں اور بڑی طاقتوں کے مفادات سے الگ ہو کر کچھ دیر کے لیے اپنے سود و زیاں کی بابت سوچیں۔ آخر عالمِ اسلام کب تک بے یقینی کی اس دلدل میں پھنسا رہے گا؟ جہاں تک وسائل کا تعلق ہے عالمِ اسلام کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں، لیکن ان وسائل پر اغیار کا تسلط ہے اور مسلم ممالک اپنے وجود کی حفاظت تک کے لیے "دشمن" سے تحفظ کے حصول پر مجبور ہیں۔ عالمِ اسلام کے قائدین کو یہ باور کر لینا چاہیے کہ مسلم ممالک کا روشن مستقبل بڑی طاقتوں کے دامن سے وابستہ ہو کر سیاسی و دفاعی تحفظ کے حصول میں نہیں بلکہ اپنے تمام تر وسائل کو مجتمع کر کے صنعتی و دفاعی سائنس میں بڑی طاقتوں کے شانہ بشانہ آگے بڑھنے میں مضمر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اپنی استطاعت اور وسائل کی حد تک قوت فراہم کرو۔ اور آج کے دور میں قوت و طاقت کے بغیر کسی قوم کا باوقار طور پر زندہ رہنا ناممکن ہے۔ اس لیے ہم جس قدر جلد یہ راستہ اختیار کر لیں گے عالمِ اسلام کے لیے مفید اور یقین و اعتماد کا باعث ہو گا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے قائدین کو صحیح سمت چلنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یا الٰہ العالمین۔

قادیانی مسئلہ: وزیرِاعظم بھٹو کی تقریر پر مفتی محمود کے ارشادات

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۲۱ جون ۱۹۷۴ء)

کُل جماعتی تحفظِ ختمِ نبوت مجلسِ عمل کا اجلاس گزشتہ روز لائلپور میں حضرت مولانا محمد یوسف بنوری کی زیرِصدارت منعقد ہوا جس میں ملک کی تازہ ترین صورتحال اور وزیرِاعظم ذوالفقار علی بھٹو کی نشری تقریر پر غور و خوض کیا گیا۔ اجلاس کے اختتام پر جمعیت علماء اسلام کے قائد مولانا مفتی محمود نے اخباری کانفرنس میں مجلسِ عمل کے فیصلوں پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ:

- وزیرِاعظم بھٹو قادیانیوں کو غیرمسلم اقلیت قرار دینے اور اس سلسلہ میں سوادِاعظم کے دوسرے مطالبات تسلیم کرنے کے سلسلہ میں سنجیدہ نہیں ہیں، وہ اس مسئلہ کو اسلامی مشاورتی کونسل یا سپریم کورٹ کے سپرد کر کے سرد خانہ میں ڈالنا چاہتے ہیں۔
- مجلسِ عمل کے مطالبات بالکل واضح ہیں۔ قادیانیوں کو غیرمسلم اقلیت قرار دینے کے مسئلہ کو قانونی حیثیت دینے کے لیے قومی اسمبلی سے فیصلہ لینا ضروری ہے۔ لیکن وزیرِاعظم اپنے منصب کی حیثیت سے ربوہ کو کھلا شہر قرار دے سکتے ہیں، وہ حادثہ کے مرتکب افراد کے خلاف قانونی احکام اور مرزا ناصر کو گرفتار کرنے کا حکم دے سکتے ہیں، اور قادیانیوں کی "فرقان فورس" اور "خدامِ احمدیہ" کو خلافِ قانون قرار دے سکتے ہیں۔
- اگر بھٹو صاحب قادیانی مسئلہ اور قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کے بارے میں سنجیدہ ہوتے تو فوری طور پر اس کا اعلان کر سکتے تھے اور قومی اسمبلی کے بجٹ سیشن میں وقت نکال کر ایک ہی اجلاس میں فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔
- قومی اسمبلی میں قرارداد پیش کرنے کی تجویز کو ہم قبول نہیں کرتے، اس مسئلہ کو ایک بل کی صورت میں قومی اسمبلی میں لانا چاہیے۔ قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کا مسئلہ نزاعی معاملہ نہیں، گزشتہ جنوری میں پاکستان کے ۳۵ مقتدر راہنماؤں اور "رابطہ عالمِ اسلامی" نے اپنے اجلاسِ مکہ مکرمہ میں متفقہ طور پر مطالبہ کیا تھا کہ اس اجتماعی مسئلہ کو مسلمانانِ عالم کی خواہشات کے مطابق حل کیا جائے۔

- وزیراعظم کی تقریر جانبدارانہ ہے اور اس سے قوم مطمئن نہیں ہوئی۔ ظفراللہ خان اور مرزا ناصر نے اقوامِ متحدہ کے مبصروں کو پاکستان کے حالات کا جائزہ لینے کی دعوت دینے کی بات کر کے پاکستان سے غداری کی ہے۔

قائدِ جمعیت کے ارشادات کی روشنی میں مجلسِ عمل کا موقف بالکل واضح اور دوٹوک ہے۔ وزیراعظم بھٹو نے نشری تقریر میں اپنی مخصوص حکمتِ عملی سے کام لیتے ہوئے جس طرح اس مسئلہ کو کھٹائی میں ڈالنے کی سعی فرمائی ہے اس کے پیشِ نظر عوام کے دینی جذبات کے ساتھ ان کی ''دلچسپی'' بخوبی سمجھی جا سکتی ہے۔ بھٹو صاحب کی ہمیشہ سے یہی تکنیک رہی ہے کہ مسئلہ کو الفاظ کے گورکھ دھندے میں الجھا کر اصلی پہلو کو عوام کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا جائے۔ اس بار بھی بھٹو صاحب نے یہی کچھ کیا ہے، انہوں نے قومی اسمبلی، اسلامی نظریاتی کونسل اور سپریم کورٹ کے حوالہ سے اپنی ذمہ داریوں سے جان چھڑانے کی کوشش کی ہے۔ جبکہ یہ مسئلہ اب اس موڑ پر پہنچ چکا ہے کہ اس کے حل میں مزید تاخیر ملکی و قومی نقطۂ نظر سے مضرت رساں ثابت ہو سکتی ہے۔

اس لیے ہم وزیراعظم سے عرض کریں گے کہ اب اس سلسلہ میں تاخیر نہ فرمائیں اور عوامی جذبات و احساسات کا احترام کرتے ہوئے فوری طور پر مجلسِ عمل کے مطالبات تسلیم کرنے کا اعلان کر دیں۔

ولی خان، مسٹر بھٹو اور افغانستان

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور ــــ ۲۶ جولائی ۱۹۷۴ء)

وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو نے گزشتہ دنوں صوبہ سرحد کے شمالی علاقوں کا دورہ کرتے ہوئے اپنی تقاریر میں پاکستان کی سرحدوں پر افغانستان اور بھارت کی افواج کے اجتماع کے انکشاف کے ساتھ ساتھ قومی اسمبلی میں حزبِ اختلاف کے قائد جناب عبد الولی خان کے خلاف بھی غم و غصہ کا اظہار فرمایا ہے۔ اگرچہ اس سلسلہ میں انہوں نے کوئی نئی بات کرنے کی بجائے وہی باتیں دہرائی ہیں جو وہ اور ان کے پیشرو حکمران اس سے قبل متعدّد بار کہہ چکے ہیں، لیکن موجودہ ملکی و بین الاقوامی صورتحال کے پیشِ نظر بھٹو صاحب کی یہ نئی مہم اپنے ''مالہ وماعلیہ'' پر غور و خوض کی دعوت دیتی ہے۔

مسٹر عبد الولی خان کے نظریات و افکار پاکستان کے کسی شہری پر پوشیدہ نہیں، وہ ملکی اور بین الاقوامی سیاست میں ایک مخصوص نقطۂ نظر کے حامل سیاستدان ہیں جس کا اظہار وہ کئی بار کر چکے ہیں۔ اور شاید ولی خان کی سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ وہ زمانے کے ساتھ چلنے اور ہوا کا رخ بدلتا دیکھ کر اپنے موقف میں لچک پیدا کر لینے کی ''صلاحیت'' سے محروم ہیں، ورنہ آج صورتحال اس سے مختلف ہوتی جو دکھائی دے رہی ہے۔ ولی خان کے خلاف آج تک جتنی باتیں بھی کہی جاتی رہی ہیں ان کی تان دو باتوں پر آکر ٹوٹتی ہے:

۱. ایک یہ کہ ولی خان قیامِ پاکستان کے مخالف تھے،

۲. اور دوسری یہ کہ وہ افغانستان جاتے ہیں اور افغان حکمران سے ملتے ہیں۔

جہاں تک قیامِ پاکستان کی مخالفت کا تعلق ہے، یہ کوئی جرم نہیں۔ ملتِ اسلامیہ کے ایک باشعور حلقے نے دلائل کی بنیاد پر دیانتداری کے ساتھ قیامِ پاکستان کی مخالفت کی تھی اور قیامِ پاکستان کی صورت میں کچھ خدشات کا اظہار کیا تھا۔ اس بات سے قطع نظر کہ اس حلقے نے جو خدشات پیش کیے تھے وہ غلط ثابت ہوئے یا صحیح، قیامِ پاکستان کے بعد اس حلقے نے ملکی سالمیت کے تحفظ اور پاکستان کی فلاح و بہبود کے لیے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اور اس حقیقت کو جھٹلانے کی کوئی جرأت نہیں کر سکتا کہ ۱۹۷۱ء میں جب سالمیت پاکستان کے بعض نام نہاد ٹھیکیداروں کی سرگرمیاں پاکستان کو دولخت کرنے کا موجب بن رہی تھیں، قیامِ پاکستان کی مخالفت کرنے والے حلقہ کے دو ممتاز راہنما مولانا مفتی محمود اور خان عبد الولی خان ڈھاکہ میں ملک کے دونوں حصوں کے درمیان غلط فہمیوں کو دور کرنے اور تقسیمِ ملک کو روکنے کی کوششوں میں

مصروف تھے۔ اور آج بھی دونوں راہنما دوسرے سیاسی قائدین کے شانہ بشانہ ملک میں جمہوری عمل کی بحالی اور سالمیتِ پاکستان کے تحفظ کی خاطر سرگرمِ عمل ہیں۔

باقی رہی افغانستان کی بات تو اس سلسلہ میں ہماری دیانتدارانہ رائے یہ ہے کہ مسٹر ولی خان کے موقف کو کُلی طور پر نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ خان موصوف نے گزشتہ روز اسلام آباد میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

- وہ محبِ وطن ہیں اور ان کی حبِ وطنی ملک کے کسی بھی بڑے شخص سے زیادہ مضبوط ہے۔
- وہ چاہتے ہیں کہ افغانستان اور پاکستان کے درمیان کشیدگی ختم ہو اور دونوں مسلم پڑوسی ممالک بھائیوں کی طرح امن وآشتی کے ساتھ رہیں۔
- مسٹر بھٹو نے نئی مہم ملک کے داخلی مسائل سے عوام کی توجہ ہٹانے کے لیے شروع کی ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ولی خان کا یہ موقف ٹھنڈے دل سے غور وخوض کا طالب ہے۔ اولاً اس لیے کہ یہ دو مسلم پڑوسی ممالک کا معاملہ ہے اور اس سلسلے میں جو شخص یا حلقہ بھی صلح وامن کی بات کرے گا، ہم اس کا خیر مقدم کریں گے۔ ثانیاً اس لیے کہ ہمارے خیال میں افغانستان اور پاکستان کے درمیان پائی جانے والی کشیدگی کے عوامل اور اس سلسلہ میں پاکستان کے پہلے وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خان اور صوبہ سرحد کے بعض اقتدار پسند سیاستدانوں کے طرزِ عمل کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اس لیے خدانخواستہ افغانستان کی افواج بقول بھٹو صاحب پاک سرحدوں کی طرف بڑھ رہی ہیں تو بھی حکومتِ پاکستان کو صلح وامن کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتے ہوئے کشیدگی کو کم کرنے کی سعی کرنی چاہیے۔ اس سلسلہ میں مسلم برادری اور اسلامی سیکرٹریٹ سے بھی رجوع کیا جا سکتا ہے۔ آخر مسلم برادری اگر بھٹو اور مجیب کو ایک میز پر بیٹھنے پر آمادہ کر سکتی ہے تو داؤد اور بھٹو کو ایک اسٹیج پر لانا اس کے لیے کون سا مشکل امر ہے؟

اسی طرح ولی خان کے بار بار افغانستان جانے کے بارے میں بھی بھٹو صاحب کو معقول اور سنجیدہ موقف اختیار کرنا چاہیے۔ سوال یہ ہے کہ اگر ولی خان کا بیرون ملک جانا ملک کے لیے نقصان دہ ہے تو انہیں حکومت پاکستان باہر جانے کی اجازت کیوں دیتی ہے؟ ولی خان جب بھی ملک سے باہر گئے، حکومت کی اجازت سے گئے۔ اب اگر حکومت کو ان کی سرگرمیوں پر اعتراض ہے تو بیان بازی کی بجائے سنجیدگی کے ساتھ اس کا نوٹس لیا جائے اور عدالت کی میز پر ان کے خلاف الزامات کا ثبوت مہیا کر کے آئندہ کے لیے اس صورتحال کا سدباب کر دیا جائے۔ ورنہ اس تاثر کو رد نہیں کیا جا سکتا کہ بھٹو صاحب بھی اپنے پیشرو

حکمرانوں کی طرح سیاسی مخالفین کو کچلنے کے لیے غدار، وطن دشمن اور غیر ملکی ایجنٹ جیسے مہمل اور مفہوم و معانی سے عاری الفاظ کا سہارا لے رہے ہیں۔

بھٹو صاحب کی طرف سے
آزاد کشمیر کو پاکستان کا صوبہ بنانے کی تجویز

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۲۶ جولائی ۱۹۷۴ء)

وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی طرف سے آزاد کشمیر کو پاکستان کا صوبہ بنانے کی تجویز پر جمعیت علماء اسلام کے قائد مولانا مفتی محمود نے قوم کو خبر دار کیا تھا کہ اس سے مسئلہ کشمیر کے بارے میں پاکستان کے موقف کو نقصان پہنچے گا اور یہ تجویز عملاً مسئلہ کشمیر کو دفن کر دینے کے مترادف ہے۔ چنانچہ بھٹو صاحب نے آزاد کشمیر کو صوبہ بنانے سے تو اجتناب کیا لیکن آزاد کشمیر میں پارلیمانی نظام اور ''بالاتر کشمیر کونسل'' پر مشتمل نیا آئینی فارمولا پیش کر کے مذکورہ مقاصد کے لیے نئی راہ اختیار کر لی۔ اس فارمولے کے نتائج و ثمرات رفتہ رفتہ واضح ہوتے جا رہے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ آزاد کشمیر کی بڑی سیاسی جماعتوں مثلاً مسلم کانفرنس اور جمعیت علماء آزاد کشمیر نے اسے مسترد کر دیا ہے، اور سردار محمد عبد القیوم خان بھی اس پر دستخط کرنے کے بعد ''سجدہ سہو'' کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

ادھر مقبوضہ کشمیر میں ''کشمیر کونسل'' کے اس فارمولے کے بہانے بعض حلقوں نے بھارت کے ساتھ کشمیر کے باقاعدہ الحاق کی تحریک کو تیز تر کر دیا ہے۔ اور اس طرح کشمیریوں کا حقِ خود ارادیت دونوں طرف سے بعض افراد کی سیاسی اغراض کا شکار ہوا چاہتا ہے۔

ہم حکومتِ پاکستان سے مطالبہ کرتے ہیں کہ نئے آئینی فارمولے کو واپس لے کر آزاد کشمیر کی سابقہ آزاد حیثیت کو بحال رکھا جائے اور پوری ریاست جموں و کشمیر کے عوام کو آزادانہ رائے کے ساتھ اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا انسانی و جمہوری حق دلوانے کے لیے اپنی جدوجہد کو مؤثر اور تیز تر کر دیا جائے۔

سقوطِ مشرقی پاکستان کے ذمہ دار جنرل یحییٰ خان کی رہائی!

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۲۶ جولائی ۱۹۷۴ء)

وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو صوبہ سرحد کے شمالی علاقوں میں خان عبد الولی خان پر الزامات کے تیر برسانے میں مصروف تھے کہ وزیر داخلہ مسٹر عبد القیوم خان نے قومی اسمبلی میں اعلان کر دیا کہ سابق صدر یحییٰ خان اب حکومت کی حراست میں نہیں ہیں۔

یحییٰ خان نے ایوب خان کے دستبردار ہونے پر پاکستان کا نظم ونسق سنبھالا تھا اور سقوطِ مشرقی پاکستان کے المناک سانحہ پر ان کے اقتدار کا سروج غروب ہو گیا تھا۔ ان کے دورِ اقتدار میں ملک اپنی تاریخ کے سب سے بڑے بحران کا شکار ہوا۔ پاکستان دولخت ہو گیا، نوے ہزار فوجی دشمن کی قید میں چلے گئے، اور مغربی پاکستان کے محاذ پر بھی بہت بڑے علاقے پر دشمن نے قبضہ کر لیا۔ یحییٰ خان اگرچہ اس دور میں ملک کے بلاشرکت غیرے حکمران رہے لیکن عوامی حلقوں کا یہ تاثر ہے کہ اس کاروائی میں ان کے ساتھ کچھ سیاسی چہرے بھی شریک ہیں اور تن تنہا اتنا کام کر لینا ان کے بس کی بات نہ تھی۔

یہی وجہ ہے کہ قومی حلقے یہ مطالبہ کرتے چلے آرہے ہیں کہ یحییٰ خان پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے تاکہ عوام کو یہ معلوم ہو سکے کہ اس جرمِ عظیم میں ان کے ساتھ کون کون شریک ہے، لیکن ابھی تک اس عوامی مطالبہ کو پذیرائی حاصل نہیں ہو سکی۔ اور اب حکومت کی طرف سے یحییٰ خان پر مقدمہ چلانے کے عوامی مطالبہ کا یہ جواب عوام کے خدشات میں یقیناً اضافہ اور تقویت کا باعث بنے گا۔ حیرت کی بات ہے کہ سقوطِ ڈھاکہ کا ذمہ دار یحییٰ خان حراست سے نجات پا چکا ہے اور آخر وقت تک ملک کو متحد رکھنے کی کوشش کرنے والا ولی خان غداری کے فتووں کی زد میں ہے۔

ع جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

جناب وزیر اعظم! تشدد سے مسئلہ حل نہیں ہو گا

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۹ اگست ۱۹۷۴ء)

وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو نے کوئٹہ میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ قادیانی مسئلہ کے حل میں تاخیر ملک و قوم کے مفاد میں نہیں ہے اس لیے میں قومی اسمبلی کے ارکان سے کہوں گا کہ وہ سات ستمبر تک اس مسئلہ کا کوئی حل طے کر لیں۔

اس بات سے قطع نظر کہ ۷ ستمبر تک مہلت بھی تاخیر کے زمرے میں آتی ہے یا نہیں، ہمیں بھٹو صاحب کے اس ارشاد سے سو فیصد اتفاق ہے کہ اس مسئلہ کے حل میں تاخیر ملک و قوم کے مفاد میں نہیں ہے۔ اسی لیے مجلسِ عمل کے راہنما یہ مطالبہ کرتے چلے آرہے ہیں کہ قوم کے دینی و ملی جذبات سے گہری وابستگی رکھنے والا یہ نازک مسئلہ بلا تاخیر عوامی خواہشات کے مطابق حل کر دیا جائے۔ اور ملک و قوم کے اسی مفاد کے پیشِ نظر مجلسِ عمل کے قائدین اپنے آئینی و جمہوری مطالبات منوانے کے لیے پر امن جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہیں۔

جہاں تک تحریک کو آئین و قانون کے دائرہ میں پر امن طور پر جاری رکھنے کا تعلق ہے، ہم مجلسِ عمل کے راہنماؤں کو خراج تحسین پیش کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ انہوں نے انتہائی اشتعال انگیز کارروائیوں کے جواب میں صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا اور جدوجہد کو تشدد اور لاقانونیت کی راہ پر ڈالنے کی ہر سازش کو ناکام بنا دیا۔ لیکن اب یوں محسوس ہو رہا ہے کہ شاید صبر و تحمل کا یکطرفہ ٹریفک زیادہ دیر تک نہ چل سکے۔ پر امن جدوجہد کے قائدین اور کارکنوں کے خلاف تشدد کے مسلسل واقعات، اور ایک فریق کی طرف سے پے در پے اشتعال انگیز حرکات کا سلسلہ اس قدر وسیع ہو چکا ہے کہ اب مجلسِ عمل کے راہنماؤں کو شاید سنجیدگی کے ساتھ اس کا نوٹس لینا پڑے۔ صورتحال یہ ہے کہ:

- ریڈیو، ٹی وی اور پریس سے تحریک کے خلاف مسلسل پروپیگنڈا جاری ہے۔
- اخبارات پر سنسر لگا کر تحریک کی خبروں کو روک دیا گیا ہے۔
- مساجد کے اندر مجلسِ عمل کے پر امن اجتماعات کو بھی قدغنوں کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔
- علماء کرام، طلبہ اور کارکنوں کی گرفتاریوں کا سلسلہ دن بدن وسیع ہوتا جا رہا ہے۔
- دفعہ ۱۴۴، ڈی پی آر اور تحفظِ امنِ عامہ کے قوانین کا اندھا دھند استعمال جاری ہے۔

- سرگودھا، اوکاڑہ، شاہ کوٹ، کبیر والا، کھاریاں اور متعدّد دیگر مقامات پر پولیس حکام کو تحریک کے کارکنوں پر وحشیانہ تشدد جلتی پر تیل کا کام کر رہا ہے۔
- مجلسِ عمل میں شامل دینی و سیاسی جماعتوں اور قائدین کے خلاف وزیرِاعظم سمیت حکمران پارٹی کے بیشتر اعلیٰ ارکان غیر ذمہ دارانہ تقاریر کر رہے ہیں۔
- سرگودھا، سانگلہ ہل اور کیمل پور وغیرہ میں مجلسِ عمل کے ارکان اور راہنماؤں کے مکانات اور اجتماعات میں شیل پھینکے گئے ہیں۔
- ایک فاشسٹ گروہ تحریک کے کارکنوں کو دھمکی آمیز خطوط لکھ کر صورتحال کو خراب کر رہا ہے۔
- اوکاڑہ، تر گڑی ضلع گوجرانوالہ، چنیوٹ اور بعض دیگر جگہوں میں مسلمانوں پر قاتلانہ حملے کیے گئے ہیں اور ان کی دکانیں نذرِ آتش کر دی گئی ہیں۔

ان حالات میں یہ کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ مجلسِ عمل کے راہنما اس تحریک کے گرد اَمن و امان کا حصار قائم رکھنے میں زیادہ دیر تک کامیاب رہ سکیں گے؟ اس لیے ہم حکومت سے یہی گزارش کریں گے کہ وہ ملک و قوم کے مفاد کے پیشِ نظر اس مسئلہ کو کسی تاخیر کے بغیر عوامی امنگوں کے مطابق حل کر دے اور اپنے وسائل اور توانائی کو تحریک کی راہ میں مزاحم بنا کر ملک کے حالات کو بے یقینی کے اندھے غار میں دھکیلنے کی بجائے تمام تر توجہات اس مسئلہ کو حل کرنے میں صَرف کر دے، تاکہ یہ مسئلہ جلد حل ہو کر قوم کے اطمینان کا باعث بن سکے۔

۱۹۷۱ء کے ہنگامی حالات، آخر کب تک؟

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۳۰ اگست ۱۹۷۴ء)

پارلیمنٹ نے گزشتہ روز مشترکہ اجلاس میں حزبِ اختلاف کے واک آؤٹ کے بعد ہنگامی حالات میں مزید چھ ماہ کی توسیع کی قرارداد منظور کر لی۔ اس سے قبل قائد حزبِ اختلاف خان عبد الولی خان نے قرارداد کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ ہنگامی حالات کو باقی رکھنے کا اقدام عوام کے ساتھ سخت ناانصافی ہے۔ خان صاحب نے کہا کہ ۱۹۷۱ء میں پاک بھارت جنگ کی بنا پر ملک میں ہنگامی صورتحال کا اعلان ہوا تھا اور یہ صورتحال اب تک برقرار رکھی جا رہی ہے، حالانکہ حکومت نے بھارت کے ساتھ ''شملہ معاہدہ'' کے تحت حالات کو معمول پر لانے کی راہ اختیار کر لی ہے اور اب ۱۲ دسمبر سے بھارت کے ساتھ بات چیت کا آغاز کر رہی ہے۔ خان عبد الولی خان نے کہا کہ بھارت کے ساتھ تعلقات کی استواری کا آغاز کرنے کے بعد ہنگامی حالات کو برقرار رکھنے کا کوئی جواز نہیں۔ قائدِ حزبِ اختلاف نے حکومت کی غیر جمہوری پالیسیوں پر کڑی نکتہ چینی کے بعد اعلان کیا کہ حزبِ اختلاف ہنگامی حالات میں مزید توسیع میں حصہ دار بننے کے لیے تیار نہیں۔ اس کے بعد خان عبد الولی خان کے ساتھ حزبِ اختلاف کے تمام ارکان ایوان سے واک آؤٹ کر گئے۔

ہنگامی حالات دراصل ۱۹۷۱ء میں پاک بھارت جنگ کے سلسلہ میں نافذ کیے گئے تھے اور اس وقت سے اب تک بدستور چلے آرہے ہیں، حالانکہ اب وہ صورتحال باقی نہیں رہی جس کے تحت ہنگامی حالات کا نفاذ ضروری سمجھا گیا تھا۔ بھارت کے ساتھ شملہ معاہدہ کے بعد حالات کافی حد تک تبدیل ہو چکے ہیں اور تعلقات کو معمول پر لانے کے لیے بھٹو حکومت ۱۲ ستمبر سے انڈیا گورنمنٹ کے ساتھ پھر سے مذاکرات شروع کر رہی ہے۔ اس لیے ہنگامی حالات کو مزید جاری رکھنے کی غرض سے سابقہ وجوہات کو بنیاد بنانے کا کوئی جواز نہیں۔ سالِ رواں کے آغاز پر جب ہنگامی حالات کی مدت میں چھ ماہ کی توسیع کی گئی تھی، وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے وعدہ کیا تھا کہ اس توسیع کے بعد ہنگامی حالت کی مدت میں مزید اضافہ نہیں کیا جائے گا، لیکن اب چھ ماہ کے لیے ہنگامی حالات کی مدت اور بڑھا دی گئی ہے۔

اس سلسلہ میں حزبِ اختلاف کے اس الزام کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ بھٹو حکومت نے ہنگامی حالات کے تحت حاصل شدہ اختیارات کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے اور انہی مقاصد کے لیے ایمرجنسی کی عمر میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ عملاً جو کچھ ہوا ہے اس کے پیشِ نظر یہ بات پورے وثوق کے

ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اِکادُ کا واقعات کو چھوڑ کر اب تک ہنگامی قوانین مثلاً ڈیفنس آف پاکستان رولز وغیرہ کا بیشتر استعمال اپوزیشن کے راہنماؤں اور کارکنوں کے خلاف ہوا ہے۔ اور اب بھی یہ قوانین تحریکِ ختمِ نبوت اور متحدہ جمہوری محاذ کے کارکنوں کے خلاف استعمال کیے جا رہے ہیں۔ اس وقت متعدّد سیاسی و دینی کارکن ڈی پی او (ڈیفنس آف پاکستان آرڈیننس ۱۹۷۱ء) کے تحت جیلوں میں بند ہیں اور ہنگامی قوانین کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا رجحان بدستور اضافہ پذیر ہے۔

اس لیے ہم حزبِ اختلاف کے اس موقف پر صاد کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہنگامی حالات کو باقی رکھنے کا کوئی جواز نہیں ہے اور بھٹو حکومت اپنے اقتدار کو تحفظ دینے اور اپوزیشن کو کچلنے کے لیے ہنگامی حالات کا سلسلہ دراز کر رہی ہے۔

آخر میں ہم اربابِ اقتدار سے یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ آپ آخر کب تک ڈی پی او، دفعہ ۱۴۴ اور امتناعی قوانین کی بیساکھیوں کے سہارے چلتے رہیں گے؟ آپ عوام کے منتخب نمائندے ہیں اور جمہوری عمل کے راستے سے آئے ہیں، اس لیے جمہوری عمل بحال کر کے جمہوری طریقوں سے اپوزیشن کا سامنا کیجئے۔ جمہوری عمل کے تعطل نے ہی تیرہ کروڑ مسلمانوں کے پاکستان کو دولخت کر دیا تھا اور اب پھر یہ تعطل دھیرے دھیرے منطقی نتائج کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس لیے اگر آپ حضرات نے جمہوری ذرائع سے عوام کو اعتماد میں لینے کا راستہ اختیار نہ کیا تو حالات جو رخ بھی اختیار کریں گے آپ حضرات اس کی ذمہ داری سے دامن نہیں چھڑا سکیں گے۔

پاکستان، امریکی مفاد کی کڑی؟

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۴ا کتوبر ۱۹۷۴ء)

برطانیہ کے اخبار ''ایوننگ اسٹینڈرڈ'' کی ایک اطلاع کے مطابق اب اس بات کا امکان پیدا ہو گیا ہے کہ امریکہ پاکستان کی فوجی امداد بحال کر دے گا۔ اخبار کے مطابق امریکی وزیر خارجہ مسٹر ہنری کیسنجر نے رائے ظاہر کی ہے کہ ''پاکستان مشرق وسطیٰ میں بڑھتے ہوئے امریکی مفاد کی اہم کڑی ہے''۔ اور ان کے خیال میں اس علاقے میں پاکستان اور ایران ہی دو ایسے ملک ہیں جن پر امریکہ تکیہ کر رہا ہے۔

جہاں تک امریکہ کی فوجی امداد کی بحالی کا تعلق ہے، اگر امریکہ پاکستان کی امداد بحال کر دے تو اس سے پاکستان کو دفاعی ضروریات پوری کرنے اور برصغیر میں طاقت کا توازن برقرار رکھنے میں یقیناً مدد ملے گی۔ لیکن اس امداد کے پس منظر میں ڈاکٹر کیسنجر کے ریمارکس کے پیشِ نظر ہم اس خدشہ کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ شاید ایک بار پھر پاکستان کی خارجہ پالیسیوں کے گرد استعماری زنجیروں کا حلقہ تنگ کیا جا رہا ہے اور امریکہ کی طرف سے فوجی امداد کی یہ بحالی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

ہم نے ابتدا ہی سے اس واضح اور دوٹوک رائے کا اظہار کیا ہے کہ پاکستان کو بین الاقوامی سیاست میں کسی بھی بلاک سے وابستہ ہوئے بغیر انصاف کے ملی تقاضوں اور قومی مفادات کی بنیاد پر اپنی پالیسیوں کو ترتیب دینا چاہیے۔ پاکستان کا مقام یہ نہیں کہ وہ علاقہ میں کسی بڑی طاقت کے مفادات کی اہم کڑی ثابت ہو، بلکہ یہ ہے کہ وہ اسلامی برادری کو ایک پلیٹ فارم پر منظم کرتے ہوئے عالمِ اسلام کے بے پناہ وسائل، توانائی اور افرادی قوت کو مجتمع کرے اور اس طرح دنیائے اسلام کو مفاد پرست طاقتوں کی خود غرضی کا شکار ہونے سے بچائے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر پاکستان میں سادگی اور کفایت شعاری کے اسلامی اصولوں پر اقتصادی منصوبہ بندی کر کے ہم اپنے اور عالمِ اسلام کے وسائل کو ملتِ اسلامیہ کی سربلندی اور دفاعی ضروریات کے لیے استعمال میں لائیں تو ہمیں اپنی اقتصادی اور دفاعی ضروریات کے لیے کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔

عالمِ اسلام کے ساتھ استعماری قوتوں کا رویہ ہمیشہ معاندانہ رہا ہے۔ خصوصاً امریکی سامراج نے تو ہر مشکل موقع پر مسلم قوم کو زک پہنچائی ہے۔ مشرق وسطیٰ میں اسرائیل نوازی، پاکستان کے ساتھ فوجی معاہدوں کے باوجود مشکل مواقع پر پاکستان کا ساتھ نہ دینا، اور اب قبرص کی جنگ کے موقع پر قریب ترین حلیف ترکی کی فوجی امداد بند کر دینے کے بارے میں امریکی کانگرس کا غور و خوض اس امر کا غماز ہے کہ بین

الاقوامی استعماری قوتیں قدم قدم پر عالمِ اسلام کے لیے مشکلات پیدا کر کے مسلم ممالک کو ہمیشہ کے لیے اپنی سیاسی اغراض کے شکنجے میں جکڑے رکھنا چاہتی ہیں۔

اس لیے ہم پاکستان کے قومی حلقوں سے گزارش کریں گے کہ وہ اس نئی صورتحال پر سنجیدگی سے توجہ دیں اور قومی سطح پر اس امر کی سعی کریں کہ پاکستان بین الاقوامی سیاست میں بڑی طاقتوں کے مفادات کی کڑی ثابت ہونے کی بجائے ایسی پالیسی پر گامزن ہو جس سے وہ عالمِ اسلام کے اتحاد اور ملتِ اسلامیہ کی سربلندی کی خاطر اپنا کردار ادا کر سکے۔

پارلیمنٹ کا فیصلہ اور قادیانیوں کے عزائم

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۴ء)

قادیانیت کے سلسلہ میں پارلیمنٹ کے فیصلہ کو ایک ماہ گزر چکا ہے لیکن ابھی تک نہ تو اس فیصلہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ضروری اقدامات کا آغاز ہوا ہے اور نہ ہی قادیانی گروہ نے اس فیصلہ کو تسلیم کرنے کا اعلان کیا ہے۔ مرزا ناصر احمد نے گزشتہ دنوں ربوہ میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے آئین میں واضح ممانعت کے باوجود اپنے دادا کی نبوت کا پرچار جاری رکھنے کا عزم ظاہر کیا ہے اور ''خدا کی بشارتوں'' کے حوالے سے کہا ہے کہ میں جنوری تک اس فیصلہ کے بارے میں کوئی ردعمل ظاہر نہیں کروں گا۔

اس کے ساتھ ہی ملک میں قادیانیوں کی جارحانہ سرگرمیاں پہلے سے تیز ہوگئی ہیں۔ ایک اطلاع کے مطابق ۱۳ اکتوبر کو کنری سندھ میں قادیانیوں نے مسلمانوں پر مسلح حملہ کر کے ۱۶ مسلمانوں کو زخمی کر دیا۔ اسی طرح سرگودھا میں مجلسِ عمل کے جنرل سیکرٹری راؤ عبد المنان پر قاتلانہ حملہ ہوا اور ضلع گوجرانوالہ کے مقامات ماچھی دولو والی اور تتلے عالی میں قادیانیوں کی اشتعال انگیز حرکات کے علاوہ وزیر آباد میں مولانا محمد رمضان مرحوم کے جنازہ کے موقع پر ایک قادیانی کے ہاتھ میں دستی بم کا پھٹنا بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ قادیانی گروہ اور اس کے ہمنواؤں نے مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے مابین اختلافات کو ہوا دے کر ملی اتحاد کو سبوتاژ کرنے کا بھی پروگرام بنایا ہے اور اس مقصد کے لیے انہوں نے تین لاکھ روپے مخصوص کر دیے ہیں۔

اس صورتحال کے پیشِ نظر یہ بات واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہے کہ قادیانی گروہ نے پارلیمنٹ کے متفقہ فیصلہ کو قبول کرنے کی بجائے اسے غیر مؤثر بنانے کا تہیہ کر لیا ہے اور انہیں جنوری تک حالات میں کوئی نمایاں تبدیلی پیدا ہونے کی توقع ہو چکی ہے۔ اور شاید اسی توقع کو یقین کے درجہ تک پہنچانے کے لیے انہوں نے ملک میں افراتفری اور فرقہ وارانہ فسادات بپا کرنے کے پروگرام پر عملدرآمد شروع کر دیا ہے۔

اس لیے ہم حکومتِ پاکستان اور مرکزی مجلسِ عملِ تحفظِ ختمِ نبوت پاکستان کی خدمت میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ اس صورتحال کا گہری توجہ اور سنجیدگی کے ساتھ نوٹس لیں۔ حکومت کو پارلیمنٹ کے فیصلہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے عملی اقدامات کا آغاز کر دینا چاہیے اور قادیانیوں کو جارحیت سے باز رکھنے کے لیے یہ انتہائی ضروری ہے کہ فوری اقدام کے طور پر ان کی تمام نیم فوجی تنظیموں فرقان فورس اور

خدام الاحمدیہ وغیرہ کو خلاف قانون قرار دے کر ان کا اسلحہ ضبط کیا جائے اور اس کے ساتھ آئین میں ترمیم کے عملی تقاضوں کو جلد از جلد پورا کیا جائے۔

مرکزی مجلسِ عملِ تحفظِ ختمِ نبوت پاکستان کے اربابِ حل و عقد سے گزارش ہے کہ وہ اپنی صفوں میں اتحاد و یکجہتی برقرار رکھنے کا اہتمام کریں، ابھی انہوں نے بہت سے کام کرنے ہیں۔ قادیانیت کے بارے میں پارلیمنٹ کے فیصلہ پر عملدرآمد کی نگرانی کے بعد بھی اسلام کے عادلانہ نظام کے قیام اور اصلاح معاشرہ کی منزل ابھی بہت آگے ہے۔ اور یہ منزل اسی اتحاد، رواداری اور معاونت کے جذبہ سے کام لے کر ہی حاصل کی جا سکتی ہے جس کے تحت قادیانیت کا مسئلہ اپنے منطقی انجام کو پہنچا ہے۔ مجلسِ عمل کے راہنماؤں کو ان افراد کی سرگرمیوں پر کڑی توجہ رکھنی چاہیے جو اس موقع پر باہمی اختلافات کو ہوا دے کر پارلیمنٹ کے فیصلہ کو غیر مؤثر بنانے کے قادیانی پروگرام کو تقویت پہنچانا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسے ملت فروش عناصر کو غائب و غاصر فرمائیں، آمین یا الٰہ العالمین۔

جداگانہ شیعہ تعلیمی نصاب کے مطالبہ کی منظوری

(روزنامہ اسلام، لاہور — ۱۰ دسمبر ۲۰۱۵ء)

......اہلِ تشیع کی طرف سے قومی معاملات میں اپنے جداگانہ تشخص و امتیاز کی تحریک نے زور پکڑا تو ان کے مطالبات میں ایک بات یہ بھی تھی کہ سکولوں اور سرکاری تعلیمی اداروں میں ان کے لیے دینیات کا الگ نصاب رائج کیا جائے اور انہیں اہلِ سنت کے اکثریتی احکام و عقائد کی تعلیم حاصل کرنے سے مستثنیٰ رکھا جائے۔ یہ قصہ ۱۹۷۴ء کے لگ بھگ کا ہے، ملک میں پیپلز پارٹی کی حکومت تھی اور ذوالفقار علی بھٹو مرحوم وزیراعظم تھے۔ اہلِ تشیع کے مطالبے پر ان کے لیے جداگانہ تعلیمی نصاب رائج کرنے کا حکومتی سطح پر فیصلہ ہوا تو اس حوالہ سے تنظیم اہلِ سنت پاکستان کے راہنماؤں میں اختلاف رائے ہو گیا۔ حضرت مولانا سید نور الحسن شاہ بخاریؒ، حضرت مولانا محمد ضیاء القاسمیؒ اور ان کے رفقاء کا موقف اس فیصلے کو قبول کر لینے کا تھا، جبکہ حضرت مولانا عبد الحئی جام پوریؒ اور دیگر حضرات نے اس سے اختلاف کیا اور تنظیم اہلِ سنت پاکستان دو حصوں میں بٹ گئی۔ قائد جمعیت حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی حمایت دوسرے فریق کو حاصل تھی......

”قادیانی مسئلہ حل ہو چکا ہے“: بھٹو صاحب کے ارشاد کا جائزہ

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۱۹۷۵ء)

جناب ذوالفقار علی بھٹو نے سرگودھا کے جلسہ عام میں ارشاد فرمایا ہے کہ قادیانی مسئلہ حل ہو چکا ہے اور اس سلسلہ میں اب کچھ کرنا بھی باقی نہیں رہا۔ قائدِ جمعیت علماء اسلام حضرت مولانا مفتی محمود مدظلہ نے ایک اخباری بیان میں اس دعوی کی تردید فرماتے ہوئے کہا ہے کہ اصولی طور پر قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے سوا ابھی تک کوئی عملی کاروائی نہیں کی گئی اور حکومت اس مسئلہ میں مسلسل ٹال مٹول کر رہی ہے۔

۷ ستمبر ۱۹۷۴ء کے بعد سے اب تک کی صورتحال پر غور کیا جائے تو بھٹو صاحب کے اس بے جان دعوے کو جھٹلائے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ قادیانی مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر نگاہ ڈالتے ہوئے بھٹو صاحب کے اس دعوے کا جائزہ لیں۔

اسلامیانِ پاکستان کے مطالبات

جہاں تک قادیانی مسئلہ کا تعلق ہے، اسلامیانِ پاکستان اور خصوصاً مجلسِ عمل تحفظِ ختمِ نبوت کے مطالبات اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل تھے:

۱. قادیانیوں کے دونوں گروہوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔
۲. انہیں کلیدی اسامیوں سے برطرف کیا جائے۔
۳. ربوہ کو کھلا شہر قرار دیا جائے۔
۴. قادیانیوں کی ملک دشمن سرگرمیوں کا محاسبہ کیا جائے۔
۵. خدام الاحمدیہ، فرقان فورس اور دیگر نیم فوجی قادیانی تنظیموں پر پابندی لگا کر اسلحہ ضبط کیا جائے۔
۶. ربوہ کے اوقاف پر ملکی قانون کا عملی اطلاق کیا جائے۔

مطالبات کے سلسلہ میں معروضی صورتحال

لیکن عملی دنیا میں دیکھا جائے تو سوائے اس کے کہ صرف پہلے مطالبہ کو محض اصولی طور پر تسلیم کیا گیا ہے، ان مطالبات کے ضمن میں اور کوئی عملی کاروائی نہیں ہوئی، بلکہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے عملی تقاضے بھی ابھی پورے نہیں کیے گئے۔ مثلاً:

- رجسٹریشن کے کاغذات اور ووٹروں کی فہرستوں میں انہیں بطور غیر مسلم لکھنے کا حکم جاری نہیں کیا گیا۔
- وہ قانوناً غیر مسلم ہونے کے باوجود اسلامی شعائر و اصطلاحات مثلاً اذان، نماز، قرآن کریم، مسجد، امیر المؤمنین، خلیفہ وغیرہ کا استعمال حسبِ سابق جاری رکھے ہوئے ہیں۔ حالانکہ یہ اصطلاحات و شعائر صرف اسلام اور اہلِ اسلام کے لیے مخصوص ہیں۔
- آئین میں عقیدۂ ختم نبوت کے خلاف تبلیغ کی کُلی ممانعت کے باوجود قادیانی گروہ اسلام کے نام پر ملتِ اسلامیہ کے اجتماعی عقائد کے خلاف تبلیغ میں مصروف ہے اور ان کا لٹریچر، جو سراسر ملتِ اسلامیہ کے لیے ناگوار اور دل آزار ہے، برابر طبع و تقسیم ہو رہا ہے۔

یہ تو حال ہے اس مطالبے کا جسے پارلیمنٹ نے اصولی طور پر تسلیم کر لیا ہے اور جس کے بارے میں صرف حکومت کے ذمہ کا کام باقی رہ گیا ہے۔ باقی رہے دوسرے مطالبات تو ان کا حال بھی واضح ہے۔

۱. قادیانیوں کو کلیدی اسامیوں سے ہٹانے کی بجائے نئے قادیانیوں کو کلیدی عہدوں پر فائز کیا جا رہا ہے۔ مثلاً حضرت مولانا مفتی محمود صاحب مدظلہ کی اطلاع کے مطابق ایبٹ آباد کے ایک معروف قادیانی عبداللہ سعید کو حال ہی میں فوج میں جنرل بنایا گیا ہے۔ اسی طرح دوسرے محکموں میں بھی قادیانی حضرات ابھی تک کلیدی عہدوں پر براجمان ہیں۔
۲. ربوہ کو کھلا شہر قرار دینے کی بات بھی رسمی کاروائی سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ چند رسمی اقدامات کے سوا ربوہ کو مسلمانوں کے لیے کھلا شہر بنانے کے سلسلہ میں کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا گیا اور عملاً آج بھی قادیانیوں کے لیے ربوہ ”مخصوص اور محفوظ اسٹیٹ“ کی حیثیت رکھتا ہے۔
۳. قادیانیوں کی ملک دشمن سازشوں کو بے نقاب کرنے اور ان کا محاسبہ کرنے کی بات بھی حکمرانوں کی توجہ کی منتظر ہے اور حال ہی میں سرحد کے وزیر داخلہ حیات محمد خان شیرپاؤ کی المناک موت کے بعد سرحد کے مبینہ طور پر قادیانی آئی جی پولیس میاں بشیر احمد کے تبادلہ اور معاً بعد فوری برطرفی کے پس منظر سے بھی قوم کو آگاہ نہیں کیا گیا۔ حالانکہ ملکی حالات کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی بھی ذی شعور اس امر کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔
۴. قادیانیوں کی نیم فوجی تنظیمیں فرقان فورس اور خدام الاحمدیہ اسی طرح مسلح اور مصروفِ عمل ہیں۔ حکومت جو پختون زلمے جیسی محبِ وطن تنظیم کو گوارا کرنے پر تیار نہیں، خدام الاحمدیہ اور فرقان فورس کی مسلح سرگرمیوں پر چپ سادھے ہوئے ہے۔

۵۔ قادیانیوں کے اندرونِ ملک اوقاف اور بیرونِ ملک ملکی زرِ مبادلہ کے ذریعے حاصل کی جانے والی جائیدادوں کا مسئلہ بھی جوں کا توں ہے اور ابھی تک اس سلسلہ میں پالیسی نہیں طے کی گئی۔

حتیٰ کہ ۷ستمبر ۱۹۷۴ء کو قادیانیوں کو غیرمسلم اقلیت قرار دینے کے اعلان کے ساتھ بھٹوصاحب نے تحریکِ ختمِ نبوت کے کارکنوں کے خلاف قائم کیے گئے مقدمات واپس لینے کا جو وعدہ کیا تھا وہ بھی تشنۂ تکمیل ہے اور ملک بھر میں خصوصاً پنجاب میں ہزاروں کارکنوں کے خلاف مقدمات ابھی تک چل رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ پولیس کے حکّام کے اشارے پر تحریک کے دوران تحریک کے کارکنوں کے خلاف مقدمات عملاً فوجداری دفعات کے تحت درج کیے گئے ہیں اور اب ہر جگہ وہ یہ بہانے پیش کر رہے ہیں کہ یہ مقدمات سیاسی نہیں اس لیے بھٹوصاحب کے وعدے کے ضمن میں نہیں آتے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق تحریکِ ختمِ نبوت کے کارکنوں کے خلاف کم و بیش دو ہزار سے زائد مقدمات ابھی تک چل رہے ہیں۔

اس صورتحال میں بھٹوصاحب کا یہ کہنا کہاں تک بجا ہے کہ ”قادیانی مسئلہ حل ہو چکا ہے اور اس سلسلہ میں کچھ کرنا باقی نہیں رہا؟“

وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کا دورۂ گوجرانوالہ

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۱۸اپریل ۱۹۷۵ء)

وزیراعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو "رابطہ عوام" مہم کے اختتام پر لاہور ڈویژن کے دورہ پر تشریف لائے تو گوجرانوالہ کی سرزمین کو "ورودِ مسعود" کے شرف سے نوازا۔

قائدِ عوام کے استقبال کی تیاریاں

وزیراعظم کی تشریف آوری سے ہفتہ عشرہ قبل ہی انتظامیہ کی نقل و حرکت کسی آندھی اور طوفان کی آمد کا پتہ دے رہی تھی۔ ضلع کی اہم شاہراہوں پر پولیس آفیسر بسوں کے کاغذات وصول کر کے انہیں وزیراعظم کی آمد پر دیہات سے عوام کو ڈھونڈنے کا فریضہ سونپ رہے تھے۔ انتظامیہ، عدلیہ اور پولیس آفیسر شب و روز جلسۂ عام کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ میونسپل اسٹیڈیم میں جلسہ کے انتظامات کیے جا رہے تھے اور عوام کو قائدِ عوام سے دور رکھنے کے لیے اسٹیج سے ۲۰۰ گز کے فاصلے پر لوہے کے پائپ نصب کیے جا رہے تھے۔ اخبارات کے خصوصی نمبر شائع کرنے کی مساعی ہو رہی تھیں۔ غرض کہ ہر طرف وزیراعظم کی آمد ہی کا غلغلہ تھا اور انتظامیہ کی شبانہ روز سرگرمیوں سے یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان لوگوں کا مصرف اب صرف یہی رہ گیا ہے کہ وزیراعظم کے جلسہ کا انتظام کریں، کیونکہ اس دوران کوئی اور انتظامی یا عدالتی کام معمول کے مطابق انجام نہیں دیا گیا۔

جلسہ کے انتظامات کے لیے صنعتکاروں سے لاکھوں روپے کا چندہ وصول کیا گیا اور تحصیلداروں کے ذریعہ بھی چندہ وصول کرنے کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا گیا۔ تحصیلداروں نے محکمہ کے افراد اور پٹواریوں کے ذمہ کام لگایا، ایک خبر کے مطابق صرف تحصیل وزیرآباد سے پٹواریوں نے ۵۰ ہزار روپے چندہ اکٹھا کر کے دیا۔ اس کے علاوہ پٹواریوں اور پولیس انسپکٹروں کے ذمہ دیہات سے بسیں بھر کر لانے کی ڈیوٹی بھی لگائی گئی اور وہ غریب بسیں اور ٹرک لیے دیہات میں غریب عوام کی منتیں کر کے انہیں شہر کی سیر، بھٹو صاحب کی زیارت اور پلاؤ کھلانے کے بہانے دو روز تک جمع کرنے میں مصروف رہے۔ بسوں اور ٹرکوں کے مالکوں کی کیفیت عجیب تھی، ایک بس والے نے بتایا کہ ہماری بسیں بھی قبضہ میں لے لی گئیں اور ۲۰ روپیہ فی بس چندہ بھی لیا ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ۶۰۰ بسیں اور ٹرک صرف گوجرانوالہ کے جلسہ کو کامیاب بنانے کے لیے تحویل میں لیے گئے۔ ایک ٹرک والا میونسپل اسٹیڈیم کے دروازے پر

بیٹھا سنا رہا تھا کہ ٹرک بھی دو روز کے لیے پولیس نے قبضہ میں لے لیا، ہم بھی پھنسے ہوئے ہیں، کھانا بھی نہیں ملا اور پٹرول بھی ہمیں اپنے خرچ سے ڈلوانا پڑ رہا ہے۔

وفود کی ملاقات کا معاملہ

وزیر اعظم کی کھلی کچہری کے لیے وفود کی تیاری کا مرحلہ آیا تو بڑی دلچسپ باتیں سننے میں آئیں:

- وکلاء کے وفد کو پابند کرنے کی کوشش کی گئی کہ جو سوالات انتظامیہ کی طرف سے دیے جائیں گے آپ صرف ان سوالات کو پڑھ کر سنا سکتے ہیں اس کے علاوہ کچھ نہیں کہیں گے۔ وکلاء نے اسے آزادیٔ رائے کے منافی قرار دیا اور بار ایسوسی ایشن کے اجلاس میں بھاری اکثریت سے قرارداد منظور کر کے جناب بھٹو کے دورہ کا بائیکاٹ کر دیا۔ اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ ہوئی کہ پی پی سے متعلق وکلاء نے اپنے طور پر وفد کی صورت میں ملاقات کا پروگرام بنا کر اس ''خلا'' کو پر کرنے کی کوشش کی مگر دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے کہ مصداق ان غریبوں کو بھی ''سلامی'' کی اجازت نہ ملی۔ بھٹو صاحب کی طبع نازک پر وکلاء کا یہ بائیکاٹ گراں گزرا۔ مزید برآں انہوں نے بار ایسوسی ایشن کے لیے گرانٹ کا اعلان کیا تو غیرت مند وکلاء نے اسے بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ سنا ہے کہ فیصل شہیدؒ میموریل ہسپتال کا افتتاح کرتے ہوئے بھٹو صاحب نے وکلاء پر خفتگی کا اظہار فرمایا، مگر ''اب پچھتائے کیا ہووت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت؟''
- صحافیوں کے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کا مسئلہ پیش آیا۔ انہیں چند سوالات و آداب کا پابند کر دیا گیا تھا مگر انتظامیہ کو پھر بھی اطمینان نہ ہوا۔ بالآخر یہ کہہ کر ان کے وفد کو ملاقات سے روک دیا گیا کہ ''تم میں ایک شر پسند ہے''۔ اب سنا ہے کہ گوجرانوالہ کے صحافی اپنی صفوں میں اس ''شر پسند'' کی تلاش میں مصروف ہیں جس کی وجہ سے وہ قائدِ عوام کے دیدار سے محروم رہ گئے۔
- طلبہ کو بھی پابند کیا گیا کہ وہ چند متعلقہ سوالات سے آگے نہیں بڑھیں گے، مگر یہاں انتظامیہ سے کچھ چوک ہوگئی۔ کھلی کچہری کے دوران اسلامیہ کالج یونین کے سیکرٹری اور جمعیت طلباء اسلام کے سرکردہ کارکن سجاد حسین نے جرأتِ رندانہ سے کام لیتے ہوئے تحریکِ ختمِ نبوت کے کارکنوں کے خلاف مقدمات اور گوجرانوالہ کے طلبہ کے خلاف مقدمات کا ذکر چھیڑ دیا جس پر بھٹو صاحب کے حکم پر صوبائی وزیر اعلیٰ جناب محمد حنیف رامے صاحب کو تحریکِ ختمِ نبوت کے مقدمات واپس لینے کا اعلان بالآخر کرنا ہی پڑا۔ انہی مقدمات کے سلسلے میں مجلسِ عمل تحفظِ ختمِ

نبوت گوجرانوالہ نے بھی وزیراعظم سے بات چیت کے لیے ایک وفد ترتیب دیا تھا مگر ڈی سی صاحب نے وفد کو ملاقات کا وقت دینے سے معذوری کا اظہار کیا۔ پھر عرض کیا گیا کہ کھلی کچہری میں آنے کا موقع دیا جائے، جواب ملا کہ کھلی کچہری میں جانے کے لیے پیشگی اجازت لینا شرط ہے۔

- بھٹو صاحب کی تشریف آوری والے دن علماء کرام جامع مسجد شیرانوالہ باغ میں جمع ہوئے، بھٹو صاحب کو ٹیلی گرام دیا گیا کہ ہم ملاقات کے خواہش مند ہیں اور فون ۳۸۷۳ پر آپ کے حکم کے منتظر ہیں۔ جواب نہ آنا تھا نہ آیا۔ بہرحال آواز پہنچ گئی اور پورے پنجاب میں مقدمات واپس لینے کا اعلان بھی کر دیا گیا۔ مگر حیرت کی بات ہے کہ اس اعلان کے چار روز بعد او کاڑہ کی جامع مسجد گول چوک کے سابق خطیب مولانا عبداللہ، حال امام اونچی مسجد لاہوری گیٹ گوجرانوالہ، کو تحریکِ ختمِ نبوت کے دوران درج شدہ مقدمہ کے سلسلہ میں گرفتار کر لیا گیا اور بڑی دِقت کے ساتھ کچھ "دے دلا کر" جان چھڑائی گئی۔ اس کے بعد خدشہ محسوس ہونے لگا کہ کہیں یہ وعدہ بھی ۷ ستمبر کے وعدے کی طرح "سیاسی مصلحتوں" کی بھینٹ نہ چڑھ جائے۔

پولیس، سکیورٹی فورس اور عوام کی آنکھ مچولی

جلسہ عام کے لیے لوگوں کو جمع تو کر لیا گیا مگر اب مسئلہ درپیش تھا قائدِ عوام کی عوام سے حفاظت کا۔ چنانچہ اسٹیج سے کم و بیش ۲۰۰ گز کے فاصلہ پر پائپ نصب کر کے درمیان کا حصہ خالی رکھا گیا۔ اس کے بعد غالباً سیکورٹی فورس سول لباس میں بٹھائی گئی۔ اس کے پیچھے دیہات سے "بیگار" میں لائے گئے عوام کو جگہ ملی جبکہ شہریوں کے حصہ میں ڈنڈے اور لاٹھیاں آئیں اور دروازوں پر کھڑی پولیس اور سیکورٹی فورس کو اپنا فن دکھانے کا خوب خوب موقع ملا۔ جو بھی جلسہ میں جانے کے لیے آگے بڑھا پولیس نے اس کی خوب تواضع کی۔ میں نے خود پیپلز پارٹی کے اہم کارکنوں کو اس حالت میں میدان چھوڑتے دیکھا ہے کہ انہیں اسٹیڈیم کے دروازوں سے اندر جانے کی صورت میں ڈنڈے کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ایک موقع پر تو خود سیکورٹی فورس کو بھی پولیس پر غصہ آ گیا۔ اور سنا ہے پھر سیکورٹی فورس کے لٹھ برداروں نے پولیس کے نوجوانوں کی بھی کر دی۔ اندر بھٹو صاحب تقریر فرما رہے تھے، جو لوگ اندر دھکیل دیے گئے ان کے باہر آنے کے دروازے بند کر دیے گئے، اور جو باہر رہ گئے تھے پولیس اور سیکورٹی فورس ان کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے میں مصروف تھی۔

اور اس طرح وزیراعظم گوجرانوالہ کے عوام کو اپنی تقریر دلپذیر سے شاد کام فرما کر شیخوپورہ روانہ ہوگئے۔

سردار عبدالقیوم خان کی صدارت سے برطرفی

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۲ مئی ۱۹۷۵ء)

آزاد کشمیر میں بالآخر وہ سب کچھ ہوگیا جس کی مدت سے توقع کی جا رہی تھی۔ سردار عبدالقیوم کی برطرفی آزاد کشمیر کی سیاست سے دلچسپی رکھنے والے کسی شخص کے لیے غیر متوقع نہیں تھی۔ سردار صاحب نے اگرچہ موجودہ حکومت کے ساتھ مفاہمت و معاونت کی پالیسی اختیار کر رکھی تھی جو کشمیر کی مخصوص صورتحال کے پیشِ نظر ان کے لیے ناگزیر بھی تھی لیکن اس کے باوجود سردار صاحب کے ساتھ پی پی پی کا نباہ مشکل دکھائی دے رہا تھا۔

''اناولاغیری'' کا عملی منشور

اس لیے کہ پیپلز پارٹی کے چیئرمین کا ''اناولاغیری'' کا عملی منشور اور سردار صاحب کا دینی مزاج اور حریت پسندی ایک ساتھ نہیں چل سکتے تھے، اور سیاسی حلقے اس خبر کے منتظر تھے کہ بلوچستان کے سردار عطاء اللہ مینگل کی طرح آزاد کشمیر کے سردار عبدالقیوم خان کی جمہوری حکومت بھی کب نازنینانِ اقتدار کی اٹھکیلیوں کی نذر ہوتی ہے۔ چنانچہ وہی ہوا جس کا انتظار تھا، البتہ اب کے طریقۂ واردات پہلے سے مختلف تھا۔

سردار صاحب کا کہنا ہے کہ انہوں نے بھٹو صاحب سے بارہا کہا کہ میں آپ سے لڑنا نہیں چاہتا، اگر آپ چاہیں تو صدارت سے الگ ہو کر گھر بیٹھ جانے کے لیے تیار ہوں، لیکن ایک شرط پر کہ آزاد کشمیر کی سیاسی حیثیت اور مسئلہ کشمیر کی کیفیت میں تبدیلی نہیں ہونی چاہیے۔ مگر بھٹو صاحب نے اس ''شریفانہ'' پیشکش کو قبول کرنے کی بجائے سیاسی کشتی کے نئے حربے کو سردار صاحب پر آزمانا ضروری سمجھا۔

سیاسی صورتحال پر سردار صاحب کے تبصرے

صدارت سے علیحدگی کے بعد سردار عبدالقیوم صاحب ملک کے مختلف شہروں کا دورہ کر کے آزاد کشمیر کی تازہ ترین سیاسی صورتحال اور اپنی برطرفی کے اسباب و نتائج پر عمومی و خصوصی مجالس میں روشنی ڈال رہے ہیں۔

اسی مہم کے سلسلے میں وہ گوجرانوالہ تشریف لائے اور فیصلز ہوٹل میں کارکنوں اور شہریوں سے خطاب کرنے کے بعد ایک خصوصی مجلس میں اخباری نمائندوں اور سیاسی کارکنوں کے سوالات کا جواب

بھی دیا۔ انہوں نے بتایا کہ آزاد کشمیر کے آئین کے تحت صدر کے خلاف عدمِ اعتماد کی تحریک کا حق آئندہ منتخب ہونے والی اسمبلی کو حاصل ہے اور موجودہ اسمبلی اس کی مجاز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسپیکر منظر مسعود کی طرف سے عدمِ اعتماد کی تحریک کے سلسلہ میں اسمبلی کا اجلاس بلانے پر جب مسلم کانفرنس نے ہائیکورٹ سے رجوع کیا تو ہائی کورٹ نے اس موقف کو تسلیم کرتے ہوئے اسمبلی کے اس اجلاس کے سلسلہ میں حکمِ امتناعی جاری کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود اجلاس منعقد کیا گیا اور حیرت کی بات ہے کہ اسی ہائیکورٹ کے چیف جسٹس نے غیر قانونی اجلاس کے نتائج کو تسلیم کرتے ہوئے اسپیکر منظر مسعود سے صدر کے عہدہ کا حلف بھی لے لیا جو صریحاً توہینِ عدالت ہے اور اس سلسلہ میں قانونی کارروائی کی جارہی ہے۔

سردار صاحب نے کہا کہ عدمِ اعتماد کی تحریک پیش کرنے سے چوبیس گھنٹے قبل ان کی سرکاری رہائشگاہ کو سکیورٹی فورس نے گھیرے میں لے لیا اور آزاد کشمیر میں ایک طرح سے ''سول مارشل لاء'' نافذ کر دیا گیا، ہر طرف سنگینیں ہی سنگینیں نظر آتی تھیں۔ اس کے باوجود اسمبلی کے اجلاس میں مسلم کانفرنس کے ارکان کو جانے نہیں دیا گیا اور اس طرح سردار عبدالقیوم خان کو صدارت سے ہٹانے کا ''جمہوری و آئینی عمل'' پایۂ تکمیل تک پہنچا۔

سردار صاحب نے کہا کہ آزاد کشمیر میں جہاں اس سے قبل کبھی دفعہ ۱۴۴ نافذ نہیں کی گئی، امنِ عامہ کے سلسلہ میں پولیس یا فوج کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، کسی سیاسی کارکن کے خلاف مقدمہ نہیں بنا، پوری ریاست میں ایک بھی سیاسی قیدی نہیں تھا، تمام سیاسی و جمہوری آزادیاں بحال تھیں، آج وہاں پولیس اور سکیورٹی فورس کی حکومت ہے، پوری ریاست میں دفعہ ۱۴۴ نافذ ہے، اور صدر منظر مسعود کے بچے تک سنگینوں کے سائے کے بغیر صدارتی رہائش گاہ سے باہر نہیں نکل سکتے۔ ہر طرف خوف وہراس ہے، قانون اور آئین کی حکمرانی کی باتیں کرنے والے انگشت بدنداں ہیں اور کچھ بعید نہیں کہ لوگ حالات کی سنگینی کی وجہ سے ہجرت پر مجبور ہو جائیں۔ یہ ہجرت اگر پاکستان کی طرف ہوئی تو کوئی بات نہیں دوسرے کشمیری مہاجرین کے ساتھ ان کی بھی گزر بسر ہو جائے گی، لیکن اگر خدانخواستہ ظلم وجبر اور ناانصافی کا ردعمل انہیں حدِ متارکہ جنگ سے اس پار دھکیل کر لے گیا تو مشرقی پاکستان کی طرح آزاد کشمیر پر بھارت کی فوج کشی کا جواز مہیا کرنے کی ذمہ داری آخر کس پر ہوگی؟

سردار صاحب نے متحدہ جمہوری محاذ کی دعوت کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ محاذ کے قائدین نے مجھے ۲۶/اپریل کے اجلاس میں شمولیت کی دعوت دی ہے جو میں نے قبول کر لی ہے اور میں اجلاس میں شریک ہو کر محاذ کے رہنماؤں کو آزاد کشمیر کی تازہ ترین صورتحال سے آگاہ کروں گا۔ محاذ کے اجلاس میں میری شمولیت پر بعض حضرات کی طرف سے یہ کہا جارہا ہے کہ مجھے محاذ کے ساتھ نہیں جانا چاہیے، محاذ تو بہت

بدنام ہو چکا ہے اس لیے مجھے ان کے ساتھ ملنے کی بجائے اپنے طور پر کام کرنا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات سرکاری ذرائع سے جان بوجھ کر پھیلائی جا رہی ہے اور میں ان سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر متحدہ جمہوری محاذ بقول تمہارے واقعی بدنام ہے تو تمہیں مجھ سے یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ مجھے بھی پھر بدنام ہو جانے دیں۔ پھر کہا جاتا ہے کہ محاذ میں تو ولی خان ہے جو غدار ہے، میں کہتا ہوں کہ مجھے بھی تو حکومت سے الگ کر کے غدار کہا جا رہا ہے، کیا ولی خان بھی ایسا ہی غدار ہے؟

سردار صاحب نے کہا ہمیں کسی سے حب الوطنی کا سرٹیفکیٹ لینے کی ضرورت نہیں اور نہ ہم ایسے کسی سرٹیفکیٹ کو تسلیم کرتے ہیں۔ سردار عبدالقیوم خان نے کہا کہ مسئلہ درحقیقت صدارت کا نہیں، یہ بات ہوتی تو میں اس سے قبل کئی بار صدارت سے الگ ہونے کی پیشکش کر چکا ہوں۔ لیکن اس پیشکش کو ٹھکرا کر اس طریقے سے صدارت سے مجھے برطرف کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مقصد دراصل کچھ اور ہے۔ اس لیے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ مسئلہ صدارت کا نہیں ملکی سالمیت کا ہے اور اسی لیے مسلم کانفرنس نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم پاکستان کی سالمیت کے تحفظ کے لیے پاکستان کی سیاست میں عملی طور پر حصہ لیں گے، اس سلسلہ میں طریق کار بھی جلد طے کر لیا جائے گا۔

''شملہ معاہدہ'' کے خفیہ مقاصد!

سردار صاحب نے کہا کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ شملہ معاہدے کے بعض خفیہ مقاصد کو پورا کرنے کے لیے خطِ متارکہ جنگ کے دونوں طرف اقدامات ہو رہے ہیں اور کشمیر کے دونوں حصوں میں ہونے والے سیاسی اقدامات ان ہی مقاصد کی تکمیل کی ابتدائی کڑیاں ہیں۔ لیکن میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ کشمیر اور پاکستان کے عوام اس معاہدہ میں فریق نہیں اور اگر شملہ معاہدہ کے تحت کشمیر کی حیثیت میں کوئی تبدیلی کی گئی تو اسے ریاست اور پاکستان کے عوام کسی صورت میں قبول نہیں کریں گے۔

سردار عبدالقیوم خان کے ان افکار و خیالات کی روشنی میں آزاد کشمیر کی سیاسی صورتحال اور مسئلہ کشمیر کے مستقبل کے بارے میں اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ چنانچہ سردار صاحب کافی عرصہ تک حکمرانوں سے مفاہمت کا رویہ اختیار کیے رکھنے کے بعد اب پاکستان کی سالمیت کے تحفظ کا مقدس جذبہ لے کر میدان میں اتر آئے ہیں۔

بھٹو صاحب کے سیاسی حربے
اور متحدہ جمہوری محاذ کی دوسالہ جدوجہد

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۶ جون ۱۹۷۵ء)

متحدہ جمہوری محاذ کے باعزم رہنما ہدیۂ تبریک کے مستحق ہیں کہ اس دور میں بھی جمہوری اقدار کی سربلندی اور ملکی سالمیت کے تحفظ کی جدوجہد میں مصروف ہیں جبکہ حکمران پارٹی اپنے اقتدار کو مضبوط اور شخصی آمریت کو مستحکم کرنے کی خاطر تمام سیاسی، اخلاقی اور جمہوری حدود و قیود کو خیرباد کہہ چکی ہے۔ محبِ وطن سیاسی رہنماؤں کے خلاف سرکاری ذرائع ابلاغ کا مکروہ پراپیگنڈا اور پولیس و فیڈرل فورس کے وحشیانہ مظالم ہٹلر اور مسولینی کی روح کو بھی شرما رہے ہیں۔

محاذ کا مقصدِ قیام اور مساعی

آج سے دوسال قبل جب متحدہ جمہوری محاذ کا قیامِ عمل میں لایا گیا تھا تو جمہوری اقدار کی بحالی اور ملکی سالمیت کے تحفظ کو اس کے پروگرام میں بنیادی حیثیت دی گئی تھی۔ دوسال کا عرصہ گواہ ہے کہ اس مقدس مہم کی راہ میں موجودہ حکومت نے ہر ممکن رکاوٹیں کھڑی کرنے کی کوشش کی مگر محاذ کے باہمت قائدین کے قدم رکنے کی بجائے مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں۔ اور یہ متحدہ جمہوری محاذ کی مسلسل مساعی کا نتیجہ ہے کہ آج حکومت کے یکطرفہ پروپیگنڈا کے باوجود عوام کی غالب اکثریت اس کے جمہوریت کش اقدامات اور آئین و قانون کے خلاف کارروائیوں کو محسوس کرنے لگی ہے۔ اور دوسال قبل کی بہ نسبت حکومت کے لیے آج عوام کو دھوکہ دینا زیادہ مشکل ہو گیا ہے۔

- لیاقت باغ راولپنڈی میں محاذ کے جلسے پر غنڈہ گردی اور بربریت کے مظاہرے،
- محاذ کے رہنماؤں کی ٹرین پر گوجرانوالہ، وزیرآباد اور دوسرے ریلوے اسٹیشنوں پر حملے،
- قائدِ جمعیت علماء اسلام حضرت مولانا مفتی محمود مدظلہ اور اپوزیشن لیڈر خان عبد الولی خان پر قاتلانہ حملوں،
- عطاء اللہ مینگل، خیر بخش مری، غوث بخش بزنجو اور دیگر سیاسی رہنماؤں کی گرفتاری کے بعد نیشنل عوامی پارٹی پر پابندی اور ولی خان اور دیگر رہنماؤں کی گرفتاریوں،
- تحریکِ بحالیٔ جمہوریت کے ”عوامی قیدیوں“ پر وحشیانہ مظالم،

- دفعہ ۱۴۴ اور ڈی پی او کے اندھادھند استعمال،
- سرکاری ذرائع ابلاغ ٹی وی، ریڈیو واخبارات کے ذریعے اپوزیشن کے خلاف مذموم پراپیگنڈا،
- فیڈرل سکیورٹی فورس کی عوامی کارستانیوں،
- قومی اسمبلیوں میں حزب اختلاف کی آواز کا گلا گھونٹ کر اسے بائیکاٹ پر مجبور کرنے اور پھر استعفیٰ کے مطالبے

سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ موجودہ حکمران پارٹی ہر قیمت پر اپوزیشن کو راہ سے ہٹا دینا چاہتی ہے۔ اور اس کی خواہش یہ محسوس ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح اپوزیشن جدوجہد کی راہ سے ہٹ جائے یا حکمران پارٹی کے حربوں سے زچ ہو کر اسمبلیوں سے مستعفی ہو جائے تاکہ دھاندلی اور دھونس کے ذریعے کچھ اور مرضی کے افراد کو اسمبلی میں لا کر ''ڈمی اپوزیشن'' تشکیل دی جا سکے۔ لیکن محاذ کے رہنماؤں نے کمال تدبر اور فراست سے کام لے کر حکومت کے ان حربوں کو ناکام بنا دیا ہے اور اسمبلی میں وزیر اعظم کی تقریر ان کی بوکھلاہٹ کا کھلا ثبوت ہے۔

حکمران پارٹی اور آزاد کشمیر

حال ہی میں آزاد کشمیر کے سلسلہ میں بھی حکمران پارٹی نے خانہ جنگی کی بنیاد رکھنے اور متحدہ جمہوری محاذ کی بیخ کنی کا ''جواز'' تلاش کرنے کی سعیٔ لاحاصل کی۔ سردار محمد عبدالقیوم خان کی برطرفی، مسلم کانفرنس کے کارکنوں کے خلاف غنڈہ گردی، فیڈرل فورس کا آزاد کشمیر آپریشن، متحدہ جمہوری محاذ کے رہنماؤں کے دورۂ آزاد کشمیر کی صورت میں مجوزہ اقدامات، اور سردار عبدالقیوم کے آزاد کشمیر میں داخلہ پر پابندی۔ یہ تمام کارروائیاں ایک ہی محور کے گرد گھومتی رہیں لیکن محاذ کے رہنماؤں کا تدبر اور سردار محمد عبدالقیوم خان کا حوصلہ آڑے آیا اور بھٹو صاحب کی محاذ کو ''اڑنگے پر لا کر پٹخنی دینے'' کی خواہش ناتمام رہی۔

اور اب جبکہ ''بلی تھیلے سے باہر'' آچکی ہے، بھٹو صاحب قومی اسمبلی میں اپوزیشن کے ارکان اسمبلی سے مستعفی ہونے اور ان کی سیٹوں پر ضمنی انتخاب کرانے کا اعلان فرما کر اپنے عزائم کو بے نقاب کر چکے ہیں، اور پی پی پی کے سیکرٹری جنرل ڈاکٹر مبشر حسن کی طرف سے اپوزیشن ارکان اسمبلی کے خلاف غنڈہ گردی کے مظاہرہ کا باضابطہ اعلان سامنے آچکا ہے، ملکی سالمیت اور جمہوری اقدار متحدہ محاذ کو ایک اور مہم کا راستہ دکھا رہی ہیں۔ یہ مہم سخت بھی ہے اور قدم قدم پر ایثار و قربانی کی متقاضی بھی۔

قائدِ حزبِ اختلاف مولانا مفتی محمود کا اعلان

قومی اسمبلی میں حزبِ اختلاف کے قائد حضرت مولانا مفتی محمود صاحب مد ظلہ نے اس نئی مہم کا اعلان ان الفاظ کے ساتھ فرمایا ہے:

"حکومتی جماعت نے ہمارے خلاف مہم کا آغاز کر دیا ہے۔ اب ہم بھی حکومت کے خلاف مہم چلائیں گے اور اسے یا تو جمہوریت بحال کرنا پڑے گی یا اقتدار سے الگ ہونا پڑے گا۔"

حکمران پارٹی کی دھاندلیوں اور غیر آئینی کارروائیوں کے خلاف جمہوری قوتوں کی یہ مہم ان شاء اللہ آخری اور فیصلہ کن ثابت ہوگی اور یقیناً حکمران پارٹی کو جمہوری اقدار، آئین کے تقدس اور ملکی سالمیت کے تقاضوں کے سامنے سرنڈر ہونا پڑے گا۔ متحدہ جمہوری محاذ نے اس مہم کے باضابطہ آغاز کے لیے ۱۴ و ۱۵ جون بروز ہفتہ و اتوار لاہور میں محاذ میں شامل تمام جماعتوں کے کارکنوں کا قومی کنونشن طلب کیا ہے جس میں موجودہ سیاسی صورتحال پر غور و خوض کے بعد آئندہ لائحۂ عمل کا اعلان کیا جائے گا اور عوام کے سیاسی، معاشی اور آئینی حقوق کی بحالی کی فیصلہ کن مہم کا باقاعدہ آغاز ہوگا۔

قائدِ جمعیت علماء اسلام حضرت مولانا مفتی محمود صاحب مد ظلہ کی ہدایت پر جمعیت کی مرکزی مجلسِ عمومی کے تمام ارکان کو متحدہ جمہوری محاذ کے قومی کنونشن میں شرکت کے لیے باضابطہ دعوت نامے جاری کر دیے گئے ہیں اور کنونشن کے اختتام پر اس کے فیصلوں کی توثیق کے لیے جمعیت کی مرکزی مجلسِ عمومی کا اجلاس بھی طلب کر لیا گیا ہے۔ حضرت مفتی صاحب نے مجلسِ عمومی کے تمام ارکان کو ہدایت کی ہے کہ وہ ۱۴ و ۱۵ جون کے ساتھ ۱۶ جون کا دن بھی فارغ رکھیں تاکہ ضروری جماعتی امور کی تکمیل بھی اسی موقع پر ہو جائے۔

کچھ آزاد کشمیر کے بارے میں

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۴ جولائی ۱۹۷۵ء)

علاقہ تھب تحصیل باغ آزاد کشمیر کے جماعتی بزرگوں کے ارشاد پر ۲۳ جون کو وہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ تھب کا علاقہ آزاد کشمیر کا مردم خیز خطہ ہے جہاں کے عوام کو دینی علوم کے ساتھ والہانہ عقیدت اور لگاؤ ہے۔ چنانچہ اس خطہ میں قرآن و حدیث کے علوم سے بہرہ ور حضرات کی ایک معتدبہ تعداد موجود ہے اور اب بھی دینی تعلیم کا عمومی رجحان موجود ہے۔

۲۳ جون کو تھب کی مرکزی جامع مسجد میں سالانہ جلسہ تھا جس سے راقم الحروف کے علاوہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب چناری، حضرت مولانا امیر الزمان خان نعمان پورہ، حضرت مولانا مفتی عبد المتین صاحب تھب، حضرت مولانا شفیع اللہ شاہ باغ، حضرت مولانا عبد الحئی صاحب دیول، حضرت مولانا محمد اظہر صاحب بکوٹ شریف، راجہ محمد سبیل خان ممبر آزاد کشمیر اسمبلی اور دوسرے حضرات نے خطاب کیا۔ اور بعد میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی یادگار کے طور پر جامع مسجد تھب میں امداد العلوم کے نام سے دینی مدرسہ کے آغاز کا اعلان کیا گیا۔

آزاد کشمیر کی دینی قیادت اور محکمۂ قضا

راقم الحروف نے علاقہ کے دیندار مسلمانوں خصوصاً علماء کرام کو اس طرف متوجہ کیا کہ انہیں عملی سیاست کو شجرِ ممنوعہ سمجھنے کی بجائے اسے اپنانا چاہیے۔ کیونکہ ظلم و جبر کے نظام کی مخالفت اور دینِ حق کے اِعلاء و اِجرا کی جدوجہد کرنا علماء کرام کا دینی و ملی فرض ہے اور علماء کرام ہی کی سیاسی قیادت عوام کے مسائل کو مخلصانہ طور پر حل کر سکتی ہے۔ دراصل آزاد کشمیر کے علماء کرام نے شروع ہی سے سیاسی مسائل میں عوام کی نمائندگی و رہنمائی کی ہے اور ان کی ایک تنظیم ''جمعیت علماء آزاد کشمیر'' کے نام سے تیس سال سے سیاسی و مذہبی میدان میں سرگرمِ عمل ہے، اور ان کی مسلسل محنت کا ثمرہ ہے کہ آزاد کشمیر میں عائلی قوانین کا نفاذ نہیں ہو سکا۔

محکمۂ قضا پوری ریاست میں شرعی قوانین کے نفاذ کی ذمہ داریوں سے ایک حد تک عہدہ برآ ہو رہا ہے اور سردار محمد عبد القیوم خان سمیت سابق حکمرانوں نے متعدّد اسلامی اصلاحات نافذ کیں، لیکن ایک بنیادی اور ناگزیر حقیقت سے صرفِ نظر کے باعث آزاد کشمیر کے علماء کرام وسیع اور فیصلہ کن اثر و رسوخ

رکھنے کے باوجود آزاد کشمیر کی سیاسی قیادت میں اپنا صحیح مقام حاصل نہیں کر سکے، جس کے نتائج دینی سیاست کے مستقبل کو اس خطہ میں مخدوش بنا سکتے ہیں۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ ان بزرگ علماء کرام نے سیاسی میدان میں قربانی اور محنت کی ذمہ داریاں تو خود سنبھالے رکھیں لیکن عملی قیادت و سیاست کا پھل دوسروں کی جھولی میں ڈالتے رہے اور مخصوص قبائلی مصلحتوں کے خول سے خود کو باہر نہ نکال سکے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ قبائلی سیاست کے سرداروں نے ان بزرگ علماء کرام کی محنت، خلوص اور قربانیوں کا استحصال کر کے اب تک اپنی دکانیں چمکائی ہیں تو شاید یہ بے جا نہ ہو۔ حتیٰ کہ سدھن قبیلہ سے تعلق رکھنے والے بزرگ عالمِ دین شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یوسف خان صاحب بھی آج تمام اجتماعی تقاضوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے سدھن برادری کے سردار محمد ابراہیم خان کے جلو میں سیاسی پیش قدمی پر مجبور ہوئے اور اب آزاد کشمیر اسمبلی کا رکن منتخب ہونے کے بعد سردار ابراہیم کی معیت کے تمام تقاضے انہیں پورے کرنا پڑ رہے ہیں۔

الغرض سیاسی جدوجہد میں صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے باوجود سیاسی قیادت کو اپنے ہاتھ میں لینے سے ہچکچاہٹ کے طرزِ عمل نے آزاد کشمیر کے علماء کو عجیب گومگو اور مخمصہ کی کیفیت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اور دوسری طرف دینی سیاست کے محاذ کو خالی دیکھ کر دیگر جماعتیں آزاد کشمیر میں دھیرے دھیرے اپنے اثرات کا دائرہ وسیع کر رہی ہیں۔

اس صورتحال کے پیشِ نظر راقم الحروف نے تھب کے جلسہ کے موقع پر ان بزرگ علماء کرام سے گزارش کی اور اب بھی یہی استدعا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آپ حضرات کسی خطرہ اور مصلحت کو خاطر میں لائے بغیر دینی سیاست کے محاذ کو سنبھالیں، کیونکہ آزاد کشمیر کا دینی مستقبل آپ سے وابستہ ہے، ریاستی عوام کے دینی رجحانات کو الحاد و حریت کے اس دور میں اسی صورت میں دوام بخشا جا سکتا ہے کہ ان کی فکری و عملی زمام کار علماء کرام کے ہاتھ میں ہو۔ اس لیے اس صورتحال کو کنٹرول کرنا آپ کا ملی و شرعی فریضہ ہے۔

آزاد کشمیر میں پیپلز پارٹی کا قیام اور وزارت کی رسہ کشی

علماء کرام سے اس مؤدبانہ گزارش کے بعد آزاد کشمیر کے سیاسی بحران کے بارے میں بھی کچھ بات ہو جائے۔ یہ بحران جسے سیاسی انارکی کہنا زیادہ موزوں ہوگا اس وقت شروع ہوا تھا جب مسلم کانفرنس کے ٹکٹ پر منتخب ہونے والے ارکانِ اسمبلی کو ورغلا کر ان کے سہارے آزاد کشمیر میں پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ اس کے بعد "ضمیروں" کی خرید و فروخت کا بازار گرم رہا تا آنکہ سردار محمد عبد القیوم خان کو عدمِ اعتماد کی ایک نام نہاد تحریک کے ذریعہ فیڈرل فورس کی سنگینوں کے سائے میں اقتدار سے الگ کر دیا گیا۔ پھر

سردار صاحب اور ان کی جماعت کے لیے انتخابات حصہ لینے کے تمام شریفانہ راستے بند کر کے انہیں بائیکاٹ پر مجبور کر دیا گیا اور کشمیری سیاست میں سردار محمد عبدالقیوم خان کے حریفوں نے انہیں سیاسی شکست دینے کے نشہ میں پی پی پی کی اس حد تک ناز برداری کی کہ آج اس کے نتیجہ میں وہ خود چٹخنیاں کھا رہے ہیں۔

پیپلز پارٹی جس نے اپنے ''مخصوص ذرائع'' سے ۴۰ کے ایوان میں ۲۳ نشستیں ''وصول'' کر لی ہیں، اب سردار ابراہیم کی مسلم کانفرنس، کے ایچ خورشید کی لبریشن لیگ اور چوہدری نور حسین کی آزاد مسلم کانفرنس پر مشتمل متحدہ محاذ کو قبول کرنے سے انکاری ہے۔ پیپلز پارٹی کے رہنماؤں کا دعویٰ ہے کہ ان کی پارٹی کو اسمبلی میں قطعی اکثریت حاصل ہے اس لیے حکومت بنانا اس کا حق ہے۔ جبکہ کے ایچ خورشید کا کہنا ہے کہ الیکشن متحدہ محاذ نے جیتا ہے اس لیے حکومت مشترک ہوگی۔ ادھر خود پی پی پی کے رہنماؤں میں وزارت کے لیے رسہ کشی جاری ہے۔ علی جان شاہ فرماتے ہیں کہ ریاست میں پیپلز پارٹی کی بنیاد انہوں نے رکھی اس لیے وزارتِ اعلیٰ ان کا حق ہے۔ ممتاز راٹھور کا ارشاد ہے کہ سب سے زیادہ قربانیاں انہوں نے دی ہیں اس لیے وہ وزارتِ اعلیٰ کے صحیح مستحق ہیں۔ منظر مسعود صاحب کا دعویٰ ہے کہ سردار عبدالقیوم خان کو چاروں شانے چت کرنے میں ان کا حصہ سب سے زیادہ ہے اس لیے یہ منصب انہیں ملنا چاہیے۔ اور خان عبدالحمید خان پارٹی کے صدر اور ''مضبوط مرکزی وزیر داخلہ'' خان عبدالقیوم خان کے بھائی ہونے کے ناطے سے وزارتِ اعلیٰ کے ''اصلی تے وڈے'' حقدار ہونے کے دعوے دار ہیں۔ اس کے علاوہ مشترک حکومت کی صورت میں کے ایچ خورشید وزارتِ اعلیٰ سے کم کسی بات پر راضی ہونے کے لیے تیار نہیں اور شاید یہ منصب نہ ملنے پر وہ اپوزیشن کی بنچوں پر بیٹھنے کو ترجیح دیں۔

یہ رسہ کشی ان دنوں عروج پر ہے۔ اسمبلی کے دو اجلاس اب تک اس افراتفری میں ملتوی ہو چکے ہیں، اب سنا ہے کہ ۲۷ جون کو بھٹو صاحب آزاد کشمیر کے ارکانِ اسمبلی سے ملیں گے اور ۲۸ جون کو ''پیا جس کو چاہے وہی ہے سہاگن'' کے مصداق بارگاہِ عالی میں باریاب ہونے والے کسی رکن اسمبلی کو وزیر اعلیٰ منتخب کر لیا جائے گا۔ اور یہ ہوگا اس ڈرامے کا ''ڈراپ سین'' جسے بقول شخصے بھٹو صاحب کے ''بحرانوں سے عشق'' نے آزاد کشمیر کے سیاسی افق پر اسٹیج کر رکھا ہے۔

اسلام پر رحم کیجئے!

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۲۶ ستمبر ۱۹۷۵ء)

جناب کوثر نیازی وزیر امور مذہبی اسلامی جمہوریہ پاکستان نے لاہور میں پارٹی کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ

''ملک میں قرآن کے منافی کوئی نظام نہیں لایا جاسکتا''۔

اسلام، سوشلزم اور پچا سام

یہ بات نیازی صاحب محترم کو اس وقت سوجھی جب ان کے مخالف دھڑے کے کارکن ان کی تقریب میں ہلڑ بازی کر کے ''سوشلزم آوے ہی آوے'' کے نعروں کی گونج میں اسٹیج کی طرف چیچے اچھال رہے تھے۔ نیازی صاحب پیپلز پارٹی کے ''اسلام پسند'' حلقے کے ترجمان کی حیثیت سے کافی عرصہ سے اپنا امیج بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جبکہ دوسری طرف بھٹو صاحب کی چابکدستی کے شکار جے اے رحیم، خورشید حسن میر، معراج محمد خان اور حنیف رامے ''سائینٹفک سوشلزم'' کی بنیادوں پر اپنا سیاسی مستقبل استوار کرنے کی فکر میں ہیں۔ توقع ہے کہ مختار رانا کی رہائی کے بعد اس گروہ کی سرگرمیوں میں اضافہ ہوگا۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ ''پچا سام'' ایک بار پھر اسلام اور سوشلزم کے نام سے پاکستانی قوم کی باہمی کشتی دیکھنے کا خواہشمند ہے کیونکہ پچھلی بار جمعیت علماء اسلام کے ارباب بصیرت نے کباب میں ہڈی ڈال دی تھی اور ان کی بروقت مداخلت کی وجہ سے اسلام اور سوشلزم کا دنگل دیکھنے کی خواہش پچا سام پوری نہیں کر سکا تھا۔ وہ دن بھی عجیب تھے، ایک طرف سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور مفاد پرستوں کا طبقہ ''اسلام پسندی'' کا لیبل لگا کر اپنے مفادات اور اغراض کے تحفظ کی جدوجہد میں مصروف تھا، اور دوسری جانب مسٹر بھٹو لاچار عوام کو روٹی، کپڑا اور مکان کے گورکھ دھندے میں الجھا کر ''اسلامی سوشلزم'' کی دلہن کو گھونگٹ اوڑھائے قریہ قریہ بستی بستی پھرا رہے تھے۔ روٹی، کپڑا اور مکان کی کشش اور مسٹر بھٹو کی سحر آفرین اداکاری غریب عوام کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کا استحصال کر رہی تھی۔ بہت سے لوگ بے سوچے سمجھے ''ہے جمالو'' کی دھن پر محوِ رقص تھے۔ ''اسلام پسند'' اور ''سوشلسٹ'' فوجیں آمنے سامنے تھیں، ایک سو تیرہ علماء کرام کے فتویٰ کا نقارہ بج چکا تھا کہ دو سو سالہ ولی اللّٰہی سیادت کی امین جمعیت علماء اسلام آڑے آگئی۔ اس کے بیدار مغز امیر اور باہمت قائد نے مفاد پرستوں کے درمیان لڑی جانے والی اس

جنگ میں اسلام کو فریق تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور علی الاعلان کہہ دیا کہ یہ جنگ اسلام اور کفر کی نہیں معاشی حقوق ومفادات کی ہے۔ اس طرح اسلام اور سوشلزم کا یہ معرکہ بپانہ ہوسکا اور چچاسام سر پیٹ کر رہ گیا۔

جمعیت علماء اسلام کا بروقت کردار

جمعیت علماء اسلام کی اس بروقت مداخلت پر بہت سوں نے ناک بھوں چڑھایا، کئی اپنوں کو بھی بات کی سمجھ نہ آئی لیکن آج وقت اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ یہ مداخلت درست تھی اور جمعیت علماء اسلام کا موقف صحیح تھا کیونکہ مطلع صاف ہوا تو نہ کوئی سوشلسٹ، سوشلسٹ تھا اور نہ کوئی اسلام پسند، اسلام پسند۔

سوشلسٹ برسر اقتدار آئے لیکن ایک سو تیرہ کی اکثریت نے اس ''کفر'' کو گوارہ کرکے چپ بیٹھے رہنے میں ہی عافیت سمجھی۔ شیخ رشید، جے اے رحیم، معراج محمد خان، حنیف رامے اور ان کے رفقاء اسی سامراجی نظام کے کل پرزے بنے رہے جو اُن کی اصطلاح میں بورژوازی (سرمایہ دار) نظام ہے۔ اسلام پسندی پر سب سے زیادہ پھبتیاں کسنے والے کوثر نیازی اسلام پسندوں کے سب سے بڑے ترجمان مولانا احتشام الحق تھانوی سے بغل گیر ہوئے اور رویتِ ہلال کمیٹی کے چیئرمین کی کرسی پر بیٹھنے کے بعد تھانوی صاحب پر کوثر نیازی کی اسلام پسندی کا راز کھلا۔ جبکہ بھٹو صاحب نے جو سوشلزم نافذ کیا وہ سب پر عیاں ہے۔

یہ تھا ''ڈراپ سین'' اس ڈرامے کا جو اسلام اور سوشلزم کے عنوان سے ۱۹۷۰ء میں کھیلا گیا کہ پردہ اٹھا تو اسلام پسندی اور سوشلزم کا کہیں نام و نشان نہ تھا اور مفادات و اغراض باہم دست و گریبان تھے۔ اب جبکہ پی پی کی اندرونی سیاست پھر کروٹ بدل رہی ہے، جو سراسر مفادات اور اغراض کی سیاست ہے اور اس سیاست کے اداکاروں کو نہ اسلام سے کوئی ہمدردی ہے اور نہ ہی سوشلزم سے کوئی دلچسپی، بلکہ مفاد پرستی کا منطقی نتیجہ گروہ بندی کی صورت میں سامنے نظر آرہا ہے۔ شاید دونوں گروہوں نے طبع آزمائی کے لیے پھر اسلام اور سوشلزم ہی کو عنوان بنانے کی بات سوچی ہے اور ہوسکتا ہے ۱۹۷۰ء کا ناکام ڈرامہ از سرِنو اسٹیج کرنے کی خواہش چچا سام کے دل میں پھر سے کروٹ لے رہی ہو۔ اس لیے جمعیت علماء کے جواں ہمت کارکنوں کو اپنا تاریخی کردار ادا کرنے کے لیے پھر سے تیار رہنا چاہیے۔

مفادات کی جنگ کے لیے اسلام کا عنوان!

سوشلزم کی بات تو سوشلسٹ جانیں لیکن اسلام کی حفاظت کی ذمہ داری ہم پر ہے اور ہمیں گروہی سیاست کے کھلاڑیوں پر یہ بات واضح کر دینی چاہیے کہ خدا کے لیے اسلام پر رحم کرو اور اپنے مفادات کی جنگ کے لیے اسلام کی بجائے کوئی اور عنوان منتخب کرو۔ اسلام نصف صدی سے اس خطۂ زمین میں غلط کاروں کے سیاسی استحصال کا شکار ہو رہا ہے۔ یہاں جو کرسی کی طرف بڑھا اس نے اسلام کو نعرے کے طور پر استعمال کیا اور جس کی کرسی کو خطرہ ہوا اس نے اسلام کو ڈھال بنا لیا۔ اس کے سوا ان لوگوں کے ہاں اسلام کا اور کیا مصرف رہا ہے؟ اس لیے اب اسلام کے نام کو غلط مقاصد اور گروہی مفادات کے لیے استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ جو لوگ برسرِاقتدار رہ کر اسلام کے عملی نفاذ کے لیے کچھ نہیں کر سکے اور آج کرسیوں پر بیٹھے بھی کچھ نہیں کر رہے، ان کے منہ سے اسلام اور قرآن کی بات ایسے ہی ہے جیسے شراب کی بوتل پر شربت صندل لکھ دیا جائے۔

اسلام مظلوم اور محنت کش کا ساتھی ہے، اس کی تعلیمات عدل و انصاف، حقوق کی مساوات، سیاسی آزادی اور عزت نفس کے تحفظ کی ضامن ہیں۔ وہ کسی ایک طبقے یا گروہ کے مفادات کا نہیں بلکہ معاشرہ کے ہر فرد کے صحیح مفادات کا ضامن ہے۔ اور اگر کچھ لوگ محض ذاتی و گروہی مفادات کے تحفظ کے لیے اسلام کا نام استعمال کر رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ معاشرہ کے غریب عوام کو اسلام کی طرف سے مایوس کر کے خود اس ملک میں سوشلزم اور کمیونزم کی راہ ہموار کر رہے ہیں۔ سوشلزم کا راستہ روکنا ہے تو اسلام کو پورے کا پورا عملی طور پر نافذ کر دو، ورنہ اگر تمہارے اس طرز عمل سے سوشلزم کی حوصلہ افزائی ہوئی تو کروڑوں مسلمانوں کو سوشلزم کی گود میں دھکیلنے کے ذمہ دار تم ہو گے۔

جمعیت علماء اسلام کے ''نظامِ شریعت کنونشن'' کے اہم گوشے

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور ۔۔۔۳۱ اکتوبر ۱۹۷۵ء)

۱. کل پاکستان جمعیۃ علماء اسلام کے زیر اہتمام دو روزہ نظامِ شریعت کنونشن (گوجرانوالہ) گزشتہ شب بخیر و خوبی اختتام پذیر ہوا۔

۲. کنونشن میں پنجاب، سرحد، سندھ، بلوچستان اور آزاد کشمیر سے کم و بیش دس ہزار مندوبین نے شرکت کی جن میں علماء کرام، وکلاء، طلباء اور ہر طبقہ سے تعلق رکھنے والے افراد شامل تھے۔

۳. کنونشن کا اعلان ۲۸ و ۲۹ اپریل کو مرکزی مجلسِ شوریٰ کے اجلاس منعقدہ ملتان کے بعد کیا گیا تھا۔ اس کے بعد مجلسِ استقبالیہ نے ضلعی انتظامیہ سے مسلسل رابطہ قائم رکھا۔ مولانا مفتی محمود نے صوبائی حکومت سے بھی رابطہ قائم کیا مگر آخر وقت تک انتظامیہ نے شیرانوالہ باغ میں کنونشن کے انعقاد کی اجازت دینے یا نہ دینے کے بارے میں مجلسِ استقبالیہ کو کوئی باضابطہ جواب نہیں دیا۔

۴. جمعیۃ علماء اسلام کی مرکزی مجلسِ عاملہ کا اجلاس ۲۳ اکتوبر کو گوجرانوالہ میں مولانا محمد عبد اللہ درخواستی کی زیرِ صدارت شروع ہوا جس میں کنونشن کے انتظامات کا جائزہ لیا گیا۔

۵. جمعیۃ علماء اسلام کے امیر مولانا محمد عبد اللہ درخواستی نے ۲۴ اکتوبر کو جامع مسجد نور گوجرانوالہ میں جمعۃ المبارک کے عظیم اجتماع سے خطاب کیا اور اعلان کیا کہ حکومت کی رکاوٹوں کے باوجود کنونشن پروگرام کے مطابق منعقد ہوگا۔ آپ نے ۲۵ اکتوبر کو صبح گرجاکھ میں احمد ڈسپنسری کا افتتاح کیا اور اس کے بعد جامع مسجد گرجاکھ کے کارکنوں سے بھی خطاب فرمایا۔

۶. ۲۵ اکتوبر کو صبح ۹ بجے مرکزی مجلسِ شوریٰ کا اجلاس مولانا محمد عبد اللہ درخواستی مدظلہ کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں تازہ ترین صورتحال پر غور و خوض کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ کنونشن قانونی رکاوٹ کی وجہ سے شیرانوالہ باغ کی بجائے جامع مسجد نور نزد گھنٹہ گھر گوجرانوالہ میں ہوگا۔

۷. قائد جمعیۃ مولانا مفتی محمود نے ۲۵ اکتوبر کو صبح ۱۰ بجے مدرسہ قاسم العلوم لاہور میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کنونشن کے انتظامات پر روشنی ڈالی اور بعد ازاں جامع مسجد شیرانوالہ گیٹ لاہور میں خطبہ جمعۃ المبارک ارشاد فرمایا۔

۸. بیرونی مندوبین کی آمد ۲۴ اکتوبر سے ہی شروع ہوگئی تھی اور ۲۵ اکتوبر کی دوپہر تک مندوبین اتنی کثیر تعداد میں جمع ہوچکے تھے کہ انتظامیہ کو عصر کے بعد والے باضابطہ افتتاحی اجلاس سے قبل ظہر کی نماز کے بعد ایک غیر رسمی اجلاس کا اہتمام کرنا پڑا۔ اجلاس کی صدارت مولانا ابوبکر نائب امیر جمعیۃ بلوچستان نے کی، مولانا قاری نور الحق قریشی ایڈووکیٹ، طالب علم راہنما عبد المتین چودھری اور دیگر مقررین نے خطاب کیا۔

۹. مجلسِ استقبالیہ نے بیرونی وفود کی سہولت کے لیے جنرل بس اسٹینڈ، ریلوے اسٹیشن، شیخوپورہ چوک اور حافظ آباد روڈ پر معلوماتی کیمپ قائم کیے تھے جنہیں متعدّد بار پولیس نے اکھاڑنے کی کوشش کی مگر مولانا مفتی محمود کے شدید احتجاج پر ایس پی گوجرانوالہ نے پولیس کو مداخلت سے روک دیا۔

۱۰. کنونشن کا افتتاحی اجلاس ۲۵ اکتوبر کو عصر کے بعد جامع مسجد نور میں امیر مرکزی مولانا محمد عبداللہ درخواستی کی زیرِ صدارت شروع ہوا جس میں صدر مجلسِ استقبالیہ مولانا عبید اللہ انور نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔

۱۱. اسی روز بعد نماز عشاء دوسری نشست زیرِ صدارت مولانا محمد شریف وٹو نائب امیر مرکزی جمعیۃ علماء اسلام منعقد ہوئی جس سے مولانا ایوب جان بنوری امیر صوبہ سرحد، مولانا محمد خان شیرانی امیر صوبہ بلوچستان، مولانا عبد الغفور کوئٹہ، مولانا عبد الحمید سواتی اور مولانا عبد الکریم آف بیر شریف نے خطاب فرمایا۔

۱۲. ۲۶ اکتوبر کو صبح ۸ بجے مرکزی مجلسِ شوریٰ کا اجلاس منعقد ہوا جس میں جمعیۃ کے آئندہ لائحہ عمل پر غور کیا گیا اور اہم فیصلے کیے گئے۔

۱۳. کنونشن کی تیسری نشست ۲۶ اکتوبر کو ۱۰ بجے صبح زیرِ صدارت مولانا عبد الکریم آف بیر شریف نائب امیر مرکزی جمعیۃ علماء اسلام منعقد ہوئی جس میں مولانا محمد لقمان علی پوری، مولانا قاضی عبد اللطیف کلاچی، مولانا دل محمد سکھر اور دیگر مقررین نے خطاب کیا۔

۱۴. چوتھی نشست ۲۶ اکتوبر کو ۲ بجے نائب امیر مرکزی حضرت مولانا محمد شریف وٹو کی زیرِ صدارت انعقاد پذیر ہوئی۔ مولانا محمد رمضان صاحب میانوالوی، مولانا قاضی عبد الکریم صاحب ڈیرہ اسماعیل خان اور مولانا سعید احمد صاحب رائے پوری نے خطاب کیا۔ سید امین گیلانی نے اپنی تازہ ترین ولولہ انگیز نظموں سے سامعین کو نوازا۔ اس نشست کے آخر میں قائد جمعیۃ مولانا مفتی محمود نے اراکین و مندوبین کو ہدایات دیں۔ انہوں نے خصوصیت کے ساتھ جمعیۃ کے کارکنوں

کو تلقین کی کہ وہ ''ترجمان اسلام'' کی اشاعت کے لیے کوشش کریں، اور کہا کہ جمعیۃ کے ہر کارکن کے پاس جماعتی آرگن ہفت روزہ ترجمان اسلام کا ہونا ضروری ہے۔ نشست کے آغاز میں رانا شمشاد علی خان نے خطاب کیا۔

۱۵. کنونشن کی آخری نشست جلسہ عام کی صورت میں حضرت مولانا خان محمد صاحب سجادہ نشین خانقاہ سراجیہ کندیاں منعقد ہوئی جس سے خطاب کرتے ہوئے مولانا مفتی محمود نے جمعیۃ کے آئندہ لائحہ عمل کا اعلان کیا۔ اس نشست سے مولانا سید نیاز احمد گیلانی جنرل سیکرٹری جمعیۃ علماء اسلام پنجاب، جمعیۃ طلباء اسلام کے راہ نما جاوید پراچہ، عبدالمتین چودھری، حافظ محمد طاہر اور آخر میں مرکزی امیر مولانا محمد عبد اللہ درخواستی مدظلہ نے افتتاحی خطاب فرمایا۔ اور ٹھیک ۲ بجے رات حضرت الامیر کی دعا پر کنونشن اختتام پذیر ہوا۔

۱۶. ۲۶ اکتوبر کو عصر کی نماز کے بعد جمعیۃ علماء اسلام کی رضا کار تنظیم ''انصار الاسلام'' کے تقریباً ایک ہزار باوردی رضاکاروں کے جیش نے سالارِ اعظم حاجی کرامت اللہ کی قیادت میں قائد جمعیۃ مولانا مفتی محمود کو سلامی پیش کی۔ اس موقع پر مفتی صاحب نے جیش کا معائنہ کیا اور مختصر خطاب فرمایا۔

۱۷. کنونشن کی مختلف نشستوں میں اسٹیج سیکرٹری کے فرائض جمعیۃ کے مرکزی ناظم انتخابات قاری نور الحق ایڈووکیٹ اور مدیر ترجمان اسلام لاہور اکرام القادری نے سرانجام دیے۔ جبکہ جلسہ عام میں اسٹیج سیکرٹری کے فرائض جمعیۃ علماء اسلام کے مرکزی ناظم نشر و اشاعت مولانا زاہد الراشدی نے سرانجام دیے۔

۱۸. کنونشن کے انتظامات مجموعی طور پر تسلی بخش رہے۔ صوبہ سرحد، بلوچستان اور سندھ کے مندوبین کی رہائش کا انتظام مدرسہ انوار العلوم اور جامع مسجد شیرانوالہ باغ میں، پنجاب کے مندوبین کی رہائش مدرسہ نصرۃ العلوم میں، آزاد کشمیر کے مندوبین کی رہائش اکبری مسجد جی ٹی روڈ میں اور ارکانِ مجلسِ شوریٰ کے قیام کا مختلف دوستوں کی قیام گاہوں پر کیا گیا تھا۔ شیرانوالہ باغ میں کنونشن کی اجازت نہ ملنے کی وجہ سے جگہ کی قلت کے باعث بیرونی مہمانوں کو کچھ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا مگر مجموعی طور پر تمام انتظامات بخیر و خوبی انجام پائے۔

۱۹. مجلسِ استقبالیہ کے صدر مولانا عبید اللہ انور نے کنونشن کی شاندار کامیابی پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے جمعیۃ کے تمام ارکان کو ہدیۂ تبریک پیش کیا ہے اور کنونشن کی کامیابی میں حصہ لینے والے تمام حضرات کا شکریہ ادا کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ بعض ناگزیر حالات کے باعث جن مہمانوں کو

مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، مجلسِ استقبالیہ ان سے معذرت خواہ ہے اور انہیں یقین ہے کہ عظیم مقاصد کی خاطر ہمارے مہمان درگزر فرمائیں گے۔

تحریکِ واگزاریٔ مسجد نور گوجرانوالہ

(روزنامہ اسلام، لاہور — ۲۶ اکتوبر ۲۰۰۵ء)

نوید انور نوید ایڈووکیٹ کا انتقال

ان سطور کی تحریر کے وقت میں واشنگٹن میں ہوں اور ایک دو روز میں واپس روانگی کی تیاری کر رہا ہوں۔ گزشتہ شب گھر سے اہلیہ نے فون کیا تو اس میں یہ خبر بھی سنائی کہ نوید انور نوید ایڈووکیٹ کا انتقال ہو گیا ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ تفصیل پوچھی تو بتایا کہ اخبار میں ان کی وفات پر فاتحہ خوانی کی خبر پڑھی ہے اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں ہے۔ نوید انور نوید گوجرانوالہ کے معروف وکلاء میں سے تھے، تین بار ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر رہ چکے تھے اور غالباً اس سے قبل ایک بار سیکرٹری بھی رہے تھے۔ وہ سیاسی طور پر نوابزادہ نصر اللہ خان مرحوم کے پیروکاروں میں سے تھے اور پاکستان جمہوری پارٹی میں کچھ عرصہ سرگرمِ عمل رہے۔ ان کے ساتھ ہماری رفاقت کا بھی ایک دور گزرا ہے جس سے بہت سی یادیں وابستہ ہیں، یہ یادیں نئی نسل کی امانت ہیں اور اسی خیال سے انہیں احاطۂ تحریر میں لا رہا ہوں۔

نوید انور نوید مرحوم ۱۹۷۴ء کی تحریکِ ختمِ نبوت میں ایک پرجوش طالب علم رہنما کے طور پر ابھرے، شعلہ نوا مقرر اور سرگرم کارکن تھے اس لیے آگے بڑھتے چلے گئے۔ ایک ضمنی الیکشن میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے پیپلز پارٹی کے امیدوار کے مقابل آئے، شہری حلقہ تھا، انہوں نے انتخابی مہم کا بازار خوب گرم کیا، الیکشن تو نہ جیت سکے مگر اپنا تعارف کرا گئے۔ وہ مرکزی جامع مسجد کے خطیب اور مفتیٔ شہر حضرت مولانا مفتی عبد الواحد رحمہ اللہ سے متاثر تھے۔ مفتی صاحبؒ کے ہاں ان کا اکثر آنا جانا رہتا تھا اور حضرت مفتی صاحبؒ بھی ان کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کرتے تھے، اور اسی حوالے سے ہمارے ساتھ بھی اچھی راہ و رسم ہو گئی۔

پھر ۱۹۷۶ء میں نوید انور نوید مرحوم مسجد نور کی واگزاری کی تحریک کے قائد کے طور پر سامنے آئے اور بھٹو حکومت کے خلاف معرکہ کا ایک اور بازار گرم کر دیا جس کی یادیں کم و بیش تیس سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں تازہ ہیں۔ مدرسہ نصرۃ العلوم گھنٹہ گھر گوجرانوالہ کے ساتھ ملحق وسیع جامع مسجد کو مسجد نور کہا جاتا ہے جسے پیپلز پارٹی کی صوبائی حکومت نے محکمہ اوقاف کی تحویل میں لینے کا اعلان کر دیا تھا۔ مدرسہ نصرۃ العلوم کا نام لیے بغیر حکومت نے مسجد نور کو اس سے ملحقہ پینتالیس کمروں

سمیت اوقاف کی تحویل میں لینے کا نوٹیفیکیشن جاری کر دیا تھا۔ محکمہ اوقاف اس نوٹیفیکیشن کے مطابق مسجد و مدرسہ دونوں پر قبضہ کرنے کی تیاری کر رہا تھا کہ حضرت مولانا مفتی عبد الواحدؒ نے مجھے اور نوید انور نوید مرحوم کو بلایا اور فرمایا کہ یہ بڑا خطرناک فیصلہ ہے، اگر اس پر عمل ہو گیا تو ملک بھر میں مدارس پر سرکاری قبضے کا راستہ کھل جائے گا اس لیے اس کی مزاحمت ہونی چاہیے اور مؤثر احتجاج ہونا چاہیے، آپ نوجوان لوگ اس کی کوئی صورت نکالیں۔ اس پر ہم تیار ہو گئے اور مزاحمت کا فیصلہ کر لیا۔

مسجد نور میں جمعیت علماء اسلام کا کُل پاکستان نظامِ شریعت کنونشن

مسجد نور پر حکومت کے قبضے کے اس فیصلے کا پس منظر یہ تھا کہ اکتوبر ۱۹۷۵ء میں جمعیت علمائے اسلام پاکستان نے گوجرانوالہ میں کُل پاکستان نظامِ شریعت کنونشن منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور شیرانوالہ باغ میں علماء کرام اور دینی کارکنوں کے ملک گیر اجتماع کا پروگرام بنا لیا تھا۔ مگر عین وقت پر حکومت نے باغ میں کنونشن کی اجازت دینے سے انکار کر دیا جس کی وجہ سے یہ کنونشن جامع مسجد نور میں منعقد کیا گیا۔ ملک بھر سے پانچ ہزار کے لگ بھگ علماء کرام اور دینی کارکن اس کنونشن میں شریک ہوئے تھے۔ جمعیت کی مرکزی اور صوبائی قیادتیں بھرپور انداز میں شریک ہوئیں، استقبالیہ کے صدر حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ اور سیکرٹری مولانا مفتی عبد الواحدؒ تھے جبکہ ان کے نائب اور معاون کے طور پر راقم الحروف سرگرمِ عمل تھا۔

یہ ملک میں بھٹو حکومت کے عروج کا دور تھا اور قومی اسمبلی میں حزبِ اختلاف کے قائد مولانا مفتی محمودؒ کی جماعت کا اتنا بڑا اور کامیاب اجتماع پبلک پارک میں اجازت نہ دیے جانے کے باوجود منعقد ہو گیا تھا، اس لیے مدرسہ نصرۃ العلوم پر سرخ نشان لگا دیا گیا۔ اس کنونشن سے خطاب کرنے والے تیس سے زائد رہنماؤں کے خلاف ۱۶ ایم پی او کے تحت مقدمہ درج کیا گیا جن میں مقامی صرف میں تھا۔ جمعیت علمائے اسلام کی مرکزی مجلسِ شوریٰ نے قبل از گرفتاری ضمانتیں نہ کرانے کا فیصلہ کر لیا جس کی وجہ سے مجھے سب کی طرف سے فرضِ کفایہ ادا کرنا پڑا اور میں گرفتار ہو گیا، یہ میری زندگی میں پہلی گرفتاری تھی۔ تقریباً آٹھ دس دن ڈسٹرکٹ جیل گوجرانوالہ میں رہنے کے بعد ضمانت پر رہائی ہوئی۔

پیپلز پارٹی حکومت کا مسجد نور کو اوقاف کی تحویل میں لینے فیصلہ

اس کے چند ماہ بعد صوبائی محکمہ اوقاف کی طرف سے مسجد نور گھنٹہ گھر گوجرانوالہ کو اس سے ملحقہ تمام کمروں سمیت اپنی تحویل میں لینے کا نوٹیفیکیشن جاری ہو گیا جس کی مزاحمت کرنے کا ہم چند افراد نے حضرت مولانا مفتی عبد الواحدؒ کی سرپرستی میں عزم کر لیا۔ نوید انور نوید مرحوم اور راقم الحروف کے ساتھ جن حضرات نے اس تحریک میں سرگرم کردار ادا کیا ان میں علامہ محمد احمد لدھیانوی، مولانا سید عبد المالک

شاہ، ڈاکٹر غلام محمد اور مولانا صوفی رستم علی قادری بطور خاص قابلِ ذکر ہیں جنہوں نے اس تحریک کی کامیابی کے لیے دن رات ایک کر دیے۔

مسجد نور کی واگزاری کی تحریک

اس تحریک کو ”تحریکِ بحالئ مسجد نور“ کا نام دیا گیا اور اس کے لیے ”عوامی مجلسِ تحفظِ مساجد و مدارس“ کے نام سے باقاعدہ فورم قائم کیا گیا جس کے چیئرمین نوید انور نوید ایڈووکیٹ مرحوم تھے اور باقی ہم سب ان کے معاون طور پر شریک کار تھے۔ تحریک کی طرف سے اعلان یہ ہوا کہ مسجد نور و مدرسہ نصرۃ العلوم پر سرکاری قبضے کی مزاحمت کی جائے گی اور محکمہ اوقاف کے اس نوٹیفکیشن کی واپسی تک شہر میں احتجاجی طور پر گرفتاریاں پیش کرنے کی مہم چلائی جائے گی۔ طریق کار یہ طے ہوا تھا کہ ہفتہ میں دو دن پانچ پانچ کارکنوں کا گروپ شہر میں نافذ دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے گرفتاریاں پیش کرے گا۔ پہلے گروپ میں جس نے گرفتاریوں کے اس سلسلے کا آغاز کیا میرے چھوٹے بھائی مولانا عبدالحق خان بشیر، محمد زبیر بٹ، محمد یوسف انصاری اور شبیر احمد گوریلا شامل تھے، پانچویں ساتھی کا نام اس وقت میرے ذہن میں نہیں ہے۔

اس دوران محکمہ اوقاف نے ہمارے کچھ مقامی ”مہربانوں“ کے اشارے سے یہ چال چلی کہ حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی دامت برکاتہم، جو کہ ہمارے چچا محترم اور استاد و مربی ہیں، کی جگہ میرے چھوٹے بھائی مولانا عبدالقدوس قارن کو مسجد نور کا خطیب مقرر کرنے کا نوٹیفکیشن جاری کر دیا۔ اس کا مقصد ہمارے خاندان میں تفریق پیدا کرنا تھا اور دو بھائیوں حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم اور حضرت صوفی عبدالحمید سواتی دامت برکاتہم کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کرنا تھا جو ایک انتہائی خطرناک بات تھی۔ قارن صاحب کو یہ آرڈر ملا تو انہوں نے مجھ سے بات کی، میں نے ان سے کہا کہ یہ جتنی بڑی سازش ہے، جواب بھی اتنا ہی بڑا ہونا چاہیے۔ اس لیے آپ گرفتاری کے لیے تیار ہو جائیں اور کارکنوں کے مظاہرے کے موقع پر خطاب کرتے ہوئے سب کے سامنے یہ نوٹیفکیشن پڑھیں اور اس کے بعد اسے پرزے پرزے کرتے ہوئے اعلان کریں کہ میری طرف سے اس آرڈر کا یہ جواب ہے اور میں خود کو گرفتاری کے لیے پیش کرتا ہوں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا اور تقریباً پانچ ماہ کا عرصہ جیل میں گزارا۔

ہم پروگرام کے مطابق ہفتہ میں دو دن گرفتاریاں پیش کرتے اور مختلف مقامات پر احتجاجی جلسے کرتے۔ ابتدا میں ہم اعلان کر دیتے کہ فلاں جگہ سے فلاں وقت گرفتاریاں پیش کی جائیں گی، پولیس اس جگہ کو آکر گھیر لیتی اور کارکنوں کا بسا اوقات وہاں پہنچنا مشکل ہو جاتا۔ پھر ہم نے جگہ اور وقت کا پیشگی اعلان

کرنا چھوڑ دیا، کارکن اچانک کسی پُرہجوم جگہ پر کتبے اٹھائے نمودار ہوتے اور نعرہ بازی کرتے ہوئے ایک طرف بڑھنا شروع کر دیتے۔ پولیس افراتفری کے عالم میں وہاں پہنچتی اور کارکنوں کو گرفتار کرتی۔ گرفتاری کے لیے کارکنوں کو تیار کرنا، انہیں پروگرام کے مطابق گرفتار کروانا، گرفتاری کے بعد ان کی دیکھ بھال کرنا اور جیل میں موجود ساتھیوں کی خبر گیری کرنا ڈاکٹر غلام محمد، صوفی رستم علی قادری اور مولانا سید عبد المالک شاہ کے ذمہ تھا جنہوں نے بہت اچھے طریقے سے اس کام کو نبھایا۔ پریس سے رابطہ رکھنا، خبریں چھپوانا، لوگوں کو تازہ ترین صورتحال سے آگاہ کرنا اور اگلے پروگرام کی منصوبہ بندی کرنا نوید انور نوید اور راقم الحروف کا کام تھا جو ہم حضرت مولانا مفتی عبد الواحدؒ کی سرپرستی اور مشورہ کے ساتھ انجام دیا کرتے تھے۔

مولانا مفتی محمود کی آمد اور حمایت کا اعلان

اس دوران ہمارے بعض مہربان دوستوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ چند سرپھرے نوجوان ہیں جو بھٹو حکومت سے ٹکر لے کر پورے ملک کے علماء کرام اور دینی کارکنوں کے لیے مشکلات پیدا کر رہے ہیں، مرکزی قیادت میں کوئی ان کے ساتھ نہیں ہے اور یہ خوامخواہ ٹکراؤ اور مزاحمت کا راستہ اختیار کیے ہوئے ہیں جو حالات کے تقاضے اور حکمت و دانش کے خلاف ہے۔

میں نے اسلام آباد جا کر حضرت مولانا مفتی محمودؒ کو اس صورتحال سے آگاہ کیا تو انہوں نے کہا کہ وہاں جلسہ عام رکھو، میں فلاں دن آؤں گا اور اس تحریک کی حمایت کا اعلان کروں گا۔ چنانچہ وہ تشریف لائے، مسجد نور میں ہی جلسہ ہوا اور انہوں نے نہ صرف اس جلسہ میں تحریک کی مکمل حمایت کا اعلان کیا بلکہ قومی اسمبلی میں اپوزیشن لیڈر کے طور پر اپنی بجٹ تقریر میں اس تحریک کا ذکر کیا اور اس کی تائید کرتے ہوئے حکومت سے مسجد نور کو واگزار کرنے کا مطالبہ کیا۔

محکمہ اوقاف نے اس دوران مولانا عبد القدوس قارن کی گرفتاری کے بعد مرکزی جامع مسجد سیٹلائیٹ ٹاؤن گوجرانوالہ کے امام مولانا قاری محمد عبد اللہ کو مسجد نور کا خطیب مقرر کرنے کا آرڈر جاری کیا۔ وہ آرڈر لے کر حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی کے پاس آئے، حضرت صوفی صاحب نے ان سے کہا کہ اگر مسجد نور کے نمازی آپ کو بطور خطیب قبول کرتے ہیں تو تشریف لے آئیے، مگر مسجد نور کے نمازی تو کجا پورا شہر سراپا احتجاج تھا، اس لیے محترم قاری صاحب نے بھی محکمہ سے معذرت کر دی۔

تحریک کے راہنماؤں کی گرفتاریاں اور جیل

ہم چند افراد نے جو اس تحریک کو چلا رہے تھے اپنے بارے میں فیصلہ کر رکھا تھا کہ ہم گرفتاریاں نہیں دیں گے بلکہ کوشش کریں گے کہ گرفتار نہ ہوں تاکہ تحریک کا تسلسل قائم رہے۔ چنانچہ پولیس کے ساتھ ہماری آنکھ مچولی کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ مجھے مرکزی جامع مسجد شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ میں جمعہ پڑھانا ہوتا تھا جبکہ میری رہائش گکھڑ میں ہوا کرتی تھی جہاں سے میں جمعہ اور درس کے لیے گوجرانوالہ آیا کرتا تھا۔ پولیس جمعہ سے قبل مسجد کی ناکہ بندی کر لیتی اور عصر تک یہ ناکہ بندی رہتی، اس دوران پولیس کی آنکھوں سے بچ کر میں مسجد میں داخل ہوتا اور جمعہ پڑھا کر مسجد سے نکل بھی جاتا۔ پولیس کا اپنا طریقہ کار تھا اور ہمارا اپنا طریقہ کار تھا۔ کافی ہفتوں تک یہ آنکھ مچولی چلتی رہی اور پولیس اپنی پوری کوشش کے باوجود مجھے ناکہ بندی کے دوران گرفتار نہ کر سکی۔ اس دور میں گوجرانوالہ میں میاں عبدالرشید اے سی تھے جو بعد میں محکمہ اوقاف پنجاب کے سیکرٹری رہے ہیں۔ کافی عرصہ بعد جب وہ سیکرٹری اوقاف تھے میں ایک وفد کے ساتھ انہیں ملنے گیا اور اپنا تعارف کرانا چاہا تو بولے کہ میں آپ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ ہم نے آپ کی گرفتاری کے لیے مسجد نور کی تحریک کے دوران بہت جتن کیے لیکن اس میں کامیاب نہ ہوئے، آخر آپ کس طرح پولیس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتے تھے؟ میں نے گزارش کی کہ یہ "پیشہ وارانہ راز" ہے جو میں آپ کو نہیں بتا سکتا۔

لیکن میں مسجد نور کی تحریک کے دوران بعد میں گکھڑ سے گرفتار ہوگیا اور تقریباً ساڑھے تین ماہ جیل میں رہنے کے بعد ۲۸ اکتوبر کو میری رہائی ہوئی جو میرا یومِ پیدائش بھی ہے۔ اسی دوران نوید انور نوید مرحوم بھی گرفتار ہوگئے اور تحریک کو جاری رکھنے کی تمام تر ذمہ داری مولانا سید عبد المالک شاہ، ڈاکٹر غلام محمد، صوفی رستم علی قادری اور ان کے رفقاء پر آگئی اور انہوں نے کمال ہمت سے کام لے کر تحریک کے تسلسل کو ٹوٹنے نہ دیا۔ نوید انور نوید مرحوم احتجاج کے نت نئے طریقے ایجاد کرنے اور نئے نئے انداز میں احتجاجی خبریں بنانے کے ماہر تھے۔ وہ خود کو اس معاملے میں آغا شورش کاشمیری مرحوم کا شاگرد کہا کرتے تھے۔ انہوں نے جیل میں بھوک ہڑتال کر دی اور کئی دن تک اس حوالے سے خبروں کا بازار گرم رکھا۔ تحریک میں گرفتاری کے لیے ملتان، شیخوپورہ، جہلم، شاہ کوٹ، وزیرآباد، لاہور اور دیگر مقامات سے بھی کارکن آئے اور خود کو اس قربانی کے لیے پیش کیا۔ دینی کارکنوں کے علاوہ مسلم لیگ گوجرانوالہ کے ایک پُرجوش رہنما خواجہ انور مرحوم نے بھی گرفتاری دی اور کافی دنوں تک جیل میں رہے۔

سپر نٹنڈنٹ جیل کی طرف سے رعایت

ڈسٹرکٹ جیل کے سپر نٹنڈنٹ چودھری یار محمد درانہ تھے جو شریف اور جری آدمی تھے۔ جبکہ اوقاف کے صوبائی وزیر رانا محمد اقبال ایڈووکیٹ تھے جو گوجرانوالہ سے تعلق رکھتے ہیں اور انہی کے حکم سے مسجد نور کو تحویل میں لینے کا نوٹیفیکیشن جاری ہوا تھا۔ چنانچہ ہمارا براہ راست انہی سے مقابلہ تھا، اتفاق سے جیل خانہ جات کے وزیر بھی وہی تھے۔ ایک دن سپر نٹنڈنٹ صاحب نے مجھے دفتر میں بلایا اور کہا کہ جن سے آپ کی لڑائی ہے جیلوں کے وزیر بھی وہی ہیں۔ وہ آپ لوگوں کے بارے میں جو کچھ مجھے کہہ سکتے ہیں اس کا آپ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں لیکن آپ اپنے ساتھیوں کو کنٹرول میں رکھیں، اگر آپ حضرات کی طرف سے جیل کے قواعد وضوابط کی خلاف ورزی کا کوئی مسئلہ نہ پیدا ہو تو اوپر کا دباؤ میں سنبھال لوں گا۔ چنانچہ ہم نے بھی کوشش کی کہ ان کے لیے کوئی مسئلہ کھڑا نہ ہو اور انہوں نے بھی تمام تر دباؤ کے باوجود ہمارے ساتھ سلوک مناسب ہی رکھا۔ جیل میں ہمارے لیے دو بیرکیں تھیں، ان میں اگر کچھ دوسرے قیدی تھے تو وہ بھی ہمارے مزاج کے ہی تھے اس لیے نمازوں، درس، مجلسِ ذکر اور دیگر معمولات کا سلسلہ چلتا رہا۔

دیگر مکاتبِ فکر کی طرف سے حمایت

مجموعی طور پر دو سو کے لگ بھگ افراد گرفتار ہوئے اور تقریباً تین ماہ تک یہ تحریک چلتی رہی۔ شہر کے مختلف مکاتبِ فکر کے علماء کرام نے ہمارا ساتھ دیا۔ احتجاجی جلسوں میں خطاب کرنے والوں میں علامہ محمد احمد لدھیانوی، مولانا احمد سعید ہزاروی، حافظ گلزار احمد آزاد، مولانا فضل الرازق مرحوم اور مولانا علی احمد جامی کے علاوہ بریلوی مکتبِ فکر سے مولانا رحمت اللہ نوری اور مولانا خالد حسن مجددی، جبکہ اہلِ حدیث مکتبِ فکر سے مولانا عبدالرحمٰن واصل مرحوم بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ بلکہ مرکزی جامع مسجد منعقدہ ایک جلسہ میں ایسا بھی ہوا کہ سامعین میں شیعہ مکتبِ فکر کے معروف رہنما اور کھیالی دروازہ کی امام بارگاہ کے خطیب خواجہ محمد وارث بھی موجود تھے، انہوں نے ایک مقرر کی پُرجوش تقریر کے دوران وہیں سے ہاتھ کھڑے کر کے اعلان کیا کہ میں بھی آپ کے ساتھ ہوں، دوسرے دن انہیں گرفتار کر لیا گیا اور چند روز جیل میں رہنے کے بعد وہ ضمانت پر رہا ہوئے۔

قومی پریس کی حمایت

قومی پریس نے اس مہم میں ہمارا بھرپور ساتھ دیا اور گوجرانوالہ کی اس احتجاجی تحریک نے ملک گیر شہرت حاصل کر لی۔ اس دوران ایک موقع پر میں ملاقات کے لیے نوائے وقت کے چیف ایڈیٹر محترم

جناب مجید نظامی کے پاس گیا تو انہوں نے تحریک کی رفتار پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ”راشدی صاحب! یہ ٹیسٹ کیس ہے“۔ میں نے گزارش کی کہ ہم بھی اسے ٹیسٹ کیس سمجھ کر ہی یہ جنگ لڑ رہے ہیں۔ قومی اسمبلی میں حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے اس تحریک کے لیے آواز اٹھائی جبکہ پنجاب اسمبلی میں اپوزیشن لیڈر علامہ رحمت اللہ ارشد مرحوم اور جناب تابش الوری نے کلمۂ حق بلند کیا اور اس طرح یہ تحریک جو ایک شہر میں ایک مسجد کی واگزاری کے لیے شروع کی گئی تھی اس کی اہمیت قومی اور صوبائی سطح پر محسوس کی جانے لگی۔

مدرسہ میں دورۂ تفسیر القرآن کا آغاز

دورانِ تحریک ایک اور مسئلہ سامنے آگیا کہ مدرسہ نصرۃ العلوم کے دارالاقامہ میں کم و بیش تین سو کے لگ بھگ طلبہ ہر وقت مقیم رہتے ہیں، ان کی مدرسہ میں موجودگی اور شہر میں گرفتاریوں اور مظاہروں کی فضا اس بات میں رکاوٹ رہی کہ حکومت پولیس ایکشن کے ذریعے مسجد و مدرسہ پر قبضے کے لیے کوئی عملی قدم اٹھائے کیونکہ اس صورت میں بڑے تصادم کا خطرہ تھا۔ مگر شعبان اور رمضان المبارک کی تعطیلات میں مدرسہ خالی رہتا تھا اور اس بات کا امکان موجود تھا کہ اس دوران پولیس ایکشن کے ذریعے محکمہ اوقاف مدرسہ پر قبضہ کر لے۔ یہ امکان اس لیے بھی زیادہ محسوس ہو رہا تھا کہ صوبائی وزیر اوقاف اسی شہر سے تعلق رکھتے تھے اور انہوں نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنا رکھا تھا۔ اس صورتحال سے نمٹنے کے لیے یہ طے پایا کہ شعبان و رمضان کی تعطیلات کے دوران مدرسہ کو خالی نہ رہنے دیا جائے اور دورۂ تفسیر القرآن شروع کر دیا جائے۔ چنانچہ والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم نے پہلا دورۂ تفسیر شعبان اور رمضان المبارک کے دوران اسی سال پڑھایا۔ یہ سلسلہ ۱۹۹۶ء تک کم و بیش اکیس سال جاری رہا جس سے ملک بھر کے ہزاروں علماء و طلبہ نے استفادہ کیا اور اس طرح اس معاملہ میں خیر کا یہ پہلو بھی نکل آیا۔

رمضان المبارک ہم نے جیل میں گزارا اور عید بھی وہیں کی۔ تراویح میں قرآن کریم بھی مختلف حفاظ نے سنایا اور اسباق کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ ہمارا طریق کار یہ تھا کہ جو کارکن خود گرفتاری پیش کرتے ان کی ضمانت نہیں کرائی جاتی تھی، اور جن کو پولیس اپنے طور پر گرفتار کرتی ان کی ضمانت پر رہائی کا انتظام کیا جاتا تھا۔ ضمانت عام طور پر ہو جایا کرتی تھی بلکہ حکومت کی خواہش ہوتی تھی کہ گرفتار شدگان ضمانت پر رہا ہو کر گھروں کو جائیں۔ مگر تحریک کا فیصلہ یہ تھا کہ جب تک حکومت مسجد نور کو اوقاف کی تحویل میں لینے کا نوٹیفکیشن واپس نہیں لیتی گرفتار شدگان ضمانتیں نہیں کرائیں گے اور جیل میں ہی رہیں گے۔ بالآخر کارکنوں کی ثابت قدمی اور تحریک کے ملک میں پھیلتے ہوئے اثرات کو دیکھ کر وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے

مداخلت کی اور صوبائی حکومت نے مسجد نور کو تحویل میں لینے کا آرڈر واپس لے لیا جس پر یہ تحریک کامیابی کے ساتھ اپنے انجام کو پہنچی۔

نوید انور نوید مرحوم اس تحریک میں ہمارے سربراہ تھے۔ ان کا دماغ، زبان، قلم اور جسم اس تحریک کے لیے مسلسل حرکت میں رہے اور ان کے جنون نے ہمیں بھی مسلسل حرکت میں رکھا۔ نوید انور نوید مرحوم کے ساتھ ہمارا بہت اچھا وقت گزرا۔ وہ دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے کھرے دشمن تھے۔ انہوں نے ختمِ نبوت کے تحفظ کی تحریک میں بھی بطور کارکن اور پھر بطور وکیل ہمیشہ سرگرم کردار ادا کیا اور بے لوث خدمات سرانجام دیں۔ ان کی جدوجہد اور تگ و تاز کی بہت سی یادیں ذہن کے گوشوں میں محفوظ ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دیں، نیکیاں قبول کریں، گناہوں سے درگزر کریں اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

زیڈ اے سلہری صاحب! اپوزیشن ناکام نہیں ہے!

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور ـــ ۲۳ اپریل ۱۹۷۶ء)

معروف صحافی جناب زیڈ اے سلہری کا ایک مضمون ''اپوزیشن ناکام کیوں ہے؟'' کے زیرِ عنوان روزنامہ جنگ راولپنڈی ۱۸ اپریل ۱۹۷۶ء کے شمارہ میں شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے اپوزیشن کو ناکام قرار دیتے ہوئے اس کی ناکامی کے اسباب و عوامل کا تجزیہ فرمایا ہے۔ اس سلسلہ میں چند گزارشات پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ تصویر کا دوسرا رخ بھی قارئین کے سامنے آسکے۔

سب سے پہلے تو یہ دعویٰ غور طلب ہے کہ ''اپوزیشن ناکام ہے'' اس لیے کہ بظاہر اگرچہ حکمران گروہ کے مسلسل پراپیگنڈا، وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے شب و روز دوروں اور سیاستدانوں کی دھڑادھڑ پیپلزپارٹی میں شمولیت سے یہی تاثر ملتا ہے کہ اپوزیشن رائے عامہ کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب نہیں ہوسکی لیکن ذرا گہری نظر سے اس صورتحال کا جائزہ لیا جائے تو اس تاثر کو ایک سرسری بلکہ سطحی تاثر سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں دی جاسکتی۔

ملک کا سیاسی منظر نامہ

ذرا ملک کے سیاسی منظر پر ایک نگاہ ڈالیے آپ دیکھیں گے کہ

- حکمران سیاسی جماعت کے سوا باقی تمام سیاسی جماعتیں حتیٰ کہ حکمران سیاسی پارٹی کی حلیف سیاسی جماعت ''قیوم لیگ'' تک ملک میں سیاسی عمل کے تعطل، اظہار رائے پر پابندی اور دفعہ ۱۴۴ کے مسلسل نفاذ کی شاکی ہے۔ اور عملاً صورتحال یہ ہے کہ ملک کے کسی بھی حصہ میں اجتماع کی آزادی حاصل نہیں ہے، اخبارات و جرائد کو بے بس کر دیا گیا ہے۔ جسارت، شہباز، مہران، اداکار، لیل و نہار، صحافت اور درجنوں دیگر جرائد و اخبارات موت کے گھاٹ اتر چکے ہیں۔ ریڈیو، ٹی وی، سرکاری اخبارات اور دیگر ذرائع ابلاغ سے بے بنیاد یکطرفہ پروپیگنڈا شب و روز جاری ہے۔
- اپوزیشن راہنماؤں کی کردارکشی کا مذموم عمل جاری ہے۔

- سیاسی قیدیوں کے ساتھ انسانیت سوز اور شرمناک سلوک ہو رہا ہے۔ حتیٰ کہ صوبہ سرحد کے بے شمار نوجوانوں کو جدید آلاتِ اذیت رسانی کے ذریعے ٹارچر کیا گیا ہے اور انہیں ان کے جسمانی اعضاء تک سے محروم کر دیا گیا ہے۔
- فوج کو سیاست سے علیحدہ رکھنے کے اہم قومی تقاضا کو نظر انداز کیا گیا ہے اور سیاسی مخالفین پر فوج کشی کی یحییٰ خانی روایت کو دہرایا جا رہا ہے۔
- اپوزیشن کے جلسوں کو غنڈہ گردی کے ذریعے منتشر کرنے کی روایت اپنائی گئی ہے اور لیاقت باغ راولپنڈی اور شاد باغ لاہور کا شرمناک المیہ قوم کی نگاہوں کے سامنے ہے۔
- اپوزیشن کا نقطۂ نظر شائع کرنے پر پریس مالکوں کے خلاف مقدمات درج کیے جا رہے ہیں اور انہیں گرفتار کیا جا رہا ہے۔
- اسمبلی میں اپوزیشن کے اختلاف رائے کو برداشت نہیں کیا جاتا اور حزبِ اختلاف کے ارکان اسمبلی کو جبراً اٹھا کر باہر پھینک دیا گیا ہے۔

اس صورتحال میں جب اپوزیشن اجتماع کے حق سے محروم ہے، جلوس نہیں نکال سکتی، ریڈیو اور ٹی وی پر اس کا نقطۂ نظر پیش کرنے کی بجائے اس کے خلاف پروپیگنڈا جاری ہے، اسے پریس کی آزادی کماحقہٗ میسر نہیں ہے اور اخبارات و جرائد اس کی ترجمانی نہیں کر سکتے، سلہری صاحب ارشاد فرمائیں کہ اپوزیشن رائے عامہ کو ساتھ ملانے کے لیے کونسا راستہ اختیار کرے؟ جب قانون و آئین کے راستے تمام کے تمام بند بلکہ مقفل ہیں تو کیا سلہری صاحب اپوزیشن کو یہ مشورہ دینا چاہتے ہیں کہ وہ تمام قانونی راستے بند پا کر رائے عامہ کو منظم کرنے کے لیے غیر قانونی راستہ تلاش کرے؟

اس سے قطع نظر اگر دیکھا جائے تو عوام اور اپوزیشن کے درمیان امتناعی قوانین و احکامات کی بلند و بالا دیواریں کھڑی کر دینے سے یہ نتیجہ تو اخذ کیا جا سکتا ہے کہ حکمران گروہ اپوزیشن کی مقبولیت سے خائف ہے اور عوام کے ساتھ اپوزیشن کے رابطہ کی صورت میں حکمران گروہ کو اپنا سیاسی مستقبل مخدوش نظر آتا ہے، لیکن اس سیاسی تعطل سے حکومتی گروہ کی مقبولیت کا تاثر لینا کسی صورت درست نہیں ہو سکتا۔ یہ اپوزیشن کی کامیابی کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ اس نے حکمران گروہ کو رائے عامہ کی حمایت کے اعتماد سے محروم کر کے دفعہ ۱۴۴، ڈی پی او، فیڈرل فورس، فوج، پولیس اور تحفظِ امنِ عامہ کے امتناعی قوانین کی بیساکھیوں کے سہارے چلنے پر مجبور کر دیا ہے اور آج انتظامی قوت اور امتناعی قوانین ہی جناب وزیراعظم بھٹو کی سیاسی قوت کا واحد سرچشمہ ہیں۔

قائدِ حزبِ اختلاف مولانا مفتی محمود کا چیلنج

چنانچہ وزیرِاعظم بھٹو قومی اسمبلی میں قائدِ حزبِ اختلاف مولانا مفتی محمود کے ساتھ اس دیرینہ چیلنج کا آج تک سامنا نہیں کر سکے کہ

"اگر مسٹر بھٹو فیڈرل سکیورٹی فورس اور پولیس کے بغیر ملک میں ایک جلسہ بھی کر دکھائیں تو میں سیاست سے دستبردار ہو جاؤں گا۔"

میں سلہری صاحب سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ مسٹر بھٹو کی جس سیاسی پیش قدمی کی انہوں نے مدح سرائی فرمائی ہے کیا وہ یہی ہے؟ یا اس کے سوا اس کا کوئی اور پہلو بھی ہے؟

بھٹو کا موازنہ ایوب اور یحییٰ سے

محترم سلہری صاحب نے موجودہ سیاسی صورتحال کا مرحوم ایوب خان کے آخری دور سے موازنہ کر کے مسٹر بھٹو کی سنسنی خیز سیاست کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے اور فرمایا ہے کہ

"موجودہ اپوزیشن میں آپ کو کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جو اس طرح وزیرِاعظم بھٹو کا متبادل ہو جیسے وہ خود صدر ایوب یا یحییٰ کے نظر آتے تھے۔"

گویا سلہری صاحب کے نزدیک اپوزیشن کی سیاست کا معیار وہ ہے جس کا مظاہرہ بھٹو صاحب نے ایوب خان مرحوم اور یحییٰ خان کے دور میں کیا تھا۔ لیکن گستاخی معاف کیا سلہری صاحب اس سنسنی خیز سیاست کے نتائج سے بے خبر ہیں؟ اور کیا وہ اب بھی یہی چاہتے ہیں کہ کوئی سیاستدان اٹھے، عوام کے مزاج کے مطابق انتخابی نعرہ تراشے اور ڈگڈگی بجاتا ہوا پوری قوم کو آگے لگا لے۔ اگر عوام کے دکھوں اور مجبوریوں سے کھیلنا اور انہیں خوش فہمیوں کا شکار کر کے سیاسی مقاصد حاصل کرنا سیاست ہے تو یہ سیاست چار حرف بھیجنے کے لائق ہے۔ اسی ہنگامہ خیز اور سنسنی آمیز سیاست کے نتیجہ میں تو وطنِ عزیز دولخت ہوا ہے اور بدقسمتی سے سلہری صاحب آج پھر سیاستدانوں کو اسی سیاست کا سبق پڑھانا چاہتے ہیں۔

متبادل قیادت کے فقدان کا معاملہ

باقی رہی متبادل قیادت کے فقدان کی بات تو یہ کوئی نئی بات نہیں۔ غلام محمد کے دور میں بھی یہی بات کہی جاتی تھی، سکندر مرزا کا دور بھی ان دعوؤں سے خالی نہیں ہے، مرحوم ایوب خان کے مداح تو یہ کہا کرتے تھے کہ پورے ملک میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جو ان کا جانشین بن سکے، اور اب مسٹر بھٹو کے دور میں بھی متبادل قیادت کے فقدان کا رونا رویا جا رہا ہے۔

یہ ایک سیاسی بات ہے جو ہر حکمران کے مداح نے کہی ہے اور آئندہ بھی کہی جاتی رہے گی۔ لیکن کوئی انسان اس دنیا میں عقلِ کُل نہیں ہے اور نہ ہی کسی کے جانے سے دنیا کا نظام بگڑ جاتا ہے۔ اپوزیشن میں مسٹر بھٹو سے بھی زیادہ ذہین، زیرک، معاملہ فہم اور محبِ وطن سیاستدان موجود ہیں جو ملک کی باگ ڈور سنبھال کر اسے مصائب و مشکلات کے بھنور سے نکال سکتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اپوزیشن نے حکمران گروہ کے بے پناہ جبر و تشدد اور غیر آئینی و غیر قانونی ہتھکنڈوں کے باوجود تحمل کے ساتھ چلنے اور مشتعل نہ ہونے کا جو رویہ اختیار کیا ہے وہ اپوزیشن راہنماؤں کی سیاسی بصیرت اور حب الوطنی کا واضح ثبوت ہے۔ اپوزیشن کے لیے مسٹر بھٹو کی طرح ہنگامہ خیز سیاست کو اختیار کر لینا کوئی مشکل کام نہیں ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس کا فائدہ کسے ہوگا؟ یہ درست ہے کہ اپوزیشن کا طرزِ عمل تحمل، بردباری، اصول و اخلاق اور آئین کے دائرہ میں رہتے ہوئے دھیرے دھیرے سے چلنا ہے مگر قوم کے مزاج کو دیکھ کر اس کے مطابق حکمتِ عملی ترتیب دینا تو کوئی عزیمت کی بات نہیں۔ بسا اوقات قوم کے مزاج کے خلاف چلنا اور قوم کے مزاج کو تبدیل کے لیے محنت کرنا بھی ضروری ہو جاتا ہے جیسا کہ اب ضروری ہے۔ کیونکہ سیاست کو قومی مزاج کے دھارے کے ساتھ بہا دینے کے نقصانات ہمارے سامنے آ چکے ہیں، ہم نے ہنگامہ خیز سیاست سے بہت خسارہ اٹھایا ہے اور اب ضرورت اس بات کی ہے کہ لوگوں کو بااصول سیاست کا عادی بنایا جائے تاکہ صاف ستھرا سیاسی عمل ملک میں پنپ سکے۔

اس لیے میں بڑے ادب کے ساتھ محترم جناب زیڈ اے سلہری سے گزارش کروں گا کہ وہ اپوزیشن کو عجلت پسندی اور ہنگامہ خیزی کا مشورہ دینے کی بجائے وزیر اعظم بھٹو کو اس بات پر آمادہ کرنے کے لیے اپنی صلاحیتیں صرف کریں کہ وہ اس قسم کی سیاست کے اعادہ سے ملک و قوم کو بچائیں جس کا مظاہرہ خود انہوں نے ایوب خان اور یحییٰ خان کے دور میں کیا تھا اور جس کے منفی نتائج آج پوری قوم بھگت رہی ہے۔ اور اپوزیشن کو جبر و تشدد کے ذریعے ہنگامہ خیز سیاست کا خوگر بنانے کی بجائے ملک میں سیاسی آزادیاں بحال کریں، دفعہ ۱۴۴ اور ڈی پی او کا اندھا دھند استعمال ختم کریں، اخبارات و جرائد کو رائے عامہ کی آزادانہ ترجمانی کا موقع فراہم کریں، ریڈیو اور ٹی وی سے اپوزیشن کو بھی اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کا حق دیں تاکہ صحیح سیاسی عمل کے ذریعے متبادل قیادت سامنے آ سکے۔ کیونکہ متبادل قیادت آزادانہ سیاسی عمل کے ذریعے ہی سامنے آیا کرتی ہے۔ جبر، سیاسی تعطل اور گھٹن سے ہمیشہ بچہ سقہ فائدہ اٹھاتے ہیں اور پاکستان کو اب کسی بچہ سقہ کی ضرورت نہیں ہے۔

جیلوں کے نظام میں اصلاح کی ضرورت

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۱۲ نومبر ۱۹۷۶ء)

گزشتہ سال اکتوبر ۱۹۷۵ء میں جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کے زیر اہتمام مسجد نور گوجرانوالہ میں منعقد ہونے والے ''کل پاکستان نظامِ شریعت کنونشن'' کی آخری نشست میں قرار دادیں پڑھ کر سنانے کے جرم میں گوجرانوالہ پولیس کی مہربانی سے دسمبر ۱۹۷۵ء میں تحفظِ امنِ عامہ آرڈیننس کی دفعہ ۱۶ کے تحت پہلی بار جیل یاترا کا موقع ملا، لیکن صرف ۹ دن ڈسٹرکٹ جیل گوجرانوالہ میں رہنے کے بعد ضمانت پر رہائی ہوگئی۔

اس سال اسی کنونشن کے انعقاد کی اجازت دینے کی پاداش میں محکمہ اوقاف پنجاب نے مسجد نور اور اس کے ساتھ مدرسہ نصرۃ العلوم کو اپنی تحویل میں لینے کا اعلان کیا تو گوجرانوالہ کے دینی وسیاسی حلقوں نے اسے سیاسی انتقام کی کاروائی قرار دیتے ہوئے شدید احتجاج کیا۔ اور مختلف مکاتبِ فکر کے نوجوانوں نے معروف طالب علم راہنما جناب نوید انور نوید کی قیادت میں ''عوامی مجلسِ تحفظ مساجد و مدارس'' قائم کر کے احتجاجی تحریک کا آغاز کر دیا جس کے تحت ڈیڑھ سو سے زائد کارکن گرفتار ہوئے اور بالآخر صوبائی وزیر اوقاف کی طرف سے مسجد نور کی واگزاری کے وعدہ پر تحریک روک دی گئی۔

اس تحریک کے دوران ۹ جولائی ۱۹۷۶ء کو عوامی مجلس کے زیر اہتمام جامع مسجد شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ میں احتجاجی جلسہ عام سے خطاب کرنے کے جرم میں گوجرانوالہ پولیس نے تحفظِ امنِ عامہ آرڈیننس کی دفعہ ۱۶ کے تحت ۱۰ جولائی کو میری رہائش گاہ گکھڑ سے مجھے گرفتار کر کے ۱۱ جولائی کو ڈسٹرکٹ جیل میں عوامی مجلس کے اسیر کارکنوں کے پاس پہنچا دیا۔ اس دفعہ بحمد اللہ تعالیٰ جیل کی اندرونی زندگی کا جائزہ لینے اور جرم و سزا کے ماحول میں بسنے والے انسانوں کا مطالعہ کرنے کا کافی موقع ملا اور بالآخر تین ماہ اٹھارہ دن جیل میں گزارنے کے بعد ۲۸ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو اپنی انتیسویں سالگرہ کے دن ضمانت پر جیل سے رہا ہوا۔

اس دوران جیل کے اندر کی زندگی کو جس طرح دیکھا اور اس کے بارے میں جو کچھ محسوس کیا اس کی داستان تو بہت طویل ہے لیکن چند اہم امور کی طرف حکومت وقت اور رائے عامہ کو توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں۔ کیونکہ ایسے معاملات میں خاموش رہنا اور ضمیر کی آواز کو اربابِ حل و عقد تک نہ پہنچانا اسلامی تعلیمات کی رو سے دینی و ملی جرم شمار ہوتا ہے۔

جرائم کی بیخ کنی اور اسلامی قوانین

ایک بات جو سب سے زیادہ محسوس ہوئی اور جس نے اسلام کے عادلانہ نظام پر یقین و ایمان کو مزید استحکام بخشا، یہ ہے کہ ہماری جیلوں کی چہل پہل اور رونق اسلامی نظام عدل و انصاف سے گریز اور مروجہ نظام عدل و انصاف کی سست روی اور پیچیدگی کے باعث ہے۔ اور مروجہ قوانین کی پیچیدگیاں ہی معاشرے میں جرائم کے اضافہ کا سب سے بڑا سبب ہیں۔ اگر ان کی جگہ اسلامی قوانین کا نفاذ عمل میں لایا جائے تو جرائم کی رفتار کو بڑی حد تک کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔

مثلاً قتل کو ہی لیجئے، یہ جرم ہمارے معاشرے میں سے زیادہ ہوتا ہے اور جیلوں کی چار دیواری کے اندر جھانک کر دیکھیے آپ کو قتل کے ملزم دوسروں سے زیادہ نظر آئیں گے۔ اور اس قبیح جرم کے محرکات میں پہلے نمبر پر

- انتقامی جذبات،
- دوسرے نمبر پر زمینوں وغیرہ کے جھگڑے،
- اور تیسرے نمبر پر عصمت وغیرت کا سوال دکھائی دیتا ہے۔

اور تینوں صورتوں میں اس قدر قبیح جرم کا ارتکاب کرنے والے افراد یہ سوچ کر انتہائی قدم اٹھاتے ہیں کہ مروجہ نظامِ قانون میں ان کے دلی اطمینان اور مشتعل جذبات کی تسکین کی ضمانت نہیں ہے۔ اس لیے وہ قانون کی پیچیدگیوں کے باعث پیدا ہو جانے والے خلا کو قانون کو ہاتھ میں لے کر پُر کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس کے نتیجے میں رفتہ رفتہ معاشرہ اخلاقی انارکی کے جہنم کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کی بجائے اگر اسلام کے سادہ اور ٹھوس نظام انصاف کے ذریعہ ایک مقتول کے وارثوں کو ان کا انتقامی حق دلوا دیا جائے اور انہیں یقین ہو جائے کہ نظامِ قانون میں ان کی دادرسی کی مکمل ضمانت موجود ہے تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ انتقامی قتل کا سلسلہ کافی حد تک رک سکتا ہے۔

اسی طرح اگر زمینوں کی تقسیم شرعی اصولوں کے مطابق ہو، اس تقسیم کی پشت پر قانون کی قوت کے ساتھ ساتھ نظریاتی وابستگی اور اخلاقی قوت بھی فراہم ہو جائے اور ہر شخص کو یقین ہو کہ ٹھوس اور مستحکم نظامِ قانون کی وجہ سے کوئی شخص اس کا حق نہیں دبا سکتا تو زمین کے جھگڑوں اور ان کے نتیجے میں قتل و غارت کو روکا جا سکتا ہے۔

اور اگر بدکاری کا شرعی قوانین کے مطابق سدباب کر دیا جائے، زنا و شراب وغیرہ کی شرعی سزائیں نافذ ہو جائیں اور بے پردگی کو ممنوع قرار دے دیا جائے تو غیرت کے سوال پر ہونے والے قتلوں کا سلسلہ بھی روکا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ اسی صورت میں ممکن ہے جب موجودہ قوانین اور سست رو اور پیچیدہ

نظام انصاف کی جگہ مکمل اسلامی قوانین اور اسلامی نظام انصاف نافذ کر دیا جائے، اس کے بغیر معاشرہ کو قتل اور اس جیسے دیگر جرائم سے پاک نہیں کیا جا سکتا۔

جیل میں اخلاقی تربیت

جیل کے بارے میں عام طور پر یہ تصور پایا جاتا ہے کہ مجرم کو مزید جرم سے روکنے اور اس کی اصلاح و تربیت کے لیے اسے جیل میں بند کیا جاتا ہے۔ یہ بات ٹھیک ہے لیکن اصلاح و تربیت والی بات جیل میں کہیں نظر نہیں آتی۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا کہ جیل میں ہم پیشہ مجرموں کو باہمی ملاقات، ایک دوسرے کے طریقہ ہائے واردات سے آگاہی، اور جرائم کی مزید تربیت کا کافی موقع مل جاتا ہے۔ اور ایک مجرم جب جیل سے باہر آتا ہے تو پہلے سے زیادہ مجرمانہ ذہن اور خود اعتمادی سے بہرہ ور ہوتا ہے۔

حالانکہ جیل میں مجرمانہ ذہن کی حوصلہ شکنی اور اخلاقی تربیت کا معقول انتظام ہونا چاہیے۔ اور اصلاح و تربیت کے نقطۂ نظر سے یہ ضروری ہے کہ ہر جیل میں ایک مسجد ہو جس میں باجماعت نماز کی ادائیگی کا اہتمام ہو اور جیل حکام قیدیوں اور حوالاتیوں سے نماز کی پابندی کروائیں۔ اس مسجد کے ساتھ ایک درسگاہ ہو جس میں قرآن و حدیث کی تعلیم کا بندوبست کیا جائے۔ حوالاتیوں اور قیدیوں کو، جن کے پاس وافر وقت ہوتا ہے، قرآن کریم کا ترجمہ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے مقدس اصحاب کرام رضی اللہ عنہم کے حالات زندگی، اخلاقی تعلیمات پر مشتمل مختصر رسالے، اور خصوصاً جرائم کے بارے میں قرآن و حدیث کے ارشادات اہتمام کے ساتھ پڑھائے جائیں۔ تاکہ ان کے ذہنوں میں جرائم سے نفرت پیدا ہو اور وہ شریف شہری کی حیثیت سے اپنے فرائض سرانجام دینے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوں۔

اس کے علاوہ جو افراد پڑھنا لکھنا نہیں جانتے، انہیں پڑھنا لکھنا سکھایا جائے اور وقتاً فوقتاً دینی و اخلاقی تعلیمات پر ہلکا پھلکا لٹریچر جیلوں میں تقسیم کیا جاتا رہے۔ بالخصوص بچوں کی تعلیم و تربیت سے غفلت تو انتہائی دکھ کی بات ہے۔ بعض معصوم بچے خارجی اثرات کے تحت جرائم کر کے جیلوں میں چلے جاتے ہیں جہاں ان کی اصلاح کی بجائے ان کے معصوم ذہنوں پر جرم و بدکرداری کے اثرات و نشانات قائم ہو جاتے ہیں اور ہمیشہ کے لیے ان کی زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔

گوجرانوالہ جیل میں بچوں کی گنتی عموماً سو سوا سو کے لگ بھگ رہتی ہے، دوسری جیلوں کو اس پر قیاس کیجئے اور اندازہ لگائیے کہ ملک میں اس وقت جیلوں کی چار دیواری کے اندر کتنے معصوم بچے ہوں گے جن کی زندگیوں کی مستقل تباہی کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ اس لیے بچوں کی دینی تعلیم، اخلاقی تربیت اور لکھنا پڑھنا سکھانے کے علاوہ انہیں مختلف ہنر سکھانے کی طرف بھی توجہ دینی چاہیے۔ جیلوں میں چھوٹی چھوٹی صنعتیں

قائم کر کے ان بچوں اور دوسرے حوالاتیوں کو کوئی نہ کوئی ہنر سکھانے کا انتظام ہونا چاہیے تاکہ وہ جیل سے رہائی کے بعد خود اعتمادی کے ساتھ شریفانہ زندگی کا آغاز کر سکیں۔

مدتِ حوالات کس شمار میں؟

مروجہ نظامِ قانون کی سست روی اور پیچیدگی کے باعث بے شمار لوگ مقدمات کے فیصلوں کے انتظار میں طویل عرصہ حوالاتی کی حیثیت سے جیل میں بلاوجہ محبوس رہتے ہیں اور جیلوں میں زیادہ تعداد حوالاتیوں کی ہوتی ہے۔ گوجرانوالہ کی جیل میں ۱۱۰۰ سے ۱۳۰۰ کی نارمل گنتی میں سزا یافتہ قیدیوں کی تعداد ۲۰۰ سے زیادہ نہیں ہوتی، جبکہ باقی سب حوالاتی ہوتے ہیں جو تین تین چار چار سال تک مقدمات کے فیصلوں کے انتظار میں محبوس رہتے ہیں۔ اور حوالاتی کی حیثیت سے گزاری ہوئی قید کسی کھاتے میں شمار نہیں ہوتی بلکہ سزا ہونے پر مجرم کو از سرنو پوری سزا بھگتنا ہوتی ہے۔ بسا اوقات تو حوالات کی مدت اصل سزا سے بڑھ جاتی ہے۔ ہمارے سامنے ایک ملزم کو چوری کے الزام میں تین ماہ قید کی سزا سنائی گئی جبکہ وہ مقدمہ کے فیصلہ کے انتظار میں سات ماہ تک قید بھگت چکا تھا، لیکن اسے از سرِنو تین ماہ سزا بھگتنا پڑی۔

سوال یہ ہے کہ یہ حوالات کس کھاتے میں شمار ہوگی؟ اور اگر نظام قانون سست روی اور پیچیدگی کے باعث مقدمات جلد نمٹانے پر قادر نہیں ہے تو اس کی سزا ملزم کو کیوں دی جاتی ہے؟ اس مسئلہ کا صحیح حل تو وہی ہے جو اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ اسلام کا عادلانہ نظامِ قانون نافذ کیا جائے، لیکن مروجہ قانون کے تحت بھی مندرجہ ذیل طریقہ سے اس مسئلہ کی سنگینی کو کافی حد تک کم کیا جا سکتا ہے۔

۱. مقدمات کی درجہ بندی کر کے ان کے فیصلوں کے لیے مدت متعیّن کی جائے اور اس وقت تک فیصلہ نہ ہونے کی صورت میں اسی بنیاد پر ملزم کی ضمانت منظور کر لی جائے۔

۲. حوالات کی حیثیت سے بھگتی ہوئی قید کی مدت کو باضابطہ حساب کر کے اسے باضابطہ سزا میں شمار کیا جائے۔

۳. اگر کوئی ملزم عائد شدہ الزام کے تحت حوالاتی کی حیثیت سے پوری مدتِ سزا جیل میں گزار لے تو اسے رہا کر دیا جائے اور جیل حکام کو اس کے اختیارات دیے جائیں۔

بارکوں میں گنتی کا مسئلہ

بارکوں میں گنجائش سے زیادہ گنتی کا مسئلہ بھی پریشان کن ہے اور اس سے متعدّد اخلاقی و باطنی مسائل جنم لیتے ہیں۔ اس مسئلہ کی سنگینی کا اندازہ اس امر سے کیجئے کہ قانوناً صرف بارہ افراد کے لیے منظور شدہ ایک چھوٹی سی بارک میں پینتیس سے چالیس افراد کی گنتی بالکل نارمل سمجھی جاتی ہے۔ شدید گرمی کے موسم میں

ایک بارک میں پینسٹھ تک افراد بھی گھسیڑ دیے جاتے ہیں۔ بسا اوقات تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ان بارکوں میں انسانوں کو نہیں، بھیڑ بکریوں کو بند کیا جا رہا ہے۔ اور زیادہ افراد کی صورت میں کئی لوگوں کو رات بیٹھ کر گزارنا پڑتی ہے اور جو لیٹتے ہیں ان کے لیے بھی کروٹ بدلنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔

اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہر بارک کے لیے زیادہ سے زیادہ گنتی کی حد متعیّن کر کے اس سے زیادہ افراد بارک میں بند کرنے کی ممانعت کر دی جائے اور باقی ماندہ افراد کے لیے متبادل انتظامات کیے جائیں۔

حوالاتیوں سے بیگار نہ لی جائے

ایک بات اور دیکھنے میں آئی ہے کہ جیل میں عموماً حوالاتیوں سے بیگار لی جاتی ہے اور جیل کی اصطلاح میں اسے ''فٹیک'' کہا جاتا ہے جس میں دیواروں کی چنائی و مرمت، نالیوں کی صفائی، کچے راستوں پر پوچا پھیرنا اور اس نوعیت کے دوسرے کام شامل ہیں۔ حالانکہ مشقت صرف قیدی سے لی جا سکتی ہے حوالاتی سے نہیں، لیکن یہاں فٹیک حوالاتیوں ہی سے لی جاتی ہے۔ اور ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ جو شخص انچارج ہیڈوارڈ کی مٹھی میں چپکے سے دس روپے پکڑا دے گا وہ بیگار سے بچ جائے گا۔ آج کل اس کا ریٹ یہی ہے۔ اور جو دس روپے دینے کی طاقت نہیں رکھتا اس سے زبردستی بیگار لی جاتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب قانوناً حوالاتی مشقت کا پابند نہیں ہے تو اس سے جبراً فٹیک کیوں لی جاتی ہے؟ اس سے انکار نہیں کہ بے کار حوالاتیوں سے کچھ نہ کچھ کام ضرور لینا چاہیے لیکن اس میں جبر کے عنصر کو شامل نہ کیا جائے اور اس فٹیک کو رضاکارانہ شکل دے کر اس کے عوض کام کرنے والوں کو کچھ سہولتیں فراہم کر دی جائیں تو معاملات خوش اسلوبی کے ساتھ چل سکتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر حوالاتیوں کو چھوٹے چھوٹے ہنر سکھانے کے لیے ہلکی سی انڈسٹری قائم کی جائے اور کام کرنے والوں کو تھوڑا بہت معاوضہ دے دیا جائے تو جیل کی آمدنی میں اضافہ ہوگا اور حوالاتی بھی بے کار بیٹھنے کی بجائے خوشی خوشی کام کریں گے۔

پھر جیل کے اندر رشوت کا عمل دخل تو ستم ظریفی کی انتہا ہے۔ اور جب ہر شخص سے گیٹ پر تلاشی لے کر اس سے رقم لے لی جاتی ہے کہ جیل میں رقم لے جانے کی ممانعت ہے تو ایسی صورت میں جیل کے اندر رشوت کا تقاضہ انتہائی ستم اور ظلم کی بات ہے۔ ممکن ہے بعض ملازمین مہنگائی اور اخراجات سے تنگ آکر مجبوراً ایسا کرتے ہوں لیکن اس کا حل یہ نہیں ہے۔ بلکہ حکومت کو چاہیے کہ جیل میں ملازمین کو معقول مشاہرے اور سہولتیں دی جائیں تا کہ حوالاتی اور قیدی ان کی دستبرد سے محفوظ رہ سکیں۔

قیدیوں کی مشقت

قانوناً بعض سخت مجرموں کی سزا میں مشقت بھی شمار ہوتی ہے لیکن مشقت کے طریقے فرسودہ اور فرنگی دور کی یادگار ہیں۔ مثلاً مونج کوٹنا اور بان بٹنا وغیرہ۔ اس کی جگہ اگر مشقت کے نئے طریقے اختیار کر لیے جائیں تو زیادہ بہتر ہوگا اور اس کی صورت انڈسٹری ہے۔ قیدیوں سے اگر صنعتی مشقت لی جائے تو جیل کی آمدنی میں بھی اضافہ ہوگا اور مشقت کرنے والے کو بھی زیادہ دقت نہیں ہوگی۔

بہتر کلاس کا استحقاق

جیل میں بہتر کلاس کے حصول کا مسئلہ بھی خاصا تعجب خیز ہے۔ اول تو یہ مختلف کلاسوں کا سلسلہ ہی اسلامی تعلیمات کی رو سے غیر ضروری ہے۔ اور اگر مروجہ قانون کے تحت اس کی گنجائش ہے تو بہتر کلاس کے حصول کا طریق کار قطعی نامناسب ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر ایک شخص قانون کی رو سے بہتر کلاس کا مستحق ہے تو کیا اس حق کے حصول کے لیے خود اس کا درخواست دینا ضروری ہے؟ جب پولیس کے ریکارڈ میں ملزم کے تمام کوائف اور اس کے بارے میں تفصیلات موجود ہوتی ہیں تو عدالت میں اسے پیش کرتے وقت خود پولیس کو یہ رپورٹ دینی چاہیے کہ یہ ملزم کون سی کلاس کا مستحق ہے۔ تاکہ مجسٹریٹ متعلقہ جیل کے سپرد کرتے وقت ہی ملزم کی حیثیت کے مطابق کلاس کا تعین کر دے۔

مجھے اس دفعہ بہت سے احباب نے مشورہ دیا کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو درخواست دے کر جمعیۃ علماء اسلام کے مرکزی عہدہ دار کی حیثیت سے اپنے لیے بہتر کلاس کی منظوری حاصل کرلوں۔ لیکن کچھ تو اسیر ساتھیوں کی رفاقت کے خیال سے، اور کچھ اس خیال سے درخواست دینے سے گریز کیا کہ اگر بہتر کلاس قانوناً میرا حق ہے تو قانون کو ازخود میرے طلب کیے بغیر مجھے یہ حق دینا چاہیے کہ یہی شریفانہ طریقہ ہے۔

کھیلوں کا انتظام

آخر میں ایک اور بات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ جیل میں اگر نوجوانوں اور بچوں کے لیے مناسب کھیلوں کا انتظام کیا جائے تو یہ بہت مفید بات ہوگی۔ جیل کے گھٹے گھٹے ماحول میں ذہنی و جسمانی مشقت اور تفریح بہت ضروری ہے اور کھیل اس کا بہترین ذریعہ ہے۔

الغرض مذکورہ تمام معروضات کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ جیل کو اصلاح و تربیت اور ذہنی و فکری نشوونما کا ایک ایسا مرکز ہونا چاہیے جہاں مجرمانہ ذہن کی حوصلہ شکنی ہو اور حوالاتیوں و قیدیوں کے ذہنوں سے مجرمانہ خیالات و تصورات کو نکال کر انہیں پاکیزہ خیالات کا گہوارہ بنایا جائے۔ تاکہ لاکھوں شہری جو اس وقت

جیلوں کے اندر بند ہیں، باہر آکر اخلاقی انارکی کا سامان پیدا کرنے کی بجائے معزز اور شریف شہریوں کی سی زندگی بسر کر سکیں۔

شیعہ سنی فسادات کون کرانا چاہتا ہے؟

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۳دسمبر ۱۹۷۶ء)

جدید ڈپلومیسی کی ایک تکنیک یہ بھی ہے کہ جو غلط کام خود کرنا چاہو اسے اپنے مخالف کی طرف منسوب کر کے اس قدر پراپیگنڈا کرو کہ عوام کی نظروں میں اس کار بد کی ذمہ داری سے خود بچ سکو اور مخالفین کو بدنام کرنے کا ایک بڑا بہانہ ہاتھ آئے۔ حکمران گروہ دراصل اسی تکنیک کو اختیار کر کے اپوزیشن رہنماؤں کی مسلسل کردار کشی میں مصروف ہے۔ پیپلز پارٹی کے برسرِاقتدار آنے کے بعد سندھ میں لسانی فسادات، پٹ فیڈر کے جھگڑے، عراقی اسلحہ کا چکر اور شیرپاؤ مرحوم کے المناک قتل کے ضمن میں اپوزیشن لیڈروں کے خلاف بے بنیاد پروپیگنڈا حکمران گروہ کی اسی حکمتِ عملی کا شاہکار ہیں۔ اور اب حکمران گروہ کے مداح حلقوں کی طرف سے اپوزیشن قائدین کے بارے میں ایک اور خدشے کا اظہار کسی نئے طوفان کی آمد کی خبر دے رہا ہے۔

اس لیے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ قومی حلقوں کو خطرے کی اس مدھم انداز میں بجنے والی گھنٹی کی طرف متوجہ کریں۔ گزشتہ دنوں جمعیت علماء اسلام کے قائد اور وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے ناظمِ اعلیٰ حضرت مولانا مفتی محمود مدظلہ نے مدارس و مساجد کی آزادی و خود مختاری کے تحفظ کے سلسلہ میں غور و خوض کے لیے مختلف مکاتبِ فکر کے نمائندوں کا ایک اجلاس راولپنڈی میں طلب کیا جس کی مفصل رپورٹ ''ترجمانِ اسلام'' کے گزشتہ شمارے میں آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ قومی اخبارات میں اس عظیم اجلاس کی مفصل کاروائی کی اشاعت کو مخصوص ذرائع سے رکوانے کے بعد سرکاری اخبارات و جرائد نے وفاق المدارس کے کنونشن کے بارے میں جو تاثر پیدا کرنے کی کوشش شروع کر رکھی ہے اس سے حکمران گروہ کے مذموم عزائم کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔

سب سے پہلے پیپلز پارٹی کے جماعتی آرگن روزنامہ ''مساوات'' لاہور نے مساجد و مدارس کنونشن کے بارے میں ''ٹیبل نیوز'' شائع کی۔ اور اب اسی ٹیبل نیوز کو پارٹی کے نیم سرکاری آرگن ہفت روزہ تلوار راولپنڈی نے غیاث الدین جانباز ایڈیٹر ''تلوار'' کے قلم سے اس طرح نمایاں کیا ہے کہ

> ''اسلام آباد میں مفتی محمود کی دعوت پر اسلامی مدارس کے علماء کا اجتماع بھی ہوا۔ میں اس اجتماع کی جو سن گن لگا سکا ہوں وہ انتہائی خطرناک ہے۔ میری معلومات کے مطابق مفتی صاحب نے ان علماء کو عاشورہ محرم کے لیے اہم ہدایات دی ہیں جن میں ایک ہدایت یہ بھی شامل ہے کہ

عاشورہ کے دوران فرقہ پرستی پر مبنی ایک خاص فرقہ کے خلاف متعصبانہ تقریریں کی جائیں تاکہ ملک کے عوام کو فرقہ پرستی کے نام پر لڑایا جا سکے اور ملک میں لاء اینڈ آرڈر سچویشن پیدا کر کے جمہوریت اور جمہوری اداروں کے خلاف وہی کھیل کھیلا جا سکے جو ۱۹۵۹ء کے عام انتخابات کے انعقاد سے قبل ایوب خان نے ۷ اکتوبر ۱۹۵۷ء کو کھیلا تھا اور جس کے نتیجے میں ملک میں پارلیمانی جمہوریت کا چراغ روشن ہوتے ہوتے رہ گیا تھا اور پھر تیرہ سال تک قوم کو آمریت کا جبر و استحصال برداشت کرنا پڑا اور آخر ملک دو لخت ہوا۔

سنا ہے کہ مفتی محمود نے ان تمام علماء کو اکٹھا کیا تھا جو ذہنی اور نظریاتی اعتبار سے پاکستان کے قیام کی جدوجہد کے مخالف تھے یا ان مخالفین کے قرب کے سبب ان کا دل و دماغ بھی پاکستان کو قبول نہیں کرتا۔ بہرحال اگر میری سن گن صحیح ہے تو پھر وطنِ عزیز کے لوگوں کو آئندہ ایک ڈیڑھ ماہ تک اپنی آنکھیں کھلی رکھنی ہوں گی اس لیے کہ وطنِ عزیز میں جمہوریت کے خلاف اگر کوئی سازش کامیاب ہو گئی تو پھر پاکستان کی بقا و سالمیت کو بھی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ گزشتہ پندرہ دنوں کے دوران مولانا نورانی، میاں طفیل، مولانا مودودی، مفتی محمود اور اصغر خان کے بیانات کا جو لب و لہجہ رہا ہے اس سے بھی حزبِ اختلاف کے عزائم کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر مبشر حسن واحد رہنما ہیں جنہوں نے اس لب و لہجہ کو محسوس کیا ہے ورنہ تو انتخابات کی ہماہمی میں کسی نے بھی وفاقی مدارس کے معلموں کے اجتماع اور ہفتہ نفاذِ شریعت کے پس پردہ عوامل کا نوٹس لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔"

(ہفت روزہ تلوار، راولپنڈی۔ ۲۳ نومبر ۱۹۷۶ء)

اس طویل اقتباس کو ایک بار پھر ملاحظہ کیجئے اور وفاق المدارس کے کنونشن پر عائد کی جانے والی "چارج شیٹ" کے پس منظر میں حکمران گروہ کے عزائم کو تلاش کیجئے۔ ذرا سے غور کے بعد حکمران گروہ کے ارادے عریاں ہو کر آپ کے سامنے آجائیں گے۔ جہاں تک کنونشن میں مفتی محمود صاحب کے خطاب اور کنونشن کے فیصلوں کا تعلق ہے اس سلسلہ میں خفا کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور شرکاء کنونشن اس امر کے عینی شاہد ہیں کہ اس میں مدارس و مساجد کی آزادی اور حقوق نسواں کمیٹی کی سفارشات کے علاوہ کوئی مسئلہ زیر بحث نہیں آیا اور محرم یا اس کی مناسبت سے فرقہ وارانہ مسائل کا تو کوئی محل ہی نہیں تھا۔

البتہ روزنامہ مساوات اور ہفت روزہ تلوار کا یہ واویلا حکمران گروہ کے عزائم کی خوب نشاندہی کرتا ہے اور یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے حکمران گروہ نے انتخابات کے عمل کو سبوتاژ کرنے اور اپوزیشن کو آئندہ انتخابات سے قبل مکمل طور پر کرش کر دینے کے لیے راہ ہموار کرنا شروع کر دی ہے۔ اس لیے قومی حلقوں

کا فرض ہے کہ وہ صورتحال پر فوری توجہ دیں اور قوم کو فرقہ وارانہ اختلافات کے نام سے لڑانے کی اس سازش کو ناکام بنانے کے لیے مشترکہ لائحۂ عمل اختیار کریں۔ مساوات اور تلوار نے خطرہ کی گھنٹی بجادی ہے اور اگر اس آواز کی طرف توجہ نہ دی گئی تو اس کے نتائج سنگین ہوں گے اور ان کا فائدہ ایک فاشسٹ گروہ کے آمرانہ عزائم کی تقویت ہی کی صورت میں سامنے آسکتا ہے۔

جمعیت کا دورِ حکومت اور خان محمد حنیف خان کا ارشاد

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور ــــ ۱۷ دسمبر ۱۹۷۶ء)

روز نامہ جنگ راولپنڈی ۲۹ نومبر ۱۹۷۶ء کے مطابق وفاقی وزیر اطلاعات خان محمد حنیف خان صاحب نے ہری پور میں پارٹی ورکرز سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ:

''جمعیت علماء اسلام نے اپنے دور اقتدار میں شریعت کے نفاذ کے لیے کوئی مثبت اقدام نہیں کیا۔''

معلوم نہیں صوبہ سرحد میں جمعیت علماء اسلام اور نیشنل عوامی پارٹی کی دس ماہ کی حکومت کے دوران خان صاحب موصوف ملک سے باہر تھے یا بستر استراحت پر محو خواب تھے۔ کیونکہ ملک کے باقی شہریوں نے تو اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا کہ مولانا مفتی محمود نے صوبہ سرحد کی وزارت اعلیٰ سنبھالنے کے بعد سب سے پہلا اعلان صوبہ میں شراب پر مکمل پابندی کے بارے میں کیا تھا جسے ملکی و بین الاقوامی اسلامی حلقوں نے گرم جوشی کے ساتھ سراہا تھا۔ اور اس کے بعد مفتی صاحب کی حکومت نے صوبہ میں

- اردو کو سرکاری زبان قرار دیا،
- شلوار قمیض کو سرکاری لباس قرار دیا،
- تقاوی قرضوں پر سود معاف کیا،
- احترام رمضان المبارک کا آرڈیننس نافذ کیا،
- اسکولوں اور کالجوں میں قرآن کریم کی تعلیم کے لیے الگ اساتذہ مقرر کیے اور داخلے کے لیے نماز اور قرآن کریم کی بنیادی تعلیم کو شرط قرار دیا،
- صوبہ کے تمام قوانین کو اسلام کے مطابق بنانے کے لیے تین جید علماء اور دو قانون دانوں پر مشتمل بورڈ قائم کیا۔

اور ان جیسی درجنوں اسلامی اصلاحات کی طرف قدم اٹھایا اور یہ سب کچھ اس حالت میں ہوا کہ وفاقی حکومت کی مداخلت اور ناراضگی کی تلوار ہر وقت سر پر لٹکی رہی۔ صرف ایک شراب کے مسئلہ پر مرکزی حکومت نے جس طرح بار بار باز پرس کی اگر خان محمد حنیف خان صاحب کو علم نہ ہو تو متعلقہ ریکارڈ ان دسترس سے باہر نہیں ہے۔

سوال یہ ہے کہ صوبہ سرحد میں جمعیت اور نیپ کی مشترکہ حکومت نے ساڑھے نوماہ کے قلیل عرصہ میں اختیارات کے محدود اور ناکافی ہوتے ہوئے بھی جتنی اسلامی اصلاحات نافذ کی ہیں، پیپلز پارٹی کی حکومت کلی اختیارات کے باوجود پانچ سال میں ان جیسی ایک اصلاح بھی کیوں نہ لا سکی؟ اس موقع پر مجھے سودا کی رباعی یاد آرہی ہے جو میں بصد احترام خان محمد حنیف خان صاحب موصوف کی خدمت میں پیش کرتا ہوں:

سودا قمار عشق میں شیریں سے کوہکن
بازی اگرچہ لے نہ سکا سر تو دے سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز
اے روسیاہ! تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

ملک محمد اختر صاحب! مذہب سے چڑ کیوں؟

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۷ادسمبر ۱۹۷۶ء)

روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی ۲۹ نومبر ۱۹۷۶ء کے مطابق وفاقی وزیر قانون و پارلیمانی امور جناب ملک محمد اختر نے ارشاد فرمایا ہے کہ عوامی نمائندگی کے بل کے تحت برادری سسٹم، ذات پات، علاقائی عصبیت اور مذہب کے نام پر ووٹ مانگنے کو جرم قرار دے دیا جائے گا جس کی سزا تین سال تک قید ہو سکتی ہے۔

جہاں تک برادری سسٹم، ذات پات اور علاقائی عصبیت کا سوال ہے ملک صاحب کی بات سمجھ میں آتی ہے لیکن ان ناپسندیدہ امور کی فہرست میں مذہب کا اضافہ کس منطق کی رو سے کیا جا رہا ہے؟ جبکہ اس ملک کی بنیاد ہی مذہب پر ہے۔ قیامِ پاکستان سے قبل جن صوبوں میں ریفرنڈم کرانے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی ان میں تحریکِ پاکستان کے قائدین نے مذہب ہی کے نام پر عوام سے ووٹ مانگے تھے۔ پھر آئین میں اسلام کو مملکت کا سرکاری مذہب قرار دیا گیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب ملک کے بنیادی نظریہ اور آئین کی بنیاد مذہب پر ہے تو مذہب کو انتخابی ممنوعات کی فہرست میں کیسے شامل کیا جا سکتا ہے؟ اور کیا ایسا کرنا نظریۂ پاکستان اور آئین کی اسلامی دفعات کے منافی نہیں ہوگا؟

اصل بات یہ ہے کہ حکمران گروہ نے اسلام کے نام پر عوام سے جو وعدے کیے تھے انہیں پورا کرنے میں وہ ناکام رہا ہے اور اس سلسلہ میں عوام کے شدید انتخابی ردعمل سے بچنے کے لیے مذہب کو انتخابی ممنوعات کی فہرست میں شامل کرنا چاہتا ہے۔ لیکن ملک صاحب کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ مذہب کو چڑ بنا کر وہ عوام کے شدید انتخابی ردعمل سے نہیں بچ سکتے۔ عوامی محاسبہ کا دن قریب آرہا ہے اس لیے پناہ گاہیں ڈھونڈنے کی بجائے عوام کے سامنے آنے کا حوصلہ کیجیے۔

آئندہ انتخابات اور وزیر داخلہ خان عبدالقیوم خان

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۱۷دسمبر ۱۹۷۶ء)

وفاقی وزیر داخلہ خان عبدالقیوم خان ان دنوں جس انداز سے چہچہار ہے ہیں اس سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ آئندہ انتخابات کے لیے ''ڈمی اپوزیشن'' کو سامنے لانے کی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں ورنہ خان عبدالقیوم خان اور حکومت پر تنقید! لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ بہر حال خان موصوف اور حکمران گروہ کے درمیان اس ''نورا کشتی'' میں بسا اوقات کچھ راز کی باتیں بھی منظر عام پر آجاتی ہیں۔

انتخابات کے بارے میں اپوزیشن کافی عرصہ سے اس خدشہ کا اظہار کر رہی ہے کہ بھٹو صاحب الیکشن کا اچانک اعلان کریں گے اور اپوزیشن کو اتنا وقت بھی نہیں دیں گے کہ وہ انتخابات کے لیے اپنی صفوں کو منظم کر سکے۔ بھٹو صاحب نے متعدد بار اپوزیشن کے اس خدشہ کی پھبتی اڑائی لیکن اب ان کے گھر کے بھیدی خان عبدالقیوم خان وزیر داخلہ حکومت پاکستان نے تحصیل صوابی میں ٹوپی کے مقام پر مسلم لیگی کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے یوں ارشاد فرمایا ہے:

> ''لیگی کارکنوں کو اپنی تنظیم تیز سے تیز کر دینا چاہیے، وہ اس بات پر وقت ضائع نہ کریں کہ انتخابات کب ہوں گے، میں کارکنوں سے کہتا ہوں کہ وہ یہ سمجھ لیں کہ رات کو سو کر جب صبح اٹھیں تو الیکشن کا اعلان ہوگا۔ آپ کو اس طرح تیاری کرنی چاہیے تاکہ حالات کے چیلنج کا صحیح جواب دے سکیں۔'' (روزنامہ جنگ راولپنڈی۔ ۲۳نومبر)

ہم گھر کی گواہی پر خان صاحب موصوف کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپوزیشن پارٹیوں اور خصوصاً جمعیت علماء اسلام کے کارکنوں سے یہ گزارش کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ خان صاحب کے تھوڑے کہے کو بہت سمجھیں اور ابھی سے اپنے آپ کو ذہنی اور انتظامی لحاظ سے انتخابات کے لیے تیار کر لیں تاکہ ہم بگل بجتے ہی الیکشن کے میدان میں کود سکیں۔

وفاقی وزیر جناب کوثر نیازی اور دینی مدارس

(ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور ـــ ۱۴ جنوری ۱۹۷۷ء)

یادش بخیر جناب کوثر نیازی وفاقی وزیر مذہبی امور طویل عرصہ کی معنی خیز خاموشی کے بعد گزشتہ دنوں پشاور میں چہکے ہیں اور ان کی گفتگو کا عنوان وہی پرانا ہے جو ان کے ذمہ ہے یعنی دینی مدارس اور حکومت کی پالیسی۔ نیازی صاحب نے جو کچھ فرمایا روزنامہ نوائے وقت ۳ جنوری ۱۹۷۷ء کے مطابق اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

۱. مولانا مفتی محمود کا یہ الزام درست نہیں ہے کہ حکومت دینی مدارس کو سرکاری تحویل میں لینا چاہتی ہے۔
۲. دینی مدارس کو سرکاری تحویل میں لینے سے اخراجات بڑھ جائیں گے اور تعلیمی بجٹ کو نقصان پہنچے گا۔
۳. البتہ حکومت دینی مدارس کے نصاب میں تبدیلیاں کرے گی، ان کی نگرانی کرے گی اور ان کے حسابات خود آڈٹ کرائے گی۔

گویا نیازی صاحب نے بالواسطہ اس امر کا اعتراف کر لیا ہے کہ دینی مدارس کے اخراجات جن دیندار مسلمانوں کے عطیات و صدقات سے پورے ہوتے ہیں وہ سرکاری تحویل میں آنے کے بعد دینی مدارس کی امداد نہیں کریں گے اور اپنے عطیات و صدقات کے سلسلہ میں سرکاری مشینری پر اعتماد نہیں کریں گے، اس طرح تمام اخراجات کا بوجھ تعلیمی بجٹ پر پڑے گا اور تعلیمی بجٹ کو نقصان پہنچے گا۔ اس لیے حکومت نے سوچا ہے کہ عطیات و صدقات کی وصولی کا شعبہ تو علماء کرام ہی کے پاس رہنے دیا جائے کیونکہ عوام اس سلسلہ میں صرف انہی پر اعتماد کرتے ہیں لیکن اخراجات اور تعلیمی نصاب کا شعبہ حکومت اپنی نگرانی میں لے لے تاکہ دینی مدارس کو سرکاری تحویل میں لینے کی بدنامی تو حصہ میں نہ آئے لیکن عملاً اس کے مقاصد پورے ہوتے رہیں۔ اور دینی مدارس سے خالص دینی ذہن رکھنے والی جو کھیپ ہر سال تیار ہو کر معاشرہ میں آتی ہے، نصاب میں تبدیلی کر کے اسے سرکاری پالیسی اور مقاصد کے مطابق تیار اور استعمال کیا جا سکے۔

بلاشبہ یہ پالیسی حکمرانوں کی عیارانہ چابکدستی کی واضح مثال ہے اور ’’ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا آئے‘‘ کا محاورہ بھی ایسے ہی موقع پر کام آتا ہے۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ وفاق المدارس العربیہ

کے ناظمِ اعلیٰ حضرت مولانا مفتی محمود صاحب مدظلہ نے پشاور میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ ہم حکومت کو دینی مدارس کے نصاب میں تبدیلی کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔

وزیر اوقاف رانا اقبال احمد خان کی کسک

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۱۴ جنوری ۱۹۷۷ء)

پنجاب کے وزیر اوقاف رانا اقبال احمد خان نے گزشتہ روز گوجرانوالہ میں کہا کہ نظامِ شریعت کانفرنس دراصل حکومت کے خلاف ایک سازش تھی جس میں مولانا مفتی محمود نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہم پاکستان بنانے کے گناہ میں شامل نہیں تھے۔ (روزنامہ امروز، لاہور ۵ جنوری ۱۹۷۷ء)

معلوم ہوتا ہے کہ جمعیت علماء اسلام پاکستان کے زیر اہتمام اکتوبر ۱۹۷۵ء کے دوران گوجرانوالہ میں منعقد ہونے والا ''کُل پاکستان نظامِ شریعت کنونشن'' صوبائی وزیر اوقاف کی کمزوری بن گیا ہے اور انہیں خواب میں بھی کنونشن ہی کے مناظر دکھائی دیتے ہیں۔

پہلے تو ان صاحب نے کنونشن کو روکنے کی کوشش کی، ضلعی انتظامیہ پر مسلسل دباؤ ڈالا لیکن تمام تر رکاوٹوں کے باوجود نظامِ شریعت کنونشن جامع مسجد نور گوجرانوالہ میں پوری شان و شوکت کے ساتھ منعقد ہو گیا، تو یہ صاحب انتقامی حرکات پر اتر آئے اور مسجد کو سرکاری تحویل میں لینے کا اعلان کر دیا۔ لیکن یہاں بھی بات نہ بنی اور ملک کے دیندار نوجوانوں نے مزاحمت کی، تحریک چلی، گرفتاریاں ہوئیں، بالآخر صوبائی وزیر اوقاف پسپائی پر مجبور ہو گئے اور سرکاری تحویل میں لینے کے باضابطہ اعلان کے باوجود ان کا مسجد نور اور مدرسہ نصرۃ العلوم پر قبضہ کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ نظامِ شریعت کنونشن ابھی تک ان کے اعصاب پر سوار ہے اور سوا سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود وہ اپنی اس اعصابی کمزوری سے پیچھا نہیں چھڑا سکے۔

جہاں تک کنونشن کے سازش ہونے یا مولانا مفتی محمود کے اس میں پاکستان بنانے کو گناہ قرار دینے کا تعلق ہے اس سلسلہ میں کسی قسم کی وضاحت کی ضرورت نہیں کیونکہ کنونشن کی کوئی نشست خفیہ نہیں تھی اور جو کچھ ہوا ملک بھر سے آئے ہزاروں مندوبین اور گوجرانوالہ کے لاکھوں شہریوں کے سامنے ہوا۔ البتہ ہم صوبائی وزیر اوقاف کے لیے دعا ہی کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے اعصاب کو نظامِ شریعت کنونشن کے مناظر سے چھٹکارا عطا فرمائیں۔

کینیڈا کی طرف سے ایٹمی مواد کی فراہمی کا مسئلہ اور وفاقی وزیر اطلاعات

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۱۴ جنوری ۱۹۷۷ء)

قائد جمعیت علماء اسلام مولانا مفتی محمود نے گزشتہ روز پشاور میں پریس کانفرنس سے خطاب کیا اور حکومت کی خارجہ پالیسی پر تنقید کرتے ہوئے فرمایا کہ کینیڈا نے کراچی کے ایٹمی بجلی گھر کے لیے ایندھن وغیرہ سے جو انکار کیا ہے وہ ہماری خارجہ پالیسی کی کمزوری کی علامت ہے۔ انہوں نے کہا کہ خارجہ پالیسی اتنی کامیاب نہیں جتنی کہ اس کی تشہیر کی جاتی ہے چنانچہ میں نے ایک موقع پر قومی اسمبلی میں خارجہ پالیسی پر بحث کرنا چاہی تھی مگر حکومت اس مسئلہ پر بحث سے گریزاں ہے۔

(روزنامہ نوائے وقت لاہور۔ ۵ جنوری ۱۹۷۷ء)

مفتی صاحب کے اس بیان پر وفاقی وزیر اطلاعات محمد حنیف خان سیخ پا ہوئے ہیں اور روزنامہ امروز لاہور ۷ جنوری ۱۹۷۷ء کے مطابق:

> ”وفاقی وزیر اطلاعات مسٹر محمد حنیف خان نے مفتی محمود کے بیان پر کڑی نکتہ چینی کی ہے جس میں مفتی صاحب نے حکومتِ پاکستان پر یہ الزام لگایا تھا کہ اس نے کینیڈا سے ایٹمی مواد حاصل کرنے کے لیے منفی رویہ اختیار کیا ہے۔ وفاقی وزیر اطلاعات نے مفتی محمود سے سوال کیا ہے کہ کیا وہ چاہتے ہیں کہ پاکستان کینیڈا کے دباؤ کے سامنے گھٹنے ٹیک دے؟ مسٹر محمد حنیف نے کہا کہ مفتی محمود نے اس سلسلہ میں جو بیان دیا ہے وہ ان کے اپنے احساس کمتری کا مظہر ہے۔“

اسے کہتے ہیں کہ ”ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ“۔ سوال یہ ہے کہ مفتی صاحب نے کب کہا ہے کہ پاکستان کو کینیڈا کے دباؤ کے سامنے گھٹنے ٹیک دینے چاہئیں، انہوں نے تو کینیڈا کی طرف سے ایٹمی مواد کی فراہمی سے انکار کو پاکستان کی کمزور خارجہ پالیسی کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ اور محمد حنیف خان صاحب کے لیے یہ بات سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ ایٹمی مواد کی فراہمی سے کینیڈا کا انکار ایک الگ مسئلہ ہے، اور کینیڈا کی شرائط اور دباؤ کو قبول کرنے سے پاکستان کا انکار الگ مسئلہ ہے۔ بحث پاکستان کے انکار پر نہیں، کینیڈا کے انکار پر ہے۔ اور مولانا مفتی محمود نے یہی سوال اٹھایا ہے کہ حالات نے یہ رخ کیوں اختیار کیا کہ کینیڈا نے ایٹمی مواد فراہم کرنے سے انکار کر دیا، اس انکار کا پس منظر کیا ہے، اس کے محرکات و عوامل کیا ہیں، اور کیا کوئی بھی

عقلمند شخص اس انکار کے پس منظر میں پاکستان کی خارجہ پالیسی کو متحرک، مضبوط اور کامیاب قرار دے سکتا ہے؟

محمد حنیف خان صاحب کو چاہیے کہ وہ خلط مبحث کر کے عوام کو ذہنی خلجان میں مبتلا کرنے کی بجائے حقیقت پسندی کے ساتھ مولانا مفتی محمود کے سوال کا سامنا کریں اور عوام کو بتائیں کہ کامیاب اور متحرک خارجہ پالیسی کا دعویٰ کرنے والی حکومت پاکستان کینیڈا کو ایٹمی مواد کی فراہمی سے کھلم کھلا انکار سے باز کیوں نہیں رکھ سکی؟ رہی بات احساس کمتری کی تو اس کا مظہر مولانا مفتی محمود کا بیان نہیں بلکہ حکومتِ پاکستان کا رویہ ہے جو قومی اسمبلی میں خارجہ پالیسی کو زیر بحث لانے سے مسلسل گریزاں ہے اور جسے پارلیمنٹ میں بحث کی صورت میں خارجہ پالیسی کی کامیابی کے بارے میں پراپیگنڈا کے غبارے سے ہوا نکلتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔

عبدالحفیظ پیرزادہ کے انتخابی حریف مولانا محمد زکریا کی گرفتاری

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۱۵اپریل ۱۹۷۷ء)

کراچی کے مردِ حُر مولانا محمد زکریا نے، جو جمعیت علماء اسلام کراچی سنٹر کے امیر ہیں، حالیہ الیکشن اور اس کے بعد تحریک میں جرأت و استقامت کی جو شاندار روایات قائم کی ہیں ان پر بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ مولانا محمد زکریا نے قومی اسمبلی کے الیکشن میں پیپلز پارٹی کے عبدالحفیظ پیرزادہ کا مقابلہ کیا اور پیرزادہ غنڈہ گردی اور دھاندلیوں کی انتہا کو چھونے کے باوجود الیکشن میں مولانا محمد زکریا کو شکست نہ دے سکے اور انہیں نام نہاد قومی اسمبلی میں بیٹھنے کے لیے نتائج میں گڑبڑ کے نئے ہتھکنڈے کا سہارا لینا پڑا۔ حتیٰ کہ مولانا محمد زکریا کو الیکشن کے دن اتنا زدو کوب کیا گیا کہ وہ کئی دنوں تک جناح ہسپتال کراچی میں صاحبِ فراش رہے اور جب ہسپتال سے فارغ ہوئے تو قومی اتحاد کی احتجاجی تحریک کی جرأتمندانہ قیادت کرتے ہوئے گرفتار ہو گئے۔

مولانا زکریا کی گرفتاری کا منظر بھی انتہائی ایمان افروز ہے، مولانا موصوف اور ان کے رفقاء جلوس کی قیادت کرتے ہوئے جب مقررہ جگہ سے روانہ ہوئے تو فوج نے ان کا راستہ روکا اور ان کے آگے سرخ پٹی بچھا کر خبردار کیا کہ اس پٹی کو عبور کیا تو گولی مار دی جائے گی۔ فوجی جوان پوزیشن سنبھالے ہوئے تھے لیکن مولانا محمد زکریا اور ان کے ساتھ کلمہ طیبہ کا ذکر کرتے ہوئے سرخ پٹی کو عبور کر گئے۔ فوجی افسر نے سرخ پٹی کو وہاں سے اٹھا کر اور آگے بچھا دیا کہ اگر اب اس کو عبور کیا تو گولی مار دی جائے گی۔ مولانا زکریا اور ان کے ساتھیوں نے کلمہ طیبہ پڑھتے ہوئے اس کو بھی عبور کر لیا۔ پھر یہ سرخ پٹی اور آگے رکھ کر گولی کی دھمکی دہرائی گئی لیکن ان مردانِ حُر نے کلمہ طیبہ کا ورد کرتے ہوئے اس بار بھی سرخ پٹی کو پاؤں تلے روند ڈالا، اس کے بعد انہیں گھیرے میں لے کر گرفتار کر لیا گیا۔ اللہ تعالیٰ خوش رکھیں مولانا زکریا کو کہ انہوں نے اپنے عظیم اسلاف کی جرأتمندانہ روایات کو ایک بار تازہ کر دیا اور نئی نسل کو جرأت و ہمت کی ایک بار پھر راہ دکھائی۔

بھٹوصاحب! مذاکرات کس بات پر؟

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۱۵اپریل ۱۹۷۷ء)

پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین جناب ذوالفقار علی بھٹو بار بار اس بات کو دہرا رہے ہیں کہ وہ قومی اتحاد کے ساتھ مذاکرات کے لیے ہر وقت تیار ہیں اور باہمی تنازعات کو بات چیت کے ذریعے طے کرنے کے خواہشمند ہیں۔

مذاکرات اور بات چیت کی دعوت بظاہر بڑی خوشنما ہے لیکن سوال یہ ہے کہ مذاکرات کس مسئلہ پر ہوں گے؟ قومی اتحاد اور پیپلز پارٹی کے درمیان اصل مابہ النزاع مسئلہ قومی اسمبلی کے انتخابات کا ہے جو سات مارچ کو منعقد ہوئے اور جن میں اس قدر وسیع پیمانے پر دھاندلیاں ہوئیں کہ نہ صرف قومی اتحاد بلکہ چاروں صوبوں کی ہائیکورٹ بار ایسوسی ایشن اور دو سابق ججوں جناب بشیر الدین احمد اور جناب بدیع الزمان کیکاؤس کی رائے کے مطابق جزوی تحقیقات یا انتخابی ٹربیونل کے قیام سے ان دھاندلیوں کا مداوا نہیں ہو سکتا اور اس کا حل صرف یہ ہے کہ وزیراعظم مستعفی ہوں، الیکشن کمیشن کی از سرِ نو تنظیم کی جائے اور عدلیہ و فوج کی نگرانی میں نئے سرے سے الیکشن کرائے جائیں۔

دوسری طرف جناب ذوالفقار علی بھٹو کا موقف یہ ہے کہ قومی اسمبلی کے الیکشن کا معاملہ طے شدہ ہے اس پر گفتگو نہیں ہو سکتی اور نہ ہی دوبارہ الیکشن کرائے جا سکتے ہیں لیکن اس کے علاوہ دوسرے امور پر وہ قومی اتحاد سے بات چیت کے لیے تیار ہیں۔ یہ بات کسی بھی ذی شعور کی سمجھ سے بالاتر ہے جب مسٹر بھٹو کے نزدیک قومی اسمبلی کے الیکشن کا مسئلہ طے شدہ ہے اور قومی اتحاد کے نزدیک اصل مابہ النزاع ہی قومی اسمبلی کا الیکشن ہے تو مسٹر بھٹو قومی اتحاد کے ساتھ آخر کس موضوع پر بات چیت کرنا چاہتے ہیں؟

اس صورتحال کے پیشِ نظر یہ بات بھی توجہ کے قابل ہے کہ مذاکرات سے عملی انکار قومی اتحاد کی جانب سے نہیں بلکہ مسٹر بھٹو کی طرف سے ہے، آخر اصل مسئلہ کو ایجنڈا سے خارج کر کے مذاکرات کی دعوت دینا بات چیت سے انکار نہیں تو اور کیا ہے؟

مسٹر بھٹو کی کرسی کا تحفظ

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور ــ ۱۵ اپریل ۱۹۷۷ء)

صدر مملکت فضل الٰہی چودھری کی آئین سے ''وفاداری''

قومی اتحاد نے صدر مملکت جناب فضل الٰہی چودھری کے نام ایک خط میں استدعا کی کہ وہ قومی اسمبلی کے الیکشن کرانے کا اہتمام کریں جس کے جواب میں صدر مملکت نے ارشاد فرمایا ہے کہ دوبارہ الیکشن کرانا آئین کی خلاف ورزی ہے اور میں نے آئین سے وفاداری کا حلف اٹھایا ہوا ہے۔

قطع نظر اس سوال کے کہ دوبارہ الیکشن کرانا آئین کی فی الواقع خلاف ورزی ہے یا نہیں، سوال یہ ہے کہ اب تک جو کچھ ہوا ہے کیا وہ سب کچھ آئین کے مطابق ہے؟ کیا صدر مملکت کے نوٹس میں یہ بات نہیں کہ:

- پیپلز پارٹی نے الیکشن کی ابتدا ہی دھاندلیوں سے کی اور اپوزیشن کے امیدواروں کو اغوا کر کے اور ان کے جعلی دستخط کر کے ۲۰ بلا مقابلہ سیٹیں حاصل کرنے کا اہتمام کیا۔
- الیکشن میں پیپلز پارٹی اور اس کے ساتھ انتظامیہ کے بدعنوان افسران نے اس قدر وسیع پیمانے پر دھاندلیاں کیں کہ ہٹلر کی روح پر بھی لرزہ طاری ہو گیا۔
- بیلٹ بکس اٹھائے گئے، صوبائی اور وفاقی وزیر اسٹین گنیں کندھے پر لٹکائے پولنگ اسٹیشنوں پر لوگوں کو دھمکاتے رہے۔
- نتائج پہلے سے طے کر کے ریڈیو اور ٹی وی پر نشر کیے گئے۔
- قومی اسمبلی کے انتخابات کے سرکاری نتائج صرف اس لیے دو ہفتے سے زیادہ عرصہ تک تاخیر سے ظاہر کیے گئے کہ شاید اپوزیشن سے کچھ سیٹوں پر سودابازی ہو جائے۔ اپوزیشن کے ارکان کو بار بار سودابازی کی ترغیب دی جاتی رہی اور اب بھی دی جا رہی ہے۔
- چیف الیکشن کمشنر نے خود پریس کانفرنس میں تسلیم کیا کہ الیکشن میں دھاندلیاں ہوئی ہیں۔
- جن چند حلقوں کی تحقیقات کی کاروائی اخبارات میں شائع ہوئی ہے وہ مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر دھاندلیوں کی وسعت اور سنگینی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔
- ۱۱ مارچ اور ۲۶ مارچ کو ملک گیر ہڑتال اور ۱۰ مارچ کو صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کے مکمل بائیکاٹ کے ذریعے عوام نے ۱۰ مارچ کی دھاندلیوں پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔

- اور اب تو خود پیپلز پارٹی بلوچستان کے ذمہ دار عہدہ داروں نے انتخابات میں کھلم کھلا دھاندلی کا اعتراف کر لیا ہے۔

کیا صدر مملکت یہ ارشاد فرمائیں گے کہ یہ سب کچھ آئین کے مطابق ہوا ہے؟ اور کیا جس عرصہ میں یہ سب کچھ ہوا ہے اس دوران صدر محترم آئین سے وفاداری کے حلف سے مستثنیٰ تھے؟

صدر گرامی قدر! مسئلہ آئین کا نہیں عوام کے حقوق اور ووٹ کے تقدس کا ہے۔ اور آپ اگر واقعی آئین اور ملک کے وفادار ہیں تو اس وفاداری کا تقاضہ مسٹر بھٹو کی کرسی کے تحفظ میں نہیں بلکہ عوام کے ووٹ کے احترام اور ان کی رائے کے تقدس کو بحال کرنے میں ہے۔ کیونکہ آئین ایک شخص کی وفاداری کی بجائے عوام کے فیصلے کو تسلیم کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔

بلوچستان پیپلز پارٹی کے خازن کا اعتراف اور مطالبہ

روزنامہ نوائے وقت لاہور ۲۸ مارچ صفحہ آخر کی ایک خبر کے مطابق بلوچستان پیپلز پارٹی کے خازن ملک باز محمد زتی نے مطالبہ کیا ہے کہ آزادانہ ماحول میں مصنفانہ الیکشن کرائے جائیں کیونکہ انتخابات میں بڑے پیمانے پر دھاندلیاں ہوئی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ یہ مطالبہ ساتھیوں کے مشورے سے کر رہے ہیں اور اگر یہ مطالبہ منظور نہ ہوا تو وہ ۲۰/اپریل کو مستعفی ہو جائیں گے۔

لیجئے اب تو گھر کے بھیدی نے بھی گواہی دے دی کہ ہاں دھاندلیاں ہوئی ہیں اور بڑے پیمانے پر ہوئی ہیں اور اس کا مداوا الیکشن ٹربیونل سے نہیں بلکہ آزادانہ ماحول میں منصفانہ انتخابات کرانے سے ممکن ہے۔ جناب الیکشن کمشنر! کیا اب بھی کسی مزید گواہی کی ضرورت ہے؟

احتجاجی مظاہرین کو گولی مارنے کی دھمکی

۲۶ مارچ کی کامیاب ملک گیر ہڑتال سے قبل چاروں صوبوں کے وزراء اعلیٰ نے یہ حکم جاری کیا کہ تخریبی کاروائیوں میں ملوث افراد کو دیکھتے ہی گولی مار دی جائے۔ اسی طرح ہڑتال والے روز ملتان میں ایک فوجی جیپ سے بار بار یہ اعلان نشر ہوتا رہا کہ دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کرنے والوں کو گولی مار دی جائے گی۔

قطع نظر اس کے کہ "دیکھتے ہی گولی مار دینے" کے اس نادر شاہی حکم کا عوام کی صحت پر کتنا اثر ہوا اور یہ گولی عوام کے احتجاجی مظاہروں کو روکنے کے لیے کہاں تک کامیاب ہوئی، یہ اعلانات پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے خدانخواستہ ہم ایک آزاد ملک پاکستان کے شہری ہونے کی بجائے رہوڈیشیا کے باشندے ہیں جن پر غیر ملکی آقاؤں نے گولی کے زور سے تسلط قائم کر رکھا ہے اور جو ملک کے اصل باشندوں کی ذرا سی نقل و حرکت کا جواب بھی گولی سے دینے کے لیے ہر وقت اٹن شن رہتے ہیں۔

ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ ہمارے حکمران خود کو اس قوم کے افراد سمجھنے جانے کی بجائے شاید غیر ملکی آقا ظاہر کرنے میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں ورنہ اپنی ہی قوم کے افراد کو بار بار گولی کی دھمکیاں دینے کا کیا مطلب ہے؟

خانہ جنگی کی سازش؟

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۲۲اپریل ۱۹۷۷ء)

پیپلز پارٹی کے چیئرمین جناب ذوالفقار علی بھٹو نے ۱۴/اپریل کو لاہور گورنر ہاؤس میں پارٹی کے کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے ان سے جو کچھ کہا اس کا نتیجہ سامنے آنے میں کچھ زیادہ دیر نہیں لگی۔ اسی روز گورنر ہاؤس سے نکل کر پی پی ورکرز نے جلوس نکالا، مختلف بازاروں میں گھوم کر دوکانیں بند کرانے کی ناکام کوشش کی اور پھر داتا دربار کا رخ کیا جہاں سے قومی اتحاد کا عظیم الشان جلوس مارچ کرنے والا تھا۔ لیکن عوام کے بے پناہ ہجوم کے نمودار ہوتے ہی مٹھی بھر افراد پر مشتمل پی پی ورکرز کے جلوس کا کچھ پتہ نہ چلا کہ انہیں آسمان نے اچک لیا یا زمین نے نگل لیا۔ اس طرح پیپلز پارٹی کے کارکنوں نے اپنے چیئرمین کی ہدایات پر عملدرآمد کا آغاز کیا۔

۱۵/اپریل کو قومی اتحاد کے چھ عظیم الشان جلوس مسجد شہداء پر اختتام پذیر ہوئے اور اس کے بعد نوجوانوں کا ایک ہجوم میکلوڈ روڈ کی طرف روانہ ہوا تو پی پی ورکرز اسٹین گنوں اور رائفلوں سے مسلح ہو کر رتن سینما اور پارٹی کے دفتر میں مورچہ بند بیٹھے تھے۔ نوجوان جب قریب آئے تو ان پر بے تحاشا فائرنگ کا سلسلہ شروع کر دیا گیا، چار نوجوان شہید اور سینکڑوں زخمی ہوگئے لیکن اسٹین گنوں کے مقابلہ میں نوجوانوں کے جذبات اور حوصلوں نے زیادہ کام دکھایا۔ سینما اور دفتر دونوں نذر آتش کر دیے گئے اور ایک محتاط اندازے کے مطابق دونوں عمارتوں کی آگ میں پیپلز پارٹی کے کم از کم نصف درجن افراد بھی بھسم ہوگئے۔ اسی روز مکھن پورہ مصری شاہ میں پی پی کے ورکرز نے ایک مسجد کو جہاں سے جلوس نکلنا تھا گھیر لیا، قومی اتحاد کے صوبائی سیکرٹری جنرل پیر محمد اشرف کو شدید زدوکوب کیا، مولانا احمد علی قصوری کی دوکان لوٹ لی اور سرعام غنڈہ گردی کا مظاہرہ کیا۔

۱۶/اپریل کو عوامی جلوس کے مسجد شہداء پر اختتام پذیر ہونے کے بعد نوجوانوں کے مشتعل ہجوم نے مصری شاہ کا رخ کیا اور طارق وحید بٹ، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ گزشتہ روز کی غنڈہ گردی کا اہتمام اس نے کیا تھا، اس کے مکان کو گھیرے میں لے لیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ صاحب مکان اس سے پہلے ہی راہ فرار اختیار کر چکا ہے اور مکان کے اندر کچھ بھی باقی نہیں ہے۔ چنانچہ نوجوانوں کا مشتعل ہجوم پولیس کی طرف سے آنسو گیس کے اندھا دھند استعمال کے بعد منتشر ہو گیا۔ اور اس طرح لاہور کی حد تک

اس ڈرامہ کا ڈراپ سین ہوگیا جسے اسٹیج کرنے کے لیے مسٹر بھٹو پانچ روز تک گورنر ہاؤس میں بیٹھے پلاننگ کرتے رہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسٹر بھٹو، جو خود کو ایشیا کا ذہین ترین سیاستدان سمجھتے ہیں، اس ڈرامہ کی پلاننگ کرتے ہوئے یہ بات کیسے بھول گئے تھے کہ پوری قوم جب ایک طرف ہوجائے تو وہاں مٹھی بھر افراد اور چند اسٹین گنیں کچھ نہیں کرسکتیں۔ اسلحہ ہمیشہ اسلحہ کا مقابلہ کرتا ہے، جذبے کا مقابلہ کرنا دنیا میں کسی اسلحہ کے بس کی بات نہیں اور اس وقت پاکستانی قوم کے جذبات کا جو عالم ہے اسے سامنے رکھتے ہوئے مسٹر بھٹو کا پی پی ورکرز کو عوامی مظاہروں کے سامنے لانا خود پارٹی کارکنوں کو عوامی غیظ وغضب کا نشانہ بنانے کے مترادف ہے۔ مسٹر بھٹو کی پلاننگ کا جو نتیجہ لاہور میں سامنے آیا ہے اس کے پیشِ نظر خود پی پی ورکرز کو سنجیدگی سے سوچنا چاہیے کہ انہیں اس مرحلہ میں عوامی جلوسوں کے مقابل لانا کیا واقعی ان کے ساتھ ہمدردی اور وفاداری کا مظہر ہے؟ قطع نظر اس سے کہ اس محاذ پر پیپلز پارٹی کی مزید پیش قدمی کا ملی وقومی نقطۂ نظر سے کیا نقصان ہوگا۔ خود پی پی ورکرز کا مفاد اس میں ہے کہ وہ مسٹر بھٹو کے اس اقدام کو مسترد کر دیں اور عوامی مظاہروں کے مقابل آکر ملک وقوم کا نقصان کرنے کے ساتھ ساتھ خود بھی عوامی غیض و غضب کا نشانہ نہ بنیں۔

پی پی ورکرز نے اسی ملک میں اسی قوم کے درمیان رہنا ہے۔ مسٹر بھٹو یا ان کے چند حواری اگر کسی اور ملک میں پناہ حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہوگئے تو وہ پی پی ورکرز کو اپنے ساتھ نہیں لے جائیں گے۔ اس لیے ہم پورے ملک میں پیپلز پارٹی کے کارکنوں کو اس مسئلہ پر سنجیدگی کے ساتھ غور وفکر کی دعوت دینا اپنا ملی فریضہ سمجھتے ہیں اور ہمیں امید ہے کہ پی پی ورکرز ملک وقوم اور خود اپنا مفاد سامنے رکھتے ہوئے مسٹر بھٹو کے احمقانہ منصوبہ کو آگے بڑھانے سے گریز کریں گے۔

عبوری حکومت سے گزارش

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۶ جنوری ۱۹۷۸ء)

روزنامہ نوائے وقت لاہور نے شیخوپورہ کے نمائندہ خصوصی کے حوالے سے ۲۸ دسمبر کے شمارہ میں ''ٹیلی ویژن والوں کی بدحواسی'' کے زیرعنوان ایک خبر میں انکشاف کیا ہے کہ گزشتہ روز لاہور ٹیلی ویژن سے کسی گزشتہ تقریب کی فلم ٹیلی کاسٹ کی گئی ہے جس میں چیف آف آرمی اسٹاف جنرل محمد ضیاء الحق کو سابق وزیراعظم بھٹو کو سلامی دیتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

ہمارے خیال میں ٹیلی ویژن والوں کی اس حرکت کو محض بدحواسی کا عنوان نہیں دیا جاسکتا، ہمیں اس معاملہ کا دوسرا پہلو کسی طور پر بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ ہماری رائے ہے کہ انتظامیہ میں سابق حکمران گروہ کے پروردہ ایسے افسران کی کمی نہیں ہے جو مختلف شعبوں میں اب بھی مسٹر بھٹو اور ان کی پارٹی کے مفاد میں کام کررہے ہیں۔ بالخصوص وہ افسران جنہیں محض بھٹو پرستی کی بنا پر کسی جواز کے بغیر تقرریوں اور ترقیوں سے نوازا گیا تھا۔

مارشل لاء انتظامیہ نے جس وقت ملک کا نظم ونسق سنبھالا تھا اس کے بعد سے اب تک اگر سول انتظامیہ کے طرزعمل کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح طور پر محسوس کی جائے گی کہ سول انتظامیہ کا رویہ اور کارکردگی مارشل لاء حکومت کے لیے کسی نیک نامی کا باعث نہیں بن سکے اور ہم اسے محض اتفاق قرار دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ہم عبوری حکومت سے گزارش کریں گے کہ وہ سول انتظامیہ کے مجموعی کردار بالخصوص بھٹو آمریت کے دور میں بلاجواز ترقیوں اور تقرریوں سے بہرہ ور ہونے والے افسران پر کڑی نظر رکھے تاکہ وہ ملک میں جن خوشگوار تبدیلیوں کی بنیاد رکھنا چاہتی ہے، وہ نوکر شاہی کی مخصوص چالوں کا شکار ہوکر نہ رہ جائے۔

ولی خان اور پنجاب، چودھری ظہور الٰہی کی نظر میں

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۱۴ جنوری ۱۹۷۸ء)

روزنامہ جنگ کراچی کے نمائندہ خصوصی عارف الحق عارف کو انٹرویو دیتے ہوئے ممتاز مسلم لیگی لیڈر چودھری ظہور الٰہی نے اس سوال کے جواب میں کہ

"کیا ولی خان کو پنجاب قومی قائد کی حیثیت سے قبول کرلے گا؟"

کہا کہ:

"مسٹر ولی خان کو بھٹو نے گرفتار ہی ان کے پنجاب کے کامیاب ترین دورے کے بعد کیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ یہ مفاد پرستوں کا پروپیگنڈہ ہے کہ پنجاب ولی خان کے خلاف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پنجاب میں ولی خان کو ایک عظیم محبِ وطن کی حیثیت حاصل ہے۔ اس لیے میں نہیں سمجھتا کہ قومی لیڈر کی حیثیت سے وہ پنجاب کو کیوں قابلِ قبول نہیں ہوں گے۔"

(روزنامہ جنگ، کراچی۔ ۸ جنوری ۱۹۷۸ء)

خان عبدالولی خان کی حب الوطنی اور پنجاب میں ان کی مقبولیت کے بارے میں مذکورہ بالا ریمارکس اس لحاظ سے انتہائی اہمیت کے حامل ہیں کہ یہ پنجاب سے تعلق رکھنے والے ایک ذمہ دار اور سربرآوردہ مسلم لیگی کے ریمارکس ہیں۔ اور اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سیاسی راہنماؤں اور کارکنوں کے اس طبقہ کے بارے میں جسے "نیشنلسٹ" کہا جاتا ہے، قیوم خان برانڈ مفاد پرستوں کے پھیلائے ہوئے اثرات رفتہ رفتہ زائل ہورہے ہیں۔ اور ملک و قوم سے ہمدردی رکھنے والے عناصر یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ سیاست میں اس سرگرم اور بااصول گروہ کو نظر انداز کرنے اور پیچھے دھکیلنے کی بجائے ملک و قوم کو اس کی خدمات اور صلاحیتوں سے بہرہ ور کرنا ہی پاکستان اور اس کے غریب عوام کے مفاد میں ہے۔

اس میں شک نہیں کہ تحریکِ آزادی کے نامور راہنما خان عبدالغفار خان نے قیامِ پاکستان کے بعد جب ماضی کے اختلافات کو نظر انداز کرتے ہوئے ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے اپنا تعاون غیر مشروط طور پر پیش کیا تھا، اگر عبدالقیوم خان کی سازشوں کے باعث تعاون کے اس ہاتھ کو جھٹک نہ دیا جاتا تو آج ملک کی سیاسی صورتحال بہت مختلف ہوتی۔ لیکن قیوم خان برانڈ سیاستدانوں کی مذموم چالوں کے باعث خان عبد الغفار خان، ان کے خاندان اور رفقاء کو اب تک مسلسل جس طرح دھکیلا اور رگیدا جاتا رہا ہے اور ان کے ہاتھ میں غداری کا پرچم جبراً تھمانے کی کوششیں ہوتی رہی ہیں اس کے باوجود اس عظیم خاندان اور اس کے

متعلقین نے صبر وتحمل اور بردباری کا دامن نہیں چھوڑا اور انتہائی صبر واستقامت کے ساتھ جھوٹ اور فریب کے منطقی انجام کا انتظار کرتے رہے۔

آج بحمد اللہ تعالیٰ ان کا صبر رنگ لایا ہے اور مکر وفریب کی دھند چھٹنے کے بعد خان عبدالولی خان ایک بار پھر قومی سیاست کے مطلع پر نمودار ہوئے ہیں، مستقبل ان کا منتظر ہے اور وہ وقت دور نہیں کہ ''نیشنلسٹ'' کہلانے والے سیاسی راہنما اور کارکن پاکستان کی تعمیر واستحکام میں اپنا حقیقی سیاسی کردار ادا کریں گے، اور ان شاءاللہ العزیز یہ پاکستان کے روشن مستقبل کا نقطۂ آغاز ہوگا۔

ملتان میں مزدوروں کی شہادت

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۱۴جنوری ۱۹۷۸ء)

کالونی ٹیکسٹائل ملز ملتان میں مزدوروں پر پولیس کی وحشیانہ فائرنگ کی تحقیقات شروع ہوگئی ہے اور یہ سطور شائع ہونے تک اس کے نتائج سامنے آچکے ہوں گے۔ اس وقت تک جو تفصیلات مختلف اخبارات کے ذریعے سامنے آئی ہیں ان کے مطابق واقعہ کے دیگر پہلوؤں کے ساتھ ساتھ یہ پہلو انتہائی سنگین اور توجہ طلب ہے کہ پولیس نے یہ فائرنگ کسی باضابطہ آرڈر کے بغیر کی ہے جس کے نتیجہ میں کم از کم چودہ مزدور شہید ہوئے ہیں۔ اور یہ پہلو بھی محلِ نظر ہے کہ یہ واقعہ اس وقت ہوا جب پیپلز پارٹی نام نہاد ''یوم جمہوریت'' منانے کی تیاریاں کر رہی تھی۔

پیپلز پارٹی نے طبقاتی کشمکش کو جس طرح منظم طور پر پروان چڑھایا اور ۵ جولائی کے انقلاب کے بعد نئی حکومت کو اس ضمن میں بدنام کر کے مزدوروں، کسانوں اور محنت کشوں کو اس سے بدظن کرنے کی جو مہم اس نے چلا رکھی ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے کالونی ٹیکسٹائل ملز کے المناک واقعہ کا پس منظر اور بھی زیادہ توجہ طلب ہو جاتا ہے اور ذہن میں یہ سوال بار بار ابھرتا ہے کہ یہ واقعہ کہیں انتظامیہ میں پیپلز پارٹی کے پروردہ عنصر کی سازش تو نہیں ہے؟ تحقیقات کے ضمن میں مزید کچھ کہے بغیر ہم اتنی گزارش ضرور کریں گے کہ اس سنگین اور افسوسناک واقعہ کے اس پہلو کو بھی مدنظر رکھا جائے اور اس کے محرکات واسباب کی صحیح طور پر نشاندہی ہو اور مجرم کیفر کردار تک پہنچیں۔

قبائلی علاقوں سے انصاف کیا جائے!

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۱۴ جنوری ۱۹۷۸ء)

قبائلی علاقوں سے قومی اسمبلی کے سابق رکن ملک جہانگیر نے ایک بیان میں مطالبہ کیا ہے کہ بھٹو حکومت کے دور میں قبائلیوں کے ساتھ کی گئی ناانصافیوں کی تحقیقات کے لیے کمیٹی قائم کی جائے۔

اگرچہ قبائلی سیاست میں خود ملک صاحب کا کردار بعض حلقوں میں موضوع بحث ہے مگر ان کا یہ مطالبہ ہمارے نزدیک بالکل درست اور بجا ہے، اس لیے کہ بھٹو حکومت نے جہاں ملک کے دوسرے حصوں میں وحشت و بربریت کے شرمناک مظاہرے کیے وہاں قبائل بھی اس کی وحشیانہ کارروائیوں کا نشانہ بنا ہے۔ حتیٰ کہ جنوبی وزیرستان کے صدر مقام وانا کے بازار کو بلڈوزروں سے مسمار کر دیا گیا اور علاقہ کے مذہبی راہنما مولانا نور محمد اور ان کے رفقاء کو گرفتار کر لیا گیا جو اَب تک جیل میں ہیں۔ اور وانا تباہی کے بعد ابھی تک دوبارہ آباد نہیں ہو سکا جبکہ ہزاروں قبائلی بے گھر اور روزگار سے محروم ہیں۔

ہم حکومت سے گزارش کریں گے کہ ملک کے دوسرے حصوں کی طرح قبائلی عوام کے ساتھ بھٹو حکومت کے سلوک کا بھی جائزہ لے بالخصوص جنوبی وزیرستان کے مذکورہ واقعہ کی تحقیقات کرا کے گرفتار شدگان کو رہا کیا جائے اور جن لوگوں کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے انہیں فوری اور مناسب انصاف مہیا کیا جائے۔

۱۹۷۷ء کی فیڈرل سکیورٹی فورس کا واقعہ

(اجنوری ۲۰۰۴ء)

......۱۹۷۷ء کی تحریکِ نظامِ مصطفیٰؐ کے دوران، جو پاکستان قومی اتحاد کے زیر اہتمام بھٹو حکومت کے خلاف چلائی گئی تھی، اور بھٹو حکومت نے سیاسی مخالفین سے نمٹنے کے لیے فیڈرل سکیورٹی فورس (ایف ایس ایف) کے نام سے ایک مستقل فورس قائم کر رکھی تھی، گکھڑ میں ہر جمعہ کے بعد تحریک کے مطالبات کے حق میں جلوس نکالے جاتے تھے۔

ایک دن ایسا ہوا کہ نمازِ جمعہ کے بعد والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم کی قیادت میں جلوس کا آغاز ہوا تو جی ٹی روڈ پر ایف ایس ایف نے جلوس کو روکنے کے لیے پوزیشنیں سنبھال رکھی تھیں۔ جلوس کو آگے بڑھتے دیکھ کر ایف ایس ایف کے کمانڈر نے زمین پر ایک لکیر کھینچ کر اعلان کیا کہ اس لائن کو عبور کرنے والوں کو گولی مار دی جائے گی۔ اس اعلان کے ساتھ ہی ایف ایس ایف کے سپاہیوں نے رائفلیں تان لیں اور فائرنگ کے لیے پوزیشن میں آگئے۔ اس لکیر کے پاس پہنچ کر والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم نے کہا کہ میں اپنی مسنون عمر پوری کر چکا ہوں اور اب شہادت کی تمنا رکھتا ہوں یہ کہہ کر وہ کلمہ طیبہ کا ورد کرتے ہوئے اس ممنوعہ لکیر کو پھلانگ کر آگے بڑھ گئے، ان کے ساتھ جن دو ساتھیوں نے یہ لکیر عبور کی ان میں سے ایک ہمارے استاذ محترم قاری محمد انور صاحب تھے اور دوسرے جمعیت علماء پاکستان کے حاجی سید احمد ڈار مرحوم تھے، ان کا یہ عزم دیکھ کر ایف ایس ایف کی تنی ہوئی رائفلیں جھک گئیں اور جلوس پورے وقار کے ساتھ آگے روانہ ہو گیا۔......

”تاشقند کا راز“

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ ۔۔۔ اگست ۱۹۹۳ء)

تاشقند وسطی ایشیا کی ایک اہم ریاست ازبکستان کا دارالحکومت ہے اور ہماری کئی تاریخی اور قومی یادیں اس سے وابستہ ہیں۔

وسطی ایشیا کا یہ خطہ جسے علمی حلقوں میں ماوراء النہر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، صدیوں تک علومِ اسلامیہ بالخصوص فقہ حنفی کا مرکز رہا ہے اور اسے امام بخاریؒ، امام ترمذیؒ، صاحب ہدایہ امام برہان الدین مرغینانیؒ اور فقیہ ابواللیث سمرقندیؒ جیسے اساطینِ علم وفضل کی علمی جولانگاہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔

پھر پاکستان کی قومی تاریخ میں بھی تاشقند کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ۱۹۶۵ء کی خوفناک پاک بھارت جنگ کے نتائج کو سمیٹنے کے لیے پاکستان کے صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان مرحوم اور بھارت کے وزیر اعظم آنجہانی لال بہادر شاستری کے درمیان مذاکرات اسی تاشقند میں ہوئے تھے اور انہی مذاکرات کے حوالہ سے ”تاشقند کا راز“ ۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۰ء تک مرحوم ذوالفقار علی بھٹو کا ایک مؤثر سیاسی ہتھیار اور قومی سیاست میں ہلچل اور گہما گہمی کا ذریعہ بنا رہا۔

اس پس منظر میں سوویت یونین کے تسلط سے وسطی ایشیا کی ریاستوں کی آزادی کے بعد سے یہ خواہش تھی کہ وسطی ایشیا کے اہم علاقوں بالخصوص تاشقند کو دیکھا جائے اور اس خطہ کے مسلمانوں کی دینی، تعلیمی اور معاشرتی حالت کا جائزہ لیا جائے۔......

جمعیت علماء اسلام، بھٹو کی پھانسی اور پیپلز پارٹی

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور ــــ ۱۱ مئی ۱۹۷۹ء)

(جناب الطاف حسین بی اے ایل ایل بی کے انٹرویو کا کچھ حصہ)

سوال: کافی عرصہ سے کارکن مرکزی اکابر کے دوروں کے منتظر ہیں اور اس کے علاوہ قیادت کی دوسری صف کا فقدان شدت سے محسوس کیا جا رہا ہے۔

جواب: مرکزی اکابر تمام اکٹھے مل کر ملکی دورہ کرنے سے تو قاصر ہیں لیکن ہر مرکزی رہنما کسی نہ کسی شکل میں ملکی سطح پر دورے ترتیب دیتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ملکی حالات، قومی اتحاد کی صورتحال کی وجہ سے تسلی بخش دورے نہ ہو سکے۔ دوسری سطح کی قیادت کا جو فقدان محسوس کیا جا رہا ہے وہ دراصل تین دھچکوں کا نتیجہ ہے جو گزشتہ دس سال کے دوران ہمیں برداشت کرنا پڑے:

- ۱۹۶۸ء و ۱۹۷۰ء میں مولانا مفتی محمود اور مولانا غلام غوث ہزاروی کے بعد مولانا محمد اکرم مرحوم کا نام سامنے آیا تھا، انہوں نے بہت جلد اپنی قیادت اور صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا تھا لیکن جلد وہ ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔
- اس کے بعد ۱۹۷۳ء میں دوسری صف کی اچھی خاصی ٹیم بھٹو کی محبت کا شکار ہوئی، ہم سے رخصت ہوئے اور قیادت کی دوسری صف خالی نظر آنے لگی۔
- اس کے بعد بہت جلد بلوچستان کے مرد حر مولانا شمس الدین شہیدؒ اپنی خداداد صلاحیتوں، جرأت و ہمت کے ساتھ سامنے آئے اور ملک بھر کے جماعتی کارکنوں کی نظر ان پر ٹھہری، لیکن وہ بھی بھٹو کے ظلم و جبر کا لقمہ بن گئے۔ دوسری صف کے اس طرح خالی ہونے سے اس خلا کا احساس شدید ہوتا چلا گیا، اس کی شدت میں اب کچھ کمی نظر آنے لگی ہے۔
- جمعیت علماء اسلام کی طرف سے جنرل ضیاء الحق کی کابینہ میں بالخصوص الحاج محمد زمان خان اچکزئی، حاجی فقیر محمد خان کی بے لوث خدمات، انتھک جدوجہد اور جاندار کارکردگی نے جمعیت کے کارکنوں کی توجہات اپنی طرف مبذول کرا لی ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ یہ حضرات دوسری صف کی قیادت کے خلا کو پر کرنے میں اہم کردار ادا کریں گے۔

سوال: کیا بھٹو کو پھانسی کے بعد پیپلز پارٹی ختم ہو گئی؟

جواب: یہ انتہائی غلط سوچ ہے، پیپلز پارٹی ملک میں موجود ہے، اس لیے کہ بھٹو ایک شخص کا نام نہیں تھا، ایک فکر اور نظریہ کا نام تھا جو آج بھی زندہ ہے۔ اور اس فکر اور نظریہ کا جواب گالی گلوچ اور جذبات سے نہیں بلکہ نظریہ اور فکر ہی سے دیا جاسکتا ہے۔

بھٹودور کی چند یادیں

(ماہنامہ قومی ڈائجسٹ، لاہور ـــ دسمبر ۲۰۰۷ء)

(ماہنامہ قومی ڈائجسٹ میں دسمبر ۲۰۰۷ء کو شائع ہونے والے
انٹرویو سے چند سوالات)

امریکہ، برطانیہ کا جانشین

سوال: آپ نے امریکہ کو زیادہ خطرناک کیوں سمجھا؟

جواب: ہم امریکہ کو اس خطے میں برطانیہ کا جانشین سمجھتے تھے۔ ہم نے برطانیہ کے خلاف ڈیڑھ سو سال تک جنگ لڑی تھی، باقاعدہ مسلح جنگیں بھی لڑیں، قربانیاں دیں، گرفتاریاں دیں، تحریکیں برپا کیں۔ اور مصر کے جمال عبدالناصر سے ہماری قربت بھی اسی وجہ سے تھی کہ ہم عالمی سطح پر امریکہ کو برطانیہ کا جانشین سمجھتے تھے۔ تب دو ہی امکانات تھے کہ امریکہ کی مدد سے روس کے ساتھ لڑائی لڑی جائے، یا پھر روس کی مدد سے امریکہ کے ساتھ لڑائی لڑی جائے۔ لیکن میں اس حوالے سے مولانا مودودیؒ کو کریڈٹ دیتا ہوں کہ انہوں نے کمیونزم کے خلاف ایک بھرپور فکری جنگ لڑی ہے۔ ہم ان کے ساتھ نہیں تھے جس پر ہمیں سوشلسٹ علماء بھی کہا گیا۔ ہم ان کے مقابلہ میں اس وقت بائیں بازو کی تائید کرتے تھے۔ بھٹو کے خلاف جب ایک سو تیرہ علماء کا فتویٰ آیا۔ مولانا مفتی محمودؒ اور مولانا غلام غوث ہزارویؒ نے کہا ہم نہیں مانتے ایسے فتووں کو۔ جمعیت علماء اسلام نے اس فتوے کو مسترد کر دیا۔ اس کا پس منظر یہ تھا کہ جمال عبدالناصر نیشنلزم کے قائل تھے اور یہ نیشنلزم مغربی استعمار کے مقابلے میں تھا۔ نیشنلزم کے دراصل دو پہلو ہیں۔ ترکی میں نیشنلزم بمقابلہ اسلام تھا، ہم اس کی بات نہیں کرتے تھے۔ عرب نیشنلزم بمقابلہ برطانوی استعمار تھا، ہم اس کی حمایت کرتے تھے۔

پاکستان قومی اتحاد اور جنرل محمد ضیاء الحق کا مارشل لاء

سوال: یہ ضیاء الحق سے تعاون کا فیصلہ کیسے ہوا تھا یعنی جب اتحاد والے وزارتوں میں گئے۔ حالانکہ مولانا شاہ احمد نورانی، شیر باز مزاری، اور اصغر خان وغیرہ راضی نہیں تھے۔ کیا ان سیاسی رہنماؤں کو یہ نظر نہیں آتا تھا کہ مارشل لاء حکومت میں اصل

اختیارات تو جرنیلوں کے پاس ہوتے ہیں، یہ تعاون کرنے والے کیا حاصل کریں گے؟

جواب: اس حوالے سے بات کرنا ایک خطرناک مرحلہ ہے لیکن میں اس پر بات کروں گا۔ اصل بات یہ ہے کہ ایک سیاسی ورکر کے طور پر اس وقت بھی میری سوچ یہی تھی اور آج بھی ہے کہ ہم نے ضیاء الحق کے مارشل لاء کو قبول کر کے غلطی کی تھی۔ بھٹو نے لاہور میں مارشل لاء لگوایا تھا تو وہ ڈرا ہو گیا تھا۔ اگر ہم اکٹھے رہتے اور جدوجہد جاری رکھتے تو ضیاء الحق کبھی مارشل لاء کو طول نہ دے سکتے اور انہیں واپس جانا پڑتا۔ میں نے جمعیت کی شوریٰ میں یہ رائے بھی دی تھی۔ میں یہ بات بھی ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں کہ قومی اتحاد کا مارشل لاء کو قبول کرنا صحیح نہیں تھا۔ میری رائے تھی کہ ہم ایک دو مہینے مزید قربانیاں دے کر مارشل لاء سے جان چھڑا لیں، لیکن اتحاد نے وہ مارشل لاء قبول کر لیا۔

قومی اتحاد جب وزارتوں میں گیا تو ان دنوں راولپنڈی میں جمعیت کی شوریٰ کا اجلاس تھا جس میں مفتی محمود صاحبؒ بھی موجود تھے۔ وہاں میرے اور مولانا قاضی عبداللطیف صاحب کے درمیان طویل مکالمہ ہوا۔ وہ بھی مرکزی ناظم تھے اور میں بھی مرکزی ناظم تھا۔ میرا موقف یہ تھا کہ ہمیں وزارتوں میں نہیں جانا چاہیے جبکہ قاضی صاحب جانے کے حق میں تھے۔ یوں سمجھیے کہ اچھا خاصا مناظرہ ہوا ہمارے درمیان۔ شوریٰ والے اور مفتی صاحب ہمیں دیکھے جا رہے تھے اور ہم اپنے اپنے موقف کے حق میں دلائل دے رہے تھے۔

سوال: آپ نے دلیل کیا دی؟

جواب: میں نے دو باتیں کہیں۔ ایک یہ کہ ہم مارشل لاء حکومت کا حصہ نہ بنیں، مارشل لاء لگ گیا ہے، ہم اسے روک تو نہ سکے لیکن اس کا حصہ بننا درست نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ یہ لوگ ہمیں کچھ نہیں کرنے دیں گے، خواہ مخواہ کی بدنامی ہوگی اور رسوائی اٹھائیں گے۔ شوریٰ نے مجموعی طور پر وزارتوں میں جانا طے کر لیا تو میں نے مفتی صاحب سے کہا کہ اس فیصلے کے ساتھ میرا اختلافی نوٹ درج کیا جائے۔ مفتی صاحب نے کہا، ٹھیک ہے یہ آپ کا حق ہے۔ چنانچہ اس فیصلے پر میرا اختلافی نوٹ شوریٰ کی کارروائی میں موجود ہے۔

میرے نزدیک پاکستان کی تاریخ میں دو ایسے مرحلے آئے جب رخ بدل سکتا تھا لیکن دونوں مرحلوں پر ہم سے غلطی ہوئی:

۱. ایک جب سقوطِ ڈھاکہ کے بعد بقیہ پاکستان پر ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت قائم ہوئی، اس وقت بھٹو صاحب اتنی سیاسی طاقت رکھتے تھے کہ وہ سول بیوروکریسی اور ملٹری بیوروکریسی کو لگام ڈال

سکتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اگر بھٹو صاحب اسٹیبلشمنٹ کے ہتھے نہ چڑھ جاتے تو یہاں سیاسی عمل پوری آزادی سے رواں دواں رہتا، لیکن بدقسمتی سے اسٹیبلشمنٹ نے بھٹو کو شکار کر لیا۔ مولانا مفتی محمود اور خان عبدالولی خان کے ساتھ بھٹو کا جو سہ فریقی معاہدہ ہوا تھا سرحد اور بلوچستان کی حکومتوں کے حوالے سے، میرے نزدیک پاکستان کی تاریخ میں اس سے بہتر معاہدہ اور اس سے بہتر ٹیم نہیں آسکتی۔ میں ایک سیاسی ورکر کے طور پر سوچتا تھا کہ بھٹو، ولی، اور مفتی صاحب کی صورت میں ایسی ذہین اور محبِ وطن ٹیم آگئی ہے کہ جو ملک کو ایک نئے رخ پر ڈال سکتی ہے، لیکن اسٹیبلشمنٹ نے بھٹو کو گھیرے میں لے لیا۔

۲. دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ اگر پاکستان قومی اتحاد ضیاء الحق کے مارشل لاء کو قبول نہ کرتا یا کم از کم وزارتوں میں شریک نہ ہوتا بلکہ مقابلے میں اسٹینڈ لیتا تو پھر بھی جلد ملٹری رجیم سے نجات حاصل کی جا سکتی تھی لیکن ایسا نہیں ہوا۔

سوال: بعد میں مفتی صاحب کو احساس ہوا اس بات کا؟

جواب: جی ہاں بعد میں احساس ہو گیا تھا مفتی صاحب کو۔ انہوں نے وزارتوں سے نکلنے کے بعد سیاسی جماعتوں کو اکٹھا کرنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ وہ ابھی اس کام میں مصروف ہی تھے کہ وفات پا گئے۔

تحریکِ نظامِ مصطفیٰؐ اور اس کا پس منظر

سوال: پھر ایم آر ڈی کی تحریک چل پڑی؟

جواب: اس کی ابتدا مفتی صاحب ہی نے کی تھی۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ’’قومی اتحاد‘‘ سے پہلے ’’متحدہ جمہوری محاذ‘‘ بنا تھا جس کے پیر پگاڑا صاحب صدر تھے۔ تب میں محاذ کا پنجاب کا نائب صدر تھا۔ جب قومی اتحاد بنا تو میں پنجاب کونسل میں تھا، حمزہ صاحب صدر تھے، اور پیر اشرف جنرل سیکرٹری تھے۔

سوال: آپ اس ساری جدوجہد میں شامل رہے ہیں، آپ بتائیں کہ کیا شروع میں یہ طے تھا کہ اتحاد نظامِ مصطفیٰؐ کے لیے بنایا جا رہا ہے، یا بعد میں یہ نعرہ اختیار کیا گیا؟ کیونکہ اتحاد میں ولی خان ایسے سیکولر مزاج رہنما بھی موجود تھے۔

جواب: پہلے میں اپنی پوزیشن واضح کر دوں کہ جب قومی اتحاد بنا تو میں پنجاب کے پارلیمانی بورڈ میں جمعیت کا نمائندہ تھا، مرکزی دستور کمیٹی میں بھی جمعیت کا نمائندہ تھا اور میں منشور بنانے والوں میں شامل

تھا۔ ایم انور بار یٹ لاء اس کمیٹی کے صدر تھے اور ان کے ساتھ سیدہ عابدہ حسین اور ظہور الحسن بھوپالی مرحوم تھے۔

بات یہ ہے کہ تحریک تو شروع ہوئی تھی دھاندلیوں کے خلاف لیکن اس سے پہلے جس منشور پر قومی اتحاد الیکشن لڑ چکا تھا اس میں نظامِ مصطفیٰؐ کا باقاعدہ پروگرام شامل تھا بلکہ اسی نعرہ پر الیکشن لڑا گیا تھا اور سب پارٹیوں نے ہمارا ساتھ دیا تھا۔

سوال: کسی پارٹی نے اعتراض نہیں کیا؟

جواب: بنیادی مخالفت نہیں ہوئی، رجحان یہ تھا کہ ہم اس کے بغیر نہیں چل سکیں گے۔ اگرچہ تحریک جو چلی تھی وہ دھاندلیوں کے خلاف تھی۔ اس میں نظامِ مصطفیٰؐ کا جو نعرہ لگا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اتحاد اسی نعرے کی بنیاد پر الیکشن لڑ چکا تھا۔ تب میں پنجاب کا نائب صدر تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب تحریک کے عین درمیان میں رفیق احمد باجوہ صاحب نے بھٹو صاحب سے خفیہ ملاقات کی تو انہیں جنرل سیکرٹری کے عہدے سے ہٹا دیا گیا، اس پروگرام میں پیر اشرف صاحب بھی ان کے ساتھ تھے چنانچہ انہیں بھی ہٹا دیا گیا۔

سوال: جماعت میں رہتے ہوئے بھی وہ کچھ مشکوک تو ہوچکے ہوئے تھے؟

جواب: بہرحال وہ جماعت ہی کی طرف سے قومی اتحاد پنجاب کے جنرل سیکرٹری بنے تھے۔ لیکن باجوہ صاحب کو بھٹو سے ملاقات کے نتیجے میں ان کے ساتھ پیر صاحب کو بھی اتحاد سے فارغ کر دیا گیا تو مجھے پنجاب کا جنرل سیکرٹری منتخب کر لیا گیا۔ اتحاد کی پنجاب ٹیم میں میرے ساتھ اکبر ساقی، اقبال احمد خان، علامہ احسان الٰہی ظہیر، اور مولانا فتح محمد تھے، تحریکِ استقلال کے معین الدین بھی تھے۔ نوابزادہ نصر اللہ خان کے دفتر میں ہمارا دفتر ہوتا۔ ہفتہ کے دوران دو تین روز وہاں جانا ہوتا تھا بلکہ تحریک کے دوران تو میں وہیں رہتا تھا۔ اس دوران نوابزادہ صاحب سے بے تکلفی ہوگئی اور ان سے بہت کچھ سیکھا۔ میں نے جن تین شخصیتوں سے سیاست سیکھی ہے وہ ہیں مولانا غلام غوث ہزارویؒ، مولانا مفتی محمودؒ، اور نوابزادہ نصر اللہ خان۔ نوابزادہ صاحب عابد شب زندہ دار تھے، پانچ وقت کے نمازی تھے، عقیدے کے مضبوط تھے۔ آدمی کسی کے قریب آکر یا تو بھاگ جاتا ہے یا پھر اور قریب ہوجاتا ہے۔ میں قریب ہونے والوں میں ہوں اور ان کی کئی باتوں سے متاثر ہوا ہوں۔

سوال: نوابزادہ نصر اللہ خان صاحب کی کونسی خوبی زیادہ پسند آئی؟ وہ بہت محتاط تھے، پریس کانفرنس ہو یا جلسہ عام ہو بہت کھلتے نہیں تھے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: وہ جو بات ایک دفعہ طے کر لیتے تھے تو پھر ادھر اُدھر نہیں ہوتے تھے اور کسی مصلحت کا شکار نہیں ہوتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ کونسی بات کہنی ہے اور کونسی نہیں، ان میں ایک اچھے سیاستدان والی خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں اور موجودہ بحران میں تو وہ بہت یاد آتے ہیں۔

تحریک کے چند واقعات

پی این اے (پاکستان قومی اتحاد) کی جو مرکزی کونسل گرفتار ہوئی تھی اس میں اکبر ساقی بھی تھے اور میں بھی تھا۔ لاہور میں قومی اتحاد کی مرکزی کونسل کے اجلاس کے دوران ہمیں گھیرا ڈال کر گرفتار کر لیا گیا تھا۔ محمود علی قصوری مرحوم تھے، جماعتِ اسلامی کے عبد الوحید خان تھے، اتفاق سے رانا نذر الرحمٰن، حمزہ صاحب اور میں پنڈی سے آ رہے تھے۔ جبکہ والد صاحب مولانا سرفراز خان صفدر اس سے پہلے گوجرانوالہ سے گرفتار ہو چکے تھے اور وہ ایک ماہ جیل میں رہے۔

والد صاحب کے ساتھ تو یہ ہوا کہ ان دنوں بھٹو صاحب نے نیم فوجی تنظیم فیڈرل سیکیورٹی فورس بنا رکھی تھی جس سے وہ تحریک کو روک رہے تھے۔ گکھڑ میں جمعہ کی نماز کے بعد جلوس نکلا کرتا تھا جس کی قیادت والد صاحب کیا کرتے تھے۔ ایف ایس ایف کے کمانڈر نے جلوس کے سامنے سڑک پر لکیر کھینچ دی کہ جو اسے عبور کرے گا اسے گولی مار دی جائے گی۔ والد صاحب یہ کہہ کر اس لکیر کو عبور کر گئے کہ مسنون عمر پوری کر چکا ہوں، اب شہادت کی تمنا ہے، مل جائے تو خوش قسمتی ہوگی۔ مدینہ والے میرے استاذ قاری محمد انور صاحبؒ بھی وہاں موجود تھے، جے یو پی (جمعیت علماء پاکستان) کے سید احمد ڈار بھی تھے، وہ بھی عبور کر گئے۔ ایف ایس ایف کے کمانڈر حیران پریشان رہ گئے۔

ہم پنڈی سے آ رہے تھے، گکھڑ پہنچے تو میں نے رانا نذر الرحمٰن سے کہا کہ یار گاڑی روکو میں والد صاحب کا پتہ کر لوں کہ جیل میں ہیں یا باہر۔ والد صاحب ایک دن پہلے رہا ہوئے تھے اور دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔ شام کو قومی اتحاد کی مرکزی کونسل کی میٹنگ تھی۔ حمزہ صاحب مجھے ڈیوس روڈ پر یہ کہہ کر اتار گئے کہ آپ چلیں ہم دس منٹ میں آتے ہیں۔ میں اندر گیا تو مجھے گرفتار کر لیا گیا جبکہ یہ لوگ بچ گئے۔

میں قومی اتحاد کے پارلیمانی بورڈ میں بھی رہا ہوں۔ پیر پگاڑا صاحب سے بھی مجھے کچھ عقیدت تھی۔ میں جو ”راشدی“ کہلاتا ہوں تو اس کی وجہ پیر صاحب کے خاندان کے ایک بزرگ تھے شاہ محمد راشدؒ، ان کی نسبت سے کہلاتا ہوں۔ حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ، دین پور کی گدی، اور امروٹ شریف کی گدی سب ان سے وابستہ ہیں۔ اسی نسبت سے ہم راشدی کہلاتے ہیں۔ جب ہم لاہور ٹھہرے ہوئے تھے تو ایک دن میں نے بات چھیڑ دی کہ میں بھی راشدی ہوں۔ پیر صاحب نے سنی اَن سنی کر دی۔ میں نے تو

ایسے ہی اظہار کیا تھا کہ مجھے آپ کے بڑوں سے ایک نسبت ہے، عقیدت ہے۔ جب دیکھا کہ انہیں میری باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تو میں بھی خاموش ہو گیا۔

ایک دفعہ ایک تلخ تجربہ بھی ہوا کہ رمضان کا مہینہ تھا لیکن پارلیمانی بورڈ کی میٹنگ میں پیر صاحب سگار پیتے رہے۔ ظہور الحسن بھوپالی مرحوم سے میری کافی انڈر اسٹینڈنگ تھی، وہ جے یو پی (جمعیت علماء پاکستان) کے تھے اور میں جے یو آئی (جمعیت علماء اسلام) کا تھا۔ جہاں کوئی مسئلہ ہوتا ہم باہم صلاح مشورہ کر کے ایک رائے بنا لیتے، کبھی مولانا فتح محمد صاحب کو بھی ملا لیتے۔ پیر صاحب کی سگار نوشی پر ہم نے طے کیا کہ بات کرنی چاہیے۔ چنانچہ ایک دن ہم نے کہہ ہی دیا کہ پیر صاحب! رمضان میں آپ کا سگار پینا افسوسناک ہے۔ کہنے لگے، چھوڑو۔ گویا سنی اَن سنی کر دی اور کوئی توجہ نہ دی۔ آخر ہم نے مفتی صاحب سے کہا کہ یہ افسوسناک امر ہے کہ رمضان المبارک میں پارلیمانی بورڈ کا اجلاس ہو رہا ہوتا ہے اور بورڈ کے چیئرمین صاحب سگار پینا شروع کر دیتے ہیں۔ ہمارے کہنے سے صرف اتنا فرق پڑا کہ میٹنگ دن کی بجائے رات کو ہونے لگی۔ بہر حال اس دور کی سیاست میں میرا ایک متحرک کردار رہا ہے۔

سوال: آپ کتنا عرصہ گرفتار رہے؟

جواب: پہلی دفعہ تو میں ۱۹۷۵ء میں گرفتار ہوا تھا۔ گوجرانوالہ میں جمعیت علماء اسلام کا آل پاکستان کنونشن ہوا تھا جس میں ہم نے پرائیویٹ شرعی عدالتوں کے قیام کا اعلان کیا تھا۔ اس پر حکومت نے جمعیت کی پوری قیادت پر مقدمات بنائے تھے۔ اکتیس علماء پر مقدمے بنے تھے۔ پارٹی نے فیصلہ کر لیا کہ ہم ضمانتیں نہیں کروائیں گے، قبل از گرفتاری ضمانت نہ کروانے کا فیصلہ تھا۔ میں دو ہفتے گرفتار رہا پھر میری ضمانت ہو گئی۔ دوسری دفعہ میں ۱۹۷۶ء میں گرفتار ہوا تھا۔ مدرسہ نصرۃ العلوم گھنٹہ گھر کے ساتھ مسجد نور میں یہ کنونشن ہوا تھا جس میں ملک بھر سے پانچ ہزار علماء نے شرکت کی تھی۔ گوجرانوالہ سے ایک صاحب رانا محمد اقبال اوقاف اور جیل خانہ جات کے وزیر تھے۔ ان ہی دنوں محکمہ اوقاف نے اس مسجد اور مدرسہ کو اپنی تحویل میں لینے کا اعلان کر دیا۔ مدرسہ نصرۃ العلوم کے متعلق نوٹیفکیشن جاری ہو گیا۔ اس میں مدرسہ کا نام نہیں لیا گیا تھا بلکہ لکھا تھا کہ مسجد نور مع ملحقہ پینتالیس کمروں کے۔ اس وقت نوید انور نوید گوجرانوالہ کے نوجوان وکیل تھے۔ ہم نے مزاحمت کرنے کا فیصلہ کیا اور احتجاجی تحریک شروع کر دی۔ ساڑھے چار مہینے لگاتار ہم نے تحریک چلائی، ڈیڑھ پونے دو سو ورکر گرفتار ہوئے، میں خود بھی تین مہینے جیل میں رہا، نوید انور نوید مرحوم بھی جیل میں رہے۔

سوال: اس مہم میں دوسرے مکاتبِ فکر نے بھی ساتھ دیا؟

جواب: بالکل دیا۔ خواجہ وارث شیعہ رہنما تھے وہ بھی ہماری تحریک میں شامل رہے۔ ہماری مسجد میں جلسہ ہو رہا تھا، رانا اقبال کے خلاف قرارداد پیش کی گئی تو خواجہ صاحب نے اٹھ کر کہا کہ میں بھی آپ کے ساتھ ہوں، پھر وہ گرفتار بھی ہوئے۔

سوال: اس کے بعد کب گرفتار ہوئے؟

جواب: میں تیسری بار قومی اتحاد کی تحریک میں گرفتار ہوا تھا۔ آرمی ایکٹ کے تحت ہم پر کیس چلا۔ لیفٹیننٹ کرنل نصیر احمد تھے، لاہور کیمپ جیل میں عدالت لگتی تھی۔ وہاں کچھ دلچسپ باتیں ہوئیں۔ ایک تو یہ ہوا کہ میاں محمود علی قصوری ہمارے ساتھ قید بھی تھے اور سمری کورٹ میں ہمارے وکیل بھی تھے۔ ایم انور بار ایٹ لاء ہماری سپورٹ کے لیے آتے تھے لیکن کورٹ میں ہماری طرف سے قصوری صاحب ہی پیش ہوتے تھے۔ قصوری صاحب کی آواز بہت بھاری تھی، وہ جب بولتے تو کرنل صاحب میز بجانے لگتے اور ساتھ کہتے کہ آہستہ بولو، عدالت میں بول رہے ہو Contempt Of Court لگ جائے گی۔ قصوری صاحب آواز دھیمی کرنے کی کوشش تو کرتے لیکن پھر بھی اونچی رہتی۔ دو تین دفعہ کرنل صاحب لال پیلے ہوئے کہ ان کے حکم کی تعمیل نہیں ہو رہی۔ اس پر ایم انور صاحب نے آگے بڑھ کر کہا کہ جناب یہ آہستہ ہی بول رہے ہیں، آپ کی توہین نہیں کر رہے۔ ان کا لہجہ ہی اس طرح کا ہے۔

دوسرا واقعہ کافی خوفناک تھا۔ ہوا یہ کہ پولیس انسپکٹر وہاں پیش تھا اور اس پر جرح ہو رہی تھی کہ کب گرفتار کیا، کہاں سے گرفتار کیا، روزنامچے میں کیا لکھا وغیرہ وغیرہ۔ اس نے کہا کہ یہ بات روزنامچے میں لکھی ہوئی ہے۔ ہمارے وکیل نے اعتراض کیا کہ روزنامچے میں اگر یہ لکھا گیا ہے تو ضروری نہیں کہ وہ درست بھی ہو۔ اس پر انسپکٹر کے منہ سے نکل گیا کہ ہمارے لیے تو یہ قرآن کی طرح ہی ہے۔ یہ سن کر ہماری طرف سے ایک نوجوان کھڑا ہو گیا اور اس نے کہا کہ یہ کیا بکواس کر رہا ہے۔ کرنل نے بات گول کرنے کی کوشش کی، کچھ اپنی کرنیلی کا رعب بھی دکھانا چاہا۔ لیکن نوجوان نے کہا کہ چھوڑیں، کرنل ہوں گے آپ۔ میں قرآن مجید کی یہ توہین برداشت نہیں کر سکتا۔ مولانا محمد اجمل خان مرحوم بھی ہمارے ساتھ تھے، وہ اٹھ کھڑے ہوئے، انہوں نے ایسی خطابت دکھائی کہ کرنل کے چھکے چھوٹ گئے۔ وہاں موجود چند نوجوان عالم دیوانگی میں دیواروں سے سر ٹکرانے لگے کہ یہ انسپکٹر روزنامچے کو قرآن کہہ کر کتنی بڑی توہین کر رہا ہے۔ اس کے بعد عدالت ایسی برخاست ہوئی کہ پھر نہیں بیٹھی۔ ادھر عدالتِ عالیہ کے جسٹس زکی الدین پال نے مارشل لاء کو غیر قانونی قرار دے دیا، مارشل لاء ودڑا ہو گیا اور ہم بھی رہا ہو گئے۔

میری رہائی کا واقعہ بھی کچھ کم دلچسپ نہیں۔ عدالتِ عالیہ میں مجھے پیش کیا گیا تو عدالت نے مجھے بری کر دیا۔ اس پر ڈی ایس پی نے یہ کہہ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا کہ ان کے خلاف اور کیس بھی ہیں۔ جیسا کہ مجھے یاد

ہے ایک کیس وزیرآباد کا تھا، ایک گکھڑ کا تھا، ایک گوجرانوالہ کا تھا، اور توڑ پھوڑ کے دو کیس تھے۔ جسٹس نے ڈی ایس پی سے پوچھا، تعمیل ہوگئی ہے؟ کہا، ہوگئی ہے جیل میں۔ جسٹس صاحب نے ڈی ایس پی کو حکم دیا کہ آپ یہاں کھڑے رہیں۔ اور مجھے کہا کہ آپ جائیں۔ میں ہائی کورٹ سے نکلا تو جیل میں اپنا سامان لینے نہیں گیا۔ رکشہ پکڑا اور بادامی باغ کا رخ کیا، بس پر بیٹھا اور سیدھا گکھڑ جا پہنچا۔ میرا سامان دو تین روز بعد مولانا امجد خان لے کر آئے۔ مارشل لاء تک تو کہانی یہی ہے۔ جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں ایک مرتبہ دفعہ ۱۴۴ توڑنے پر سرگودھا میں گرفتار ہوا تھا لیکن چند گھنٹوں بعد رہا کر دیا گیا۔

مولانا مفتی محمودؒ اور جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم

بات ہو رہی تھی کہ مفتی محمود صاحبؒ اپنی زندگی کے آخری حصے میں کسی نہ کسی طرح فوجی حکومت سے نجات پانے کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ قومی اتحاد اور پیپلز پارٹی اکٹھے مل کر ضیاء الحق کا سامنا کریں۔ اس کے لیے گفتگو جاری تھی، کئی اجلاس ہوئے، شیرانوالہ میں بھی ایک میٹنگ ہوئی۔ کراچی کے شیخ حنیف صاحب کے واسطے سے بیگم نصرت بھٹو سے بات چیت چل رہی تھی۔ مفتی صاحب ان ایام میں اتنے غصے میں تھے کہ انہوں نے کھلم کھلا ضیاء الحق کو قادیانی کہنا شروع کر دیا۔ جنرل ضیاء الحق کے خلاف پوری تقریر کیا کرتے تھے۔ میں نے ایک دن کہا کہ حضرت وہ قادیانی ہے یا منافق، آخر لائے تو ہم ہی ہیں۔ کراچی میں ایک دفعہ جلسہ تھا، مفتی صاحب سے پہلے مولانا منظور احمدؒ چنیوٹی نے تقریر کی، تقریر کے دوران انہوں نے ضیاء الحق کو قادیانی نواز کہا۔ مفتی صاحب پیچھے بیٹھے ہوئے تھے، فوراً بولے کہ سیدھا قادیانی کہو، قادیانی نواز کیا ہوتا ہے۔ مولانا چنیوٹی نے کہا کہ میں تو قادیانی نہیں کہتا کہ وہ قادیانی نہیں ہے۔ مفتی صاحب پھر گرجے کہ کہنا پڑے گا، آخر میں یہی کہو گے۔ یعنی وہ اس حد تک غصے میں تھے ان دنوں۔

سوال: جب قومی اتحاد نے وزارتیں جوائن کیں تو سننے میں آیا کہ وزارتوں کے سیکرٹریوں نے ان وزیروں کا باہر آکر استقبال نہ کیا، اس پر اچھا خاصا جھگڑا بھی ہوا؟

جواب: بہت کچھ ہوا، لمبی داستان ہے۔ جمعیت کے تین وزیر تھے۔ میر صبح صادق کھوسو، حاجی فقیر محمد خان، اور حاجی زمان خان اچکزئی۔ کھوسو وزیر صحت تھے، اچکزئی وزیر بلدیات تھے، اور حاجی فقیر محمد خان قبائلی امور اور کشمیر کے وزیر تھے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں قبائلی علاقے میں آپریشن ہوا تھا۔ اس سلسلے میں ہمارے ایک دوست مولانا نور محمد وہاں جیل میں تھے۔ میں نے ایک دن حاجی فقیر محمد خان سے کہا کہ آپ کے پاس قبائلی امور کی وزارت ہے، ہمارے دوست مولانا نور محمد جیل میں ہیں، انہیں رہا کروانا چاہیے۔ اسی طرح ان دنوں بلوچستان کے گورنر صاحب قادیانی تھے۔ میں نے مفتی

صاحب سے کہا کہ عجیب بات ہے کہ ہم لوگ وزارتوں میں ہوں اور بلوچستان کا گورنر قادیانی ہو، آپ نے ضیاءالحق سے بات نہیں کی؟ مفتی صاحب نے جواب دیا، کئی دفعہ کی ہے، وہ سنتا ہی نہیں۔

ایک دفعہ میں حاجی فقیر محمد خان کے گھر ٹھہرا ہوا تھا، ہم دیر تک گپ شپ کرتے رہے۔ صبح ناشتہ کر رہے تھے کہ ٹیلی ویژن سے خبر نشر ہوئی کہ سردار عبدالقیوم کو آزاد کشمیر کی صدارت سے برطرف کر کے ان کی جگہ بریگیڈیئر محمد حیات کو ایڈمنسٹریٹر تعینات کر دیا گیا ہے۔ میں نے حاجی صاحب سے پوچھا کیا یہ واقعہ رات کو آپ کے علم میں نہیں تھا؟ کہنے لگے خدا کی قسم میں تو آپ کے ساتھ ہی یہ خبر سن رہا ہوں، مجھے پہلے سے اس کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ یعنی یہ حال تھا ان وزیروں کا کہ ان کی وزارت کے معاملات سے بھی انہیں بے خبر رکھا جاتا۔

علمائے پاکستان کا سیاسی و تحریکی کردار

سوال: علماء نے پاکستان کی ہر بڑی تحریک میں بھرپور حصہ لیا ہے، چاہے وہ دستور سازی کی تحریک تھی، بحالیٔ جمہوریت کی تحریک تھی، یا اینٹی قادیانی تحریک تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا کہ کیا فرق پڑا؟ حالات تو روز بروز بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ علماء نے آخر کیا کامیابیاں حاصل کیں اتنی زیادہ بھاگ دوڑ کے بعد؟

جواب: دیکھیے دو تین باتیں ہیں۔ یہ سوال کیا تھا میں نے حضرت مفتی محمودؒ سے۔ حیدر آباد کے ایک جلسے میں ہم اکٹھے تھے، نصف شب کے قریب واپس کراچی پہنچے۔ شیخ محمد حنیف چنیوٹی صاحب مفتی صاحب کے میزبان ہوتے تھے۔ میں نے مفتی صاحب سے کہا کہ ہم ۱۹۵۷ء سے انتخابی سیاست میں ہیں، اس سیاست کے فائدے کیا ہیں اور نقصانات کیا ہیں، کبھی اس پر بیٹھ کر غور نہ کر لیا جائے؟ مفتی صاحب نے پوچھا، تم کیا سوچتے ہو؟ میں نے جواب دیا، میں فائدے کم اور نقصانات زیادہ دیکھ رہا ہوں۔ کہنے لگے، ہاں اس پر بات کرنی چاہیے۔ میں نے پوچھا، کب؟ اس وقت مفتی صاحب ضیاءالحق کے خلاف تحریک اٹھانے کے موڈ میں تھے۔ داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگے، ایک دفعہ اس سے نپٹ لینے دو، پھر سوچ لیں گے اس بات پر۔

ایک اور بات مفتی صاحب کے حوالے سے ذکر کرنا چاہوں گا۔ ایک دفعہ راولپنڈی میں جامعہ اسلامیہ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس وقت اکرام الحق شیخ نوائے وقت راولپنڈی کے رپورٹر ہوتے تھے، وہ مفتی صاحب سے ملنے آ گئے۔ شیخ صاحب نے پوچھا، مفتی صاحب جب تک علماء کی خالص حکومت نہ یہاں آ جائے، کیا اسلام کے نفاذ کی توقع ہو سکتی ہے؟ یعنی حکومت میں شراکت نہ ہو اور آپ اپنے فیصلے کرنے

میں آزاد ہوں، کیا ایسی حکومت کے بغیر اسلام نافذ ہو سکتا ہے؟ مفتی صاحب نے جواب دیا، نہیں۔ شیخ صاحب نے پوچھا، کیا آپ انتخابی سیاست کے ذریعے علماء کو آگے لا سکتے ہیں؟ مفتی صاحب نے جواب دیا، نہیں۔ شیخ صاحب نے پوچھا، پھر آپ کیا کر رہے ہیں؟ مفتی صاحب نے جواب دیا، بات یہ ہے کہ ہم اس پوزیشن میں تو نہیں کہ ہم حکومت بنا سکیں، لیکن اس پوزیشن میں ضرور ہیں کہ کسی کو آرام سے حکومت نہ کرنے دیں، اور یہ کام ہم کر رہے ہیں۔

ہمایوں صاحب! آپ نے پوچھا ہے کہ علماء کو سیاست سے کیا ملا؟ میں اس بارے میں یہ کہوں گا کہ انتخابی سیاست سے ہمارے مقاصد پورے نہیں ہوئے، لیکن ایک بات ہے کہ انتخابی سیاست میں حصہ لینے سے اور اسمبلیوں میں بیٹھنے سے بہت سی باتوں میں ہم رکاوٹ ضرور بنے ہیں۔ مثلاً قادیانی مسئلہ اگر اسمبلی میں نہ جاتا تو کبھی حل نہ ہوتا۔ ۱۹۷۳ء کے دستور میں اسلامی دفعات نہ ہوتیں اگر علماء اسمبلیوں میں نہ ہوتے۔ ضیاء الحق کے دور میں دستور میں جو ترامیم کا سلسلہ شروع ہوا، جو کہ اب تک چلا آرہا ہے، اگر علماء اسمبلیوں میں نہ ہوتے تو یہ اسلامی دفعات بھی باقی نہ رہتیں۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ ہم کچھ کر نہیں پا رہے لیکن بہت سے غلط کاموں کے راستے میں رکاوٹ ضرور بنے ہیں۔

میں عملی سیاست میں ۱۹۶۲ء میں آیا تھا اور ۱۹۹۰ء تک مسلسل متحرک رہا۔ ہماری اصل کمزوری یہ ہے کہ ہماری سیاست نعرے بازی کی ہے، ہوم ورک کی نہیں ہے۔ یہ ہوم ورک نہ نظریاتی ہے اور نہ سیاسی۔ دینی جماعتیں اب بھی دس گنا زیادہ پیشرفت کر سکتی ہیں اگر یہ معروضی سیاست اور نظریاتی سیاست میں تھوڑا سا بیلنس قائم رکھیں۔ دوسرا یہ کہ ہوم ورک کریں، نظریاتی بھی اور سیاسی بھی۔

کچھ جمعیت علماء اسلام کی دھڑے بندی کے بارے میں

سوال: جمعیت علماء اسلام میں دھڑے بندی ہوتی رہی ہے، اس بارے میں کیا خیال ہے؟

جواب: ۱۹۸۰ء میں مولانا مفتی محمودؒ کے انتقال کے بعد جمعیت علماء اسلام دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ ایک گروپ حضرت مولانا عبد اللہ درخواستیؒ کے ساتھ تھا جو کہ ''درخواستی گروپ'' کہلاتا تھا۔ جبکہ دوسرا گروپ مولانا فضل الرحمٰن کے ساتھ تھا جو ''فضل الرحمٰن گروپ'' کے نام سے موسوم تھا۔ فضل الرحمٰن گروپ ضیاء الحق مرحوم کے خلاف بننے والے سیاسی اتحاد ایم آر ڈی میں شامل ہو گیا تھا مگر درخواستی گروپ نے اس میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا۔

سوال: آپ لوگوں کا کیا موقف تھا؟

جواب: نوابزادہ نصر اللہ خان نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح پوری جمعیت ایم آر ڈی کا حصہ بن جائے لیکن ہم مسلسل انکار کرتے چلے جا رہے تھے۔ نواب صاحب نے مجھے بلایا اور مخالفت کی وجہ پوچھی۔ میں نے کہا، کچھ ڈیڑھ سال پہلے تو ہم نے پیپلز پارٹی کے خلاف تحریک چلائی تھی، قربانیاں دی تھیں، جیلیں کاٹی تھیں، گولیاں کھائی تھیں، اب جو ہم کارکنوں کو آواز دیں تو انہیں کیا کہیں؟ دوسری بات یہ ہے کہ ضیاء الحق کے خلاف تحریک چلانے کے نتیجے میں اگر نورانی صاحب آگے آجائیں، آپ آجائیں، بلکہ نوستاروں میں سے کوئی ایک بھی آجائے تو میں حاضر ہوں۔ لیکن اگر نصرت بھٹو آگے آتی ہیں تو ہمارے لیے مشکل ہوگا۔ آپ میرے بزرگ ہیں، آپ ہی بتائیں اس تحریک کے نتیجے میں کیا ہوگا؟

میں اس دھڑے بندی میں مولانا درخواستیؒ کے ساتھ تھا اور درخواستی گروپ کا متحرک کردار تھا۔ حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ، حضرت مولانا محمد اجمل خانؒ، حضرت مولانا منظور احمدؒ چنیوٹی بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ۱۹۹۰ء میں دونوں گروپوں میں اتحاد ہوا جس کے تحت حضرت مولانا عبداللہ درخواستیؒ کو متحدہ جمعیت علمائے اسلام کا امیر اور مولانا فضل الرحمٰن کو سیکرٹری جنرل چنا گیا، جبکہ مجھے سیکرٹری اطلاعات منتخب کیا گیا۔ مگر حضرت مولانا سمیع الحق نے اس اتحاد کو تسلیم نہ کرتے ہوئے ''سمیع الحق گروپ'' کے نام سے جمعیت علماء اسلام کا ایک الگ گروپ قائم کر لیا۔

نظریاتی سیاست سے صرفِ نظر

سوال: اوپر فوج سارے اختیارات سنبھالے بیٹھی ہو اور نیچے سیاسی جماعتیں شریک اقتدار ہو جائیں تو آخر اس عمل کی کیا افادیت ہو سکتی ہے؟

جواب: میں یہ نہیں کہتا کہ معروضی سیاست چھوڑ دیں، سوال صرف بیلنس قائم رکھنے کا ہے۔ نظریاتی سیاست چلی گئی ہے اور صرف معروضی سیاست رہ گئی ہے۔ ہمارے پاس آخر قوت کونسی تھی؟ ایک اسٹریٹ پاور تھی جو ہم نے کھو دی ہے۔ اسٹریٹ پاور پر ہماری گرفت نہیں رہی۔ ایک زمانہ تھا جب ہمارے ہفتہ وار رسالہ ''ترجمان اسلام'' میں اعلان آتا تھا کہ فلاں مسئلے پر فلاں تاریخ کو ہماری جماعت مظاہرہ کرے گی۔ اس اعلان پر کم از کم پچاس ساٹھ شہروں میں مظاہرے ہو جاتے تھے۔ اب ہم چیختے چلاتے رہتے ہیں لیکن سوائے ہمارے دینی مدرسوں کے طالب علموں کے اور کوئی نہیں آتا۔ غضب تو یہ ہے کہ ہم اس تبدیلی کا تجزیہ کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ آخر ہم نے اسٹریٹ پاور کیوں کھو دی ہے، اس کے اسباب کیا ہیں؟

سوال: آخر یہ کیا سیاست ہے کہ دینی جماعتیں بار بار استعفیٰ دینے کی بات کرتی ہیں لیکن دیتی نہیں۔ عوام کیا سوچتے ہوں گے کہ دینی جماعتوں کا یہ کیا انداز سیاست ہے؟

جواب: افسوسناک بات ہے۔ جب یہ آئے روز استعفوں کی بات چل رہی تھی تو میں نے کہا تھا کہ مفتی صاحب کو صوبہ سرحد کی وزارتِ اعلیٰ اور ارباب سکندر کو گورنری چھوڑتے ہوئے پندرہ منٹ لگے تھے۔ اس وقت جب بھٹو نے بلوچستان میں جمیعت علماء اسلام اور نیشنل عوامی پارٹی کی مشترکہ حکومت کو برطرف کیا تھا، سردار عطاء اللہ مینگل کو وزارتِ اعلیٰ سے اور غوث بخش بزنجو کو گورنری سے ہٹایا تھا تو پندرہ بیس منٹ بعد مفتی صاحب اور ارباب سکندر کے استعفے بھٹو کی میز پر تھے۔ بھٹو صاحب نے مفتی صاحب کو بلا کر رام کرنا چاہا لیکن انہوں نے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میرے ساتھ کی پارٹی کو آپ نکال دیں اور میں کرسی سے چمٹا رہوں، یہ اصول کے خلاف ہے۔

اب کی سیاست دیکھیں کہ مہینے گزر گئے لیکن فیصلہ نہیں ہو پایا کہ استعفے دینے ہیں یا نہیں۔ یہ ہے نظریاتی اور معروضی سیاست کا قصہ۔ مفتی صاحب کو ایک ہفتہ بعد تک بھی بھٹو صاحب سمجھاتے رہے کہ مفتی صاحب! چھوڑیں کیا کرتے ہیں، آپ کو کون چھیڑتا ہے، آپ وزارت سنبھالے رکھیں۔ مفتی صاحب کا ایک ہی جواب تھا کہ میں یہ بے اصولی نہیں کر سکتا، میرا نیشنل عوامی پارٹی سے معاہدہ ہے، اگر آپ بلاوجہ اس کو فارغ کرتے ہیں تو میں کیوں اندر رہوں؟

سقوطِ مشرقی پاکستان: ایک غلط فہمی کا ازالہ

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد — ۳ مارچ ۲۰۰۰ء)

محترم راجہ انور صاحب کا کہنا ہے کہ

"سامراج سے آزادی حاصل کرنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ ہم پانچ سال کے لیے اپنی ساری ترجیحات معطل کر دیں، صرف پانچ سال کے لیے اپنے سارے اہم مسائل طاق نسیاں کی نذر کر دیں اور معاشی لحاظ سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش کریں۔ جس دن ہم معاشی طور پر مضبوط اور آزاد ہو گئے اس دن دنیا کی کوئی قوت، کوئی سامراج اور کوئی سازش ہمیں غلام نہیں رکھ سکے گی۔"

اس سلسلہ میں میرے ذہن میں ایک اشکال ہے جس پر کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں مگر اس اشکال پر کچھ عرض کرنے سے پہلے راجہ صاحب کے مضمون کے بعض دیگر مندرجات کے حوالہ سے تاریخ کا ریکارڈ درست رکھنے کے لیے چند معروضات پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

راجہ صاحب نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے المیہ کا ذکر کرتے ہوئے اس دور کی "کوتاہ فکر فوجی، سیاسی اور مذہبی قیادت" کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے اور سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ اس الیکشن میں مذہبی جماعتوں میں سب سے زیادہ نشستیں جمعیت علماء اسلام اور جمعیۃ العلماء پاکستان نے حاصل کی تھیں جن کی قیادت مولانا مفتی محمودؒ اور مولانا شاہ احمد نورانی کر رہے تھے۔

یہ درست ہے کہ مشرقی پاکستان میں یحییٰ خان کے فوجی ایکشن کو جماعت اسلامی کی حمایت حاصل تھی، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مولانا مفتی محمودؒ اور مولانا شاہ احمدؒ نورانی نے یحییٰ خان کو سپورٹ نہیں کیا تھا۔ بلکہ راجہ انور صاحب کے ممدوح جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے جب منتخب پارلیمنٹ کا ڈھاکہ میں طلب کیا جانے والا اجلاس ملتوی کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے "اِدھر تم اُدھر ہم" کا نعرہ لگایا تھا اور ان کے لاہور کے جلسہ میں یہ دھمکی دی گئی تھی کہ اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لیے ڈھاکہ جانے والے ممبران اسمبلی کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی، تو اس کے جواب میں مولانا مفتی محمودؒ نے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ اس دھمکی کو مسترد کرتے ہیں اور اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لیے ضرور ڈھاکہ جائیں گے۔

اس وقت کی صورتحال کا اصل منظر یہ ہے کہ نومنتخب دستور ساز آمبلی کا ڈھاکہ سیشن ملتوی کرنے اور مشرقی پاکستان پر فوجی ایکشن کے سلسلہ میں یحییٰ خان کے اقدامات کو جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم اور جماعتِ اسلامی نے سپورٹ کیا تھا۔ جبکہ آمبلی کی دو بڑی مذہبی جماعتوں جمعیت علماء اسلام اور جمعیۃ العلماء پاکستان نے توازن اور اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہوئے اپنا جداگانہ تشخص قائم رکھا تھا۔ اس لیے کسی استثناء کے بغیر اس دور کی پوری مذہبی قیادت کو مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا ذمہ دار قرار دینا اور اس پر ''کوتاہ فکری'' کی پھبتی کسنا راجہ انور صاحب کی دلی خواہش تو ہو سکتی ہے مگر حقائق کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔......

ذوالفقار علی بھٹو کا دورِ سیاست

بھٹو دور کی چند متحرک شخصیات

مسلمانانِ ہند کی تقسیم کا قضیہ اور مولانا مفتی محمودؒ

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد — ۲۳ مئی ۱۹۹۹ء)

گزشتہ ایک کالم میں قارئین سے وعدہ کیا تھا کہ حضرت مولانا مفتی محمودؒ سے منسوب کیے جانے والے اس جملے کے بارے میں اصل صورتحال کی وضاحت کروں گا کہ:

''ہم پاکستان بنانے کے گناہ میں شریک نہیں تھے۔''

یہ بات میرے سامنے ہوئی تھی اس لیے اس سلسلہ میں اصل قصہ کو تاریخ کے ریکارڈ پر لانا اپنی ذمہ داری سمجھتا ہوں۔ لیکن پہلے اس پس منظر کا ذکر ضروری ہے کہ مولانا مفتی محمودؒ کا تعلق اصلاً جمعیت علماء ہند سے تھا جس نے قیامِ پاکستان کی مخالفت کی تھی۔

قیامِ پاکستان سے پہلے جمعیت علماء ہند اور مجلسِ احرارِ اسلام کا موقف

جمعیت علماء ہند کے ساتھ مجلسِ احرارِ اسلام نے بھی تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی تھی اور ہندوستان کی تقسیم سے اختلاف کیا تھا اور روایتی جوش و خروش کے ساتھ کیا تھا۔ جبکہ علماء دیوبند کی ایک بڑی تعداد نے ''جمعیت علماء ہند'' سے الگ ہو کر ''جمعیت علماء اسلام'' کے نام سے تحریکِ پاکستان میں سرگرم کردار ادا کیا تھا۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اس انکار کی ضرورت ہے کہ جمعیت علماء ہند اور مجلسِ احرارِ اسلام دونوں قیامِ پاکستان کے خلاف تھیں اور انہوں نے اس کی مخالفت میں اپنی طرف سے کوئی کمی نہیں کی۔ ان جماعتوں کا موقف یہ تھا کہ:

۱. مسلم لیگی قیادت نفاذِ اسلام میں سنجیدہ نہیں ہے اور نہ ہی اس کی اہلیت رکھتی ہے۔
۲. قیامِ پاکستان سے برصغیر کے مسلمان تقسیم ہو جائیں گے اور ایک دوسرے کے کسی کام نہیں آ سکیں گے۔
۳. مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد بھارت میں ہندوؤں کے رحم و کرم پر رہ جائے گی۔

جہاں تک نتائج کا تعلق ہے نصف صدی بعد ہمیں انہی نتائج کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جن کا اظہار ان جماعتوں کے قائدین تحریکِ پاکستان کی مخالفت میں خدشات کی صورت میں کیا کرتے تھے۔

مسلم لیگی راہنما چودھری خلیق الزمان مرحوم کا اعتراف

چنانچہ مسلم لیگی قیادت کئی بار اقتدار ملنے کے باوجود نفاذِ اسلام کی طرف نصف صدی میں کوئی پیشرفت نہیں کر سکی۔ اور برصغیر کے مسلمانوں کی عظیم قوت کے تقسیم ہو جانے کے بعد مسلم لیگی راہنما چودھری خلیق الزمان مرحوم کے اس اعتراف کے بعد مزید کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی جو انہوں نے سقوطِ ڈھاکہ کے فوراً بعد ''اخبارِ جہاں'' کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ

''ہمارے طرزِ عمل کے باعث برصغیر کے مسلمان تین حصوں میں تقسیم ہو گئے ہیں جو ایک دوسرے کی کسی مشکل میں کام نہیں آسکتے۔''

قیامِ پاکستان کے بعد جمعیت علماء اسلام اور مجلسِ احرارِ اسلام کا موقف

تاہم اس سب کچھ کے باوجود قیامِ پاکستان کی مخالفت ایک سیاسی رائے تھی جسے جمعیت علماء ہند اور مجلسِ احرارِ اسلام کے راہنماؤں نے اپنی انا کا مسئلہ نہیں بنایا۔ بلکہ جب دیکھا کہ مسلمانانِ ہند نے ان کی رائے کی حمایت نہیں کی اور مسلم لیگ کا ساتھ دیا ہے تو انہوں نے خوشدلی کے ساتھ اس فیصلہ کو قبول کر لیا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں کچھ حقائق قارئین کے سامنے لانا ضروری سمجھتا ہوں۔ تحریکِ پاکستان کی مخالفت میں علماء کرام میں سب سے نمایاں تین نام ہیں:

۱. مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

۲. امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

۳. مولانا ابوالکلام آزادؒ

بلاشبہ ان تینوں حضرات نے قیامِ پاکستان کے خلاف اپنی رائے کو پورے شد و مد کے ساتھ پیش کیا مگر پاکستان بن جانے کے بعد ان کا طرزِ عمل کیا تھا، اسے بھی سامنے رکھ لیجیے۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی ہدایت

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے ان کے پاکستان میں رہنے والے عقیدت مندوں نے آئندہ کے بارے میں راہنمائی طلب کی تو انہوں نے واضح طور پر ہدایت کی کہ پاکستان کی سالمیت و استحکام کے لیے کام کریں اور ماضی کو بھول جائیں۔ مولانا مدنیؒ نے اس سلسلہ میں بڑی خوبصورت مثال دی جو ان کے مکتوب کی صورت میں شائع ہو چکی ہے۔ انہوں نے کہا کہ مسجد بننے سے پہلے اہلِ محلہ کا اختلاف ہو سکتا ہے کہ مسجد یہاں بنے وہاں نہ بنے، اتنی جگہ میں بنے اور اتنی میں نہ بنے۔ لیکن جب ایک فریق کی رائے

غالب آگئی اور انہوں نے دوسرے فریق کی رائے کے خلاف مسجد بنالی تو اب یہ مسجد سب کے لیے مسجد ہی ہے، اور اس کا احترام اور اس کے تقدس کی حفاظت سب کی ذمہ داری ہے۔

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کا عزم

اسی طرح امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے لاہور میں جلسہ عام منعقد کر کے اعلان کیا کہ قوم نے ان کی رائے کو قبول نہیں کیا اس لیے وہ قوم کا فیصلہ تسلیم کرتے ہوئے اس کے حق میں دستبردار ہوتے ہیں، اور اب وہ پاکستان کی سالمیت واستحکام کے لیے بھرپور کردار ادا کریں گے۔ چنانچہ کشمیر پر پاکستان اور بھارت کی پہلی جنگ میں مسلم لیگ کے ساتھ جس جماعت نے جہادِ کشمیر کی حمایت میں رائے عامہ کو بیدار کرنے کے لیے سب سے زیادہ کام کیا وہ مجلسِ احرارِ اسلام تھی۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ کا طرزِ عمل

اور مولانا ابوالکلام آزادؒ کے بارے میں بھی یہ بات تاریخ کے ریکارڈ پر آچکی ہے کہ تقسیمِ ہند کے موقع پر جب ریاستوں کو اس بات کا اختیار ملا کہ وہ اپنی مرضی سے پاکستان یا بھارت میں سے کسی کے ساتھ شامل ہو سکتے ہیں تو بلوچستان کی ریاست قلات کے نواب میر احمد یار خان مرحوم نے بھارت کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کیا۔ مگر اس کے اعلان سے قبل کانگریسی راہنماؤں سے رابطہ کے لیے اپنے وزیر دربار میر غوث بخش بزنجو مرحوم کو بھیجا تاکہ بھارتی حکومت سے گفت وشنید کے بعد بھارت کے ساتھ قلات کے الحاق کا باقاعدہ اعلان کر دیا جائے۔ میر غوث بخش بزنجو مرحوم دہلی پہنچے تو اس خیال سے پہلے مولانا ابوالکلام آزادؒ سے ملے کہ اس طرح کانگریس کی ہائی کمان کے ساتھ معاملات طے کرنے میں آسانی رہے گی۔ مولانا آزادؒ نے نواب قلات کے فیصلے پر ناراضگی کا اظہار کیا۔ انہوں نے میر غوث بزنجو کو دوسرے کانگرسی راہنماؤں کے ساتھ ملنے سے روک دیا اور یہ تلقین کر کے واپس بھیج دیا کہ پاکستان بن چکا ہے اس لیے آپ لوگ پاکستان کے ساتھ الحاق کریں اور اسے مضبوط بنائیں۔

شیخ مجیب الرحمٰن مرحوم سے مفتی محمودؒ اور ولی خان مرحوم کی ملاقات

مولانا مفتی محمودؒ کا تعلق اسی قافلہ سے تھا اور اپنے ان اکابر کے اسی طرزِ عمل کے مطابق انہوں نے خود کو پاکستان کی سالمیت واستحکام میں اسلامی نظام کے نفاذ کی جدوجہد کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ اس سلسلہ میں ایک تاریخی واقعہ کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات کے بعد جب صدر یحییٰ خان نے پارلیمنٹ کا طلب کردہ اجلاس ملتوی کر دیا اور شیخ مجیب الرحمٰن نے اس کے ردعمل میں

ہڑتال کا اعلان کر کے مشرقی پاکستان کا پورا نظام جام کر دیا تو پاکستان کی تقسیم کا خطرہ حقیقی طور پر بالکل سامنے نظر آنے لگا۔ اس موقع پر معاملات کو سلجھانے کے لیے قومی اسمبلی کی چھوٹی پارلیمانی پارٹیوں نے لاہور میں اجلاس منعقد کر کے فریقین سے مذاکرات کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان کے وفد میں مولانا مفتی محمودؒ بھی مذاکرات میں شرکت کے لیے ڈھاکہ گئے اور شیخ مجیب الرحمٰن سے ملے۔

مولانا مفتی محمودؒ نے جمعیت علماء اسلام کی مرکزی مجلسِ شوریٰ میں ان مذاکرات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے بتایا کہ وہ اور خان عبد الولی خان دونوں شیخ مجیب سے ملے اور ان سے دیگر بہت سی باتوں کے علاوہ یہ بھی کہا کہ:

> ''شیخ صاحب! یہ بات یاد رکھیں کہ آپ مسلم لیگی ہیں اور ہم کانگرسی۔ کل آپ پاکستان بنا رہے تھے تو ہم نے کہا تھا کہ نہ بنائیں اس سے مسلمانوں کا نقصان ہوگا۔ اور آج آپ پاکستان توڑ رہے ہیں تو ہم آپ سے یہ کہنے آئے ہیں کہ اسے نہ توڑیں مسلمانوں کو نقصان ہوگا۔''

وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کا الزام اور مولانا مفتی محمودؒ کا جواب

اس پس منظر میں بعض مجالس میں اس وقت کے وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے ایک بیان کا جواب دیتے ہوئے، جس میں بھٹو مرحوم نے اپوزیشن پر پاکستان کی تقسیم کی ذمہ داری کا الزام عائد کیا تھا اور مفتی صاحبؒ اس وقت اپوزیشن لیڈر تھے، مولانا مفتی محمودؒ نے کہا تھا کہ:

> ''ہم پاکستان کی تقسیم کے ذمہ دار نہیں ہیں، اس کی ذمہ داری تم پر عائد ہوتی ہے۔ ہم تو ہندوستان کی تقسیم کے حق میں بھی نہیں تھے، پاکستان کی تقسیم کے کس طرح حق میں ہو سکتے ہیں؟ یہ تقسیم کرنا تمہارا ہی کام ہے، کل بھی ملک تم نے تقسیم کیا اور آج بھی تم نے ملک کو دولخت کیا ہے۔ اگر یہ تقسیم گناہ ہے تو اس گناہ میں ہم نہ کل شریک تھے اور نہ آج اس گناہ میں ہم حصہ دار ہیں۔''

الفاظ اور جملوں کی ترتیب میں کمی بیشی ہو سکتی ہے لیکن میں نے پوری کوشش کی ہے کہ مولانا مفتی محمودؒ نے جو کچھ کہا اس کا پورا مفہوم بیان ہو جائے۔ یہ بات انہوں نے اکتوبر ۱۹۷۵ء کے دوران جامع مسجد نور مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں جمعیت علماء اسلام کے ملک گیر کنونشن سے خطاب کرتے ہوئے تفصیل کے ساتھ کی تھی، اور میں اس کنونشن کا اسٹیج سیکرٹری تھا۔ جبکہ بعض دیگر مجالس میں بھی انہوں نے یہ بات کہی جسے یار دوستوں نے اس جملے میں تبدیل کر دیا کہ ''ہم پاکستان بنانے کے گناہ میں شریک نہیں تھے'' اور اس کے بعد سے اس بات کو مسلسل دہرایا جا رہا ہے۔

بہر حال علماء کا وہ حلقہ جس نے ایک سیاسی رائے اور موقف کے طور پر پاکستان کے قیام کی مخالفت کی تھی اور اسے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے مجموعی مفاد میں مفید نہیں سمجھا تھا، انہوں نے پاکستان بن جانے کے بعد نہ صرف اسے خوشدلی کے ساتھ تسلیم کیا بلکہ آج وہی علماء پاکستان کے استحکام و سالمیت اور اسے ایک اسلامی نظریاتی ریاست بنانے کے لیے سب سے زیادہ سرگرمِ عمل ہیں، اور غالباً تحریکِ پاکستان کی اصل منزل بھی یہی ہے۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ سے مولانا مفتی محمودؒ تک

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد — ۱۰ اپریل ۲۰۰۱ء)

جمعیت علماء اسلام کا قیام سب سے پہلے ۱۹۴۵ء میں اس وقت عمل میں آیا جب متحدہ ہندوستان میں علماء کی سب سے بڑی تنظیم جمعیۃ العلماء ہند نے تحریکِ آزادی میں تقسیمِ وطن اور قیامِ پاکستان کے سوال پر مسلم لیگ کی بجائے انڈین نیشنل کانگریس کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا، اور قیامِ پاکستان کو جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے لیے غیر مفید قرار دیتے ہوئے اس کی مخالفت کا اعلان کیا۔ اس فیصلہ سے اختلاف رکھنے والے علماء نے، جن میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ سرفہرست تھے، جمعیت علماء ہند سے علیحدگی اختیار کر لی اور اس کے بعد جمعیت علماء اسلام کا قیام عمل میں لایا گیا جس نے قیامِ پاکستان کی جدوجہد میں مسلم لیگ کے شانہ بشانہ حصہ لیا۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کو جمعیت علماء اسلام کا پہلا سربراہ منتخب کیا گیا جبکہ ان کے ساتھ مولانا راغب احسنؒ، مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا غلام مرشدؒ، مولانا محمد شفیعؒ اور مولانا اطہر علیؒ آف ڈھاکہ جیسے سرکردہ علمائے کرام اس میں شامل تھے۔ حتیٰ کہ جب صوبہ سرحد اور سلہٹ کے علاقہ کو پاکستان میں شامل کرنے یا نہ کرنے کے سوال پر ریفرنڈم کا فیصلہ کیا گیا تو سرحد میں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور پیر صاحبؒ آف مانکی شریف، جبکہ سلہٹ میں مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے عوامی رابطہ کی منظم مہم چلا کر علماء اور عوام کو پاکستان کی حمایت کے لیے آمادہ کیا جس کے نتیجے میں دونوں جگہ مسلم لیگ نے ریفرنڈم جیت لیا۔ اور انہی خدمات کے اعتراف کے طور پر قائداعظم مرحوم نے کراچی میں قیامِ پاکستان کے موقع پر پہلا پرچم لہرانے کے لیے علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کا اور ڈھاکہ میں مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کا انتخاب کیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد دستور ساز اسمبلی کے رکن کے طور پر جمعیت علماء اسلام کے امیر شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے اسلامی دستور کی جنگ لڑی جس کے نتیجے میں وہ ''قراردادِ مقاصد'' منظور کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی حاکمیتِ اعلیٰ کے اقرار اور قرآن و سنت کی دستوری و قانونی عملداری کے اس عہد کے ساتھ پاکستان دستوری طور پر ایک اسلامی ریاست کی حیثیت اختیار کر گیا۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی وفات کے بعد جمعیت علماء اسلام ایک فعال جماعت کے طور پر متحرک نہ رہی۔ البتہ حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ، حضرت مولانا مفتی محمد حسن امرتسریؒ، حضرت مولانا اطہر علیؒ، حضرت مولانا احتشام الحق تھانویؒ، حضرت مولانا متین خطیبؒ، اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ جیسے

اکابر علماء نے وقتاً فوقتاً اس پلیٹ فارم سے دستورِ اسلامی کے نفاذ اور دیگر دینی مقاصد کے لیے سرگرمیوں کو جاری رکھا۔

۱۹۵۶ء میں ملک کے پہلے دستور کے نفاذ کے بعد اس بات کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کی گئی کہ جمعیت علماء اسلام کو از سرِ نو منظم و فعال بنایا جائے اور عوامی سطح پر اس کی تنظیمِ نو کی جائے۔ چنانچہ ۱۹۵۷ء میں ملتان میں مغربی پاکستان کی سطح پر علماء کرام کا ایک قومی کنونشن طلب کر کے ”جمعیت علماء اسلام مغربی پاکستان“ کی تنظیمِ نو کا فیصلہ کیا گیا اور حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کو امیر منتخب کیا گیا جن کے ساتھ حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ اور حضرت مولانا مفتی محمودؒ نائب امیر چنے گئے، جبکہ حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ کو جنرل سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ اس نئی ٹیم نے ملک بھر میں از سرِ نو رابطے اور دورے کر کے ہر سطح پر جمعیت علماء اسلام کے حلقے اور شاخیں قائم کر دیں اور علماء کرام کو ملک کے ہر خطہ میں عملی سیاست میں سرگرم حصہ لینے کے لیے تیار کیا۔

۱۹۵۸ء کے مارشل لاء کے بعد صدر محمد ایوب خان مرحوم نے ۱۹۶۲ء میں پہلے عام انتخابات کرائے تو حضرت مولانا مفتی محمودؒ ڈیرہ اسماعیل خان سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ نے مانسہرہ سے مغربی پاکستان اسمبلی کی رکنیت کا الیکشن جیتا۔ اس طرح ان دو ایوانوں میں جمعیت علماء اسلام کی مؤثر نمائندگی کے باعث عوامی حلقوں میں جمعیت علماء اسلام مسلسل اپنے اثر و رسوخ اور تعارف میں اضافہ کرتی گئی۔ قومی اسمبلی کے ڈھاکہ میں ہونے والے اجلاسوں میں شرکت کے دور میں مولانا مفتی محمودؒ کا مشرقی پاکستان کے علماء سے رابطہ قائم ہوا، اس کے بعد مشرقی پاکستان میں بھی جمعیت علماء اسلام قائم ہوگئی جس کا امیر پیر صاحب مرحوم کو چنا گیا۔ جبکہ دونوں صوبوں کو ملا کر مرکزی سطح پر جمعیت علماء اسلام قائم کی گئی جس کے امیر حضرت مولانا عبداللہ درخواستیؒ اور سیکرٹری جنرل حضرت مولانا مفتی محمودؒ چنے گئے۔ مغربی پاکستان میں جمعیت کا امیر حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ اور سیکرٹری جنرل حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ کو منتخب کیا گیا۔

۱۹۷۰ء کے انتخابات میں جمعیت علماء اسلام نے بھرپور حصہ لیا جس کے نتیجے میں قومی اسمبلی میں ۷، سرحد اسمبلی میں ۶، بلوچستان میں ۳ نشستیں جمعیت کے پاس تھیں۔ سرحد میں جمعیت نے نیشنل عوامی پارٹی کے تعاون سے صوبائی وزارت قائم کی جس کے سربراہ مولانا مفتی محمودؒ تھے جنہوں نے صوبائی وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے دس ماہ تک حکومت کی۔ بلوچستان میں بھی جمعیت سردار عطاء اللہ مینگل کی وزارت میں شریک تھی۔ جبکہ قومی اسمبلی میں جمعیت علماء اسلام نے اپوزیشن میں بیٹھنے کا فیصلہ کیا جس کا سربراہ خان عبد الولی خان مرحوم کو منتخب کیا گیا تھا۔ مگر بھٹو حکومت کے دور میں خان عبدالولی خان کی گرفتاری اور ان کی

پارٹی کو کالعدم قرار دینے پر مولانا مفتی محمودؒ نے صوبہ سرحد کی وزارتِ اعلیٰ سے احتجاجاً استعفیٰ دے دیا اور انہیں قومی اسمبلی میں حزبِ اختلاف کا قائد چن لیا گیا۔

اس مرحلہ پر حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ نے اختلافات کی بنا پر جمعیت کا الگ دھڑا قائم کر لیا جو ان کی وفات تک موجود و متحرک رہا۔ جبکہ قومی اسمبلی میں جمعیت کے دونوں دھڑوں کے ارکان نے دستور میں اسلامی دفعات کی شمولیت اور عقیدۂ ختمِ نبوت کے تحفظ کے لیے دوسری جماعتوں کے علماء کے ہمراہ سرگرم کردار ادا کیا جس کے نتیجے میں دستور میں اسلامی دفعات شامل ہوئیں اور قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا۔

۱۹۷۷ء میں بھٹو حکومت کے خلاف حزبِ اختلاف کی جماعتوں نے ''پاکستان قومی اتحاد'' کے نام سے ایک متحدہ محاذ قائم کیا تو اس کا سربراہ مولانا مفتی محمودؒ کو منتخب کیا گیا جنہوں نے انتخابی مہم اور اس کے بعد احتجاجی تحریک کی قیادت کی اور ملکی و عالمی سطح پر اپنی قائدانہ صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ یہ احتجاجی تحریک بعد میں ''تحریکِ نظامِ مصطفیٰؐ'' کا عنوان اختیار کر گئی تھی۔

تحریکِ نظامِ مصطفیٰؐ کے نتیجے میں جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے مارشل لاء نافذ کر کے اسلام کا نظام ملک میں رائج کرنے کا اعلان کیا تو مولانا مفتی محمودؒ نے تمام سیاسی مصلحتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ان کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ اور ملک بھر میں نفاذِ اسلام کے اقدامات کی حمایت میں دورے کر کے جنرل ضیاء الحق مرحوم کو بتایا کہ عوام اسلام کا نفاذ چاہتے ہیں۔ حتیٰ کہ مولانا مفتی محمودؒ نے ضیاء الحق کابینہ میں شمولیت بھی اختیار کر لی اور جمعیت علماء اسلام کی طرف سے میر صادق کھوسہ، حاجی محمد زمان خان اچکزئی اور حاجی فقیر احمد خان جنرل ضیاء الحق کی کابینہ میں شامل ہوئے۔ لیکن جب اتنی بھرپور حمایت و تعاون کے باوجود مولانا مفتی محمودؒ جنرل ضیاء الحق کو ملک میں عملاً نفاذِ اسلام کے لیے تیار نہ کر سکے اور بات زبانی جمع خرچ سے آگے نہ بڑھی تو مفتی صاحبؒ نے حکومت سے علیحدگی اختیار کر کے جنرل ضیاء الحق مرحوم کے خلاف عوامی جدوجہد منظم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر ابھی وہ اس کی ابتدائی تیاریوں میں تھے کہ اجل کا بلاوا آگیا اور وہ حج کے لیے جاتے ہوئے کراچی میں انتقال کر گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا مفتی محمودؒ کی آئینی جدوجہد اور اندازِ سیاست

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور ــــ ۱۷ اپریل ۱۹۸۱ء)

قائد محترم حضرت مولانا مفتی محمود قدس اللہ سرہ العزیز کی علمی، دینی اور سیاسی جدوجہد پر نظر ڈالتے ہوئے ان کی جو امتیازی خصوصیات اور نمایاں پہلو دکھائی دیتے ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ مرحوم نے قومی سیاست کے دھارے میں شامل ہو کر خود کو اس میں جذب نہیں کر دیا بلکہ وہ اس دھارے کو اپنے عزائم اور مقاصد کی طرف موڑنے میں کامیاب بھی رہے۔ اور اگر آپ آج سے پچیس سال قبل کی قومی سیاست کا آج کی قومی سیاست سے موازنہ کریں گے تو ان نمایاں تبدیلیوں کے پس منظر میں مولانا مفتی محمودؒ اور ان کے رفقاء کی جدوجہد جھلکتی نظر آئے گی۔

۱۹۵۶ء کا آئین

مفتی صاحب مرحوم کی جدوجہد کا سب سے تابناک پہلو یہ ہے کہ انہوں نے جو رائے قائم کی سوچ سمجھ کر قائم کی اور پھر اس پر نہ صرف پوری استقامت کے ساتھ پختہ رہے بلکہ بالآخر اسے منوا کر دم لیا۔ مثلاً ۱۹۵۶ء کے آئین اور ۱۹۷۳ء کے آئین پر ایک نظر ڈالیے، دونوں کے درمیان جہاں جہاں فرق ہے اس پر نشان لگائیے اور پھر حقائق و واقعات کے حوالے سے اس امر کی چھان بین کیجیے کہ ۱۹۵۶ء کے آئین کو ۱۹۷۳ء کے قالب میں ڈھالنے میں سب سے زیادہ کس کی کوششوں کا دخل ہے۔ ۱۹۵۶ء کا آئین جب نافذ ہوا تو اسلام کے بعض علمبرداروں نے یہ فتویٰ دے دیا کہ یہ آئین بالکل اسلام کے مطابق ہے اور اسلام کا مستقبل اب اس آئین کے ساتھ ہی وابستہ ہو گیا ہے۔ مگر مولانا مفتی محمودؒ نے اپنے رفقاء شیخ حسام الدین اور علامہ خالد محمود کی معیت میں اس آئین پر نظر ڈالی اور اسلامی نقطۂ نظر سے اس میں ترامیم پیش کیں اور اپنی رپورٹ میں بتایا کہ اس آئین کی متعدد دفعات قرآن و سنت کے خلاف ہیں۔ مفتی صاحب مرحوم اور ان کی جماعت و رفقاء اپنے اس موقف پر قائم رہے جبکہ اسلام کا نام لینے والے کئی گروپوں نے ۱۹۷۱ء تک مسلسل ۱۹۵۶ء کے آئین کا راگ الاپا اور اسلام کو اس کے ساتھ لازم و ملزوم قرار دینے پر مصر رہے۔

۱۹۷۳ء کا آئین

مفتی صاحب مرحوم نے آئین میں مسلمان کی تعریف، صدر اور وزیر اعظم کے مسلمان ہونے کی شرط، اور قرآن و سنت سے متصادم قوانین نہ بننے کی ضمانت کو ضروری قرار دیا۔ اور وہ رائے عامہ کے محاذ پر مسلسل جدوجہد کے بعد بالآخر ان امور کو ۱۹۷۳ء کے آئین میں شامل کرانے میں کامیاب ہوئے۔ جبکہ اسلامی نظام کے دیگر علمبرداروں کو نہ صرف یہ کہ ان مطالبات پر آواز اٹھانے میں جھجھک رہی بلکہ جب مولانا مفتی محمود مرحوم نے ایوب خان کی گول میز کانفرنس میں مسلمان کی تعریف کو آئین میں شامل کرنے کا مطالبہ کیا تو ان حضرات کو زبانی تائید کی بھی توفیق نہ ہوئی۔ آئین میں ان امور کو شامل کراتے وقت اگرچہ مفتی صاحب مرحوم کو سب اسلامی طبقات کی حمایت حاصل ہو گئی تھی لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ ان امور کو ایک مطالبہ کی صورت میں پیش کرنے اور رائے عامہ کو اس کے حق میں مسلسل ہموار کرنے کی جدوجہد کی سعادت صرف حضرت مفتی صاحب مرحوم، ان کی جماعت اور رفقاء کو حاصل ہوئی۔

مفتی صاحب مرحوم کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ آئین میں جن امور کی شمولیت کے مطالبہ کو ۱۹۵۷ء میں محض مجذوب کی بڑ سمجھا جاتا تھا اور ۱۹۶۹ء تک بڑے بڑے اسلام پسندوں کو ان مطالبات کی حمایت کی توفیق نہ ہوئی، وہی مطالبات ۱۹۷۳ء کے آئین میں نہ صرف شامل ہوئے بلکہ اس آئین کی سب سے امتیازی خصوصیت بنے۔

انتخابات ۱۹۷۰ء کے بعد کا بحران

اسی طرح ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد پیدا ہونے والے اس بحران پر نظر ڈالیے جس کے نتیجہ میں ملک دولخت ہوا۔ انتخابات کے بعد پنجاب اور سندھ سے اکثریت حاصل ہونے کے باعث مسٹر بھٹو مرحوم نے نعرہ لگایا کہ ملک میں صرف تین سیاسی قوتیں موجود ہیں:

(۱) فوج (۲) عوامی لیگ (۳) اور پیپلز پارٹی۔

مفتی صاحب مرحوم نے اس دعوے کو چیلنج کیا اور کہا کہ ملک میں ایک چوتھی قوت بھی موجود ہے اور وہ سرحد و بلوچستان میں اکثریت حاصل کرنے والی جماعتیں ہیں۔ اور پھر مفتی صاحب مرحوم نے لاہور میں اقلیتی پارلیمانی گروپوں کا کنونشن کر کے اس قوت کے وجود کا احساس دلایا اور اس سیاسی قوت کو اس طریقہ سے منظم کیا کہ خود مسٹر بھٹو کو نہ صرف اس طاقت کا وجود تسلیم کرنا پڑا بلکہ نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت علمائے اسلام کے ساتھ سہ فریقی معاہدہ تک بات پہنچی اور دو صوبوں میں حکومتیں بھی اس سیاسی قوت کے حوالہ کرنا پڑیں۔

الغرض مولانا مفتی محمودؒ کی یہ امتیازی خصوصیت تھی کہ وہ اپنے موقف پر سختی کے ساتھ قائم رہتے تھے اور اس کے حق میں دلائل و براہین کا انبار لگانے کے ساتھ ساتھ حالات اور جدوجہد کو اس طرح ترتیب دیتے تھے کہ مخالف کو اس موقف کو تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہ رہتا۔

سادگی، دیانت اور اصول کی سیاست

مفتی صاحب مرحوم کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے پاکستان کی سیاست میں، جو ایک عرصہ سے سادگی، اصول پرستی، شرافت اور دیانت سے ناآشنا ہو چکی تھی، انہی سنہری اصولوں کو اپنی سیاست کی بنیاد بنایا اور پھر ان کو اس وضع سے نبھایا کہ حق پرستی کی روایات ایک بار پھر نئے وجود سے مشرف ہو کر تاریخ کے ماتھے کا جھومر بنیں۔

- یہ مفتی صاحبؒ کی سادگی تھی کہ قومی اسمبلی کے ممبر سے لے کر وزیر اعلیٰ اور قائد حزب اختلاف تک کئی مناصب پر فائز ہوئے لیکن اپنا اور گھر کا معیارِ زندگی وہی رکھا جو ابتدا سے چلا آرہا تھا۔ کیا مجال ان مناصب میں کوئی منصب مفتی صاحب مرحوم کے گھر کے ماحول، ان کے رہن سہن، ان کے بچوں کے لباس اور خورد و نوش کے معیار اور طرز میں کوئی تبدیلی لا سکے ہوں۔ اقتدار اور لیڈری کا نشہ نہ ان پر طاری ہوا اور نہ انہوں نے اسے اپنے بچوں کے قریب آنے دیا۔
- مفتی صاحبؒ جب سرحد کے وزیر اعلیٰ بنے تو اس وقت قومی اسمبلی کے ممبر بھی تھے۔ کہنے لگے کہ بیک وقت دو تنخواہیں لینا ٹھیک نہیں ہے، بحیثیت ایم این اے تنخواہ وصول کرتے رہے مگر وزیر اعلیٰ کی تنخواہ وصول کرنے سے انکار کر دیا۔
- وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے ان کے لیے الگ بنگلہ کا اہتمام کیا جانے لگا تو انکار کر دیا اور سرکاری گیسٹ ہاؤس میں ہی وزارتِ اعلیٰ کا دور مکمل کیا۔
- مفتی صاحب مرحوم جب خان عبدالولی خان کی جگہ حزب اختلاف کے قائد چنے گئے تو اس حیثیت سے ملنے والے تمام الاؤنسز خود جناب ولی خان کے گھر جا کر ان کی بیگم کو پیش کر دیا کہ وہ جیل میں ہیں، میں ان کا قائم مقام ہوں، یہ الاؤنسز ان کے ہیں۔
- جماعتی زندگی کا عالم یہ تھا کہ وہ جماعت کے قائد تھے اور تمام تر سرگرمیاں جماعت ہی کے لیے تھیں۔ وہ دورے بھی کرتے رہے، ہوائی جہاز کا سفر بھی شب و روز رہتا تھا اور دیگر اخراجات بھی ہوتے تھے مگر خال خال مواقع کے علاوہ وہ یہ تمام اخراجات اپنے وسائل سے پورے کرتے اور پھر جماعت سے تقاضہ بھی نہ ہوتا۔

- ایوب خان مرحوم کے دور میں مناصب کی پیشکش ہوئی مگر اصولوں کو قربان کرنے پر تیار نہ ہوئے۔
- جب وزارتِ اعلیٰ سے استعفیٰ دیا تو کئی روز تک منتیں کی جاتی رہیں کہ وزارتِ اعلیٰ پر واپس آجائیں، مگر مطالبات کی منظوری سے قبل واپسی کو مسترد کر دیا۔ اس دوران بھٹو مرحوم نے کہا کہ مفتی صاحب ہم نے اب تک آپ کو حکومت کب کرنے دی ہے، حکومت کا مزہ تو آپ کو اب آئے گا۔ مفتی صاحب نے فرمایا کہ ہم حکومت میں مزے لینے کے لیے نہیں بلکہ عوام کی خدمت کے لیے آئے ہیں، اس لیے مطالبات تسلیم ہوئے بغیر استعفیٰ کی واپسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے بعد بھی متعدد بار اقتدار میں شمولیت کی پیشکش ہوئی مگر کوئی پیشکش بار آور نہ ہوئی۔
- اور یہ بھی اصول پرستی کا مظاہرہ تھا کہ اسلامی نظام کے نفاذ اور انتخاب کے واضح اعلان کی شرط پر جب موجودہ حکومت میں شامل ہوئے تو دونوں امور کا اعلان ہوتے ہی بلا تاخیر اقتدار سے باہر نکل آئے کہ ہمارا مقصد پورا ہو گیا ہے۔
- مفتی صاحب مرحوم کی اصول پرستی کے اس پہلو سے تمام جماعتی احباب بخوبی آگاہ ہیں کہ وہ دوستوں کے جائز کاموں میں ان کی سفارش اور مدد سے گریز نہیں کرتے تھے۔ لیکن جونہی کسی دوست نے ان سے کوئی ایسی بات کہہ دی جو اُن کے اصول اور وضعداری سے ٹکراتی ہو تو دوٹوک معذرت کر دی کہ یہ کام مجھ سے نہیں ہوگا، میں آپ کے اس کام کے لیے اپنا اصول نہیں توڑ سکتا۔ وقتی طور پر بعض دوست ناراض بھی ہو جاتے مگر بعد میں جب معاملہ سمجھتے تو ناراضگی خود بخود ختم ہو جاتی۔
- شرافت و دیانت کی کیفیت یہ تھی کہ اپنے بڑے سے بڑے مخالف کے ساتھ بھی اختلاف کا اظہار ایک دائرے میں رہ کر کرتے، اختلاف کو ذاتی مخالفت کا رنگ دینے سے گریز کرتے، اور اختلاف بھی طعن و اعتراض کی زبان میں نہ ہوتا بلکہ دلائل و براہین کے حوالے سے بات کرتے۔

الغرض حضرت مولانا مفتی محمود قدس اللہ سرہ العزیز نے پاکستان کی قومی سیاست میں یہ اثر چھوڑا کہ اسلام کی وکالت کو مرعوبیت، جھجک اور خوف و ملامت کے دائرہ سے نکال کر اعتماد، بے باکی اور جرأت کی شاہراہ پر گامزن کیا۔ اور سیاسی زندگی میں سادگی، اصول پرستی اور شرافت کی قدیم روایات کو از سرِ نو زندہ کر کے آنے والی نسلوں کے لیے نشانِ راہ قائم کر دیے۔

مولانا مفتی محمودؒ اور سیاسی اخلاقیات

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد — ۲ مئی ۲۰۲۲ء)

ان دنوں سیاسی رسہ کشی نے جو شکل اختیار کی ہوئی ہے وہ بہت پریشان کن ہے کیونکہ ایک دوسرے کے خلاف جو زبان اختیار کی جا رہی ہے اور باہمی الزام تراشی اور طعنہ زنی کے ساتھ ساتھ قومی اداروں بالخصوص عدلیہ کے فیصلوں کو جس طرح بے وقار کیا جا رہا ہے اور فوج کے خلاف نفرت کی فضا بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے اس نے سیاسی اخلاقیات کو سوالیہ نشان بنا کر رکھ دیا ہے اور اس خلفشار کو ''نو ٹرن پوائنٹ'' کی طرف بڑھتے دیکھ کر بسا اوقات قلبی اضطراب انتہائی حدوں کو چھونے لگتا ہے، اس ماحول میں کچھ واقعاتی جھلکیاں پیش کرنے کو جی چاہتا ہے جو ماضی قریب میں ہی قومی سطح پر ہماری قیادتوں کی اخلاقی اقدار کی طرف توجہ دلاتی ہیں اور یہ احساس دلاتی ہیں کہ ہم کہاں سے کہاں لڑھکتے چلے جا رہے ہیں۔

''شملہ معاہدہ'' کے سلسلہ میں بھٹو مرحوم پر اعتماد

وطن عزیز دولخت ہو چکا تھا، ہماری فوج کا ایک بڑا حصہ انڈیا کی قید میں تھا اور مشرقی پاکستان نے بنگلہ دیش کی صورت اختیار کر لی تھی۔ مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی، جمعیت علماء اسلام، مسلم لیگ اور نیشنل عوامی پارٹی کی باہمی سیاسی کشیدگی عروج پر تھی۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو ملک کے حکمران تھے اور خان عبد الولی خان، مولانا مفتی محمود، اور میاں ممتاز دولتانہ اپوزیشن کی قیادت کر رہے تھے۔ بھٹو صاحب کو نازک ترین مسائل پر بھارتی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی سے مذاکرات کے لیے انڈیا جانا تھا اور سیاسی ماحول میں اس بات کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ ان مذاکرات میں ملک کی اپوزیشن بھی ان کی پشت پر کھڑی دکھائی دے۔ مولانا مفتی محمودؒ نے جمعیت علماء اسلام کے ایک اجلاس میں بتایا کہ ہم نے آپس میں مشورہ کیا کہ بھارت کے ساتھ مذاکرات کے لیے بھٹو صاحب کو ہمارے اعتماد کی ضرورت ہے چنانچہ ہم نے قومی اسمبلی میں بھٹو صاحب پر اعتماد کی قرارداد منظور کر کے اس ضرورت کو پورا کیا اور بھٹو صاحب نے پورے اعتماد کے ساتھ بھارتی وزیر اعظم سے مذاکرات کیے جن کے نتیجے میں ''شملہ معاہدہ'' وجود میں آیا۔

معاصر بزرگ کے بارے میں لب کشائی سے انکار

اسی دوران جمعیت علماء اسلام پاکستان دو حصوں میں بٹ گئی اور حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ نے مولانا مفتی محمودؒ کی بعض پالیسیوں سے اختلاف کرتے ہوئے ''ہزاروی گروپ'' کے نام سے جمعیت علماء

اسلام کی تشکیل نو کر لی، جس سے مولانا مفتی محمودؒ اور مولانا غلام غوث ہزارویؒ جماعتی پالیسیوں اور گروہ بندی میں آمنے سامنے آ گئے۔ اسی تسلسل میں ۱۹۷۷ء کی ''تحریکِ نظامِ مصطفیٰ'' کے دوران جبکہ مولانا مفتی محمودؒ نو سیاسی جماعتوں کے مشترکہ فورم ''پاکستان قومی اتحاد'' کے سربراہ کے طور پر تحریک کی قیادت کر رہے تھے کہ مولانا غلام غوث ہزارویؒ کا ایک تند و تیز بیان مفتی صاحبؒ کے خلاف اخبارات کی زینت بنا۔

میں ان دنوں جمعیت علماء اسلام کا مرکزی سیکرٹری اطلاعات اور پاکستان قومی اتحاد پنجاب کا صوبائی سیکرٹری جنرل تھا، ہم کچھ دوست جامعہ اسلامیہ راولپنڈی صدر میں حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے ساتھ بیٹھے تھے کہ روزنامہ نوائے وقت کے رپورٹر اکرام الحق شیخ ان سے ملنے کے لیے آئے اور مولانا ہزارویؒ کے اس بیان کے بارے میں سوال کیا۔ مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ وہ مولانا کی رائے ہے جو انہوں نے بیان کی ہے۔ شیخ صاحب نے کہا کہ انہوں نے آپ کے بارے میں بھی کچھ کہا ہے۔ مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ وہ بھی ان کی رائے ہے۔ اکرام الحق نے ایک دو بار پھر سوال دہرایا تو مفتی صاحبؒ نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ ''اکرام! جو تم کہلوانا چاہتے ہو وہ میں نہیں کہوں گا، وہ ہمارے بزرگ ہیں۔''

دورۂ بھارت کے دوران پاکستان کے داخلی حالات پر گفتگو سے گریز

دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس میں شرکت کے لیے پاکستان سے جانے والے علماء کرام کے بھرپور وفد کی قیادت مولانا مفتی محمودؒ کر رہے تھے اور اس میں والد گرامی حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اور عم مکرم حضرت مولانا مفتی عبد الحمید سواتیؒ کے ساتھ میں بھی شامل تھا۔ یہ وہ دور تھا جب ملک میں صدر جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم اور مولانا مفتی محمودؒ کے درمیان سیاسی مخاصمت عروج پر تھی، پبلک جلسوں میں مفتی صاحبؒ کی تند و تیز فقروں پر بسا اوقات ہم بھی دھیمے لہجے میں مفتی صاحب سے کچھ عرض کر دیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ رابطہ عالم اسلامی کے سیکرٹری جنرل الشیخ محمد علی الحرکان مرحوم بھی تشریف لا کر ان دونوں کے درمیان کشیدگی کو کم کرانے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ بظاہر کشیدگی کی سطح کم کرانے کی کوئی شکل نظر نہیں آ رہی تھی اور مفتی صاحبؒ جنرل محمد ضیاء الحق کے خلاف تمام سیاسی جماعتوں کا متحدہ محاذ بنانے کے لیے سرگرمِ عمل ہو گئے تھے۔

اس فضا میں مولانا مفتی محمودؒ دہلی گئے تو بھارتی وزیر اعظم اندرا گاندھی سے ان کی ملاقات ہوئی جس کے بعد بھارتی صحافیوں نے ملاقات میں مفتی صاحبؒ سے پاکستان کی سیاسی صورتحال کے بارے میں سوالات شروع کر دیا۔ بالخصوص جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے ساتھ ان کے سیاسی اختلاف کی شدت کے بارے میں سوالات ہوئے، مفتی صاحبؒ پہلے تو طرح دیتے رہے مگر جب بار بار سوال ہوا تو مفتی صاحبؒ نے

دوٹوک لہجے میں یہ فرما کر سوالات کو روک دیا کہ ضیاء الحق کے ساتھ میرا اختلاف ملک کی سرحدوں کے اندر ہے اور یہاں میں پاکستان کا نمائندہ ہوں اس لیے اس حوالہ سے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔ جبکہ اسی ماحول میں مولانا مفتی محمودؒ کا انتقال ہو گیا تو جنرل ضیاء الحق مرحوم نے ڈیرہ اسماعیل خان جا کر جنازہ میں ذاتی طور پر شرکت کی اور مفتی صاحبؒ کو شاندار الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا۔

سیاسی اختلافات میں وضعداری

تحدیثِ نعمت کے طور پر یہاں ذکر کرنا چاہوں گا کہ ہم نے بحمد اللہ اس ماحول میں سیاسی تربیت پائی ہے اور صد شکر کہ یہ روایات ان کے بعد بھی ہمارے ماحول میں قائم و موجود ہیں جن کے بعض واقعات میں اپنے کالموں میں ذکر کر چکا ہوں کہ مولانا مفتی محمودؒ کی وفات پر بھی جمعیت علماء اسلام پاکستان (۱) درخواستی گروپ اور (۲) فضل الرحمٰن گروپ کے نام سے دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی تھی اور ہمارے درمیان بیان بازی اور ایک دوسرے کی مخالفت انتہا کو پہنچی تھی۔ مگر یہ اللہ تعالیٰ کا کرم اور بزرگوں کی صحبت و تربیت کا اثر تھا کہ اخلاقیات کا دامن ہمیشہ ہاتھ میں رہا ہے اور کسی اختلاف کو ذاتی مخاصمت اور دشمنی کا رنگ اختیار کرنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ باہمی ملاقاتیں بھی ہوتی تھیں، گپ شپ بھی ہوتی تھی، نوک جھونک بھی ہوتی تھی اور سیاسی میدان میں باہمی محاذ آرائی بھی تھی۔

اس لیے آج کی سیاسی مخاصمت اور اس کے اظہار میں شدت، سنگینی اور اخلاقیات سے عاری لب و لہجہ دیکھنے میں آتا ہے تو الجھن ہونے لگتی ہے اور دل افسردہ ہو جاتا ہے۔ گزشتہ روز ایک محفل میں اس صورتحال کا تذکرہ ہوا تو میں نے عرض کیا کہ الزام تو ہم مذہبی حلقوں پر تھا کہ ان میں قوتِ برداشت کم ہوتی ہے اور یہ دوسروں کو اختلاف کا حق دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے اور کسی مخالف کے لیے کفر سے کم کا فتویٰ ان کے پاس نہیں ہوتا۔ مگر عملی صورتحال یہ ہے کہ مذہبی قیادتیں تو آج بھی قومی اور ملی مفاد میں اکٹھے بیٹھنے کا اہتمام کر لیتی ہیں اور مشترکہ موقف طے کر لیتی ہیں۔ یہ سیاسی حلقوں کو کیا ہو گیا ہے کہ ایک دوسرے کی بات سننے کے روادار بھی نہیں رہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

مولانا مفتی محمودؒ کی پارلیمانی سیاست

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ ــــ انومبر ۱۹۹۷ء)

صوبہ سرحد کی سیاست

......۱۹۷۰ء کے انتخابات میں جمعیت علماء اسلام کو صوبہ سرحد کی اسمبلی میں چالیس کے ایوان میں چار نشستیں حاصل ہوئی تھیں اور دو آزاد ارکان الیکشن کے بعد جمعیت میں شامل ہوگئے تھے، اس طرح جمعیت کے پاس چالیس میں سے چھ سیٹیں تھیں۔ اور صوبائی حکومت کے لیے اصل مقابلہ نیشنل عوامی پارٹی اور پاکستان مسلم لیگ قیوم گروپ کے درمیان تھا جن کے پاس غالباً پندرہ اور گیارہ سیٹیں تھیں۔ خان عبدالولی خان اور عبدالقیوم خان صوبائی سیاست میں روایتی حریف چلے آرہے تھے اور ایک دوسرے کو صوبائی حکمران کے طور پر قبول کرنا دونوں میں سے کسی کے لیے بھی آسان نہیں تھا۔ اس لیے دونوں نے جمعیت علماء اسلام کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش شروع کردی۔ مولانا مفتی محمودؒ نے جمعیت علماء اسلام کے قائد کی حیثیت سے موقع کی نزاکت کا اچھی طرح اندازہ کرلیا اور تعاون کے لیے جو شرائط عائد کیں ان میں

- وفاق میں دستور ساز اسمبلی میں دستورِ پاکستان کی ترتیب و تدوین کے دوران اسلامی امور میں جمعیت سے تعاون،
- جبکہ صوبہ میں اسلامی قوانین واحکام کے نفاذ کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔

خان عبدالولی خان اور خان عبدالقیوم خان دونوں نے بظاہر ایک دوسرے کے خوف میں یہ شرطیں منظور کرلیں۔ اب جمعیت علماء اسلام کی طرف سے نئی شرط عائد کردی گئی کہ صوبہ میں وزیراعلیٰ بھی جمعیت کا ہوگا، یہ شرط بھی دونوں نے منظور کرلی۔ لیکن جمعیت علماء اسلام نے عوامی نیشنل پارٹی کے ساتھ مل کر صوبہ سرحد میں حکومت بنانے کا فیصلہ کیا، اور نہ صرف مولانا مفتی محمودؒ صوبہ سرحد کے وزیراعلیٰ بن گئے بلکہ عوامی نیشنل پارٹی اپنے منشور اور پارٹی مزاج کے علی الرغم دستور ساز اسمبلی میں اسلامی معاملات میں جمعیت کا ساتھ دینے کی پابند ہوگئی۔ جبکہ بلوچستان میں صوبائی اسمبلی کی بیس میں سے تین نشستیں جیتنے والی جمعیت علماء اسلام نیشنل عوامی پارٹی کے سردار عطاء اللہ مینگل کے ساتھ شریک اقتدار ہوئی۔ تین میں سے ایک ممبر ڈپٹی اسپیکر بنا اور دوسرا صوبائی وزیر کی حیثیت سے حکومت میں شامل ہوا۔

مفتی صاحب نے وزیراعلیٰ کی حیثیت سے اسلامی اصطلاحات کے نفاذ اور سادگی کے ساتھ حکومت کرنے کی جو مثال اس دس ماہ کے دور میں قائم کی وہ ان کی شخصیت اور جمعیت کی تاریخ کا ایک نمایاں باب ہے۔ اور یہ پارٹی لیڈر کے طور پر ان کی معاملہ فہمی، سیاسی تدبر اور موقع شناسی کا ایک شاندار مظاہرہ بھی ہے۔

وفاق کی سیاست

دوسرا موقع دستور ساز اسمبلی میں ۱۹۷۳ء کے دستور کی تیاری کا ہے۔ ۱۹۷۰ء میں منتخب ہونے والی اس دستور ساز اسمبلی میں پاکستان پیپلز پارٹی کو واضح اکثریت حاصل تھی اور اس کے منشور میں سوشلزم کا عنصر نمایاں تھا لیکن مولانا مفتی محمودؒ نے دستور ساز اسمبلی میں اپوزیشن لیڈر کے طور پر جس سیاسی ہوشمندی کا ثبوت دیا یہ اسی کا ثمر ہے کہ دستورِ پاکستان میں اسلام کو سرکاری مذہب قرار دینے کے علاوہ ملک کے تمام قوانین کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کی ضمانت موجود ہے، جو سیکولر لابیوں کے ایجنڈے میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ دستور ساز اسمبلی میں دیگر مذہبی شخصیات بھی موجود تھیں اور دستور میں زیادہ سے زیادہ اسلامی دفعات شامل کرانے کے لیے مسلسل کوشاں تھیں لیکن فیصلہ کن حیثیت مولانا مفتی محمودؒ کو حاصل تھی۔ وہ اس طور پر کہ دستور ساز اسمبلی میں بلوچستان سے چار ارکان منتخب ہوئے تھے جن میں سے تین نیشنل عوامی پارٹی کے تھے اور ایک کا تعلق جمعیت علماء اسلام سے تھا۔ یہ چار کے چار مفتی صاحب کے زیر اثر تھے، اور کہنے کو یہ چار تھے لیکن ایک مکمل صوبے اور وفاق کی ایک اکائی کی نمائندگی کر رہے تھے۔ گویا ان چار ارکان کی صورت میں مفتی صاحبؒ کے پاس وفاق کی ایک مکمل اکائی کی قوت موجود تھی جن کی مرضی کے بغیر کوئی دستور پاس نہیں ہو سکتا تھا۔

دوسری طرف پیپلز پارٹی اکثریت کے زعم میں اپنے منشور اور نظریات کے مطابق دستور تشکیل دینے پر مصر تھی اور ایوان میں من مانی کر رہی تھی۔ چنانچہ مفتی صاحب کی قیادت میں اپوزیشن نے دستور ساز اسمبلی کی کارروائی کا بائیکاٹ کر دیا جو کہ صرف اپوزیشن کا بائیکاٹ نہیں تھا بلکہ اس میں وفاق کی ایک مکمل اکائی کا بائیکاٹ بھی شامل تھا۔ اس پر بھٹو حکومت مذاکرات پر مجبور ہوئی اور ان مذاکرات میں حکومت کو اپوزیشن کے دیگر مطالبات کو تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ ان اسلامی دفعات کو بھی دستور کے حصہ کے طور پر قبول کرنا پڑا جو آج بھی دستور میں شامل ہیں اور جنہیں پاکستان کے دستور سے نکالنے اور غیر مؤثر بنانے کے لیے نہ صرف ملک کی سیکولر لابیاں بلکہ عالمی استعماری قوتیں بھی مسلسل پیچ و تاب کھا رہی ہیں۔

......

مولانا مفتی محمودؒ کی وزارتِ اعلیٰ کا دور

(روزنامہ اسلام، لاہور — ۲۳ جولائی ۲۰۰۳ء)

......اس سے قبل حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے دورِ حکومت میں بھی ہم اس قسم کی صورتحال کا سامنا کر چکے ہیں، مجھے یاد نہیں کہ یہ داستان میں نے اس سے پہلے قارئین کی خدمت میں کسی موقع پر پیش کی ہے یا نہیں، البتہ موقع کی مناسبت سے اب اس کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔

سرحد حکومت کے اسلامی اقدامات

یہ ۱۹۷۲ء کی بات ہے مشرقی پاکستان الگ ہو کر بنگلہ دیش بن چکا تھا، باقی ماندہ پاکستان پر جناب ذوالفقار علی بھٹو صاحب مرحوم ملک کے صدر کی حیثیت سے کاروبارِ حکومت چلا رہے تھے، صوبہ سرحد میں نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت علماء اسلام کی کولیشن کو اکثریت حاصل تھی اور مولانا مفتی محمودؒ کو صوبہ کا وزیر اعلیٰ منتخب کیا گیا تھا، ارباب سکندر خان خلیل مرحوم صوبہ سرحد کے گورنر تھے اور دونوں درویش صفت سیاستدانوں کا جوڑ صوبائی منظر پر عجیب سی بہار دکھا رہا تھا۔

مفتی صاحب نے صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے حلف اٹھایا اور سب سے پہلے اعلان یہ کیا کہ صوبہ سرحد میں شراب بنانے، بیچنے اور پینے پلانے پر پابندی ہوگی اور یہ قابلِ دست اندازی پولیس جرم ہوگا۔ مولانا مفتی محمودؒ نے شراب پر مکمل پابندی کے اعلان کے ساتھ صوبہ سرحد میں اپنی حکومتی ذمہ داریوں کا آغاز کیا اور اس کے ساتھ اردو کو سرکاری زبان قرار دینے، تقاوی قرضوں پر سود کی معافی اور اسکولوں میں دینیات کے استاد مقرر کرنے سمیت متعدّد دیگر اصلاحات بھی کیں۔ مگر شراب پر پابندی کا اعلان ملک بھر میں موضوع بحث بن گیا۔ جدید حلقوں میں اسے ''دقیانوسیت'' سے تعبیر کیا گیا، ترقی اور تہذیب کے منافی قرار دیا گیا اور ماضی کی طرف واپس جانے کے طعنے دیے گئے۔ بعض زیادہ من چلوں نے اسے طنز و تشنیع اور تمسخر و استہزا کا نشانہ بھی بنایا اور مختلف محافل میں شراب کی بوتلوں کو ''چھوٹا مفتی'' اور ''بڑا مفتی'' کا نام دے کر اسلام مخالف عناصر نے دل کی بھڑاس نکالنے کا راستہ اختیار کیا۔

شراب کے مسئلہ پر وفاقی اور صوبائی حکومت کی خط وکتابت

اس سلسلہ میں سب سے دلچسپ بات وہ خط و کتابت تھی جو وفاق نے اس مسئلہ پر صوبائی حکومت کے ساتھ کی اور جس کی تفصیل حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے خود ایک موقع پر جمعیت علماء اسلام کی مرکزی مجلسِ شوریٰ کے اجلاس میں ہمیں سنائی۔

مفتی صاحبؒ نے بتایا کہ صوبہ سرحد میں شراب پر پابندی کے اعلان کے بعد وفاق کی طرف سے صوبائی حکومت کو پہلا خط یہ موصول ہوا کہ شراب پر پابندی کے بعد اس کے حوالہ سے صوبائی حکومت کو ٹیکس کی جو آمدنی ہوتی تھی وہ موقوف ہو جائے گی اور صوبائی بجٹ میں اس سے خسارہ ہوگا، صوبہ اس خسارے کو پورا کرنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کرے گا کیونکہ مرکز اس سلسلہ میں صوبے کی کوئی مدد نہیں کر سکے گا؟ صوبائی حکومت نے جواب دیا کہ ہم اپنے اخراجات میں کمی کر کے اس خسارے سے نمٹ لیں گے اور وفاق کو اس سلسلہ میں زحمت نہیں دیں گے۔

اس کے بعد دوسرا خط وفاق کی طرف سے یہ آیا کہ صوبے میں غیر مسلم بھی رہتے ہیں جو شراب کو حرام نہیں سمجھتے، انہیں شراب مہیا کرنے کے لیے صوبائی حکومت کیا اقدامات کر رہی ہے؟ اس کا جواب مفتی صاحبؒ کی حکومت نے یہ دیا کہ جو غیر مسلم شراب کو حرام نہیں سمجھتے ان پر شراب کی پابندی کا اطلاق نہیں ہوگا لیکن انہیں شراب مہیا کرنا اور اس کا اہتمام کرنا حکومت کی ذمہ داری نہیں ہے، اس لیے ہم اس سلسلہ میں کچھ نہیں کر سکتے۔

اس کے بعد تیسرا خط آگیا کہ شراب بعض بیماریوں کا علاج ہے اس لیے بیماروں کے علاج کے لیے ہسپتالوں میں شراب مہیا کرنے کا اہتمام ضروری ہے۔ صوبائی حکومت نے اس کے جواب میں صوبائی ہیلتھ سیکرٹری کی سربراہی میں ممتاز ڈاکٹر صاحبان پر مشتمل میڈیکل بورڈ بنا دیا اور اس کے ذمہ یہ بات لگائی کہ ایسی بیماری کی نشاندہی کی جائے جو جان لیوا ہو اور شراب کے علاوہ اس کا کوئی متبادل علاج نہ ہو۔ مفتی صاحبؒ کا کہنا تھا کہ اگر میڈیکل بورڈ کسی ایسی بیماری کی نشاندہی کر دیتا تو ہم اس کے لیے شرعی اصولوں کی روشنی میں شراب مہیا کرنے کی کوئی صورت ضرور نکالتے، لیکن میڈیکل بورڈ کی رپورٹ یہ تھی کہ ایسی کوئی بیماری دنیا میں نہیں ہے جو جان لیوا ہو اور اس کا شراب کے علاوہ کوئی اور متبادل علاج موجود نہ ہو۔

شراب کے مسئلہ پر وفاق اور صوبے کی یہ ”کاغذی جنگ“ ابھی اس مرحلہ تک پہنچی تھی کہ بھٹو صاحب مرحوم نے بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت علماء اسلام کی مشترکہ حکومت کو، جو سردار عطاء اللہ خان مینگل کی سربراہی میں کام کر رہی تھی، اچانک برطرف کر دیا۔ جس پر احتجاج کرتے ہوئے سرحد کے گورنر ارباب سکندر خان خلیل مرحوم اور وزیر اعلیٰ مفتی محمودؒ نے استعفیٰ دے دیا اور اس طرح

تقریباً دس ماہ تک کام کرنے کے بعد سرحد اور بلوچستان دونوں صوبوں میں نیپ اور جمعیت کی مشترکہ حکومتیں ختم ہوگئیں۔......

حضرت عثمان غنیؓ کے جلسہ میں بھٹو مرحوم کا تذکرہ

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد — ۲۳ اپریل ۱۹۹۹ء)

۴/اپریل کو اوکاڑہ کے ایک محلہ میں مولانا قاری عبد المنان عثمانی نے اپنی دینی درسگاہ میں خلیفۂ سوم حضرت عثمان ذوالنورینؓ کی یاد میں ایک جلسہ رکھا ہوا تھا جس میں راقم الحروف کو اظہار خیال کی دعوت دے رکھی تھی۔ میرے خطاب سے پہلے قاری صاحب موصوف نے اپنی تمہیدی گفتگو میں حضرت عثمان غنیؓ کی سخاوت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ علماء کرام کے بارے میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ وہ خرچ کرنا نہیں جانتے، اس لیے انہیں بھی حضرت عثمانؓ کی زندگی سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔

مولانا مفتی محمودؒ اور ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی بذلہ سنجی

اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آگیا اور وہی اس جلسہ میں ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے ذکر کا باعث بنا۔ چنانچہ میں نے اپنی گفتگو کا آغاز اسی "خرچ نہ کرنے" کے نکتہ سے شروع کیا۔

"کچھ لو اور کچھ دو" پر ایک لطیفہ

ایک لطیفہ حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے کئی مجالس میں بھٹو مرحوم کے حوالے سے سنایا تھا کہ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے نتائج کے خلاف چلنے والی عوامی تحریک کے بعد پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان قومی اتحاد کے درمیان مذاکرات ہو رہے تھے۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم سرکاری وفد کی قیادت کر رہے تھے جبکہ مولانا مفتی محمودؒ پاکستان قومی اتحاد کے وفد کے قائد تھے۔ قومی اتحاد کے مطالبات غالباً ۳۲ نکات پر مشتمل تھے جن میں سے ۳۱ تسلیم ہو چکے تھے اور صرف ایک مطالبہ باقی تھا جس پر گفتگو ہو رہی تھی۔ وہ مطالبہ یہ تھا کہ بھٹو صاحب وزارتِ عظمیٰ سے مستعفی ہو جائیں اور عدلیہ کی نگرانی میں دوبارہ انتخابات کرائے جائیں۔ بھٹو صاحب اس کے لیے تیار نہیں تھے جبکہ قومی اتحاد اس پر شدید اصرار کر رہا تھا اور اسی نکتہ پر بالآخر مذاکرات تعطل کا شکار ہو گئے تھے۔

مولانا مفتی محمودؒ نے بتایا کہ اس نکتہ پر مذاکرات کے دوران بھٹو مرحوم نے مفتی صاحبؒ سے مخاطب ہو کر کہا کہ مفتی صاحب! مذاکرات تو "کچھ لو اور کچھ دو" کے اصول پر ہوتے ہیں جبکہ آپ صرف اپنے مطالبات منواتے چلے جا رہے ہیں اور میری ایک بات بھی ماننے کو تیار نہیں ہیں۔ یہ بتائیں کہ آپ مجھ سے لے تو سب کچھ رہے ہیں، کیا کچھ دینا نہیں چاہتے؟

مفتی صاحبؒ نے جواب میں ازراہِ تفنن کہا کہ بھٹو صاحب! مجھ سے آپ کیا مانگتے ہیں؟ میں تو ایک مولوی ہوں اور مولوی لینا جانتا ہے دینا نہیں جانتا۔ اس پر مفتی صاحبؒ نے خود بھٹو مرحوم کو یہ لطیفہ سنایا کہ کسی گاؤں میں ایک مولوی صاحب کنویں میں گر گئے، کنواں گہرا تھا اس لیے باہر نکلنا مشکل تھا۔ شور مچایا تو قریب سے گزرتا ہوا ایک نوجوان کنویں کی منڈیر پر آ گیا۔ اس نے مولوی صاحب کو کنویں میں دیکھا تو اپنا ہاتھ نیچے کر کے کہا کہ مولوی صاحب اپنا ہاتھ مجھے دیں تا کہ میں آپ کو پکڑ کر باہر کھینچ لوں۔ مگر مولوی صاحب نے ہاتھ نہ دیا۔ اب وہ نوجوان اوپر سے آوازیں دے رہا ہے مگر مولوی صاحب دونوں ہاتھ بغلوں میں دبائے نیچے آرام سے کھڑے ہیں۔ اتنے میں کچھ اور لوگ جمع ہو گئے جن میں ایک پرانا تجربہ کار بزرگ بھی تھا۔ اس نے ماجرا پوچھا تو نوجوان نے بتایا کہ کنویں میں مولوی صاحب ہیں، میں ان سے کہہ رہا ہوں کہ اپنا ہاتھ دو تاکہ میں آپ کو باہر نکلنے کے لیے سہارا دے سکوں مگر وہ ہاتھ نہیں دے رہے۔ اس بزرگ نے نوجوان سے کہا کہ تم سادہ آدمی ہو، مولوی صاحب سے اس طرح نہیں کہا جاتا بلکہ ان سے کہو کہ میرا ہاتھ لو، تب وہ تمہارا ہاتھ پکڑیں گے اور پھر تم انہیں باہر کھینچ لینا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ نوجوان نے جیسے ہی مولوی صاحب سے کہا کہ میرا ہاتھ لو، مولوی صاحب نے جھٹ اس کا ہاتھ پکڑا اور کنویں سے باہر نکل آئے۔

یہ واقعہ سناتے ہوئے اچانک یاد آ گیا کہ آج تو ۴/اپریل ہے جو بھٹو مرحوم کا یومِ وفات ہے اور ان کے کارکن ملک بھر میں ان کی برسی منا رہے ہیں۔ چنانچہ اس کا بھی تذکرہ کر دیا اور ان کے لیے دعائے مغفرت کے ساتھ ایک اور واقعہ انہی مذاکرات کے حوالہ سے سنایا جس کا ذکر مولانا مفتی محمودؒ بسا اوقات کیا کرتے تھے۔

پچاس نمازوں پر بھٹو صاحب کا تبصرہ

مفتی صاحبؒ کا کہنا تھا کہ مذاکرات میں کئی کئی گھنٹے خشک موضوعات پر گفتگو کے دوران کبھی کبھی خوش گپیاں بھی ہو جاتی تھیں تاکہ ذہن تازہ دم ہو جائیں۔ ایسے ہی ایک موقع پر بھٹو مرحوم نے مفتی صاحبؒ سے پوچھا کہ سنا ہے ابتدا میں پچاس نمازیں فرض ہوئی تھیں پھر پانچ رہ گئیں، یہ معاملہ کیسے ہوا؟ مفتی صاحبؒ نے اس کے جواب میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفرِ معراج کا وہ حصہ بیان کر دیا کہ آپؐ کو امت کے لیے ابتدا میں پچاس نمازوں کا حکم ملا تھا مگر واپسی پر حضرت موسیٰ علیہ السلام ملے تو انہوں نے تقاضہ کیا کہ واپس جا کر تخفیف کی درخواست کریں کیونکہ آپ کی امت دن رات میں پچاس نمازوں کی پابندی نہیں کر سکے گی۔ چنانچہ حضورؐ کئی بار حضرت موسیٰؑ کے کہنے پر واپس بارگاہ ایزدی میں گئے حتیٰ کہ آخر میں پانچ

نمازیں باقی رہ گئیں۔ اس پر بھٹو مرحوم نے ہنستے ہوئے کہا کہ حضرت موسٰی علیہ السلام کو کیا مصیبت پڑی تھی کہ حضرت محمدؐ کو نمازوں میں تخفیف کے لیے بار بار واپس بھیجتے رہے۔ نمازیں پچاس ہی رہتیں تو فائدہ ہوتا کہ آپ مولوی صاحبان آرام سے نمازیں پڑھاتے رہتے اور ہم اطمینان سے حکومت کرتے۔

حضرت عثمانؓ اور ان کا مال

یہ واقعات سنانے کے بعد میں نے گفتگو کا رخ حضرت عثمان ذوالنورینؓ کی حیاتِ مبارکہ کی طرف موڑ دیا، مگر اس کے بعد سے مسلسل سوچ رہا ہوں کہ حضرت عثمان غنیؓ کے تذکرہ کے ساتھ بھٹو مرحوم کے تذکرہ میں آخر کیا مناسبت ہو سکتی ہے؟ کافی سوچ بچار کے بعد ایک نکتہ یہ ذہن میں آیا کہ دونوں مالدار تھے۔ حضرت عثمانؓ اپنے دور کے مالدار ترین شخص تھے اور بھٹو صاحب کا شمار بھی ملک کے بڑے جاگیرداروں میں ہوتا تھا۔ مگر ذہن نے فوراً اس نکتہ کو جھٹک دیا کہ یہ بھی کوئی مناسبت نہیں بلکہ سرے سے کوئی مناسبت تلاش کرنا ہی غلطی ہے۔

حضرت عثمانؓ بلاشبہ اپنے دور کے مالدار ترین شخص تھے مگر ان کی دولت اسلام کے کام آئی، مسلمانوں کے کام آئی، جہاد میں صرف ہوئی، معاشرہ کے نادار افراد پر خرچ ہوئی، اور غرباء و مساکین کے حصے میں آئی۔ حتیٰ کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد ان کے ایک ساتھی نے کہا کہ میں یہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ حضرت عثمانؓ کی زندگی (۸۳ سال) کے دنوں کی تعداد زیادہ ہے یا ان غلاموں کی تعداد زیادہ ہے جنہیں انہوں نے اپنی گرہ سے خرید کر اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے آزاد کیا تھا۔

جبکہ مال و دولت کی کثرت کے باوجود ذاتی زندگی کا حال یہ تھا کہ ان کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ جمعہ کا خطبہ دینے کے لیے وہ بہت تاخیر سے مسجد نبویؐ میں آئے۔ راوی کے کہنے کے مطابق لوگوں نے خاصا انتظار کیا حتیٰ کہ عصر کا وقت قریب آ گیا۔ حضرت عثمانؓ نے منبر پر کھڑے ہوتے ہی لوگوں سے معذرت کی اور دیر سے آنے کی وجہ بتائی کہ وہ گھر سے وقت پر ہی چلے تھے لیکن راستہ میں کسی مکان کے پرنالے سے گندے پانی کے چھینٹے ان کے کپڑوں پر پڑے جس کی وجہ سے وہ گھر واپس گئے، دوبارہ غسل کیا اور کپڑے دھوئے۔ چونکہ ان کے پاس پہننے کے لیے متبادل لباس نہیں تھا اس لیے تھوڑی دیر ان کپڑوں کے خشک ہونے کا انتظار کیا تب جمعہ کے لیے روانہ ہو سکا۔

چنانچہ حضرت عثمانؓ کے ساتھ اس جاگیردار کو کیا مناسبت ہو سکتی ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے لیے پینے کا پانی بھی پیرس سے آتا تھا۔ سرمایہ دار آج بھی بہت ہیں اور غلاموں کی تعداد بھی بڑی ہے، بلکہ ہم تو بحیثیت قوم سب کے سب قرضوں کی غلامی میں جکڑے ہوئے ہیں۔ مگر ہماری گردنوں کو

غلامی کے اس طوق سے نجات دلانے والا کوئی ''حضرت عثمانؓ''نہیں ہے جو خود ایک لباس میں زندگی گزارے اور اپنی دولت کو غلاموں کی آزادی کے لیے وقف کر دے۔

مولانا مفتی محمودؒ اور ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی ظرافت

(روزنامہ اسلام، لاہور — ۳۰ اگست ۲۰۱۴ء)

۱۹۷۷ء کی تحریکِ نظامِ مصطفیٰؐ کے بعد حکومت اور اپوزیشن کے درمیان جو مذاکرات ہوئے، ان میں حکومتی ٹیم وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو مرحوم، مولانا کوثر نیازی مرحوم، اور جناب عبد الحفیظ پیرزادہ پر مشتمل تھی۔ جبکہ اپوزیشن یعنی پاکستان قومی اتحاد کی طرف سے مولانا مفتی محمودؒ، نواب زادہ نصر اللہ خانؒ اور پروفیسر عبد الغفورؒ مذاکرات کی میز پر بیٹھے تھے۔ ان میں سے پیرزادہ صاحب کے علاوہ سب وفات پا چکے ہیں، اللہ تعالیٰ سب کی مغفرت فرمائیں اور پیرزادہ صاحب محترم کو صحت وعافیت کے ساتھ تادیر سلامت رکھیں، آمین یارب العالمین۔

انتخابی دھاندلیوں کو تسلیم کرتے ہوئے انتخابات کے دوبارہ انعقاد پر اتفاق رائے ہو چکا تھا مگر اس نکتہ پر بات پھنس گئی تھی کہ پاکستان قومی اتحاد کی قیادت وزیر اعظم بھٹو مرحوم سے یہ کہہ کر استعفیٰ کا مطالبہ کر رہی تھی کہ ان کے وزیر اعظم رہتے ہوئے دوبارہ انتخابات کے شفاف ہونے پر اطمینان نہیں ہے۔ وزیر اعظم سے استعفیٰ دینے کے اس مطالبہ پر مذاکرات ڈیڈلاک کا شکار ہو گئے تھے اور اس وقت کے آرمی چیف نے ایک مرحلہ پر مذاکرات میں شرکت کر کے یقین دلایا تھا کہ وہ آئین اور دستوری حکومت کا تحفظ کریں گے، اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ قوم کے سامنے ہے۔

میں ان مذاکرات کا براہ راست حصہ تو نہیں تھا لیکن پاکستان قومی اتحاد کے صوبائی سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے تحریکِ نظامِ مصطفیٰؐ کا سرگرم کردار تھا اور مذاکرات کے سلسلہ میں ہونے والی باہمی مشاورت کے نظام میں بھی شریک تھا۔ اس لیے اب جو کچھ ہو رہا ہے اس میں میرے لیے کوئی بات نئی نہیں ہے اور جو کچھ آئندہ ہونے والا ہے یا جس کی کچھ عرصہ کے بعد توقع کی جا سکتی ہے وہ بھی میرے لیے کوئی حیران کن بات نہیں ہوگی۔ بات کو اس سے زیادہ آگے بڑھانے کی بجائے سرِدست قارئین کے منہ کا ذائقہ دو تین لطیفوں کے ذریعہ کچھ نہ کچھ تبدیل کرنے کی کوشش کروں گا جو اُن مذاکرات کے دوران رونما ہوئے تھے اور مولانا مفتی محمودؒ نے ہمیں جمعیت علماء اسلام پاکستان کے راہنماؤں کے ایک اجلاس میں سنائے تھے۔

مفتی صاحبؒ نے بتایا کہ جب مذاکرات میں انتخابی دھاندلیوں کو تسلیم کر لیا گیا اور دوبارہ الیکشن پر بھی اتفاق ہو گیا تو بھٹو مرحوم نے کہا کہ مفتی صاحب! میں نے آپ کے دونوں مطالبات مان لیے ہیں اس لیے آپ استعفیٰ کے مطالبہ پر اصرار نہ کریں اور کوئی بات تو میری بھی مان لیں۔ کیونکہ مذاکرات ''کچھ لو کچھ دو''

کے اصول پر ہوتے ہیں اور مجھے بھی اپنی پارٹی کو مطمئن کرنا ہے۔ مفتی صاحبؒ نے جواب دیا کہ بھٹو صاحب آپ مجھ سے کیا مانگتے ہیں؟ میں مولوی ہوں اور مولوی صرف لینا جانتا ہے، دینا اس کی لغت میں ہی نہیں ہے۔ اس پر مفتی صاحبؒ نے بھٹو مرحوم کو ایک لطیفہ بھی سنایا کہ ایک مولوی صاحب کسی گاؤں کے قریب ایک کنویں میں گر گئے جہاں سے نکلنا ان کے لیے مشکل ہو گیا۔ شور مچایا تو قریب سے ایک دو نوجوان آ گئے اور ایک نوجوان نے اپنا ہاتھ آگے کر کے کہا کہ مولوی صاحب اپنا ہاتھ مجھے دو تاکہ میں آپ کو کھینچ کر باہر نکالوں۔ مولوی صاحب نے ہاتھ دینے سے انکار کر دیا جس سے عجیب صورتحال پیدا ہو گئی کہ نوجوان اس مولوی صاحب سے ہاتھ پکڑانے کا تقاضہ کر رہا ہے اور مولوی صاحب اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اتنے میں کچھ اور لوگ اکٹھے ہو گئے اور ایک پرانے تجربہ کار بزرگ نے منظر دیکھ کر اس نوجوان سے کہا کہ بیٹا مولوی صاحب سے یہ نہ کہو کہ اپنا ہاتھ دو، وہ کبھی نہیں دیں گے، بلکہ ان سے یہ کہو کہ میرا ہاتھ لو۔ نوجوان نے جونہی کہا کہ مولوی صاحب میرا ہاتھ پکڑو تو انہوں نے فوراً پکڑ لیا اور انہیں کھینچ کر باہر نکال لیا گیا۔

دوسرا لطیفہ بھی ان مذاکرات کے حوالہ سے مفتی صاحبؒ نے سنایا کہ گفتگو کے دوران ایک دفعہ بھٹو مرحوم نے مفتی صاحبؒ سے پوچھا کہ یہ پچاس نمازوں کا کیا معاملہ ہے کہ پہلے پچاس نمازیں فرض کی گئی تھیں، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مداخلت سے پانچ رہ گئیں۔ مفتی صاحبؒ نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفرِ معراج کا واقعہ بیان کیا کہ نمازیں پچاس ہی فرض ہوئی تھیں مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام راستہ سے آنحضرتؐ کو بار بار عرشِ الٰہی کی طرف واپس بھیجتے رہے کہ اتنی نمازیں آپ کی امت نہیں پڑھ سکے گی، اس لیے اللہ تعالیٰ سے ان کی تعداد کم کرنے کی درخواست کریں۔ چنانچہ جناب رسول اللہؐ کی بار بار درخواست پر یہ نمازیں پانچ رہ گئیں۔ اس پر بھٹو صاحب مرحوم نے مفتی صاحبؒ سے کہا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ تکلف کیوں فرمایا، نمازیں پچاس ہی رہتیں تو بہتر تھا، آپ مولوی لوگ شب و روز نمازوں میں مصروف رہتے اور ہم آرام سے حکومت کرتے......

باشندگانِ وطن کی کفالت کا نظام:
مفتی محمودؒ اور بھٹو مرحوم کا موقف

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد — ۱۴ جون ۱۹۹۹ء)

...... اسلامی جمہوریہ پاکستان کا مروجہ دستور جو ۱۹۷۳ء کا دستور کہلاتا ہے، جب ترتیب پا رہا تھا تو شہریوں کی بنیادی ضروریات کی کفالت کا سوال اٹھایا گیا تھا۔ دستور ساز اسمبلی میں اس وقت حضرت مولانا مفتی محمودؒ اپوزیشن لیڈر تھے، انہوں نے ہمیں جمعیت علماء اسلام کے ایک اجلاس میں اس کی تفصیل سنائی۔

مولانا مفتی محمودؒ نے بتایا کہ جب شہری اور انسانی حقوق کی بات چلی تو انہوں نے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو مرحوم سے کہا کہ کم از کم بنیادی حقوق کا تعین کیا جائے اور دستور میں ان کی کفالت کی ریاست کی طرف سے ضمانت مہیا کی جائے۔ مفتی صاحبؒ کا کہنا تھا کہ انہوں نے بھٹو مرحوم کو ان کے انتخابی نعرے ”روٹی، کپڑا اور مکان“ کی طرف بھی توجہ دلائی کہ وہ تو لوگوں سے اس کا وعدہ کر چکے ہیں، اس لیے دستور میں شہریوں کا یہ حق تسلیم کیا جائے کہ وہ ریاست سے اپنے بنیادی حقوق حاصل کرنے کے لیے عدالت سے رجوع کر سکیں۔

مفتی صاحبؒ کے بقول بھٹو مرحوم نے کہا کہ ہمارے پاس اس وقت اتنے وسائل نہیں کہ ہم سب شہریوں کو یہ حقوق فراہم کر سکیں اور ان کی دستوری ضمانت دے سکیں۔

اس پر مولانا مفتی محمودؒ نے کہا کہ قومی سطح پر مطلوب وسائل کے حصول اور ان میں توازن پیدا کرنے کے لیے ایک وقت مقرر کیا جائے اور دستور میں صراحت کر دی جائے کہ شہریوں کو اپنے بنیادی حقوق اور ضروریات کے حصول کے لیے اتنے برسوں کے بعد عدالت سے رجوع کا حق حاصل ہو جائے گا، لیکن بنیادی حقوق کی ریاست کی طرف سے ضمانت کا تذکرہ کسی نہ کسی طرح دستور میں ضرور کر دیا جائے۔ مفتی صاحب کا کہنا تھا کہ وہ تفصیلی بحث و مباحثہ کے باوجود بھٹو مرحوم کو اس طرف لانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

ہمارے ہاں شہریوں کو بنیادی حقوق کی فراہمی کے بارے میں عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ ملکی وسائل اس کے متحمل نہیں ہیں لیکن ہمیں اس موقف سے اتفاق نہیں ہے کیونکہ پاکستان کو اللہ تعالیٰ نے بہت

وسائل سے مالا مال کیا ہے۔ ہمارے پاس وسائل کی کمی نہیں ہے بلکہ اصل مسئلہ قومی دولت اور وسائل کی تقسیم میں عدمِ توازن کا ہے اور قومی وسائل کے صحیح استعمال اور اس کی ترجیحات کا ہے۔ اور ہمارا المیہ یہ ہے کہ اس وقت ہماری قومی لیڈر شپ ایک جاگیر دارانی اور ایک صنعتکار کے درمیان شٹل کاک بن کر رہ گئی ہے۔ ان میں سے کوئی بھی قومی دولت اور وسائل کی تقسیم میں عدمِ توازن کو دور کرنے کا روادار نہیں ہے۔ اس حوالہ سے ان کے درمیان اختلاف صرف طبقاتی ترجیحات کا ہے اور پوری قوم اس طبقاتی کشمکش میں سینڈوچ بنی ہوئی ہے۔ چنانچہ اس وقت ہماری اصل ضرورت ایک ایسی قومی لیڈر شپ کی ہے جس کے گرد کسی مراعات یافتہ طبقہ کے مفادات و ترجیحات کا حصار نہ ہو اور وہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے موجودہ استحصالی اور ظالمانہ معاشی ڈھانچے کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے۔......

بھٹودور میں شرعی عدالتوں کا قیام

(روزنامہ پاکستان، لاہور — ۲۰ اپریل ۲۰۰۷ء)

...... یہ بھٹو مرحوم کی حکومت کے دورِ عروج کی بات ہے۔ اکتوبر ۱۹۷۵ء میں جمعیت علماء اسلام کا کُل پاکستان علماء کنونشن مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں ہوا جس میں ملک بھر سے پانچ ہزار کے لگ بھگ جید علماء کرام نے شرکت کی۔ چاروں صوبوں اور آزاد کشمیر کی بھرپور نمائندگی تھی۔ یہ اتنا بھرپور اور کامیاب کنونشن تھا کہ اس کے نتیجے میں پنجاب کی پی پی گورنمنٹ نے جامع مسجد نور اور اس کے ساتھ مدرسہ نصرۃ العلوم کو انتقاماً اوقاف کی تحویل میں لینے کا نوٹیفکیشن جاری کر دیا تھا جس کے خلاف مزاحمت کی تحریک میں سینکڑوں علماء کرام اور دینی کارکنوں نے مسلسل چار ماہ تک گرفتاریاں پیش کیں۔ خود میں بھی ساڑھے تین ماہ کے لگ بھگ جیل میں رہا اور بالآخر بھٹو حکومت کو وہ نوٹیفکیشن واپس لینا پڑا تھا۔

اس کنونشن میں جو حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستیؒ کی زیر صدارت منعقد ہوا اور حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ اس کے صدر استقبالیہ تھے، قائدِ جمعیت حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے جمعیت علماء اسلام کی طرف سے ملک بھر میں ہر سطح پر شرعی عدالتوں کے قیام کا اعلان کیا تھا۔ اس مقصد کے لیے جمعیت کی مرکزی مجلسِ شوریٰ نے وفاقی سطح پر حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی سربراہی میں تین رکنی عدالتی بورڈ قائم کیا تھا جس میں حضرت مولانا عبد الکریم قریشی آف بیر شریف لاڑکانہ اور حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم آف گوجرانوالہ شامل تھے۔ پنجاب میں حضرت مولانا مفتی محمد عبداللہ آف ملتان کو اس کا ذمہ دار قرار دیا گیا تھا۔ جبکہ ہمارے گوجرانوالہ کے موجودہ ایم این اے حضرت مولانا قاضی حمید اللہ بھی اس وقت قاضی بنے تھے، کیونکہ انہیں ضلع گوجرانوالہ کے لیے قاضی مقرر کیا گیا تھا، ان کے نام کے ساتھ قاضی کا اضافہ اسی حوالے سے ہوا، اس سے قبل وہ قاضی نہیں کہلاتے تھے۔

ان عدالتوں کے لیے باقاعدہ قواعد و ضوابط طے کیے گئے تھے، طریقہ کار وضع کیا گیا، بعض جگہ عدالتوں نے کام بھی کیا اور کچھ فیصلے بھی کیے۔ ان عدالتوں کے قواعد و ضوابط کو جمعیت علماء اسلام پاکستان کے دستور کا حصہ بنایا گیا اور ان کی ترتیب و تدوین میں حضرت مولانا سید حامد میاںؒ، حضرت مولانا مفتی عبد الواحدؒ، حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر اور حضرت مولانا محمد یوسف خان دامت برکاتہم آف پلندری جیسے بزرگ علماء کرام نے حصہ لیا۔ ان عدالتوں کے قیام کی انتظامی ذمہ داریوں میں راقم الحروف

بھی شریک تھا۔ لیکن اس کے بعد حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ تحریکِ مسجد نور نے کم و بیش نصف سال مصروف رکھا، پھر ملکی سطح پر پاکستان قومی اتحاد تشکیل پایا جس کا سربراہ مولانا مفتی محمودؒ کو چن لیا گیا۔

الیکشن مہم اور پھر نظامِ مصطفیٰؐ کی تحریک، اس کے بعد مارشل لاء اور پھر حضرت مولانا مفتی محمود کی وفات کے واقعات اس تسلسل کے ساتھ پیش آئے کہ پرائیویٹ شرعی عدالتوں کا یہ منصوبہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ جب کہ میرے نزدیک یہ جمعیت علماء اسلام پاکستان کی موجودہ قیادت کے ذمہ حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے قرض کی حیثیت رکھتا ہے اور اگر مولانا فضل الرحمٰن اور ان کے رفقاء حضرت مولانا مفتی صاحبؒ کے اس ورثے کی طرف توجہ دے سکیں تو یہ ان کی بہت بڑی قومی خدمت ہوگی...... یہ ملک و قوم دونوں کی ضرورت ہے اگر دستور و قانون کی حدود میں رہتے ہوئے اسے چلایا جائے تو اس سے عام آدمی کو تین فائدے حاصل ہوں گے:

- ایک یہ کہ فوری اور سستا انصاف مہیا ہوگا،
- دوسرا یہ کہ شرعی احکام کے مطابق فیصلہ ہونے پر روحانی سکون میسر ہوگا،
- اور تیسرے نمبر پر خیر و برکات کا بھی حصول ہوگا۔

۱۹۷۰ء کی سیاسی صورتحال اور جمعیت علماء اسلام

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ — اکتوبر ۲۰۱۶ء)

(جمعیت طلباء اسلام پاکستان کے سابق راہنما رانا شمشاد علی خان کے سوال نامہ کے جواب کا کچھ حصہ۔)

...... ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں جمعیت علماء اسلام نے صوبہ سرحد کی اسمبلی میں چند سیٹیں حاصل کیں مگر خان عبد الولی خان اور خان عبد القیوم خان کے مابین سیاسی اختلاف کی شدت کے ماحول میں وہ چار یا پانچ سیٹیں صوبائی حکومت کی تشکیل کے لیے بیلنس پاور اور بادشاہ گر کی حیثیت اختیار کر گئیں۔ خان عبد القیوم خان کی مسلم لیگ اور خان عبد الولی خان کی نیشنل پارٹی دونوں کی یکساں کوشش تھی کہ جمعیت علماء اسلام ان کا ساتھ دے تاکہ ان کی حکومت بن جائے یا کم از کم ان کی حریف پارٹی کی حکومت نہ بن سکے۔ دونوں ایک دوسرے سے خائف تھیں جس کی وجہ سے دونوں پارٹیاں ساتھ دینے کی صورت میں جمعیت کی ہر شرط ماننے کو تیار تھیں۔ اس کشمکش میں مفتی صاحبؒ کا رجحان واضح طور پر خان عبد الولی خان کی طرف تھا جبکہ مولانا ہزارویؒ خان عبد القیوم خان کے ساتھ کولیشن کے خواہاں تھے۔

اس کے ساتھ ہی ایک اور بات کو شامل کر لیں کہ مفتی صاحبؒ کی پالیسی صوبہ میں حکومت بنانے اور مرکز میں بھٹو حکومت کے مقابلہ میں اپوزیشن کا کردار ادا کرنے کی تھی۔ جبکہ مولانا ہزارویؒ مرکز میں بھٹو حکومت کے ساتھ شامل ہونا چاہتے تھے اور اپوزیشن بالخصوص جماعتِ اسلامی کے ساتھ کسی قسم کی کولیشن کے حق میں نہیں تھے۔

اس میں ایک اور بات کا اضافہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اس وقت افغانستان میں روسی جارحیت کے خلاف افغان مجاہدین کی عسکری مزاحمت منظم نہیں ہوئی تھی مگر اس کی شروعات ہو چکی تھی اور اس کے مسلسل آگے بڑھنے کے رجحانات نمایاں تھے۔ اس کے بارے میں مولانا مفتی محمودؒ اور حضرت درخواستیؒ کا رجحان بالکل واضح تھا کہ وہ اس مزاحمت کے حق میں تھے اور اسے شرعی جہاد سمجھتے تھے۔ جبکہ مولانا ہزارویؒ اس جہاد اور مزاحمت کو سپورٹ کرنے کے حق میں نہیں تھے اور اسے خطہ میں امریکی عزائم کی تکمیل میں معاونت تصور کرتے تھے۔ اس مسئلہ پر حضرت مولانا ہزاروی کے ساتھ میری طویل خط و کتابت ہوئی تھی جس کی میں نے ایک عرصہ تک تاریخی دستاویز سمجھ کر حفاظت کی مگر بدقسمتی سے

گزشتہ تین چار سال سے تلاش بسیار اور بار بار تگ و دو کے باوجود اس کا کوئی سراغ نہیں مل رہا۔ خدا جانے وہ اس وقت کہاں اور کس حال میں ہے؟ فیا اسفاہ۔......

مولانا مفتی محمودؒ کی وفات، ایک درخشاں قومی عہد کا خاتمہ

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور ــ ۷ نومبر ۱۹۸۰ء)

دل زخمی ہے، جگر فگار اور ذہن حیرت کی وسعتوں میں گم کہ خدایا یہ اچانک بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا ہے۔ موت ایک ناگزیر حقیقت ہے جس سے کسی کو مفر نہیں، جو شخص دنیا میں آیا ہے اس نے جانا ہے۔ جب انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات جیسی ذواتِ مقدسہ کو دنیا کی زندگی میں دوام نہ مل سکا تو اور کون ہے جسے موت سے مستثنیٰ قرار دیا جا سکے۔ مولانا مفتی محمودؒ بھی دوسرے انسانوں کی طرح گوشت پوست کے انسان تھے، ان کی ذات لافانی نہ تھی، انہوں نے بھی دنیا سے جانا تھا اور وہ اپنا وقت پورا کر کے خالق و مالک کی بارگاہ میں سرخرو چلے گئے۔ لیکن ان کا دنیا سے جانا ایسے وقت میں ہوا جب وطنِ عزیز اندرونی و بیرونی طور پر الجھنوں اور پیچیدگیوں کا شکار ہے اور ان الجھنوں اور پیچیدگیوں کے رموز و اسرار اور تہہ منظر و پس منظر پر نظر رکھنے والے اربابِ دانش مولانا مفتی محمودؒ کے تدبر، حب الوطنی، حوصلہ، جرأت اور ایثار کی ضرورت کو پہلے سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کر رہے تھے۔

خالقِ موت و حیات کی حکمتیں سب سے بالا ہیں، وہ حکیم مطلق ہے، اس کا کوئی فیصلہ حکمت سے خالی نہیں اور اس کے ہر فیصلہ کو صدقِ دل کے ساتھ حکیمانہ سمجھ کر صبر و رضا کے ساتھ اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا ہی بندگی ہے۔ مگر انسان اپنی ہمت اور ضرورت کے دائرہ میں رہ کر سوچتا ہے کہ

ع فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست

یہی وجہ ہے کہ اسلام، قوم اور ملک سے محبت رکھنے والوں نے مولانا مفتی محمودؒ کی وفات کی اچانک خبر کو اس تیر کی طرح دلوں میں پیوست ہوتے محسوس کیا ہے جو بے خبری اور غفلت کے عالم میں سنسناتا ہوا آئے اور دل کی گہرائیوں میں اتر جائے۔

ایک سُرخرُو قومی کردار

مولانا مفتی محمودؒ کی وفات پر قومی حلقوں میں وسیع پیمانے پر جس غم و صدمہ کا اظہار ہوا اور جس محبت و عقیدت کے ساتھ مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا وہ دراصل دین، قوم اور ملک کے لیے مفتی صاحبؒ کی وسیع تر خدمات اور جدوجہد کا عملی اعتراف ہے، اور اس امر کا ثبوت ہے کہ مرحوم پر قوم نے قیادت کی ذمہ داریوں کے ضمن میں جو اعتماد کیا تھا وہ اس سلسلہ میں قوم کے سامنے سرخرو رہے ہیں۔

۱.   مولانا مفتی محمودؒ کون تھے؟
۲.   انہوں نے اعتماد و مقبولیت کے ساتھ قومی قیادت کا مقام کیسے اور کن مراحل سے گزر کر حاصل کیا؟
۳.   ان کی زندگی اور جدوجہد نے معاشرہ کو کن تبدیلیوں سے دوچار کیا؟
۴.   اور ان کی وفات کے بعد ان کے مشن، جدوجہد اور کردار کو معاشرہ میں کارفرما رکھنے کی کیا صورت ہوگی؟

ان میں سے اول الذکر تین سوال تو تاریخ کا ایک ناگزیر حصہ بن کر مؤرخ کی میز پر جا چکے ہیں، جبکہ آخری سوال نہ صرف مفتی صاحبؒ کے مشن سے تعلق رکھنے والے کارکنوں بلکہ اس مشن کو معاشرہ کی بنیادی ضرورت سمجھنے والے محبِ وطن عناصر کے ذہنوں میں بھی کھلبلی مچائے ہوئے ہے۔ مجھے نہ تو مؤرخ ہونے کا دعویٰ ہے اور نہ ہی ایسی فراست کا کہ مستقبل کے بارے میں پیشگوئی کر سکوں۔ لیکن تحریکِ ولی اللّٰہی کے ایک شعوری کارکن اور مولانا مفتی محمودؒ کے ایک رفیقِ کار کی حیثیت سے ان سوالات کے سلسلہ میں کچھ عرض کرنا ضروری خیال کرتا ہوں تاکہ بہت سی غلط فہمیاں جو مولانا مفتی محمودؒ اور ان کے حلقۂ فکر و عمل کے مزاج، اجزاء ترکیبی اور قوتِ کار سے ناواقفیت کی بنا پر بہت سے ذہنوں میں جنم لے رہی ہیں، یقین کی منزل کی طرف پیشرفت نہ کر سکیں۔

تعلیم و تربیت

مفتی محمودؒ بنیادی طور پر ایک عالمِ دین تھے جنہوں نے ضلع ڈیرہ اسماعیل خان کے ایک گاؤں عبدل خیل میں ایک غریب مگر دیندار گھرانے میں جنم لیا۔ ان کے والد نے اپنے دینی مزاج اور علاقہ کی خوشگوار روایت کے باعث اپنے بچے کو سکول کی ضروری تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم دلانے کا فیصلہ کیا۔ دورانِ تعلیم انہیں دیوبند، مراد آباد، دہلی اور دیگر علمی مراکز میں وقت کے چوٹی کے علماء سے تعلیم حاصل کرنے اور استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ ذہانت و فراست کی دولت اللہ تعالیٰ نے وافر دے رکھی تھی۔ حضرت السید مولانا حسین احمد مدنی، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ اور حضرت مولانا سید محمد میاں رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے مجاہد اہلِ علم کی صحبت نے اس فراست کو جلا بخشی اور ملک و قوم کی پسماندگی اور درماندگی کو دیکھ کر دل میں بیدار ہونے والے درد نے اس ذہانت و فراست کا رخ قومی خدمت کی طرف موڑ دیا۔

اساتذہ و اکابر

مفتی صاحبؒ کو جن اساتذہ سے تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا یا دورانِ تعلیم جن کی صحبت سے فیضیاب ہوئے وہ اپنے وقت کے سرکردہ علماء ہونے کے ساتھ ساتھ تحریکِ آزادی کے سرگرم مجاہد اور شب زندہ دار اہل اللہ بھی تھے۔ ولی اللّٰہی خاندان اور اس سے فیضیاب ہونے والے علماء کے قافلہ کی، جس نے بعد میں دیوبندی مکتبِ فکر کی شکل اختیار کر لی، امتیازی خصوصیت یہی تھی کہ اس کاروان کے افراد علم میں یکتا، عمل میں مُحکم اور جہاد کے جذبہ میں منفرد تھے۔ آپ امام ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے تمام فرزندوں، شاہ اسماعیل شہید، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن، حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہم اللہ تعالیٰ اور اس کاروانِ صدق و صفا کے دیگر سرخیلوں کو دیکھیں، وہ محدث و فقیہ ہونے کے ساتھ ساتھ عابد و زاہد ولی اور دین و قوم کے لیے ہر وقت سربکف مجاہد بھی تھے۔ علم و عمل اور جہاد کے اس حسین امتزاج نے ہی کاروانِ ولی اللّٰہی کو نہ صرف برصغیر پاک و ہند و بنگلہ دیش میں بلکہ پورے عالمِ اسلام میں امتیازی حیثیت عطا کی ہے۔

برطانوی استعمار کا دور

مولانا مفتی محمودؒ کی تعلیم و تربیت کے جملہ مراحل اسی ماحول میں طے ہوئے اور یہ وہ وقت تھا جب تحریکِ آزادی پورے شباب پر تھی۔ برطانوی استعمار کے خلاف باشندگانِ دین انتہائی جوش و جذبہ کے ساتھ برسرِپیکار تھے اور مدارس کی چٹائیوں پر بیٹھ کر قرآن و حدیث کا درس دینے والے طلبہ کے کانوں میں ''قال اللہ و قال الرسول'' کی پرسوز صداؤں کے ساتھ زنجیروں کی جھنکار اور آزادی کے فلک شگاف نعرے گونج رہے تھے۔ ان سب عوامل نے مل کر مفتی محمودؒ کے دل میں قومی درد کی چنگاری کو ہوا دی اور اس چنگاری نے دھیمے دھیمے بھڑکنے والے اس شعلہ کی شکل اختیار کر لی جس کی حرارت اور چمک نے ایک عرصہ تک لاکھوں دلوں کو دینی و قومی درد کی تپش سے گرمایا اور انہیں جدوجہد پر ابھار کر منزل کی طرف ان کی راہنمائی کی۔

جیّد و باکردار عالمِ دین اور فقیہ النفس مفتی

اپنے اسلاف کی طرح مفتی محمودؒ بھی علم، عمل اور جذبۂ جہاد کا حسین مرقع تھے۔ وہ اپنے وقت کے بڑے محدثین میں شمار ہوتے تھے، مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے ان کا حسین تعلیمی دور حدیث کے طلبہ کو ہمیشہ یاد رہے گا۔ حدیث اور اس کے متعلقات پر مفتی صاحبؒ کی پر مغز گفتگو

بالخصوص عصری مسائل پر ان کی مضبوط گرفت انہیں اپنے معاصر محدثین سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ فقیہ النفس مفتی تھے، ان کے تفقہ وادراک، نظر کی دقت و وسعت، اور تجزیہ و تحقیق کی صلاحیت پر معاصرین ان کی زندگی میں خراجِ تحسین پیش کر چکے ہیں۔ اور معاصرین کے اعتراف و تحسین سے بڑھ کر کسی کے کمال پر اور کوئی دلیل پیش نہیں کی جا سکتی۔ وہ معقولات کے استاذ تھے، ایسے استاذ کہ جنہیں استاذ کہتے ہوئے اربابِ فن بھی فخر محسوس کرتے تھے۔ درسِ نظامی سے تعلیمی دلچسپی رکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ اس دور میں معقولات کا اچھا استاذ ہونا ہی کمال کی معراج سمجھا جاتا ہے اور مفتی محمودؒ عروج کے اس زینہ میں بھی آخری سیڑھی پر کھڑے نظر آتے ہیں۔

اس ہمہ پہلو علم نے مفتی محمودؒ کو علم اور بڑائی کے نشہ سے دوچار نہیں کیا اور علم کا سہ آتشہ جام پینے کے باوجود وہ آپے سے باہر نہیں ہوئے۔ عمل و کردار کا آئینہ بھی علم و فضل کی طرح انہیں بامِ عروج سے ہمکنار دکھاتا ہے۔ مرحوم کے قریبی رفقاء شاہد ہیں کہ شرعی احکام کی پابندی، فرائض کی بجاآوری اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کے معاملہ میں ان کی خلوت و جلوت میں کوئی فرق نہ تھا۔ سفر، تکان اور علالت کی شدت کے دور میں بھی وہ شرعی احکام و فرائض کی اسی جذبہ و رفتار کے ساتھ پابندی کرتے دکھائی دیتے تھے جیسے عام حالات میں معمول تھا۔

روحانی طور پر وہ اپنے آبائی پیر خانہ یاسین زئی شریف سے آخر دم تک وابستہ رہے۔ اس وابستگی پر انہیں فخر تھا اور اپنی روحانی تربیت گاہ کے ساتھ ان کا قلبی لگاؤ ان کے خلوص اور دل کی صفائی کا غماز ہے۔

ہمہ جہت اور قابلِ رشک شخصیت

عمل کا ایک اور پہلو جو سب سے زیادہ روشن اور چمکدار ہے وہ مرحوم کا قابلِ رشک کردار ہے۔ کردار کا ایک رخ یہ ہے کہ مفتی صاحبؒ نے مدرسہ قاسم العلوم کے شیخ الحدیث، قومی اسمبلی کے ممبر، ایک سرگرم سیاسی جماعت کے قائد، صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ، قومی اسمبلی کے اپوزیشن لیڈر اور تحریکِ نظامِ مصطفیٰؐ جیسی تحریک کے قائد کے طور پر زندگی کے مختلف ادوار دیکھے۔ ان کے سامنے طلبہ نے زانوئے تلمذ تہہ کیے، ان کی صدارت میں پارلیمانی پارٹی کے اجلاس ہوئے، ان کے قلم سے سینکڑوں احکامات اور درجنوں قوانین کا اجرا ہوا، اور ان کے گرد لاکھوں افراد کے ہجوم نے زندہ باد اور مرحبا کے فلک شگاف نعرے بلند کیے۔ لیکن ان میں سے کوئی بات ان کے اپنے مزاج، گھر کے ماحول، طرزِ معاشرت اور سوچ کے انداز میں تبدیلی پیدا نہ کر سکی۔ زمانہ انہیں متاثر کرنے کے لیے ہر انداز میں سامنے آیا لیکن انہوں نے اپنے کردار اور عمل سے ثابت کر دیا کہ وہ متاثر ہونے کے لیے نہیں بلکہ متاثر کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔

ملکی سیاست کا بے نیاز کردار

ایک اور رخ کردار کا یہ بھی ہے کہ اقتدار، جس کی چوکھٹ پر لاکھوں جبینیں ہر وقت جھکی رہتی ہیں، مفتی محمودؒ نے اس پر بے نیازی کی ایسی ضرب لگائی کہ اقتدار کے سکہ پر کی گئی ملمع سازی کی چمک دمک ماند پڑ کر رہ گئی، اور اس مردِ درویش نے وقت کے ترازو پر اپنی بے نیازی کو اقتدار سے کہیں زیادہ وزنی ثابت کر دکھایا۔ وزارتِ اعلیٰ سے استعفیٰ کے بعد، استعفیٰ کی واپسی پر اصرار سے لے کر وفاقی وزارت کی پیشکش، اور پھر اس کے بعد موت کے دن تک وزارتوں کی پیشکش کا تسلسل، اور پھر ان پیشکشوں کے جواب میں اصولوں کے حوالے سے مفتی صاحبؒ کا انکار ملک کی تاریخ کا ایک روشن اور تابناک باب ہے جس سے اہلِ عزم و ہمت صدیوں تک راہنمائی حاصل کرتے رہیں گے۔

اربابِ فہم وادراک کی جوہر شناسی

مولانا مفتی محمودؒ کا تعلق سیاست سے اگرچہ طالب علمی کے دور میں ہی قائم ہو گیا تھا اور انہوں نے جمعیت علماء ہند کے پلیٹ فارم پر آزادیٔ وطن کی تحریک میں عملی حصہ بھی لیا۔ مگر سیاست میں ان کی باقاعدہ آمد ۱۹۵۷ء میں ہوئی جب خود اُن کی تحریک اور امام الاولیاء حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کی دعوت پر ملتان میں مغربی پاکستان کے سرکردہ علماء کے کنونشن میں جمعیت علماء اسلام کے احیا کے بعد ۱۹۵۶ء کے دستور پر مفتی صاحبؒ کی تنقیدات و ترامیم منظر عام پر آئیں۔ اربابِ فہم وادراک نے ان ترامیم و تنقیدات کے پس منظر میں کارفرما عزائم و محرکات کو بھانپ کر یہ اندازہ کر لیا تھا کہ ملتان کے ایک دینی مدرسہ کا یہ شیخ الحدیث ملک کی سیاست میں اہم کردار ادا کرنے والا ہے۔

نفاذِ اسلام کے لیے پارلیمانی اور سیاسی جدوجہد

۱۹۶۲ء میں مفتی صاحبؒ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور انہوں نے خداداد صلاحیتوں اور محنت کے ساتھ قومی بحثوں میں حصہ لے کر خود کو ایک اچھے پارلیمنٹیرین کے طور پر متعارف کرا لیا۔

جمعیت علماء اسلام کے احیا کے بعد سے مفتی صاحبؒ اس کے نائب امیر چلے آرہے تھے کہ ۱۹۶۸ء میں مشرقی پاکستان میں جمعیت علماء اسلام کے قیام کے بعد مرکزی جمعیت کے قیام کا مرحلہ پیش آیا تو انہیں مرکزی ناظم عمومی (جنرل سیکرٹری) منتخب کر لیا گیا اور آخر دم تک وہ اسی عہدہ پر فائز رہے۔

ایوب خان مرحوم کی گول میز کانفرنس میں جمہوری مجلسِ عمل کی طرف سے مولانا مفتی محمودؒ اور ان کے رفیق کار حضرت مولانا پیر محسن الدین احمدؒ بھی شریک ہوئے۔ اس موقع پر مفتی صاحبؒ نے علماء کے

۲۲ نکات کو دستور کی بنیاد بنانے اور مسلمان کی تعریف کو آئین میں شامل کرنے کا مطالبہ کر کے پورے ملک کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرا لیا۔ اس وقت تو اس مطالبہ کو دیوانے کا ایک خواب سمجھا گیا مگر صرف چھ سال کے بعد ملک کی پارلیمنٹ نے مسلمان کی تعریف کو آئین کا حصہ بنا کر یہ ثابت کر دیا کہ گول میز کانفرنس میں مفتی محمودؒ کا مطالبہ نہ صرف صحیح بلکہ قوم کی ایک اہم ضرورت تھا۔

۱۹۷۰ء کے انتخابات سے قبل ملک میں جو سیاسی خلفشار رونما ہوا یا پیدا کیا گیا، مفتی صاحبؒ اور ان کی جماعت نے اس خلفشار کو خانہ جنگی تک پہنچنے سے بچانے کے لیے توازن، اعتدال اور جرأت کو اپنی پالیسیوں کی بنیاد بنایا۔ انہوں نے سیاست اور ووٹ کی لڑائی کو اسلام اور کفر کا معرکہ نہ بننے دیا۔ اور محنت کشوں، مزدوروں، کسانوں اور نچلے طبقوں کے مسائل و مشکلات کو اسلام کے حوالے سے موضوعِ سیاست بنا کر اس تاثر کو عملاً دور کر دیا کہ سرمایہ دارانہ و جاگیردارانہ نظام کے خلاف محنت کشوں کی معرکہ آرائی میں اسلام سرمایہ داری اور جاگیرداری کا حلیف ہے۔ سوشلزم اور کمیونزم کی راہ روکنے کا یہی ایک فطری راستہ تھا جو ۱۹۷۰ء میں مولانا مفتی محمودؒ کی قیادت میں علماء حق نے اختیار کیا۔

اور آج بھی جبکہ کمیونزم اور سوشلزم کے اندرونی و بیرونی محرکات پورے نظم و وسائل کے ساتھ متحرک ہیں، سوشلزم کی راہ روکنے کا منطقی راستہ مروجہ معاشی و اقتصادی نظام کا دفاع نہیں ہے، بلکہ آج کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ مروجہ نوآبادیاتی نظام کے خلاف محنت کشوں کی بے چینی اور اضطراب کو محسوس کیا جائے اور انہیں خلوصِ دل کے ساتھ خلافتِ راشدہ کے غیر طبقاتی معاشرہ کی برکات و فیوض سے آگاہ کر کے ان کے لیے سوشلسٹ لیڈر شپ کے چنگل سے نجات حاصل کرنے کی راہ ہموار کی جائے۔

پاکستان کا محنت کش مسلمان ہے۔ معاشرہ میں خوشحال لوگوں کی فیشن ایبل بستیوں اور کچی آبادیوں کے درمیان معیارِ زندگی کے ہوشربا تفاوت نے مروجہ نظام کے خلاف محنت کشوں کے اضطراب اور بے چینی کو جواز کی ناقابلِ تنسیخ سند فراہم کر دی ہے۔ لیکن اگر آج بھی محنت کشوں کو عمل اور کردار سے یہ یقین دلا دیا جائے کہ مروجہ نوآبادیاتی اور غیر اسلامی نظام کے خلاف ان کے اضطراب میں اسلام ان کا حریف نہیں حلیف ہے، تو پاکستان کا غریب مگر دیندار محنت کش سوشلسٹ قیادت کا جوا گلے سے اتارنے میں شاید چوبیس گھنٹے کی تاخیر بھی گوارا نہ کرے۔ مگر علماء کو آپس کی لڑائیوں اور بے مقصد بحثوں سے فرصت ہو تو وہ وقت کے اس سب سے بڑے چیلنج کی طرف توجہ کریں۔ بہرحال وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ اگر علماء نے اتحاد و اشتراک اور تدبر و فراست کے ساتھ وقت کے اس چیلنج کا سامنا نہ کیا تو خدانخواستہ بخارا و تاشقند کی تاریخ دنیا کے سامنے ایک بار پھر دہرائی جائے گی۔ اور تکلف برطرف! جہد و عمل سے خالی دعائیں اور اتحاد و یگانگت سے معرا بیانات و تقاریر اس سیلاب کا راستہ نہ روک سکیں گی۔

جذبات کی رو میں دور تک بہہ گیا، ذکر مولانا مفتی محمودؒ کی ۱۹۷۰ء کی حکمتِ عملی کا ہو رہا تھا، اس حکمتِ عملی نے ملک کے سیاسی حلقوں میں مفتی صاحبؒ اور ان کی جماعت کے لیے اعتماد اور دلچسپی کے در وَا کیے، اور اسی فضا میں ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے نتائج سامنے آئے۔ جمعیت علماء اسلام نے قومی اسمبلی میں سات نشستیں حاصل کی تھیں اور سرحد و بلوچستان کی صوبائی اسمبلیوں میں توازن کی قوت اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس طرح مولانا مفتی محمودؒ کی مدبرانہ قیادت میں علماء حق کی جماعت ملکی سیاست کا ایک ناگزیر حصہ بن کر ابھری۔

پاکستان کی سالمیت کا تحفظ

۱۹۴۷ء تک کی سیاسی جدوجہد کے حوالے سے مولانا مفتی محمودؒ اور ان کے رفقاء کو قیامِ پاکستان کے مخالفین میں شمار کیا جاتا ہے اور انہیں بھی ۱۹۴۷ء سے پہلے کی سیاسی زندگی کے حوالہ سے معذرت کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوئی۔ لیکن ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد یحییٰ خان، شیخ مجیب الرحمٰن اور مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے درمیان اقتدار کی کشمکش کے دوران مولانا مفتی محمودؒ نے اپنی جماعت کی سطح پر اور چھوٹی پارلیمانی پارٹیوں کی لاہور کانفرنس کے حوالے سے ملکی سالمیت کے تحفظ کے لیے جو پُرخلوص اور جرائتمندانہ کردار ادا کیا، وہ حب الوطنی کے بہت سے اجارہ داروں کے لیے بھی قابلِ رشک ہے۔ مسٹر بھٹو نے قومی اسمبلی کے ڈھاکہ سیشن کا بائیکاٹ کر کے "اِدھر تم اُدھر ہم" کے نعروں کی گونج میں ڈھاکہ جانے والے ارکانِ اسمبلی کی ٹانگیں توڑ دینے کا جو چیلنج دیا، اس کا جواب سب سے پہلے ڈیرہ اسماعیل خان کی نشست سے مسٹر بھٹو کو شکستِ فاش دینے والے اسی مرد قلندر نے ڈھاکہ سیشن میں شرکت کا دوٹوک اعلان کر کے دیا۔

۱۹۷۰ء کے انتخابات سے سقوطِ ڈھاکہ کے المناک سانحہ تک مولانا مفتی محمودؒ کا سیاسی کردار جس طویل تذکرہ کا متقاضی ہے یہ صفحات اس کے متحمل نہیں ہیں، لیکن اتنی بات ضرور عرض کرنا چاہوں گا کہ

۱. جمعیت علماء اسلام کے ارکان اسمبلی کی طرف سے ڈھاکہ سیشن میں شرکت کا اعلان،
۲. مولانا مفتی محمودؒ کی طرف سے طلب کردہ چھوٹے پارلیمانی گروپوں کی لاہور کانفرنس کے فیصلے،
۳. اور یحییٰ خان کی طرف سے قومی اسمبلی کے مشرقی پاکستان کے ارکان کو نااہل قرار دے کر ان کی جگہ نام نہاد انتخابات میں جمعیت علماء اسلام کا حصہ نہ لینے کا اعلان،

مفتی صاحبؒ کی سیاسی بصیرت اور حب الوطنی کے ایسے شاہکار ہیں جن کے سامنے بڑے بڑے سیاسی جغادریوں کے حب الوطنی کے چراغ ماند پڑ گئے۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد مغربی پاکستان میں مارشل لاء کے خاتمہ کی جدوجہد بھی مفتی صاحبؒ کے قومی کردار کا ایک تابناک باب ہے۔

وزارتِ اعلیٰ کا عہدہ

مارشل لاء کے خاتمہ کے بعد مولانا مفتی محمودؒ صوبہ سرحد میں کالعدم نیشنل عوامی پارٹی کے تعاون سے وزیر اعلیٰ بنے۔ سرحد و بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت کی مخلوط وزارتوں کا سیاسی پس منظر اور قومی سیاست پر ان کے اثرات ایک مستقل مقالہ کا تقاضہ کرتے ہیں، مگر یہاں صرف تین پہلوؤں پر مختصراً گزارش کرنا چاہوں گا۔

۱. مفتی صاحب نے اردو کو صوبہ سرحد کی سرکاری زبان کا درجہ دے کر سرحد کی سیاسی عظمت کو دوبالا کر دیا،

۲. شراب پر پابندی اور دیگر اسلامی قوانین کے اجرا سے اسلامی قوانین کے نفاذ کے سلسلہ میں پائی جانے والی جھجک اور گومگو کو ختم کر دیا،

۳. اور وفاقی وزراء کے مخالفانہ دوروں اور تقاریر کے باوجود دفعہ ۱۴۴، لاٹھی، گولی اور کسی بھی قسم کے امتناعی قوانین کے بغیر دس ماہ تک کامیابی کے ساتھ صوبہ کا نظام چلا کر یہ ثابت کر دیا کہ مُلّا اگر صحیح معنوں میں مُلّا ہو تو وہ حکومت اور سیاست کے نظام کو دوسروں سے کہیں زیادہ بہتری اور کامیابی کے ساتھ چلا سکتا ہے۔

اصولوں کی خاطر صوبہ سرحد کی وزارتِ اعلیٰ سے استعفیٰ اور اس کے بعد قومی اسمبلی میں قائدِ حزب اختلاف کے طور پر آئین سازی میں مفتی صاحبؒ کی مسلسل جدوجہد کے مناظر ابھی تک پاکستانی عوام کی نگاہوں کے سامنے گھوم رہے ہیں۔

جبکہ تحریکِ نظامِ مصطفیٰ ﷺ کی قیادت کا مرحلہ تو ابھی تازہ ہے، انہوں نے جس تدبر اور صلاحیت کے ساتھ تحریک کی قیادت کی اور پھر مذاکرات کے طویل اور جانگسل مرحلہ کو نمٹایا، وہ بھی سب کے سامنے ہے۔ مفتی صاحبؒ سیاست کا کاروبار معطل ہونے کے بعد بھی نہ تو کسی دوسرے ملک میں جا کر بیٹھ گئے اور نہ ہی اپنے گھر میں گوشہ نشیں ہوئے بلکہ ایک عالمِ دین ہونے کے حوالے سے "نظام العلماء پاکستان" کے نام سے مذہبی اور دینی پلیٹ فارم قائم کر کے آخر دم تک قوم کی دینی راہنمائی اور عوام کے حقوق و مسائل کے سلسلہ میں جدوجہد کرتے رہے۔

آج مفتی صاحبؒ ہم سے رخصت ہو گئے ہیں لیکن ان کی جدوجہد اور کارنامے زندہ ہیں۔ اور ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے علماء حق کی سیاست کو مسجد، مدرسہ، خانقاہ اور جلسہ و جلوس کے دائرہ سے نکال کر ان ایوانوں تک پہنچایا جہاں قوم کی تقدیر کے فیصلے ہوتے ہیں۔ انہوں نے جلسہ، جلوس، ایوان اور میز پر علماء کو سیاستدانوں کے شانہ بشانہ کھڑا کر کے اس اعتماد اور حوصلہ سے سرشار کیا کہ وہ اگر اپنے اسلاف کی جرأت، بے نیازی اور خلوص کو وطیرہ بنالیں تو سیاست کے ہر شعبہ میں وہ قوم کی قیادت کر سکتے ہیں۔

مفتی صاحبؒ کے بعد کیا ہو گا؟

آخر میں اس سوال پر کچھ عرض کرنا مناسب خیال کرتا ہوں کہ مفتی صاحبؒ کے بعد کیا ہو گا؟ اس لیے کہ بہت سے حلقوں اور افراد کے ذہنوں میں یہ غلط فہمی جنم لے رہی ہے کہ مولانا مفتی محمودؒ کے بعد شاید اس علماء حق کے کیمپ میں سناٹا طاری ہو جائے گا، اور یہ قافلہ معاشرہ میں جو کردار ادا کرتا آرہا ہے اس کا باب بند ہو جائے گا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ جس حلقہ کی نمائندگی مولانا مفتی محمودؒ کرتے رہے ہیں اس کی نوعیت شخصی نہیں نظریاتی ہے۔ اور نظریاتی حلقے اشخاص کے سہارے نہیں بلکہ نظریۂ خلوص اور کارکنوں کے جذبہ و عمل کے سہارے زندہ رہتے اور آگے بڑھتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مفتی صاحبؒ جیسی قد آور شخصیت کی موت اس حلقہ کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان اور ایک مدت تک نہ بھلایا جانے والا صدمہ ہے، لیکن اس سے قبل یہ حلقۂ فکر و عمل شاہ ولی اللہ، شاہ عبد العزیز، شاہ اسماعیل شہید، سید احمد شہید، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، شیخ الہند مولانا محمود حسن، شیخ العرب والعجم مولانا سید حسین احمد مدنی، شیخ الاسلام مولانا علامہ شبیر احمد عثمانی، قطب الاقطاب حضرت مولانا احمد علی لاہوری اور امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہم اللہ تعالیٰ جیسی عظیم شخصیات کی جدائی کا صدمہ برداشت کر چکا ہے۔ اس لیے اگرچہ مولانا مفتی محمودؒ کی وفات کا صدمہ تازگی کی بنا پر کیفیت و کمیّت کے لحاظ سے ان صدموں سے منفرد محسوس ہوتا ہے، لیکن جیسے ان مذکورہ بالا اکابر کی جدائی ولی اللّٰہی تحریک کے کارکنوں کے جذبہ و عمل اور قوتِ کار پر اثر انداز نہیں ہوئی، اسی طرح مولانا مفتی محمودؒ کی موت بھی یقیناً منفی اثرات و نتائج کی حامل نہیں ثابت ہوگی۔ مولانا مفتی محمودؒ نے اپنی مدبرانہ قیادت کے دور میں کاروانِ ولی اللّٰہی کو

- اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے عملی جدوجہد،

- ملکی سالمیت کی ہر قیمت پر حفاظت،
- اور عوامی حقوق و مسائل کے لیے بے لوث اور جرأت مندانہ کردار

کی جس شاہراہ پر گامزن کیا ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ یہ قافلہ اسی شاہراہ پر گامزن رہے گا۔ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا مفتی محمود نور اللہ مرقدہ کے درجات بلند فرمائے، ان کی قبر کو منور کرے اور ہمیں توفیق مرحمت فرمائے کہ ہم ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے دین، ملک اور قوم کی مخلصانہ خدمات سرانجام دیتے رہیں، آمین یارب العالمین۔

حضرت مولانا شاہ احمد نورانیؒ: ایک وضعدار دینی و قومی راہنما کی وفات

(روزنامہ اسلام، لاہور — ۱۴ دسمبر ۲۰۰۳ء)

مولانا شاہ احمد نورانیؒ کی وفات کی خبر میں نے اسلام آباد میں سنی۔ جی ٹین تھری میں واقع جامعہ صدیقہ للبنات میں بخاری شریف کے سبق کے آغاز کی تقریب تھی، جامعہ کے مہتمم مولانا عبدالرشید کے ارشاد پر طالبات کو پہلا سبق پڑھایا۔ اس کے بعد اسلام آباد کے سرکردہ علماء کرام مولانا قاری محمد نذیر فاروقی، مولانا محمد رمضان علوی، مولانا پروفیسر ڈاکٹر احمد جان اور دیگر حضرات کے ساتھ ہم کھانے کے دسترخوان پر بیٹھے تھے کہ مولانا محمد رمضان علوی کو ان کے کسی دوست نے فون پر اطلاع دی کہ مولانا شاہ احمد نورانیؒ کا دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو گیا ہے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ خبر سنتے ہی محفل سوگوار ہوگئی اور مولانا نورانیؒ کی زندگی اور خدمات کے حوالہ سے مختلف امور کا تذکرہ ہونے لگا۔ وہاں سے فارغ ہو کر مجھے ایک دو جگہ جانا تھا، اس دوران معلومات حاصل کرتے رہے اور کچھ تفصیلات معلوم ہوئیں۔ خیال تھا کہ اگر اسلام آباد میں جنازہ ہو تو اس میں شرکت ہو جائے۔ مگر پتہ چلا کہ میت کراچی لے جائی جا رہی ہے اور جنازے کا پروگرام کراچی میں ہی ہے، چنانچہ سوگوار دل کے ساتھ شام کو گوجرانوالہ واپس چلا آیا۔

جمعیت علماء پاکستان کا پس منظر

مولانا شاہ احمد نورانیؒ کا نام پہلی بار ۱۹۷۰ء میں سنا جب وہ کراچی سے جمعیت علماء پاکستان کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور پھر دھیرے دھیرے قومی سیاست کے افق پر آگے بڑھتے چلے گئے۔ اس وقت جمعیت علماء پاکستان کے سربراہ سیال شریف کے سجادہ نشین حضرت خواجہ قمر الدین سیالویؒ تھے۔ لیکن اس کے بعد مولانا نورانیؒ کو جے یو پی کا صدر منتخب کیا گیا اور وہ آخر عمر تک اس منصب کے ساتھ قومی سیاست میں متحرک کردار ادا کرتے رہے۔

جمعیت علماء پاکستان کے نام سے سیاسی جماعت سب سے پہلے دیوبندی مکتبِ فکر کے جمعیت علماء ہند سے تعلق رکھنے والے علماء نے قائم کی تھی۔ اس کے سرکردہ علماء کرام میں حضرت مولانا محمد صادقؒ آف کھڈہ کراچی، حضرت مولانا عبدالحنانؒ آف راولپنڈی، حضرت مولانا مفتی محمد نعیم لدھیانویؒ، حضرت مولانا سید گل بادشاہؒ آف سرحد، حضرت مولانا مفتی ضیاء الحسن لدھیانویؒ آف ساہیوال اور حضرت مولانا مفتی

عبدالواحدؒ آف گوجرانوالہ شامل تھے۔ یہ سب جمعیت علماء ہند سے تعلق رکھتے تھے۔ جبکہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی قیادت میں کام کرنے والی جمعیت علماء اسلام کا جمعیت علماء ہند سے تحریکِ پاکستان کی حمایت یا مخالفت کے مسئلہ پر اختلاف تھا۔ چنانچہ مذکورہ بالا حضرات نے جمعیت علماء پاکستان کے نام سے ایک تنظیم قائم کر کے اپنے رفقاء کو منظم کرنا چاہا مگر اس وقت کے حالات میں وہ آگے نہ بڑھ سکے۔ میں نے حضرت مولانا مفتی عبدالواحدؒ سے متعدد بار اس کا تذکرہ سنا ہے اور ان کے کاغذات میں اس جمعیت کی کچھ کاروائیاں بھی دیکھی ہیں۔ مگر دیوبندی مکتبِ فکر کی جمعیت علماء پاکستان متحرک نہ ہو سکی اور بریلوی مکتبِ فکر نے جمعیت علماء پاکستان کے نام سے تنظیم قائم کر کے کام شروع کر دیا، تب سے یہ پلیٹ فارم بریلوی مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے علماء کرام اور دینی کارکنوں کی سیاسی تگ و تاز کے لیے مخصوص ہے۔

جمعیت کی صدارت کا منصب

ایک دور میں جمعیت علماء پاکستان کے سربراہ آلو مہار شریف ضلع سیالکوٹ کے سجادہ نشین صاحبزادہ سید فیض الحسنؒ تھے۔ وہ قیامِ پاکستان سے قبل مجلسِ احرارِ اسلام میں شامل رہے ہیں اور ان کا شمار احرار کی صفِ اول کی قیادت میں ہوتا تھا۔ ان کی رہائش گوجرانوالہ میں تھی اور حضرت مولانا مفتی عبدالواحدؒ کا ان کے ساتھ دوستانہ تعلق تھا۔ اس لیے مجھے بھی ان کے پاس حاضر ہونے کا موقع ملتا رہتا تھا اور نیاز مندی کا یہ تعلق آخر وقت تک رہا۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات سے قبل ان کی بجائے حضرت خواجہ قمر الدین سیالویؒ کو جے یو پی کا سربراہ چنا گیا۔ الیکشن کے بعد جب قومی اسمبلی میں جمعیت علماء پاکستان کے سات منتخب ارکان پر مشتمل پارلیمانی گروپ مولانا شاہ احمد نورانیؒ کی سربراہی میں قائم ہوا تو ان کی صلاحیتوں اور ابھرتی ہوئی شخصیت کے پیش نظر جے یو پی کی صدارت کا منصب بھی انہیں کو سونپ دیا گیا۔

جے یو پی کے تنظیمی محاذ پر انہیں مولانا عبدالستار خان نیازیؒ کی رفاقت میسر آئی جن کا شمار تحریکِ پاکستان کے سرگرم کارکنوں میں ہوتا تھا اور وہ اس سے پہلے پنجاب اسمبلی کے رکن رہ چکے تھے۔ مولانا نیازیؒ اس سے قبل تحریکِ خلافت کے عنوان سے سیاسی میدان میں متحرک رہے تھے لیکن الیکشن میں جے یو پی کی نمایاں پیش قدمی کے بعد وہ مولانا نورانیؒ کے ساتھ میدان میں اترے اور دونوں کی مسلسل اور پر خلوص جدوجہد نے جمعیت علماء پاکستان کو چند سرکردہ علماء اور مشائخ کے حلقہ ہائے ارادت کے دائرہ سے نکال کر ایک عوامی سیاسی جماعت کا رنگ دے دیا۔

خاندانی اور روحانی پس منظر

مولانا شاہ احمد نورانیؒ میرٹھ سے تعلق رکھتے تھے اور وہاں سے ہجرت کر کے کراچی میں آباد ہوئے تھے۔ ان کے والد محترم مولانا عبدالعلیم صدیقیؒ کا شمار مولانا احمد رضا خان بریلویؒ کے خلفاء میں ہوتا تھا اور ان کی پیری مریدی کا سلسلہ پاکستان اور ہندوستان کے ساتھ ساتھ یورپ اور افریقہ کے دور دراز علاقوں تک پھیلا ہوا تھا۔ جبکہ مولانا نورانیؒ کی شادی مدینہ منورہ میں مولانا فضل الرحمٰن مدنیؒ کے خاندان میں ہوئی۔ مولانا نورانیؒ کو اردو، انگریزی اور عربی کے علاوہ فارسی، فرانسیسی، سواحلی اور دیگر متعدد زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ اور ۱۹۷۰ء کے الیکشن سے قبل ان کی تگ و تاز کا میدان دنیا کے مختلف حصوں میں ان کے والد مرحوم کے مریدوں اور عقیدت مندوں کے وسیع دائرہ میں پھیلا ہوا تھا جس میں خود مولانا نورانیؒ کی مساعی سے بھی خاصا اضافہ ہوا۔ مگر ان کے اصل جوہر قومی اسمبلی کا رکن منتخب ہونے کے بعد پارلیمانی محاذ پر کھلے اور انہوں نے بہت جلد ایک منجھے ہوئے پارلیمنٹرین کی حیثیت سے خود کو تسلیم کرالیا۔

مولانا مفتی محمودؒ کی رفاقت

اس وقت قومی اسمبلی میں حزب اختلاف کے قائد پہلے خان عبدالولی خان اور پھر ان کی گرفتاری کے بعد مولانا مفتی محمودؒ تھے جبکہ اپوزیشن میں ان کے ساتھ مولانا نورانیؒ ایک متحرک، مدبر اور صاف گو رہنما کے طور پر پہچانے جاتے تھے۔ ۱۹۷۳ء کے دستور کی تیاری اور پھر تحریکِ ختمِ نبوت میں انہوں نے جو کردار ادا کیا وہ تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے۔ اور دستور میں اسلامی دفعات کو شامل کرانے اور پاکستان کی اسلامی نظریاتی حیثیت کے دستوری تحفظ میں ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ خان عبدالولی خان جلد گرفتار ہو کر جیل میں چلے گئے تھے لیکن سچی بات یہ ہے کہ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد بچے کھچے پاکستان کو سنبھالنے، ایک متفقہ دستور دینے، اور دستور میں اسلام کی بنیادی دفعات کو سمونے میں اس دور کی مختصر اپوزیشن نے جو شاندار کردار ادا کیا اس میں مولانا مفتی محمودؒ، مولانا شاہ احمد نورانیؒ، مولانا ظفر احمد انصاریؒ، پروفیسر غفور احمدؒ اور چودھری ظہور الٰہیؒ کا کردار ملک کی دستوری تاریخ میں ہمیشہ پاکستانی قوم کے محسنوں کے طور پر ذکر ہوتا رہے گا۔

۱۹۷۴ء میں جب ملک میں قادیانی گروہ کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی تحریک چلی تو اسی اپوزیشن نے قومی اسمبلی کا محاذ سنبھالا اور اپنے اتحاد اور مشترکہ جدوجہد کی وجہ سے یہ مورچہ بھی سر کر لیا۔ اس وقت قومی اسمبلی میں اپوزیشن تعداد کے لحاظ سے اگرچہ بڑی نہیں تھی لیکن مذکورہ بالا بھاری بھرکم شخصیات اور ان کے

بے داغ کردار نے اسے ایک طاقتور اپوزیشن کی حیثیت دے دی تھی، اور اپوزیشن کو یہ مقام دلوانے میں مولانا نورانیؒ کا کردار بھی نمایاں تھا۔

انتخابات ۱۹۷۷ء کے ''پاکستان قومی اتحاد'' میں کردار

۱۹۷۷ء کے انتخابات سے قبل جب ملک کی نو سیاسی جماعتوں نے پاکستان قومی اتحاد کے نام سے مشترکہ پلیٹ فارم قائم کیا تو اس کے سربراہ مولانا مفتی محمودؒ تھے جبکہ مولانا نورانیؒ کی جمعیت علماء پاکستان کے سیکرٹری جنرل جناب رفیق احمد باجوہ کو قومی اتحاد کا سیکرٹری چنا گیا۔ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے لیے قومی اتحاد کی انتخابی مہم اور پھر انتخابات میں دھاندلی کے خلاف عوامی جدوجہد کو منظم کرنے میں مولانا نورانیؒ نے سرگرم کردار ادا کیا۔ قومی سیاست میں ان کی پختہ کاری اور عزم واستقامت کا ایک مظاہرہ اس وقت سامنے آیا کہ جب پاکستان قومی اتحاد کی احتجاجی تحریک کے دوران، جو عوام کے دینی جذبات کی وجہ سے تحریکِ نظامِ مصطفیٰؐ کا عنوان اختیار کر چکی تھی، قومی اتحاد کے سیکرٹری جنرل اور مولانا نورانیؒ کے رفیق کار جناب رفیق احمد باجوہ نے وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے ساتھ خفیہ ملاقات کی تو مولانا نورانیؒ نے اس کا سخت نوٹس لیا۔ انہوں نے اپنے اس پرانے رفیق کی قربانی دینے میں ایک لمحہ کی تاخیر نہیں کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر اس نازک مرحلہ میں مولانا نورانیؒ اپنے اس رفیق کے لیے تھوڑی سی لچک بھی دکھا دیتے تو قومی اتحاد اور تحریکِ نظامِ مصطفیٰؐ دونوں کا شیرازہ بکھر جاتا۔ لیکن انہوں نے تحریک اور اس عظیم مقصد کی خاطر اپنے سیکرٹری جنرل کی قربانی دے کر اصول پرستی، بیداری اور استقامت کا شاندار مظاہرہ کیا اور ان کا یہ کردار تاریخ میں سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔

ایک وضعدار اور سادہ منش عالمِ دین

مولانا نورانیؒ نے ۷۸ برس عمر پائی ہے اور ۱۹۷۰ء سے اب تک وہ قومی سیاست کا ایک متحرک کردار رہے ہیں۔ قومی اسمبلی اور سینٹ دونوں کے باری باری رکن رہے ہیں۔ ان کے حلقۂ ارادت کا دائرہ دنیا کے کئی براعظموں تک وسیع ہے۔ وہ جوہر شناس تھے اور ہیروں کا کاروبار کرتے تھے۔ دولت کے حصول اور پر تعیش زندگی کے اسباب کبھی ان کی دسترس سے باہر نہیں رہے لیکن اس کے باوجود انہوں نے سادہ زندگی گزاری ہے۔ میں نے کراچی صدر میں ان کی اس رہائشگاہ میں متعدد بار حاضری دی ہے جو نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک ان کا مسکن رہی ہے۔ یہ ایک فقیر منش عالمِ دین کی رہائشگاہ تھی جو کرائے کے فلیٹ میں تھی۔ ان کا رہن سہن کا انداز پرانے وضعدار اور باوقار علماء کی یاد تازہ کرتا تھا۔ اور ان کی مہمان نوازی اور ملنساری کے نقوش ذہنوں میں ہمیشہ کے لیے نقش ہو جایا کرتے تھے۔ ان کے مزاج میں بذلہ

سنجی اور خوش طبعی کا پہلو نمایاں تھا۔ موقع محل کے مطابق ہلکے پھلکے فقرے چست کرنے میں انہیں کمال حاصل تھا اور وہ لمحوں میں کسی بھی محفل کو زعفران زار بنا دیا کرتے تھے۔ لیکن تہذیب و شائستگی کا دامن انہوں نے کبھی نہیں چھوڑا جس کی شہادت کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ ان کے ایک بڑے سیاسی حریف کی بیٹی جو خود بھی ان کی شدید سیاسی تنقید کا نشانہ بنتی رہی ہیں، یعنی محترمہ بے نظیر بھٹو نے ان کی وفات پر جو تعزیتی بیان دیا ہے اس میں اس بات کا بطور خاص تذکرہ کیا ہے کہ مولانا نورانیؒ اختلاف کا اظہار اور تنقید تہذیب کے دائرے میں رہ کر کیا کرتے تھے۔

مولانا نورانیؒ مسلکاً بریلوی تھے اور ڈھیلے ڈھالے نہیں بلکہ متصلب اور پختہ کار بریلوی تھے۔ اور میں اس بات کا عینی شاہد ہوں کہ جہاں بھی مسلک کی بات آئی ہے ان میں کوئی لچک دیکھنے میں نہیں آئی۔ لیکن اس کے باوجود مشترکہ دینی معاملات میں انہوں نے مشترکہ جدوجہد اور رابطہ و معاونت سے کبھی گریز نہیں کیا۔ سیاسی معاملات ہوں یا دینی، ملک کی مختلف الخیال جماعتوں اور حلقوں کے درمیان رابطہ و مفاہمت کے فروغ اور اتحاد و اشتراک کے اہتمام میں ان کا کردار ہمیشہ نمایاں رہا ہے۔

افغانستان اور طالبان کی پشت پناہی

اپنی زندگی کے آخری سالوں میں افغانستان میں طالبان حکومت کی حمایت، افغانستان کی قومی خود مختاری و آزادی کے تحفظ، امریکہ کی استعماری یلغار کی مخالفت، اور پاکستان کے قومی اور داخلی معاملات میں امریکی مداخلت کی مذمت و مزاحمت میں انہوں نے جو شاندار کردار ادا کیا وہ ہماری قومی تاریخ کے ایک مستقل باب کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کی دینی قوتوں نے متحدہ مجلسِ عمل کے نام سے سیاسی اتحاد قائم کیا تو اس کی سربراہی کے لیے سب سے نمایاں اور حقدار شخصیت انہی کی سامنے آئی۔ اور وہ ملک میں جمہوری اقدار کی بحالی، قومی خود مختاری کے تحفظ، دستور کی بالادستی اور عالمی سطح پر امریکی استعمار کی اسلام دشمنی کے خلاف جدوجہد کی قیادت کرتے ہوئے اس شان کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوئے کہ پوری قوم غم و اندوہ میں ڈوب گئی۔ تمام مکاتبِ فکر کے علماء کرام اور دینی کارکن ان کی جدائی کی کسک اپنے دلوں میں محسوس کر رہے ہیں اور بلا امتیاز ہر طبقہ ان کی دینی و قومی خدمات پر خراجِ تحسین پیش کر رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دیں اور تمام پسماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق ارزانی فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

ولی خان مرحوم اور ماضی کی چند یادیں

(روزنامہ پاکستان، لاہور — ۳۰ جنوری ۲۰۰۶ء)

...... خان عبدالولی خان مرحوم کو میں نے پہلی بار اس وقت دیکھا جب وہ ۱۹۷۰ء کے الیکشن کے بعد جمعیت علمائے اسلام اور نیشنل عوامی پارٹی کے سیاسی اتحاد کے دور میں گوجرانوالہ آئے اور مرکزی جامع مسجد شیرنوالہ باغ میں عوام کے ایک اجتماع سے خطاب کیا۔ وہ دوٹوک لہجے میں بات کرنے کے عادی تھی، مجھے ان کے اس انداز نے بہت متاثر کیا۔ انہوں نے اس جلسے میں بھٹو حکومت کی پالیسیوں پر تنقید کرتے ہوئے دو لطیفے سنائے جو آج تک میرے ذہن میں تازہ ہیں۔

ولی خان مرحوم کے دو لطیفے

انہوں نے کہا کہ بھٹو حکومت کو پنجاب اوپر لایا ہے اس لیے پنجاب ہی کو اسے اتارنے کے لیے بڑا کردار ادا کرنا پڑے گا۔ اس پر انہوں نے ایک لطیفہ سنایا کہ ایک دور دراز دیہات کا رہنے والا شہر میں آیا تو کوئی مؤذن مسجد کے مینارے پر چڑھ کر اذان دے رہا تھا۔ جس زمانے میں لاؤڈ اسپیکر نہیں ہوتے تھے، مؤذن اسی طرح بلند مینار پر چڑھ کر اذان دیا کرتے تھے تاکہ آواز زیادہ دور تک جا سکے۔ اس دیہاتی نے مؤذن کو بلند مینار پر اذان دیتے ہوئے دیکھا تو سمجھا کہ اس کو نیچے اترنے کے لیے راستہ نہیں مل رہا اور مدد کے لیے چیخ و پکار کر رہا ہے۔ وہ آگے بڑھا اور مینار کے چاروں طرف گھوم کر اس نے دیکھا کہ مدد کے لیے اس کے پاس پہنچنے کا کوئی راستہ ہے؟ جب کسی طرف سے کوئی راستہ دکھائی نہ دیا تو نیچے سے بلند آواز کے ساتھ مؤذن کو پکارا کہ بھئی مجھے تو کوئی راستہ نظر نہیں آرہا، اس لیے جس نے تجھے اوپر چڑھایا ہے وہی تجھے نیچے بھی اتارے گا۔

دوسری بات ولی خان مرحوم نے یہ کہی کہ پاکستان ایک بار ٹوٹ چکا ہے اب باقی ماندہ پاکستان کو بچانے کی ضرورت ہے کہ کہیں ہماری حرکتوں کی وجہ سے خدانخواستہ یہ بھی نہ ٹوٹ جائے۔ اس پر انہوں نے ایک اور لطیفہ سنایا کہ ایک شخص چوڑیوں کی ٹوکری زمین پر رکھے کھڑا تھا کہ پولیس کا ایک سپاہی آیا، اس نے ٹوکری کو ٹھوکر مار کر پوچھا کہ اس میں کیا ہے؟ ٹوکری والے نے جواب دیا کہ جناب ایک ٹھوکر اور مار دیں تو اس میں کچھ بھی نہیں ہے۔

ولی خان مرحوم اور مولانا مفتی محمودؒ کی سیاسی رفاقت

خان عبدالولی خان مرحوم اور مولانا مفتی محمودؒ کی سیاسی رفاقت پاکستان کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔

- اسی رفاقت کے باعث مولانا مفتی محمودؒ صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ بنے اور پاکستان میں علمائے کرام کے لیے اقتدار کی سیاست کا دروازہ وَا ہوا۔
- اسی رفاقت کی وجہ سے ۱۹۷۳ء کا دستور اس صورت میں منظور ہوا کہ اس میں اسلامی نظام، جمہوریت، اور صوبوں کے حقوق کے معاملات ایسے توازن کے ساتھ ایڈجسٹ ہو گئے کہ بہت سے نازک مراحل سے گزرنے کے باوجود یہ دستور آج بھی پاکستان کے تمام صوبوں کا متفقہ دستور ہے اور اسے پاکستان کی بقا و استحکام، اسلام و جمہوریت کی پاسداری، اور صوبوں کے حقوق کے تحفظ کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

کوئی سمجھدار مؤرخ اس دور میں ملکی سیاست اور پاکستان کے مستقبل پر جمعیت علمائے اسلام اور نیشنل عوامی پارٹی کی سیاسی رفاقت کے اثرات کا جائزہ لینا چاہے تو یہ بڑی دلچسپی کا حامل موضوع ثابت ہو گا اور قومی سیاست کے بہت سے عقدے حل ہوتے نظر آئیں گے۔ خان عبدالولی خان مرحوم نے بہت سے معاملات میں مولانا مفتی محمودؒ پر اعتماد کیا بلکہ انہیں کھلے بندوں اپنا امام تک کہہ دیا۔ اسی طرح مولانا مفتی محمودؒ نے بھی مختلف مواقع پر خان عبدالولی خان مرحوم کو بھرپور اعتماد سے نوازا۔

۱۹۷۲ء میں صوبہ سرحد میں حکومت کی تشکیل کے لیے جمعیت علمائے اسلام کو دو بڑے باہمی سیاسی حریفوں خان عبدالولی خان مرحوم اور خان عبدالقیوم خان مرحوم کی طرف سے یکساں طور پر پیشکش کی گئی تھی۔ دونوں جمعیت علمائے اسلام کی قیادت میں صوبائی حکومت بنانے کے لیے تیار تھے اور دونوں نے جمعیت علمائے اسلام کی طرف سے پیش کردہ تمام شرائط کو منظور کر لیا تھا۔ اب یہ فیصلہ جمعیت علمائے اسلام کے کورٹ میں تھا کہ وہ ان میں سے کس کو ترجیح دیتی ہے۔ جمعیت علمائے اسلام کی مجلسِ شوریٰ کے اجلاس میں جمعیت کے دو بڑے بزرگوں میں اس پر اختلاف ہو گیا۔ مولانا غلام غوث ہزارویؒ کی رائے خان عبدالقیوم خان مرحوم کے ساتھ کولیشن بنانے کی تھی جبکہ مولانا مفتی محمودؒ چاہتے تھے کہ خان عبدالولی خان مرحوم کے ساتھ کولیشن بنائی جائے۔ دونوں میں اس حوالے سے زبردست معرکہ آرائی ہوئی مگر بالآخر مولانا مفتی محمودؒ جمعیت کی مجلسِ شوریٰ سے اپنی رائے منوانے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ خان عبدالولی خان اور ان کے ساتھی بھروسے کے لوگ ہیں، وہ جو بات طے کریں گے اس پر قائم بھی رہیں گے۔ جبکہ خان عبدالقیوم خان کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس وقت کون سا رخ اختیار کریں۔ یہ خان عبدالولی خان اور نیشنل عوامی پارٹی کی اصول پسندی اور وضعداری پر

مولانا مفتی محمودؒ اور جمعیت علمائے اسلام کی طرف سے اعتماد کا اظہار تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ جمعیت کو اس کی قیمت بھی ادا کرنا پڑی کہ حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ کا راستہ بتدریج الگ ہوتا چلا گیا۔

قوم پرست، محبِ وطن اور دین پسند لیڈر

خان عبدالولی خان مرحوم معروف معنوں میں ایک ''قوم پرست پختون لیڈر'' تھے اور اس حوالے سے انہیں ایک علاقائی سیاستدان سمجھا جاتا تھا۔ لیکن قومی سیاست میں انہوں نے پاکستان کو متحد رکھنے، ملک کے تمام لوگوں کے حقوق کے تحفظ، جمہوری اقدار کی بالادستی، اور ملکی وحدت و سالمیت کے استحکام کے لیے جو مسلسل کردار ادا کیا اسے کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ میں گزشتہ کسی کالم میں اپنے اس تاثر اور احساس کا تذکرہ کر چکا ہوں کہ ۱۹۷۲ء کی قومی سیاست میں ذوالفقار علی بھٹو مرحوم، مولانا مفتی محمودؒ، اور خان عبدالولی خان مرحوم کے درمیان جو سہ فریقی اتحاد ہوا تھا، وہ اگر نہ ٹوٹتا تو ان حالات میں پاکستان کو اس سے بہتر سیاسی قیادت میسر نہیں آسکتی تھی۔ یہ ٹیم اگر مل کر ملک کی قیادت کرتی تو آج نہ صرف پاکستان بلکہ جنوبی ایشیا اور عالمِ اسلام کی صورتحال بہت مختلف ہوتی۔ مگر ملک و قوم کی بدقسمتی سے یہ ''سہ فریقی معاہدہ'' زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا اور نادیدہ قوتوں نے ۱۹۷۲ء کے باقی ماندہ پاکستان کو اس کی صحیح قیادت سے محروم کر دیا۔

مجھے خان عبدالولی خان مرحوم کے ساتھ زیادہ ملاقاتوں کا موقع نہیں ملا لیکن میں ان کے مداحوں میں سے ہوں۔ بہت سے معاملات میں ان سے اختلاف بھی رہا اور رائے و موقف کی حد تک آج بھی وہ اختلاف قائم ہے، لیکن ان کی وضعداری اور اپنی بات پر قائم رہنے کی روایت میرے نزدیک ہمیشہ قابلِ تعریف رہی ہے۔ وہ ملک کے بزرگ سیاستدانوں میں سے تھے، انہوں نے اپنے بعض تحفظات کے باوجود ہمیشہ ملکی استحکام اور سالمیت کی بات کی اور ایک لبرل بلکہ سیکولر سیاستدان ہونے کے باوجود دستور میں اسلامی دفعات، عقیدۂ ختمِ نبوت کے تحفظ، اور دیگر بہت سے دینی معاملات میں دینی جماعتوں کا ساتھ دیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائیں اور ان کے جانشین اسفندیار ولی خان کو اپنے باپ دادا کی روایات کو قائم رکھنے کی توفیق دیں، آمین یارب العالمین۔

چودھری ظہور الٰہی شہید اور ماضی کی چند یادیں

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۹ اکتوبر ۱۹۸۱ء)

ممتاز مسلم لیگی راہنما چودھری ظہور الٰہی گزشتہ جمعہ کے روز لاہور ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس جناب مولوی مشتاق حسین کو اپنی گاڑی پر ان کے گھر چھوڑنے جا رہے تھے کہ ماڈل ٹاؤن لاہور کی ایک سڑک پر نامعلوم حملہ آوروں کی وحشیانہ فائرنگ کا نشانہ بن کر جاں بحق ہو گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس حادثہ میں مرحوم کے ڈرائیور بھی قتل ہو گئے جبکہ مولوی مشتاق حسین موصوف زخمی ہوئے۔ چودھری ظہور الٰہی مرحوم نے پاکستان کی قومی سیاست میں جو سرگرم کردار ادا کیا ہے اور قومی تحریکات میں جس جوش و جذبہ کے ساتھ شریک ہوتے رہے ہیں اس کے باعث قومی حلقوں میں ان کی المناک موت اور وحشیانہ فائرنگ کی اس مذموم کاروائی پر گہرے رنج و غم اور شدید غم و غصہ کے جذبات کا مسلسل اظہار کیا جا رہا ہے۔

ایک معتمد و مخلص مسلم لیگی راہنما

چودھری صاحب مرحوم کا تعلق مسلم لیگ سے تھا اور پاکستان کی بانی جماعت ہونے کے ناطے سے مسلم لیگ کے احترام کے باوجود ہمیں مسلم لیگی طرز سیاست سے ہمیشہ بوجوہ اختلاف رہا ہے۔ لیکن چودھری ظہور الٰہی مرحوم کا شمار ان معدودے چند لیگی راہنماؤں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی مخلصانہ روش، تحمل، رواداری اور اجتماعی سوچ کے باعث کم و بیش سبھی محبِ وطن حلقوں سے احترام اور اعتماد حاصل کیا۔ مرحوم کی سیاسی زندگی کا سب سے تابناک دور وہ ہے جب انہوں نے بھٹو آمریت کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا اور اس سلسلہ میں تخویف و تحریص کے تمام ہتھکنڈوں کا پوری جرأت کے ساتھ سامنا کرتے ہوئے نہ صرف پنجاب کی روایتی سیاست کے بارے میں سابقہ تاثرات کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا بلکہ اپنی پنجابیت پر فخر کرتے ہوئے سرحد و بلوچستان کے عوام کے ساتھ یکجہتی اور محبت کا عملی اظہار کر کے علاقائی منافرت پیدا کرنے کی سازش کے تار پود بکھیر کے رکھ دیے۔

صوبوں کی یکجہتی کا علمبردار پنجابی سیاستدان

ہمیں اس دور کی سیاست کے حوالے سے حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے یہ تاثرات اچھی طرح یاد ہیں کہ اگر پنجاب کا یہ سیاستدان ہمارے ساتھ نہ ہوتا تو ہمیں پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کے عوام کے درمیان منافرت پیدا کرنے کی مکروہ سازش کو ناکام بنانے میں بے پناہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ مرحوم کو

اس حب الوطنی کی پاداش میں مقدمات، کردارکشی اور دار و گیر کے تمام مراحل سے گزرنا پڑا لیکن وہ ثابت قدمی کے ساتھ اپنے مشن پر کاربند رہے اور بالآخر سرخرو ہوئے۔

ہمارا مقصد چودھری ظہور الٰہی مرحوم کی خدمات کا احاطہ نہیں بلکہ صرف یہ گزارش کرنا ہے کہ قومی زندگی میں ان کا رویہ ہمیشہ مثبت اور حب الوطنی کا آئینہ دار رہا ہے اور انہوں نے قومی وحدت کے فروغ کو باقی ہر بات پر ترجیح دی ہے۔ آج جبکہ محبِ وطن عناصر اور مثبت سیاسی قوتوں کے درمیان یکجہتی کے قیام کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے، اس ضرورت کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کرنے والے ایک سیاسی راہنما کی موت بلاشبہ ایک قومی نقصان ہے۔ ہم اس غم میں مرحوم کے خاندان، رفقاء اور محب وطن حلقوں کے ساتھ شریک ہیں اور دعاگو ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

اس مسئلہ کے دوسرے پہلو پر سردست ہم صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ قومی زندگی میں تشدد اور دہشت پھیلانے والوں کا محاسبہ روایتی طریقوں سے نہیں ہوگا بلکہ ہنگامی بنیادوں پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ مسئلہ صرف چودھری ظہور الٰہی کی موت کا نہیں، قومی زندگی کو تشدد اور دہشت سے محفوظ رکھنے کا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ حکومت چودھری ظہور الٰہی مرحوم کے المناک قتل کے محرکات و عوامل اور اس کے پشت پناہ عناصر کو بے نقاب کرنے، دہشت گردی کے سرچشموں کا سراغ لگانے اور قاتلوں کو کیفرکردار تک پہنچانے میں کوئی کسر اٹھانہیں رکھے گی۔

نواب محمد اکبر خان بگٹی مرحوم اور ماضی کی چند یادیں

(روزنامہ پاکستان، لاہور — یکم ستمبر ۲۰۰۶ء)

نواب محمد اکبر خان بگٹی کے افسوسناک قتل نے جہاں ماضی کی بہت سی تلخ یادوں کو ایک بار پھر بے نقاب کر دیا ہے وہاں مستقبل کے حوالہ سے بھی انجانے خدشات و خطرات کی دھند ذہنوں پر مسلط کر دی ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ جو کچھ ہوا ہے درست نہیں ہوا اور اس کے نتائج ملک و قوم کے لیے خطرناک ہو سکتے ہیں، اس پر حکومتی پارٹی اور اپوزیشن میں اختلاف نہیں ہے اور متحدہ مجلس عمل اور اے آر ڈی کے ساتھ ساتھ چودھری شجاعت حسین اور میر ظفر اللہ خان جمالی بھی اس پر افسوس کا اظہار کر رہے ہیں۔ لیکن اس کے اسباب و محرکات اور اس قتل کی ذمہ داری کے حوالہ سے مختلف باتیں کہی جا رہی ہیں اور بحث و مباحثہ کا نیا بازار گرم ہو گیا ہے۔

۱۹۷۰ء کے سیاسی حالات

نواب محمد اکبر خان بگٹی کا نام پہلی بار میں نے اس وقت سنا جب ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد باقی ماندہ پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے زمامِ اقتدار سنبھالی اور سرحد و بلوچستان میں جمعیت علماء اسلام اور نیشنل عوامی پارٹی نے مخلوط حکومتیں بنائیں۔ سرحد میں مولانا مفتی محمودؒ اور بلوچستان میں سردار عطاء اللہ مینگل ان مخلوط حکومتوں کے سربراہ تھے۔ لیکن یہ مخلوط حکومتیں ابھی دس ماہ بھی کام نہ کر پائی تھیں کہ بلوچستان میں سردار عطاء اللہ خان مینگل کی وزارت کو وفاق کی طرف سے برطرف کر دیا گیا جس پر احتجاج کرتے ہوئے صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ مولانا مفتی محمودؒ نے بھی استعفیٰ دے دیا۔ اس موقع پر اسلام آباد میں عراقی سفارت خانہ سے اسلحہ کی برآمدگی کا مسئلہ سامنے آیا جس کا تعلق خان عبد الولی خان اور سردار عطاء اللہ خان مینگل کی نیشنل عوامی پارٹی سے جوڑا گیا اور پھر نیشنل عوامی پارٹی کو خلافِ قانون قرار دے کر اس کے خلاف سپریم کورٹ آف پاکستان میں ریفرنس دائر کر دیا گیا جو حیدرآباد ٹربیونل کے سامنے کئی برس تک زیر سماعت رہا۔

نواب محمد اکبر خان بگٹی اس موقع پر بلوچستان کی ایک قد آور شخصیت کے طور پر بھٹو حکومت کے اقدامات کے حامی کے طور پر سامنے آئے اور انہوں نے موچی دروازہ لاہور میں جلسہ عام سے خطاب بھی کیا۔ اس مرحلہ میں بلوچستان میں مری اور مینگل قبائل کے علاقوں میں فوجی ایکشن ہوا، ان قبائل کے

لوگ حسبِ روایت پہاڑوں پر چڑھ کر مورچہ زن ہوگئے اور پاک فوج اور قبائل کے درمیان مسلح کشمکش کے ایک دور کا آغاز ہوگیا۔

اس کشمکش میں نواب محمد اکبر خان بگٹی مرحوم جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے ساتھی تھے اور ان کی طرف سے کچھ عرصہ بلوچستان کے گورنر بھی رہے۔ اسی دور میں اپوزیشن کی جماعتوں نے مل کر ''متحدہ جمہوری محاذ'' قائم کیا جس نے حکومت کے خلاف ملک گیر سیاسی مہم کا سلسلہ شروع کیا اور پنجاب کے گورنر جناب غلام مصطفیٰ کھر کی نافذ کردہ دفعہ ۱۴۴ کو ہدف بنا کر لاہور اور ملتان سے سول نافرمانی شروع کر دی۔ اس تحریک میں دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے گرفتاریاں پیش کرنے والوں میں ملک محمد قاسم، سید محمد قسور گردیزی، جناب حمزہ، قاری نور الحق قریشی اور متعدد سرکردہ سیاسی رہنما شامل تھے۔ سیاسی کارکنوں پر لاہور اور ملتان دونوں جگہ سخت تشدد کیا گیا، ملک محمد قاسم مرحوم زخمی ہوئے، میاں محمد طفیل جیسی محترم شخصیت تذلیل کا نشانہ بنی، شیرانوالہ لاہور کے مولوی شیر محمد پر بازاری عورتیں مسلط کی گئیں، اور چودھری ظہور الٰہی مرحوم کو گرفتار کر کے بلوچستان کی مچھ جیل میں ڈال دیا گیا۔

مولانا مفتی محمودؒ اور بلوچستان

ان دنوں میں نے حضرت مولانا مفتی محمودؒ سے دریافت کیا کہ دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ تو ہمارے معمولات میں شامل ہے اور یہ اکثر ہمارے اضلاع میں نافذ ہوتی رہتی ہے، اس پر اس قدر سخت ایکشن لینے کی کیا ضرورت ہے؟ مفتی صاحب مرحوم نے فرمایا کہ دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی دراصل ہم بلوچستان کے عوام کے ساتھ یکجہتی کے اظہار کے لیے کر رہے ہیں اور فوجی آپریشن کا نشانہ بننے والے بلوچوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حکومتی کارروائیوں اور ریاستی تشدد کا ان کی طرح ہم بھی نشانہ ہیں۔ اس طرح ہماری کوشش ہے کہ پنجاب کے عوام اور سیاسی کارکن اس انداز میں قربانیاں دیں تاکہ بلوچ قبائل پر فوج کے اس آپریشن کو پنجاب کے خلاف استعمال نہ کیا جا سکے۔

چودھری ظہور الٰہی مرحوم اور بلوچستان

چودھری ظہور الٰہی مرحوم جب مچھ جیل سے رہا ہوئے تو انہوں نے بھی ہمارے ہاں مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے اسی قسم کے جذبات کا اظہار کیا اور کہا کہ ہم بلوچ عوام کے ساتھ ہیں اور ان کے ساتھ ہم آہنگی کے اظہار کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ میں خود اس جلسہ کے منتظمین میں سے تھا اور چودھری ظہور الٰہی مرحوم نے جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے

بلوچ عوام کی مظلومیت کا جو نقشہ کھینچا اور مچھ جیل میں زیر حراست بلوچوں کی بے بسی کے جو مناظر پیش کیے اس نے جلسہ میں شریک ہر آنکھ کو نم کر دیا تھا۔

ڈپٹی اسپیکر بلوچستان اسمبلی مولانا شمس الدینؒ کی شہادت

بلوچستان میں جمعیت علماء اسلام کے صوبائی امیر اور بلوچستان اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر مولوی سید شمس الدین شہیدؒ کی المناک شہادت کا واقعہ بھی اسی دور کا ہے۔ مولوی سید شمس الدین شہیدؒ کا تعلق ژوب سے تھا، انہوں نے میرے ساتھ مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ سے دورۂ حدیث کیا تھا۔ فراغت کے بعد وطن واپس پہنچے تو الیکشن کا طبل بج چکا تھا، وہ نوجوان تھے اور الیکشن لڑنے کے لیے ۲۵ سال کی عمر کی حد بمشکل پوری کر پائے تھے۔ اپنے علاقے کے نواب کے مقابلے میں وہ صرف اس نیت سے کھڑے ہوئے کہ وہ بلا مقابلہ نہ منتخب ہو جائے۔ انہوں نے سائیکلوں پر انتخابی مہم چلائی اور خلافِ توقع الیکشن جیت گئے۔ انہیں قادیانیوں کے خلاف ژوب میں ایک تحریک کے حوالے سے گرفتار کر کے غائب کر دیا گیا۔ کئی ماہ تک ان کی بازیابی اور تلاش کا سلسلہ جاری رہا حتیٰ کہ مولانا مفتی محمودؒ کو قومی اسمبلی میں یہ کہنا پڑا کہ اگر انہیں مار دیا گیا ہے تو ان کی لاش تو ورثاء کے حوالے کر دی جائے۔ وہ رہا تو ہوئے مگر چند دنوں کے بعد انہیں شہید کر دیا گیا۔

یہ اس دور کی باتیں ہیں جب ہمارا یعنی جمعیت علماء اسلام کے کارکنوں کا نواب محمد اکبر خان بگٹی مرحوم سے پہلا تعارف ہوا بلکہ ان سے واسطہ پڑا۔

بگٹی مرحوم کا جمعیت کے ساتھ رفاقت کا دور

پھر اس کے بعد وہ دور بھی آیا جب جمعیت علماء اسلام نے نواب اکبر خان بگٹی مرحوم کے ساتھ مل کر بلوچستان میں حکومت بنائی۔ جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے بعد ایک الیکشن میں بلوچستان اسمبلی میں نواب محمد اکبر خان بگٹی کی سربراہی میں کولیشن قائم ہوئی اور ان کی قیادت میں صوبائی حکومت بنائی گئی جس میں جمعیت علماء اسلام بھی شامل تھی۔

نواب اکبر خان بگٹی کا تعارف ایک سیکولر سیاستدان اور قوم پرست رہنما کا تھا، وہ سیاست میں مذہب کی چھاپ کو پسند نہیں کرتے تھے اور خالصتاً قوم پرستانہ سیاست کے قائل تھے۔ ان کے اس سیاسی پس منظر کے پیشِ نظر مجھے اس کولیشن پر تعجب ہوا۔ جمعیت علماء اسلام اس وقت فضل الرحمٰن گروپ اور درخواستی گروپ میں منقسم تھی۔ میں درخواستی گروپ کے ذمہ دار حضرات میں شامل تھا، اس کے باوجود ایک موقع پر مولانا فضل الرحمٰن سے ملاقات کے دوران میں نے ان سے یہ دریافت کرنا ضروری سمجھا کہ

نواب محمد اکبر خان بگٹی مرحوم کے ساتھ بلکہ ان کی قیادت میں جمعیت علماء اسلام کی کولیشن کے اسباب کیا ہیں؟ مولانا فضل الرحمٰن نے اس کا جو جواب دیا وہ اس موضوع گفتگو سے تعلق نہیں رکھتا اس لیے اس کا ذکر یہاں نہیں کر رہا، البتہ یہ بات بتانا چاہ رہا ہوں کہ جمعیت علماء اسلام اور بگٹی مرحوم کی یہ کولیشن وزارت کئی برس تک چلتی رہی۔

بگٹی مرحوم اور بلوچ قومیت

نواب اکبر خان بگٹی ایک جہاندیدہ اور صاحبِ مطالعہ سیاستدان تھے، معاملات کو سمجھتے تھے، اور موقع محل کے مطابق مشکل ترین حالات میں بھی راستہ نکالنے کے فن سے واقف تھے۔ لیکن ان کی سوچ اور سیاسی فکر بلوچ قومیت تک محدود رہی جس کی وجہ سے وہ قومی سیاست میں اپنی صحیح جگہ نہ پا سکے۔ ورنہ ان کے بارے میں میرا تاثر یہ تھا کہ اگر وہ بلوچ قوم پرستی کے دائرے سے نکل کر سیاست کے قومی دھارے میں وسیع ذہن کے ساتھ آتے تو قومی سطح کے سیاستدانوں کی صف میں نمایاں جگہ پا سکتے تھے۔ بلکہ مختلف علاقائی قوم پرستانہ تحریکوں کے سنگم کے طور پر ان تحریکوں کو وفاقی لیڈر شپ بھی فراہم کر سکتے تھے۔

بگٹی مرحوم کا قتل: ظلم اور ناعاقبت اندیشی

نواب محمد اکبر خان بگٹی کی سوچ سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور ہمیں ہمیشہ اختلاف رہا ہے لیکن ان کے قتل اور بلوچ قبائل کے خلاف اس طرح کے فوجی ایکشن کی کسی طرح حمایت نہیں کی جا سکتی۔ یہ جو کچھ ہوا ہے اسے صریحاً ظلم اور ناعاقبت اندیشی ہی قرار دیا جا سکتا ہے، اور اس کے خلاف اپوزیشن نے یکم ستمبر کو ہڑتال کی جو کال دی ہے وہ وقت کا ایک اہم تقاضا ہے۔ بھٹو حکومت کے دور میں بلوچستان پر ہونے والے فوجی ایکشن کے خلاف پنجاب سمیت ملک بھر کے سیاسی کارکنوں نے جس شدید ردعمل کا اظہار کیا تھا اسے پھر زندہ کرنے کی ضرورت ہے اور اس میں مولانا مفتی محمودؒ اور چودھری ظہور الٰہی مرحوم کے بیٹوں کو نمایاں کردار ادا کرنا چاہیے کہ ان دو عظیم رہنماؤں کا سیاسی ورثہ یہی ہے۔ اس سلسلہ میں اطمینان کی ایک بات ہے یہ کہ آج اس احتجاج میں ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی پارٹی بھی شریک ہے اور بلوچ عوام کے جائز حقوق کی حمایت کر رہی ہے۔ بلوچستان آج پھر فوجی آپریشن کی زد میں ہے، بلوچ عوام کو پھر کارنر کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور بلوچستان ایک بار پھر پنجاب کی طرف دیکھ رہا ہے۔ امید ہے کہ پنجاب اپنا فرض بخوبی نبھائے گا۔

خطیبِ اسلام مولانا محمد اجمل خانؒ اور ماضی کی چند یادیں

(روزنامہ پاکستان، لاہور ۔۔۵ جون ۲۰۰۲ء)

خطیبِ اسلام حضرت مولانا محمد اجمل خانؒ بھی ہم سے رخصت ہو گئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ وہ کافی عرصہ سے بیمار تھے، شوگر کے ساتھ ساتھ دل اور دمہ کی تکلیف بھی تھی اور کم و بیش ۷۰ برس عمر پا کر وہ دارِ فانی سے رحلت کر گئے۔ ان کا تعلق ہزارہ کے علاقہ ہری پور سے تھا اور انہوں نے اس دور میں لاہور میں خطابت کا آغاز کیا جب شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ حیات تھے اور مولانا اجمل خانؒ کو ان کی بھرپور شفقت اور رہنمائی میسر تھی۔ مولانا محمد اجمل خانؒ کا شمار اپنے دور کے بڑے خطیبوں میں ہوتا تھا اور انہیں خطیبِ اسلام کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔

’’خطیبِ اسلام‘‘ کا لقب

’’خطیبِ اسلام‘‘ کا لقب سب سے پہلے حضرت ثابت بن قیس انصاری رضی اللہ عنہ کے لیے استعمال ہوا تھا جو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نمائندہ خطیب کی حیثیت سے مختلف محافل میں شریک ہوا کرتے تھے۔ انہیں خطیب الانصار اور خطیبِ رسولِ کریمؐ کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا تھا اور سب سے پہلے انہی کو خطیب الاسلام کا لقب ملا۔ اس کے بعد ہر دور میں متعدد بڑے بڑے خطباء کو اس لقب سے یاد کیا جاتا رہا جبکہ گزشتہ نصف صدی کے دوران پاکستان میں اس لقب کے ساتھ سب سے زیادہ معروف ہونے والے بزرگ مولانا محمد اجمل خانؒ تھے۔

مولانا محمد اجمل خانؒ کی خطابت میں جوش و جذبہ کے ساتھ ساتھ وافر معلومات اور علمی نکات بھی ہوتے تھے۔ مسلم شریف کی روایت کے مطابق حضرت جابر بن عبد اللہؓ نے جناب نبی اکرمؐ کی خطابت کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ رسول اللہؐ جب خطاب فرماتے تو آپؐ کی آواز بلند ہو جاتی تھی، سخت غصے کی کیفیت میں نظر آتے اور آنکھیں سرخ ہو جایا کرتی تھیں۔ مولانا محمد اجمل خانؒ کی خطابت میں بھی اکثر اوقات اسی کیفیت کی جھلک نظر آیا کرتی تھی۔ جوانی کے دور میں پھیپھڑوں کے پورے زور کے ساتھ تین تین چار چار گھنٹے مسلسل بولتے چلے جاتے تھے۔ حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ نے ایک بار میرے سامنے مولانا محمد اجمل خانؒ کو خبردار کیا کہ اتنے زور سے مت بولا کرو اور اتنی لمبی تقریر نہ کیا کرو، بڑھاپے میں تنگ ہو گے اور پھیپھڑے جواب دے جائیں گے۔ مگر جوانی کے جوش اور حق گوئی کے جذبے میں

مولانا محمد اجمل خانؒ اس خطرے کو پوری طرح محسوس نہ کر سکے اور ان کا اندازِ خطابت جوش و جذبے کی پوری جولانیوں کے ساتھ مسلسل جاری رہا۔

مولانا محمد اجملؒ ساری زندگی جمعیۃ علمائے اسلام میں رہے، جمعیۃ کے مختلف عہدوں پر فائز رہے، اور وفات کے وقت انہیں جمعیۃ کے سرپرست اعلیٰ اور بزرگ رہنما کا مقام حاصل تھا۔ حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے بعد انہوں نے حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ، حضرت مولانا مفتی محمودؒ، اور حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ کی رفاقت میں سالہا سال تک کام کیا اور دینی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ انہوں نے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں اور مختلف اضلاع میں داخلہ کی پابندیوں اور زبان بندیوں کے ایک طویل سلسلہ کا ہدف بھی رہے۔ عام اجتماعات میں ان کی تقاریر کم و بیش یکساں نوعیت کی ہوتی تھیں لیکن جب انہیں کسی متعیّن موضوع پر بولنے کے لیے کہا جاتا یا علماء اور کارکنوں کی کوئی خصوصی نشست ہوتی تو ان کا انداز مختلف ہو جاتا تھا اور وہ معلومات کا ایسا انبار لگا دیتے کہ سننے والوں کے لیے ان معلومات کو سمیٹنا مشکل ہو جاتا۔

مولانا مرحوم کے نمایاں اوصاف

مولانا محمد اجمل خانؒ کے ساتھ میرا تعلق کم و بیش تیس برس سے تھا۔ وہ میرے مشفق اور دعاگو بزرگ تھے کہ ہمیشہ شفقت اور دعاؤں سے نوازتے۔ وہ جماعتی کاموں میں سرپرستی فرماتے اور مجھے ان کے ساتھ ایک کارکن کے طور پر کوئی خدمت سرانجام دے کر دلی خوشی میسر آتی۔ مجھے ان کی تین باتوں نے سب سے زیادہ متاثر کیا:

۱. ایک ان کا مطالعہ اور وسعتِ معلومات کہ وہ مسلسل اور بہت زیادہ مطالعہ کرنے والے خطیب تھے۔ ان کے عمومی خطابات سننے والوں کو اس کا پوری طرح اندازہ نہیں ہو سکتا لیکن خصوصی مجالس اور علمی نشستوں میں ان کے بیانات سننے والے جانتے ہیں کہ مطالعہ، معلومات اور علمی نکات میں انہیں اپنے معاصر خطباء پر فوقیت حاصل تھی۔ ہمارے دور میں عوامی خطباء میں مطالعہ و تحقیق اور صحیح معلومات تک رسائی کا ذوق بہت کم ہے جو بدقسمتی سے مزید کم ہوتا جا رہا ہے۔ مگر حضرت مولانا محمد اجمل خانؒ کا ذوق بہت بلند تھا اور میں اس حوالے سے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ، خطیب پاکستان حضرت مولانا احتشام الحق تھانویؒ، اور خطیبِ پاکستان حضرت مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی کے ساتھ اسی صف میں حضرت مولانا محمد اجمل خانؒ کو بھی شمار کرتا ہوں۔

۲. دوسری بات ان کی نیکی اور تقویٰ تھا۔ وہ مزاج کی بعض نزاکتوں کے باوجود قناعت پسند بزرگ تھے۔ ان کے پیشِ نظر ہمیشہ دین و جماعتی ترجیحات رہیں اور انہوں نے خطابت کے اس اعلیٰ مقام کو کبھی دنیوی مفادات کے حصول کا ذریعہ نہیں بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ کم و بیش چار عشروں تک خطابت کی دنیا میں حکمرانی کرنے کے بعد بھی ان کا جنازہ مسجد کے مکان سے اٹھا۔ وہ شب زندہ دار تھے اور صرف اسٹیج کے نہیں بلکہ مصلیٰ اور ذکر و فکر کی دنیا کے بھی بزرگ تھے۔

۳. تیسری بات ان کی حمیت و غیرت کی ہے کہ وہ دینی شعائر اور اپنے بزرگوں کے حوالے سے سخت غیور تھے۔ دینی شعائر اور اپنے بزرگوں کی ادنیٰ سی بے حرمتی بھی برداشت نہیں کر پاتے تھے اور ایسے وقت میں ان کا غصہ اور جوش قابلِ دید ہوتا تھا۔

بھٹو دور میں مولانا مرحوم اور راقم الحروف کی گرفتاری

بھٹو حکومت کے خلاف ''پاکستان قومی اتحاد'' کی تحریک کا دور تھا، لاہور میں مارشل لاء نافذ تھا اور پاکستان قومی اتحاد کی مرکزی جنرل کونسل پی این اے ہاؤس میں اپنا اجلاس منعقد کرنے پر مارشل لاء کی خلاف ورزی کے الزام میں گرفتار ہو گئی تھی۔ ان میں میاں محمود علی قصوری مرحوم، اقبال احمد خان مرحوم، ملک محمد اکبر ساقی مرحوم، جناب محمد اسلم سلیمی، فرید پراچہ، اور پچاس سے زائد دیگر رہنماؤں کے ساتھ مولانا اجمل خان مرحوم اور راقم الحروف بھی شامل تھے۔ کیمپ جیل لاہور میں آرمی ایکٹ کے تحت کورٹ قائم ہوئی جس میں کرنل نصیر احمد ہمارے مقدمہ کی سماعت کرتے تھے۔

مارشل لاء عدالت میں گستاخئ قرآن کریم پر ردعمل

مقدمہ کی سماعت کے دوران ایک پولیس افسر نے گواہی دیتے ہوئے تھانہ کے روزنامچہ کے بارے میں یہ جملہ کہہ دیا کہ ہمارے لیے تو یہ قرآن کریم کی طرح ہے۔ یہ جملہ سنتے ہی مولانا محمد اجمل خان بے تابی سے اپنی نشست پر کھڑے ہو گئے اور عدالت سے مخاطب ہو کر کہا کہ اس پولیس افسر نے قرآن کریم کی توہین کی ہے اس کو روکا جائے اور اس کے خلاف کاروائی کی جائے۔ کرنل نصیر احمد نے بہت توجہ دلانے کی کوشش کی کہ آپ عدالت میں کھڑے ہیں مگر مولانا محمد اجمل خان کے جوش و جذبہ میں کوئی کمی نہیں آرہی تھی۔ وہ بدستور کھڑے رہے اور پکارتے رہے کہ اس پولیس افسر کے خلاف کاروائی کے بغیر وہ نہیں بیٹھیں گے اور عدالت کا معاملہ آگے نہیں چلے گا۔

تھوڑی دیر میں عدالت جلسہ گاہ کی صورت اختیار کر چکی تھی، مولانا محمد اجمل خانؒ نے عظمتِ قرآن کریم پر چند جملے اس انداز سے کہے کہ عدالت میں کہرام مچ گیا، رونے اور سسکیوں کی آوازیں بلند ہونے

لگیں، کچھ نوجوانوں نے جذبات سے مغلوب ہو کر دیواروں سے سر ٹکرانا شروع کر دیے جس پر کرنل موصوف کو مذکورہ افسر کے خلاف کاروائی کے وعدے کے ساتھ عدالت فوری طور پر برخاست کرنا پڑی کہ اس کے بعد عدالتی کاروائی آگے نہ چل سکی۔ اس کے ایک دو روز کے بعد لاہور ہائی کورٹ نے مارشل لاء کو خلافِ دستور قرار دے کر ہم سب کی رہائی کا حکم دے دیا تھا۔

مولانا مفتی محمودؒ کا دفاع

دوسرا واقعہ بھی پاکستان قومی اتحاد کے حوالہ سے ہے۔ قومی اتحاد کی جنرل کونسل میں حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے ساتھ اکثر مولانا عبید اللہ انورؒ اور حضرت مولانا محمد اجمل خانؒ جایا کرتے تھے، اور مولانا مفتی محمودؒ قومی اتحاد کے سربراہ تھے۔ ایک اجلاس میں بزرگ مسلم لیگی رہنما خواجہ محمد صفدر مرحوم نے مفتی صاحبؒ کے کسی بیان پر اعتراض کیا اور کہا کہ پالیسی سے متعلقہ معاملات پر بیان دینے سے پہلے مفتی صاحبؒ کو ہمیں یعنی پاکستان قومی اتحاد میں شریک دیگر جماعتوں کو اعتماد میں لینا چاہیے۔ خواجہ صاحب مرحوم کا موقف اصولاً درست تھا مگر لہجہ کچھ تلخ ہو گیا۔ خواجہ صاحب مرحوم خود بھی مسلم لیگ کے سینئر رہنماؤں میں شمار ہوتے تھے اور مفتی صاحب کے معاصرین میں سے تھے اس لیے انہوں نے شاید اسے اپنا حق سمجھتے ہوئے لہجے میں تلخی کا عنصر کچھ زیادہ ہی شامل کر لیا جسے مولانا محمد اجمل خانؒ برداشت نہ کر سکے۔ وہ فوراً کھڑے ہو گئے اور خواجہ صاحب سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ صرف ایک سیاسی رہنما سے بات نہیں کر رہے بلکہ جس سے مخاطب ہیں وہ بزرگ عالمِ دین، بلند پایہ مفتی، اور وقت کے محدث بھی ہیں اس لیے محتاط ہو کر گفتگو کریں۔

خواجہ صاحب نے بہت صفائی پیش کرنا چاہی کہ ایک سیاسی لیڈر کی حیثیت سے مفتی صاحب کے بیان کا نوٹس لینا اور تنقید کرنا ہمارا حق ہے، مگر مولانا محمد اجمل خان نے ان کی ایک نہ چلنے دی اور آخر خواجہ صاحب کو معذرت کرنا پڑی۔ بعد میں خواجہ محمد صفدر مرحوم نے راقم الحروف سے ایک ملاقات میں اس بات کا شکوہ کیا اور کہا کہ ایک عالمِ دین اور مفتی کی حیثیت سے مولانا مفتی محمودؒ کا میں بھی احترام کرتا ہوں لیکن سیاست میں یہ باتیں نہیں چلتیں اور ایک دوسرے کی رائے سے اختلاف اور تنقید کا ہر ایک کو حق حاصل ہے۔ خواجہ صاحب کا مقصد یہ تھا کہ میں اس سلسلے میں مولانا محمد اجمل خانؒ سے بات کروں اور ان کے سامنے اس شکوے کا تذکرہ کروں مگر میں نے عرض کیا کہ مولانا محمد اجمل خانؒ سے اس معاملے میں بات کرنے سے بے بس ہوں اس لیے ان سے عرض کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

مولانا محمد اجمل خانؒ اپنے دور کے ایک نیک دل، حق گو، اور غیور عالمِ دین تھے جنہوں نے زندگی بھر حق اور اہلِ حق کا ساتھ دیا۔ اب وہ اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوگئے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازے، اور ان کے پسماندگان اور متوسلین بالخصوص ان کے جانشین مولانا محمد امجد خان کو ان کی دینی جدوجہد اور جذبہ وحمیت کی روایات کو زندہ رکھنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

الحاج سید امین گیلانیؒ کی وفات اور ماضی کی چند یادیں

(روزنامہ اسلام، لاہور ـــ ۷ اگست ۲۰۰۵ء)

جنرل محمد ایوب خان مرحوم کا دور

......الحاج سید امین گیلانیؒ کو میں نے سب سے پہلے اس دور میں دیکھا جب فیلڈ مارشل صدر ایوب خان مرحوم کے دورِ صدارت کا عروج تھا۔ صدر ایوب خان کا ایجنڈا بھی یہی تھا کہ پاکستان کے نام سے اسلام کا لفظ مٹ جائے اور اس وطنِ عزیز کی بین الاقوامی شناخت اسلام کے حوالے سے نہ ہو۔ چنانچہ ۱۹۶۲ء میں انہوں نے ملک کو نیا دستور دیا تو اس میں ملک کا نام ''عوامی جمہوریہ پاکستان'' تھا اور اسلام کا نام غائب تھا۔ اس پر زبردست عوامی احتجاج ہوا اور ہمارے ایک شاعر کا یہ شعر ملک بھر کے جلسوں میں گونجا تھا:

ملک سے نام اسلام کا غائب، مرکز ہے اسلام آباد
پاک حکمران زندہ باد، پاک حکمران زندہ باد

عائلی قوانین اور تحفظِ ختم نبوت ملک کے دینی اجتماعات کے اہم عنوانات ہوتے تھے۔ قادیانیوں کو کسی بیان یا خطاب میں کافر کہنے پر مقدمہ درج ہو جایا کرتا تھا اور گرفتاری ہوتی تھی۔ آغا شورش کاشمیری کے ہفت روزہ ''چٹان'' کا ڈیکلیریشن اور چٹان پریس قادیانیوں کے بارے میں ایک شذرہ لکھنے پر ضبط ہو گئے تھے۔ اس فضا میں الحاج سید امین گیلانی، جانباز مرزا، اور سائیں حیات پسروری جن جذبات کے ساتھ عوامی جلسوں میں عقیدہ ختم نبوت کے ساتھ اپنی وفاداری کا اعلان کرتے اور قادیانیوں کے کفر کو بے نقاب کرتے، اسے دیکھ کر بوڑھوں کے جذبات میں بھی حرارت لوٹ آیا کرتی تھی۔ الحاج سید امین گیلانی کو میں نے پہلی بار شیرانوالہ باغ گوجرانوالہ کے جلسہ عام میں سنا۔ یہ میرا طالب علمی کا دور تھا اور کسی باغی شاعر کو پورے جوبن میں سننے کا پہلا تجربہ تھا۔ وہ منظر آج تک نگاہوں کے سامنے ہے اور اس باغیانہ کلام کو سن کر دل میں جو جذبات ابھرے تھے ان کی حرارت آج تک کام آ رہی ہے۔

ایوبی آمریت کے خلاف ملک میں تحریک اٹھی اور جمعیت علماء اسلام پاکستان نے بھی اس میں متحرک کردار ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔ جمعۃ الوداع کے موقع پر حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ نے جمعہ کی نماز شیرانوالہ گیٹ لاہور سے باہر باغ میں پڑھائی اور جمعہ کے اجتماع کے بعد اجتماعی جلوس کا اعلان کیا۔ پولیس نے

جلوس کو روکنے کے لیے شدید لاٹھی چارج کیا اور بہت سے لوگوں کو گرفتار کر لیا۔ اس وحشیانہ لاٹھی چارج میں مولانا عبید اللہ انورؒ شدید زخمی ہوئے اور اسی میں ان کی ریڑھ کی ہڈی مضروب ہوئی جس کے باعث انہیں باقی زندگی مستقل علالت اور خانہ نشینی میں بسر کرنی پڑی۔ جمعیت علماء اسلام نے اگلے جمعہ کو اسی جگہ جمعہ پڑھنے اور جمعہ کے بعد احتجاجی جلوس نکالنے کا اعلان کر دیا۔ یہ عجیب منظر تھا کہ حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ، مولانا عبد اللہ درخواستیؒ، مولانا مفتی محمودؒ، اور مولانا غلام غوث ہزارویؒ سمیت جمعیت کے بیشتر اکابر موجود تھے۔ وہ منظر اہلِ لاہور کو ضرور یاد ہوگا مگر اس میں الحاج سید امین گیلانی نے جو قیامت بپا کی، اس کی یاد میں زندگی بھر نہیں بھلا سکوں گا۔ انہوں نے اپنی جس نظم سے لوگوں کے جذبات کو آگ لگائی اس کا ایک بند یہ ہے:

نورِ دیدہ وہ احمد علی کا
خود ولی اور بیٹا ولی کا
ماریں ظالم اسے تازیانہ
اٹھ بھی اٹھ قوم کے نوجوانا
بیٹھنے کا نہیں ہے زمانہ

ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کا دور

۱۹۷۴ء کی تحریکِ ختمِ نبوت کا دور تھا اور قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کی عوامی تحریک زوروں پر تھی۔ پارلیمنٹ کے اندر حضرت مولانا مفتی محمودؒ، مولانا شاہ احمد نورانیؒ، مولانا غلام غوث ہزارویؒ، اور دیگر اکابر علماء کرام تحریکِ ختمِ نبوت کی ترجمانی کر رہے تھے۔ کل جماعتی مجلسِ عمل تحفظِ ختمِ نبوت نے حکومت کو سات ستمبر کا الٹی میٹم دے رکھا تھا۔ مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ کی قیادت میں ملک بھر میں عوامی اجتماعات کا سلسلہ جاری تھا اور مجلسِ عمل کے اس الٹی میٹم کو الحاج سید امین گیلانی نے ترانے کی جو زبان دے دی تھی وہ ہر کارکن کی زبان پر تھی جس کا ایک شعر یہ تھا:

بیت گیا جو یونہی سات ستمبر بھی
پیش کریں گے ہم سینے بھی خنجر بھی

۱۹۷۷ء میں پاکستان قومی اتحاد کی تحریکِ انتخابات میں بھٹو حکومت کی دھاندلیوں کے خلاف تھی جس نے پاکستان قومی اتحاد کے انتخابی منشور اور عوامی جذبات کے حوالے سے ”تحریکِ نظامِ مصطفیٰ ﷺ“ کا عنوان اختیار کر لیا تھا۔ اور ملک بھر میں عوام نے جس ولولہ اور جوش و خروش کے ساتھ اس تحریک میں قربانیاں

دیں وہ اسلام کے ساتھ اس ملک کے عوام کی عقیدت اور جذبات کا اظہار تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم اس تحریک کا سب سے بڑا ہدف تھے اور ان سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کیا جا رہا تھا۔ اس کے جواب میں انہوں نے ایک جملہ کہا تھا کہ

"میں تو کمزور ہوں مگر میری کرسی بہت مضبوط ہے۔"

مگر چند دنوں کے بعد انہیں اس کرسی سے رات کے اندھیرے میں محروم ہونا پڑا تو اس پر الحاج سید امین گیلانی نے یہ کہہ کر بہت خوبصورت تبصرہ کیا کہ:

کٹی جو پتنگ کچی ڈور نکلی
کرسی بہت کمزور نکلی

کرسی کا یہ مرثیہ انہوں نے جس انداز میں پیش کیا، اس کی یاد بہت دیر تک لوگوں کے ذہنوں میں تازہ رہی اور یہ مصرعہ نوجوانوں کی زبانوں پر کافی عرصہ تک چلتا رہا۔

الحاج سید امین گیلانی نے اخباری رپورٹ کے مطابق ۸۳ سال کی عمر پائی مگر بڑھاپے میں بھی ان کے جذبات جوان تھے۔ کچھ عرصہ قبل پاکستان شریعت کونسل کے مرکزی سیکرٹری اطلاعات مولانا قاری جمیل الرحمٰن اختر نے باغبانپورہ لاہور میں اپنی رہائش گاہ پر شاہ جی کے ساتھ ایک شام منائی۔ بہت سے علماء کرام اور دینی کارکن جمع تھے، میں بھی موجود تھا۔ الحاج سید امین گیلانی اور ان کے فرزند و جانشین سید سلمان گیلانی نے کلام سنایا اور حاضرین کے دلوں کو گرما دیا۔ شاہ جی مرحوم نے جس انداز سے کلام پیش کیا اس سے قطعی اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ ان کی عمر کی سوئی ۸۰ کے ہندسے کو چھو رہی ہے۔

الحاج سید امین گیلانی آج ہم سے رخصت ہو گئے ہیں مگر ان کے فرزند و جانشین سید سلمان گیلانی ان کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے ہمارے درمیان موجود ہیں اور اپنے عظیم باپ کی ہو بہو تصویر ہیں۔ میں گیلانی خاندان اور شاہ جی کے عقیدت مندوں کے ساتھ اس غم میں شریک ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت الحاج سید امین گیلانی کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کریں اور سید سلمان گیلانی اور ان کے خاندان کو اپنے عظیم باپ کی روایات زندہ رکھنے کی توفیق سے نوازیں، آمین۔

حضرت مولانا نور محمد شہیدؒ اور ماضی کی چند یادیں

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ —اکتوبر ۲۰۱۰ء)

حضرت مولانا نور محمد شہیدؒ سے عام طور پر بہت کم لوگ واقف ہیں، میں نے پہلی مرتبہ انہیں ۱۹۷۶ء میں دیکھا جب میں ایک طالب علم تھا۔

فلسطین کے لیے دس ہزار کے لشکر کا وعدہ

اس وقت اسرائیل نے بیت المقدس پر قبضہ کیا ہوا تھا، مفتی محمود صاحبؒ نے ایک جلسے میں فرمایا کہ اگر حکومت ہمیں اجازت دے تو ہم اپنے خرچ پر وہاں جہاد کے لیے جائیں گے۔ مفتی صاحبؒ کے بعد ایک نوجوان کھڑا ہوا اور بڑے جوشیلے انداز میں اس نے اس بات کا اعلان کیا کہ اگر حکومت اجازت دیتی ہے تو میں قبائل کی طرف سے دس ہزار کا لشکر فراہم کروں گا۔ میں نے بڑے تعجب سے اس کی طرف دیکھا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ بعد میں مفتی صاحبؒ سے میں نے پوچھا کہ حضرت یہ نوجوان کون ہیں اور اتنا بڑا دعوی کیسے کر رہے ہیں؟ مفتی صاحبؒ نے فرمایا، یہ دے دے گا، یہ وزیروں کا لیڈر ہے۔

بھٹو صاحب کا استقبال جمعیت کے پرچموں کے ساتھ

مولانا نور محمدؒ نے وانا میں جمعیت کی بنیاد رکھی۔ قبائل کا علاقہ دینی علاقہ ہے، بھٹو صاحب مرحوم نے اپنے دورِ اقتدار میں ایک مرتبہ قبائل کا دورہ کیا۔ وہاں کے پولیٹیکل ایجنٹ نے مولانا مرحوم سے ملاقات کی کہ بھٹو صاحب کا استقبال کیسے کیا جائے، انہوں نے فرمایا کہ میں بے مثال استقبال کروں گا لیکن کروں گا جمعیت کے پلیٹ فارم سے، جبکہ وہ لوگ چاہتے تھے کہ پیپلز پارٹی کے جھنڈے تلے استقبال ہو۔ جب بھٹو صاحب ائیر پورٹ پر اترے تو ہر طرف جمعیت کے ہزاروں پرچم لہرا رہے تھے۔ اس کی مولانا کو پھر سزا بھی دی گئی، انہیں ایک مقدمے میں الجھایا گیا، وانا بازار کو بلڈوز کر دیا گیا اور مولانا سات آٹھ سال تک جیل میں رہے۔

جہادِ افغانستان پر تصنیف

مولانا نور محمد مرحوم نے جہادِ افغانستان میں بہت سرگرم کردار ادا کیا اور سب سے پہلے جو کتاب جہادِ افغانستان کی شرعی حیثیت کو واضح کرنے کے لیے لکھی گئی وہ مولانا نے ہی لکھی تھی۔ میں بھی اس وقت ایسی

کتاب کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ ہمارا جب بھی ان علاقوں کا سفر ہوتا تو ہم مولانا کے پاس ٹھہرتے اور ان سے استفادہ کرتے۔ ایک مرتبہ میں افغانستان جا رہا تھا تو راستے میں مولانا کے پاس ٹھہرا۔ انہوں نے فرمایا کہ میں نے جہادِ افغانستان پر ایک کتاب لکھی ہے جو چھپنے کے قریب ہے، انہوں نے اس کا مسودہ مجھے بھی دکھایا۔ کتاب میں نے اسی رات ساری دیکھی اور صبح ان سے عرض کی کہ میں نے ساری کتاب دیکھ لی ہے۔ پھر میں نے پوچھا کہ آپ نے یہ کتاب صرف پٹھانوں کے لیے لکھی ہے یا سب کے لیے؟ انہوں نے کہا کہ سب کے لیے ہے۔ میں نے کہا کہ اس کی زبان تو صرف پٹھانوں والی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ فرماتی ہے وغیرہ، اس کی زبان پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ فرمانے لگے کہ نظر ثانی کون کرے گا؟ میں نے کہا کہ میں کروں گا۔ میں وہ کتاب ساتھ لے آیا اور اس کی زبان کی اصلاح کی اور پھر وہ کتاب چھپی۔ اس طرح ان کی برکت سے مجھے یہ شرف بھی حاصل ہوا کہ جہادِ افغانستان پر لکھی جانے والی سب سے پہلی کتاب پر نظر ثانی کا موقع ملا، اس کتاب پر مقدمہ بھی میں نے ہی لکھا تھا۔

مولانا کے پاس علم بھی تھا، وجاہت بھی تھی اور مقام و مرتبہ بھی تھا۔ آپ قبائل کے لیڈر تھے، اگر کسی ایک شخصیت کا نام پوچھا جائے کہ جس پر تمام وزیر قبائل کو اکٹھا کیا جا سکتا تھا تو وہ نام مولانا نور محمدؒ ہی کا تھا۔ گزشتہ دنوں وہ ایک خودکش حملے میں شہید کر دیے گئے۔ نماز کی ادائیگی کے بعد مسجد سے باہر تشریف لائے تو ایک نوجوان ان سے آ کر گلے ملا اور گلے ملتے ہی اس نے اپنے آپ کو بم سے اڑا دیا اور مولانا سمیت ۲۳ افراد شہید ہو گئے۔ ان کی موت سے دیگر نقصانات تو ایک طرف، ایک بہت بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ اب شاید کوئی ایسی شخصیت نہ ملے جس پر سب قبائل کو جمع کیا جا سکے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اعلیٰ علیین میں ارفع و اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین یا رب العالمین۔

پروفیسر غفور احمد مرحوم اور ماضی کی چند یادیں

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ — فروری ۲۰۱۳ء)

پروفیسر غفور احمد اللہ کو پیارے ہو گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اخبارات میں ان کی وفات کی خبر پڑھ کر ماضی کے بہت سے اوراق ذہن کی یادداشت میں کھلتے چلے گئے۔

انتخابات ۱۹۷۰ء میں جماعتِ اسلامی کے رکن قومی اسمبلی

ان کا نام پہلی بار ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد سنا جب وہ کراچی سے جماعتِ اسلامی کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ میرا تعلق جمعیت علماء اسلام پاکستان سے تھا اور اس دور میں جمعیت علماء اسلام اور جماعتِ اسلامی میں مخاصمت دینی اور سیاسی دونوں محاذوں پر عروج پر تھی۔ مجھے مولانا عبد اللہ درخواستیؒ، مولانا عبید اللہ انورؒ، مولانا مفتی محمودؒ اور مولانا غلام غوث ہزارویؒ کے قریبی کارکنوں میں شمار ہونے کا اعزاز حاصل تھا، اس لیے جماعتِ اسلامی کے منتخب ارکان اسمبلی کے حوالے سے کسی مثبت سوچ کا اس وقت کوئی امکان نہیں تھا، لیکن خدا گواہ ہے کہ جوں جوں پروفیسر غفور احمد پارلیمانی اور سیاسی محاذ پر آگے بڑھتے گئے، قلب و ذہن کے دریچے ان کے لیے کھلتے چلے گئے اور ان کی شرافت و متانت اور حوصلہ و تدبر دیکھ کر ان کے احترام کی طرف بتدریج مائل ہوتا رہا۔

دستور ساز اسمبلی میں کردار

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد باقی ماندہ پاکستان میں دستوری طور پر سب سے بڑا اور پہلا مرحلہ دستور سازی کا تھا۔ ۱۹۷۰ء میں منتخب ہونے والی قومی اسمبلی دراصل دستور سازی کے عنوان پر منتخب ہوئی تھی اور دستور سازی کا مرحلہ طے ہو جانے کے بعد اسے قانون ساز اسمبلی کی حیثیت اختیار کر لینا تھی۔ اس دستور ساز اسمبلی میں اپوزیشن عددی لحاظ سے کچھ قابلِ ذکر نہیں تھی، لیکن شخصیات کے حوالے سے اتنی مضبوط اپوزیشن شاید ہی قومی اسمبلی کو کبھی میسر آئی ہو۔ خان عبد الولی خانؒ، مولانا مفتی محمودؒ، مولانا شاہ احمد نورانیؒ، مولانا ظفر احمد انصاریؒ، مولانا عبد الحقؒ، چودھری ظہور الٰہی اور پروفیسر غفور احمد جیسی بھاری بھرکم شخصیات اس اپوزیشن کی قیادت کر رہی تھیں اور اسلامی سوشلزم کے نعرے پر الیکشن جیتنے والی پاکستان پیپلز پارٹی کی اکثریت والے ایوان میں دستور کو واضح اسلامی بنیادوں پر استوار کرنے اور اسلام کو ملک کا سرکاری مذہب قرار دلوانے کے ساتھ ساتھ پارلیمنٹ کو قانون سازی میں قرآن و سنت کے دائرے میں پابند بنانا

۱۹۷۳ء کے دستور کی وہ نمایاں خصوصیات ہیں جن پر آج بھی اس ایوان کو فخر ہونا چاہیے اور اس مقصد کے لیے دستور سازی کے ہوم ورک میں اپوزیشن کی طرف سے مولانا ظفر احمد انصاریؒ اور پروفیسر غفور احمد کی شبانہ روز محنت بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔

قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کی جدوجہد

دستور کی منظوری اور نفاذ کے ساتھ ہی قومی اسمبلی کے سامنے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مسئلہ پیش آگیا۔ اس مسئلے کی اپنی ایک طویل تاریخ ہے جس کا ذکر بات کو طویل کر دے گا، لیکن ہوا یہ کہ قادیانیوں کی اپنی ایک حماقت کی وجہ سے کہ چناب نگر (ربوہ) کے ریلوے سٹیشن پر نشتر میڈیکل کالج ملتان کے سٹوڈنٹس پر قادیانی نوجوانوں نے حملہ کر دیا، ملک بھر میں اس پر احتجاجی سلسلہ شروع ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس احتجاج نے بھرپور عوامی تحریک کی شکل اختیار کر لی اور قومی اسمبلی کو اس پر قانون سازی کرنا پڑی۔ مسئلہ ختم نبوت پر قانون سازی کے اس مرحلے میں بھی پروفیسر غفور احمد نے سرگرم حصہ لیا۔ پروفیسر صاحب کا مزاج عام طور پر ذہن سازی اور لابنگ کے ذریعے اپنی بات کو مؤثر بنانے کا ہوتا تھا اور وہ اس میں ہمیشہ کامیاب رہتے تھے۔

تحریکِ نظامِ مصطفیٰؐ میں حصہ

مجھے ان کے ساتھ قومی اتحاد میں ۱۹۷۷ء کے الیکشن اور تحریکِ نظامِ مصطفیٰؐ کے دوران کام کرنے کا موقع ملا۔ پاکستان قومی اتحاد کے صدر مولانا مفتی محمودؒ تھے اور سیکرٹری جنرل چودھری رفیق احمد باجوہ مرحوم چنے گئے جن کا تعلق جمعیۃ العلماء پاکستان سے تھا، جبکہ پنجاب میں قومی اتحاد کے صدر محترم حمزہ تھے اور سیکرٹری جنرل جماعتِ اسلامی کے رہنما پیر محمد اشرف تھے۔ بعد میں ایک مرحلے میں رفیق احمد باجوہ اور پیر محمد اشرف دونوں ان مناصب سے کسی وجہ سے الگ ہو گئے تو مرکز میں پروفیسر غفور احمد اور پنجاب میں مجھے سیکرٹری جنرل بنا دیا گیا۔ اس حیثیت سے ہمارا رابطہ پاکستان قومی اتحاد کی تحلیل تک مسلسل رہا۔ پاکستان قومی اتحاد کے اجلاسوں کے علاوہ بھی تنظیمی حوالے سے ہمارا رابطہ رہتا تھا اور وقتاً فوقتاً ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ اس دوران میں نے کراچی میں پروفیسر غفور احمد مرحوم کے گھر میں بھی حاضری دی اور ان سے مختلف مسائل پر گفتگو اور تبادلۂ خیالات کا سلسلہ چلتا رہا۔ ان کی سنجیدگی، متانت اور تدبر سے ان کا ہر ملنے والا متاثر تھا۔ مجھے بھی ان کے دھیمے رویے، مضبوط موقف اور سب کے احترام پر مبنی لہجے نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔

۱۹۷۷ء کی تحریکِ نظامِ مصطفیٰؐ جو دراصل الیکشن میں دھاندلیوں کے خلاف احتجاجی تحریک تھی، لیکن چونکہ قومی اتحاد نے نظامِ مصطفیٰؐ کے نفاذ کے نعرے پر انتخاب لڑا تھا، اس لیے فطری طور پر اس تحریک نے بھی تحریکِ نظامِ مصطفیٰؐ کا عنوان اختیار کر لیا۔ اس تحریک کی قیادت میں مولانا مفتی محمود، نوابزادہ نصر اللہ خان، مولانا شاہ احمد نورانی، سردار شیر باز خان مزاری، چودھری ظہور الٰہی، پیر آف پگاڑہ شریف، سردار محمد عبد القیوم خان اور میاں طفیل (رحمہم اللہ تعالیٰ) کے نام نمایاں تھے۔ لیکن اس کے تنظیمی اور دفتری معاملات کو کنٹرول کرنے والی ٹیم کو پروفیسر غفور احمد کی مدبرانہ رہنمائی میسر تھی جو اس تحریک کا ایک اہم کردار ہے۔ قومی اتحاد نے جنرل ضیاء الحق مرحوم کے دور میں وفاقی کابینہ میں شمولیت اختیار کی تو پروفیسر غفور احمد مرحوم بھی وفاقی وزیر بنے۔ اس سے قبل وہ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے ساتھ مذاکرات میں پاکستان قومی اتحاد کے سہ رکنی وفد میں مولانا مفتی محمودؒ اور نوابزادہ نصر اللہ خان مرحوم کے ساتھ شامل رہ چکے تھے۔ اس دور کی یادداشتیں کتابی شکل میں ''پھر مارشل لاء آگیا'' کے عنوان سے قلم بند کر کے انہوں نے شائع کر دی ہیں۔

پروفیسر غفور احمد کا شمار محب وطن، دیانت دار، با اصول اور حق گو سیاسی رہنماؤں میں ہوتا تھا۔ قحط الرجال کے اس دور میں ان کی وفات سے یقیناً بہت بڑا خلا پیدا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں اور پسماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق دیں، آمین یارب العالمین۔

قاری نور الحق قریشی ایڈووکیٹؒ اور ماضی کی چند یادیں

(روزنامہ اسلام، لاہور — جنوری ۲۰۰۶ء)

قاری نور الحق قریشی ایڈووکیٹ بھی ہمیں داغ مفارقت دے گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔...... انہوں نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز مجلس احرار اسلام سے کیا لیکن بعد میں مولانا مفتی محمودؒ کی رفاقت کے دائرے میں آ گئے۔ ملتان میں ان کی رہائش مدرسہ قاسم العلوم کے قریب ہی ایک چوبارے میں ہوا کرتی تھی۔ مفتی صاحبؒ سے روزمرہ ربط رہتا۔ چنانچہ جب ۱۹۶۷ء اور ۱۹۶۸ء میں مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ، مولانا غلام غوث ہزارویؒ، اور مولانا مفتی محمودؒ کی قیادت میں جمعیت علمائے اسلام نے ملک گیر سطح پر عام انتخابات میں حصہ لینے کے لیے اپنی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع کیا تو قاری نور الحق قریشی ایڈووکیٹؒ اس میں شامل ہو گئے اور جمعیت کو منظم و فعال بنانے میں سرگرم کردار ادا کیا۔

قاری صاحب جلد ہی جمعیت کی صوبائی قیادت میں آ گئے۔ اس دور میں جمعیت کے صوبائی امیر مولانا عبید اللہ انورؒ رہے جن کے ساتھ سیکرٹری جنرل کے طور پر کچھ عرصہ مولانا محمد ضیاء القاسمیؒ نے کام کیا، پھر مولانا سید نیاز احمد شاہ گیلانیؒ صوبائی سیکرٹری جنرل رہے، ان کے بعد قاری نور الحق قریشیؒ ایڈووکیٹ نے یہ منصب سنبھالا اور کافی عرصہ تک یہ ذمہ داریاں نبھاتے رہے۔

جمعیت علمائے اسلام میں مختلف سطح پر قاری نور الحق قریشیؒ کے سرگرم کردار کا دور ۱۹۷۱ء سے ۱۹۸۰ء تک رہا اور انہوں نے صوبے میں جمعیت کو ایک متحرک اور فعال سیاسی جماعت بنانے کے لیے انتھک محنت کی۔

بھٹو مرحوم کے دور حکومت میں بلوچستان میں مری اور بگٹی قبائل کے خلاف فوجی آپریشن ہوا اور سردار عطاء اللہ خان مینگل کی منتخب حکومت برطرف کر دی گئی جس میں جمعیت علمائے اسلام بھی شامل تھی اور اسے بلوچستان میں واضح اکثریت حاصل تھی تو اس کے ردعمل میں اپوزیشن کی سیاسی جماعتوں نے ملک گیر احتجاج کا پروگرام بنایا۔ پنجاب میں غلام مصطفیٰ کھر کا راج تھا۔ اپوزیشن نے حکومت کے رویہ کے خلاف گرفتاریاں دینے کا پروگرام بنایا تو لاہور اور ملتان سے بہت سے رہنماؤں اور کارکنوں نے خود کو گرفتاری کے لیے پیش کیا۔ جمعیت علمائے اسلام نے بھی اس میں سرگرم حصہ لیا۔ قاری نور الحق قریشی ایڈووکیٹؒ نے ملتان سے گرفتاری پیش کی۔ اس موقع پر گرفتاریاں پیش کرنے والوں کو پولیس نے روایتی تشدد اور تذلیل کا نشانہ بنایا اور انتہائی توہین آمیز سلوک کیا مگر اس کے باوجود سیاسی کارکنوں نے استقامت

کا مظاہرہ کیا اور بھٹو حکومت کے مجموعی رویہ بالخصوص بلوچستان میں غاصب اقتدار کے خلاف سیاسی احتجاج ریکارڈ کرایا جس سے بلوچستان کے عوام کو حوصلہ ہوا کہ ان کے صوبے میں فوجی آپریشن کو ملک کی سیاسی جماعتوں بالخصوص پنجاب کے عوام کی حمایت حاصل نہیں ہے۔

۱۹۷۷ء میں پاکستان قومی اتحاد تشکیل پایا تو قاری نورالحق قریشی ایڈووکیٹ نے صوبائی سطح پر قومی اتحاد میں جمعیت علمائے اسلام کی بھرپور نمائندگی کی۔ صوبائی پارلیمانی بورڈ میں قومی اتحاد میں شامل نو جماعتوں کے درمیان سیٹوں کی تقسیم خاصا مشکل کام تھا۔ جماعتوں کو بھرپور نمائندگی دینے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ ہر سیٹ پر ایسا نمائندہ لایا جائے جو سیٹ جیتنے کی پوزیشن میں ہو۔ صوبائی پارلیمانی بورڈ میں اس مقصد کے لیے جماعتوں کے درمیان خاصی کشمکش رہی مگر قاری صاحب نے پورے حوصلے اور تدبر کے ساتھ پارٹی کی نمائندگی کی اور سیٹوں میں معقول حصہ وصول کیا، ان کے ساتھ میں بھی پارلیمانی بورڈ میں جمعیت کی طرف سے ان کی معاونت کرتا رہا۔

مولانا مفتی محمودؒ کی وفات کے بعد جمعیت علمائے اسلام درخواستی گروپ اور فضل الرحمٰن گروپ میں تقسیم ہوئی تو قاری نور الحق قریشی ابتدا میں مصالحتی کوششوں میں شریک رہے لیکن پھر دھیرے دھیرے کنارہ کش ہوتے چلے گئے اور پھر بالکل ہی خاموش ہو گئے۔ اس دوران وہ قوم پرست سرائیکی رہنما تاج محمد لنگاہ کے ساتھ سرائیکی صوبہ بنانے کی تحریک میں شامل ہوئے اور کچھ عرصہ اس میں بھرپور حصہ لیا مگر پھر اس میں بھی ان کی زیادہ سرگرمی نہ رہی۔ چند برس قبل عالمی مجلس تحفظِ ختمِ نبوت ملتان کے دفتر میں تحریکِ ختمِ نبوت کے ایک پروگرام کے سلسلہ میں ان سے ملاقات ہوئی تو وہ ملک کی سیاسی صورتحال سے خاصے دلبرداشتہ تھے۔ اس کے بعد ان سے ملاقات کی کوئی صورت نہ بن سکی۔ اللہ تعالیٰ ان کی حسنات قبول فرمائیں، سیئات سے درگزر کریں، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں، اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

میاں اسماعیل ضیاء مرحوم اور ماضی کی چند یادیں

(روزنامہ پاکستان، لاہور — ۱۱ نومبر ۲۰۱۱ء)

(پیپلز پارٹی کے) سابق ایم پی اے گوجرانوالہ میاں اسماعیل ضیاء مرحوم میرے محترم دوستوں میں سے تھے۔ سیاسی راستے الگ الگ ہونے کے باوجود ہمارے درمیان بہت سے معاملات میں مفاہمت اور ہم آہنگی رہی ہے۔ وہ مسلکاً اہلِ حدیث تھے اور سیاسی طور پر معروف معنوں میں بائیں بازو کے سیاسی دانشوروں اور کارکنوں میں شمار ہوتے تھے۔ جبکہ میں دیوبندی مسلک کے پیروکاروں میں شمار ہوتا ہوں اور میرا سیاسی تعلق ہمیشہ جمعیت علماء اسلام کے ساتھ رہا ہے۔ ہماری باہمی دوستی اور تعلق کے پس منظر میں تین چار شخصیات کا بڑا حصہ اور کردار ہے اور انہی بزرگوں کے باہمی تعلقات و روابط اور جذبات و خیالات کے سائے میں ہماری دوستی کا تانا بانا بُنا گیا تھا۔

مولانا مفتی عبد الواحدؒ اور مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ کی دوستی

گوجرانوالہ شہر میں دیوبندی مکتبِ فکر کی بڑی شخصیت حضرت مولانا مفتی عبد الواحدؒ جبکہ اہلِ حدیث مکتبِ فکر کی بڑی شخصیت حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ تھے۔ دونوں الگ الگ مذہبی مکاتبِ فکر کی نمائندگی بلکہ قیادت کرتے تھے لیکن دونوں میں گہری دوستی اور نظریاتی ہم آہنگی تھی۔ وہ برصغیر کی تقسیم سے قبل کی سیاست کے حوالے سے کانگریس کے حامی علماء میں شمار ہوتے تھے اور جمعیت علماء ہند کے ساتھ ان کا تعلق تھا۔ ان کی سیاسی فکر یکساں تھی اور سیاسی وابستگی کے دائرے ایک جیسے تھے۔ میں نے ان کی دوستی کا آخری دور دیکھا ہے جب میں طالب علم تھا اور حضرت مولانا مفتی عبد الواحدؒ کے کارکنوں میں شمار ہوتا تھا۔ اور میں نے ان دونوں بزرگوں کو کئی بار باہم سر جوڑے مشاورت کرتے دیکھا اور بسا اوقات ان کے درمیان پیغام رسانی کے فرائض بھی سرانجام دیے۔

میاں اسماعیل ضیاء مرحوم کا تعلق حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ کے حلقے سے تھا اور وہ ان کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے۔ مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ کو میں نے پہلی بار ۱۹۶۲ء میں میاں افتخار الدین مرحوم کی یاد میں گوجرانوالہ میں منعقد ہونے والے جلسے میں دیکھا تھا جو گوندلانوالہ چوک کے قریب گورنمنٹ ٹرانسپورٹ سروس کے پرانے اڈے کے سامنے منعقد ہوا تھا۔ مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ نے اس جلسہ کی صدارت کی تھی اور میں نے اس جلسہ میں آغا شورش کاشمیری مرحوم اور شیخ حسام الدین مرحوم کو پہلی بار سنا

تھا۔ اس طرح میاں اسماعیل ضیاء مرحوم اور میری دوستی دراصل مولانا مفتی عبدالواحدؒ اور مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ کے دو کارکنوں کی دوستی تھی جو رفتہ رفتہ پروان چڑھتی گئی۔

مولانا عبدالقیوم ہزاروی کے ہاں پہلی ملاقات

اس دوستی میں مزید رنگ ہمارے استاذ محترم حضرت مولانا عبدالقیوم ہزاروی نے بھرا جو میرے بڑے اساتذہ میں سے ہیں اور مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں انہوں نے سالہاسال تک تدریسی خدمات سرانجام دی ہیں۔ وہ ایک عرصہ تک سرگرم سیاسی راہنما رہے ہیں اور ان کے رجحانات کا رخ بھی بائیں بازو کی طرف رہا ہے۔ میری سیاسی ذہن سازی اور تربیت میں جن تین چار بزرگوں کا سب سے زیادہ کردار ہے ان میں ایک حضرت مولانا عبدالقیوم ہزاروی مدظلہ ہیں۔ میاں اسماعیل ضیاء کا بھی ان سے تعلق تھا اور ان کے ہاں آنا جانا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے میاں اسماعیل ضیاء کو پہلی بار انہی کے پاس دیکھا تھا۔

میاں محمود علی قصوری مرحوم سے مراسم

ہمارے درمیان دوستی اور تعلق کا ایک بڑا ستون میاں محمود علی قصوری مرحوم کی شخصیت تھی۔ حضرت مولانا عبیداللہ انورؒ میرے روحانی شیخ اور جماعتی امیر تھے اور میرا شیرانوالہ گیٹ لاہور اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ میاں محمود علی قصوری مرحوم اور حضرت مولانا عبیداللہ انورؒ کے درمیان گہرے مراسم تھے۔ حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ اور میاں محمود علی قصوری مرحوم کے خاندانی مراسم میں قدرِ مشترک تحریکِ آزادی میں دونوں خاندانوں کا کردار اور شیخ الہند محمود حسن دیوبندیؒ کی تحریک میں دونوں خاندانوں کی شرکت رہی ہے۔ میں خود کو اصلاً شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی سیاسی فکر اور تحریک کا آدمی سمجھتا ہوں۔ چنانچہ ان پانچ شخصیات یعنی مولانا مفتی عبدالواحدؒ، مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ، مولانا عبیداللہ انورؒ، مولانا عبدالقیوم ہزاروی اور میاں محمود علی قصوری مرحوم کے باہمی تعلق اور فکری ہم آہنگی کے پس منظر میں میاں اسماعیل ضیاء مرحوم کے ساتھ میری دوستی کا رشتہ استوار ہوا جو سیاسی مد و جزر کے مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے آخر وقت تک برقرار رہا۔

رفاقت اور رقابت کے ادوار

ہمارے درمیان سیاسی رفاقت کا ایک مختصر سا دور بھی رہا ہے جب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی طرف سے اسلامی سوشلزم کا نعرہ لگانے پر بہت سے علماء کرام نے اس اصطلاح کو کفر قرار دیا تو جمعیت علماء اسلام

کی قیادت (مولانا عبید اللہ انورؒ، مولانا مفتی محمودؒ، مولانا غلام غوث ہزارویؒ، مولانا مفتی عبد الواحدؒ) نے اس فتوے سے اختلاف کیا اور کہا کہ ہمیں اسلامی سوشلزم کی اصطلاح سے اتفاق نہیں مگر ہم اسے کفر قرار دینے کی بجائے تعبیر کی غلطی سمجھتے ہیں اور افہام وتفہیم کے ذریعے ایسا کرنے والوں کی غلط فہمیاں دور کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس دوران دائیں اور بائیں بازو کے حوالے سے ملک میں ایک واضح تقسیم بھی دکھائی دینے لگی جس میں جمعیت علماء اسلام کا رجحان بائیں بازو کی طرف نظر آتا تھا۔ یہ تھوڑا سا دورانیہ ہے جس میں ہم نے مشترکہ جلسے کیے اور مظاہروں میں بھی حصہ لیا۔

میاں محمود علی قصوری کے ساتھ میاں اسماعیل ضیاء پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہو چکے تھے جبکہ میں جمعیت علماء اسلام کا سرگرم رکن تھا اس لیے کچھ عرصہ ہماری رقابت کا بھی رہا۔ ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں ڈیرہ اسماعیل خان کے حلقہ انتخاب میں مفتی محمودؒ اور جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے باہمی مدمقابل آجانے سے ہمارا ہم آہنگی کا دور ختم ہو گیا۔ پھر ہمارے درمیان رقابت اور مقابلہ کا دور شروع ہو گیا جو مولانا مفتی محمودؒ اور ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی قیادت میں پاکستان قومی اتحاد اور پاکستان پیپلز پارٹی کے قومی سطح پر باہمی سیاسی حریف کے طور پر آمنے سامنے آجانے پر منتج ہوا۔ یہ سات سالہ دور ہماری سیاسی رقابت اور اختلاف کا دور تھا مگر اس دوران بھی ہمارے شخصی سماجی تعلقات اور باہمی تعلق واحترام میں کوئی فرق نہ آیا۔

۱۹۷۰ء کے الیکشن میں میاں اسماعیل ضیاء مرحوم گوجرانوالہ کی شہری سیٹ سے پنجاب اسمبلی کے لیے پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدوار تھے اور وہ بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے۔ ان کے مقابل امیدواروں میں جمعیت علماء اسلام کے حافظ شیخ محمد بشیر احمد مرحوم بھی تھے جن کی انتخابی مہم کرنے والوں میں میں شامل تھا۔ الیکشن کے روز ایک پولنگ اسٹیشن پر میرا اور میاں اسماعیل ضیاء مرحوم کا آمنا سامنا ہو گیا۔ ہم ایک دوسرے سے گلے ملے، ضیاء مرحوم گلے ملتے ہوئے مجھ سے کہنے لگے کہ ووٹ تو مجھے پتہ ہے آپ نے مجھے نہیں دینا مگر میرے لیے دعا ضرور کریں۔ میں نے کہا کہ الیکشن میں کامیابی کی دعا تو حافظ بشیر احمد صاحب کے لیے کروں گا لیکن ویسے آپ کے لیے دعا کروں گا۔

وہ پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور پنجاب میں پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت بن گئی۔ ہمارا میل جول معمول کے مطابق رہا، میں کبھی کبھار ماڈل ٹاؤن میں ان کے گھر چلا جاتا تھا اور وقتاً فوقتاً ہمارے درمیان گپ شپ کی محفل ہوتی رہتی تھی۔ ایک بار میں صبح صبح ان کے گھر جا پہنچا، مجھے دروازے پر دیکھ کر وہ کچھ متفکر ہوئے اور پوچھا اس وقت کیسے آنا ہوا؟ میں نے کہا کہ ناشتہ کرنے اور الوداعی ملاقات کے لیے آیا ہوں۔ حیرانی سے پوچھا کہ الوداعی ملاقات کس حوالے سے؟ میں نے کہا کہ کل اخبار میں ایک خبر پڑھی ہے کہ آپ کو صوبائی کابینہ میں لیا جا رہا ہے، ظاہر ہے کہ وزیر بن جانے کے بعد آپ ہماری ملاقاتوں کے

دائرے میں نہیں رہیں گے، پھر ملاقات وزارت کا پیریڈ ختم ہونے کے بعد ہی ہوگی، اس لیے میں نے سوچا کہ چلو آج الوداعی ملاقات کر لوں پھر خدا جانے کب ملاقات ہو۔ میاں صاحب نے مسکرا کر کہا کہ آپ تسلی رکھیں اس بات کا کوئی خدشہ سرِ دست موجود نہیں اور پھر پُر تکلف ناشتہ کرا کے مجھے رخصت کیا۔

میاں اسماعیل ضیاء مرحوم اور ماڈل ٹاؤن گوجرانوالہ کی مسجد مکرم

میاں اسماعیل ضیاء مرحوم جن دنوں ماڈل ٹاؤن گوجرانوالہ میں مسجد مکرم بنوا رہے تھے، ان دنوں مسجد کے اس پلاٹ پر ہم دیوبندیوں کی بھی نظر تھی اور ہم چاہتے تھے کہ یہ پلاٹ مسجد کے لیے ہمیں ملے۔ اس مقصد کے لیے کام کرنے والے دیوبندی گروپ کے سربراہ ڈاکٹر معراج الدین مرحوم تھے اور وہ اس غرض سے تگ و دو کر رہے تھے۔ میاں اسماعیل ضیاء مرحوم ایم پی اے تھے اور حکمران جماعت سے تعلق رکھتے تھے، وہ مسجد کے لیے اس پلاٹ کے حصول میں کامیاب ہوگئے اور مسجد کی تعمیر کا پروگرام بنالیا۔ اس پر مولانا مفتی عبدالواحدؒ بہت ناراض تھے، انہوں نے مجھے ایک دن بطور خاص میاں اسماعیل ضیاء مرحوم کے پاس بھیجا اور کہا کہ اس پلاٹ پر ہمارا حق ہے، آپ اپنی مسجد کے لیے کوئی اور پلاٹ لے لیں اور یہ پلاٹ ہمیں دے دیں۔ میں نے ان سے ملاقات کی اور مولانا مفتی عبدالواحدؒ کا پیغام پہنچایا جو قدرے سخت الفاظ میں تھا اور مجھے ہدایت تھی کہ پیغام انہی الفاظ میں دینا ہے۔ میں نے پیغام اسی لہجے اور الفاظ میں دیا تو اسماعیل ضیاء مرحوم مسکرائے اور کہا کہ مفتی صاحب ہمارے بزرگ ہیں، ہم ان کا احترام کرتے ہیں لیکن میری طرف سے ان سے عرض کر دیں کہ اب تو میں سارے مراحل مکمل کر چکا ہوں جن سے پیچھے ہٹنا اب میرے لیے مشکل ہے، اس لیے آپ مہربانی فرمائیں اور ماڈل ٹاؤن میں مسجد کے لیے مخصوص کسی بھی پلاٹ کے لیے درخواست دے دیں میں آپ کو مکمل سپورٹ کروں گا۔ مگر مفتی صاحب مرحوم نہ مانے، نتیجہ یہ ہوا کہ ہم دیوبندی ماڈل ٹاؤن میں مسجد کے لیے مخصوص پلاٹوں میں سے کوئی پلاٹ بھی حاصل نہ کر سکے۔

میاں اسماعیل ضیاء مرحوم ایک بے تکلف دوست، صاف گو سیاسی رہنما، انتھک کارکن، وفادار ساتھی اور اپنے نظریات و افکار کے ساتھ کمٹڈ دانشور تھے۔ یہ باتیں جہاں بھی پائی جائیں قابلِ قدر ہوتی ہیں، مگر اب یہ باتیں کم نہیں بلکہ کم تر ہوتی جا رہی ہیں۔ اس لیے ایسے دوستوں کی یاد جب بھی آتی ہے زیادہ پریشان کر دیتی ہے

ع اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر

رانا نذر الرحمٰن مرحوم اور ماضی کی چند یادیں

(روزنامہ اسلام، لاہور — ۲۴ جون ۲۰۱۷ء)

گزشتہ دنوں رانا نذر الرحمٰن بھی چل بسے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ آج کی نسل ان سے متعارف نہیں ہے لیکن جن لوگوں نے انہیں کوچۂ سیاست میں چلتے پھرتے دیکھا ہے ان کے لیے وہ بھولنے والی شخصیت نہیں ہے۔ میں نے تو ان کے ساتھ خاصا وقت گزارا ہے، باہمی محاذ آرائی کا بھی اور پھر رفاقت اور دوستی کا بھی۔

بھٹو مرحوم کا اسلامی سوشلزم کا نعرہ

جب عملی سیاست میں سرگرم ہوا تو صدر محمد ایوب خان مرحوم کا آخری دور تھا، ان کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے وزارت سے استعفیٰ دے کر ''اسلامی سوشلزم'' کے نعرے پر جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف بگل بجا دیا تھا اور ''پاکستان پیپلز پارٹی'' کے نام پر نئی صف بندی کے لیے سرگرم تھے۔ جمعیت علماء اسلام کی قیادت اس وقت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ، مولانا غلام غوث ہزارویؒ اور مولانا مفتی محمودؒ کے ہاتھ میں تھی اور میں اس کے پرجوش کارکنوں میں سے تھا۔ جمعیت میں زیادہ تر وہ علماء اور کارکن تھے جو قیامِ پاکستان سے پہلے تحریکِ پاکستان کی مخالفت میں کانگریس کا ساتھ دینے کی وجہ سے نیشنلسٹ کہلاتے تھے۔ جبکہ تحریکِ پاکستان میں حصہ لینے والی جمعیت علماء اسلام کے بیشتر حضرات حجرہ نشین تھے یا چودھری محمد علی مرحوم کی ''نظامِ اسلام پارٹی'' کی زینت بن چکے تھے۔

بھٹو مرحوم کے اسلامی سوشلزم کے نعرے نے قومی سیاست کے فکری اور نظریاتی ماحول میں تلاطم بپا کر دیا۔ دائیں بازو اور بائیں بازو میں منقسم سیاست میں دائیں بازو نے اس نعرہ کو مسترد کر دیا جبکہ بائیں بازو کے لیے سیاست میں پیشرفت کے لیے یہ نعرہ سہارا بن گیا۔

مرکزی جمعیت علماء اسلام کا فتویٰ اور جمعیت علماء اسلام کا موقف

جمعیت علماء اسلام کی معروف قیادت چونکہ سابق نیشنلسٹ علماء پر مشتمل تھی جو سیاسی محاذ آرائی میں بائیں بازو کی طرف قدرے زیادہ رجحان رکھتی تھی، اس لیے تحریکِ پاکستان والی جمعیت علماء اسلام ''مرکزی جمعیت علماء اسلام'' کے نام سے میدان میں آگئی اور ''اسلامی سوشلزم'' کی اصطلاح کو کفریہ قرار دیتے ہوئے ایک سو تیرہ سرکردہ علماء کرام کی طرف سے باقاعدہ فتویٰ صادر کر دیا گیا۔ مولانا درخواستیؒ، مولانا ہزارویؒ، مولانا مفتی محمودؒ اور مولانا عبید اللہ انورؒ نے اس فتویٰ کی حمایت سے انکار کر دیا اور فکری و علمی محاذ

آرائی کا بازار گرم ہوگیا۔ ان بزرگوں کا کہنا تھا کہ یہ اصطلاح کی غلطی ہے جس کی اصلاح ہونی چاہیے، اس پر کفر کا اطلاق درست نہیں ہے۔ چنانچہ وہ علماء جو پہلے "نیشنلسٹ علماء" کے خطاب سے یاد کیے جاتے تھے اب "سوشلسٹ علماء" کا نیا لیبل ان پر چسپاں کر دیا گیا۔

اس معرکہ آرائی میں رانا نذر الرحمٰن لاہور میں دائیں بازو کے سرگرم ترین راہنما تھے۔ انہوں نے "انجمنِ شہریان" کے عنوان سے متحرک فورم قائم کیا ہوا تھا جو دائیں بازو کے فکری اور نظریاتی موقف اور پروگرام کے فروغ کے لیے وقف تھا۔ جبکہ دوسری طرف لیفٹ کے نظریاتی کارکنوں اور جمعیت علماء اسلام کے سرگرم راہنماؤں کے اشتراک سے "عوامی فکری محاذ" کے نام سے ایک حلقہ کام کر رہا تھا جس میں مولانا اشفاق علی خانؒ، ڈاکٹر احمد حسین کمالؒ اور حکیم مختار احمد الحسینی پیش پیش تھے اور راقم الحروف بھی اس کا متحرک کردار تھا۔ لیفٹ کا قومی اخبار "امروز" ہمارا سب سے بڑا مورچہ تھا۔ چنانچہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات تک یہ "لیفٹ رائیٹ" جاری رہی۔

۱۹۷۰ء کی دہائی کی سیاست

۱۹۷۰ء کے انتخابات میں پاکستان پیپلز پارٹی اور جمعیت علماء اسلام کی رفاقت ٹوٹ گئی، قومی اسمبلی کے ڈیرہ اسماعیل خان کے انتخابی حلقہ میں مولانا مفتی محمودؒ اور ذوالفقار علی بھٹو آمنے سامنے تھے جس نے پورے ملک کی سیاست کا رخ تبدیل کر دیا۔ الیکشن کے بعد مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور سقوطِ ڈھاکہ کا المناک سانحہ پیش آیا اور اس کے بعد دونوں پارٹیاں مستقل طور پر ایک دوسرے کے حریف کا روپ دھار گئیں۔ حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ نے الیکشن سے پہلے کا فکری ماحول بحال کرنے کی کوشش کی مگر "ہزاروی گروپ" کے نام سے ایک الگ دھڑے کے قیام کے علاوہ کوئی نتیجہ سامنے نہ آیا۔

دیوبندی علماء کا ذوق شروع سے اپوزیشن کا چلا آرہا ہے، دیوبندیت کا عمومی مزاج اقتدار کی رفاقت کے لیے کبھی ہموار نہیں رہا۔ اس لیے مولانا مفتی محمودؒ اس راہ پر چلتے چلتے بالآخر اپوزیشن کی نو سیاسی جماعتوں کے متحدہ محاذ "پاکستان قومی اتحاد" کے سربراہ کے طور پر ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے سب سے بڑے حریف کے طور پر سامنے آئے۔ یہ میرا رانا نذر الرحمٰن مرحوم کے ساتھ رفاقت اور دوستی کا دور تھا۔ وہ نوابزادہ نصر اللہ خان مرحوم کی پارٹی کے متحرک راہنما تھے اور میں جمعیت علماء اسلام کا سرگرم کارکن تھا۔

پاکستان قومی اتحاد کا صوبائی ڈھانچہ تشکیل پایا تو محترم جناب حمزہ صدر تھے اور پیر محمد اشرف سیکرٹری جنرل چنے گئے۔ جبکہ صوبائی قیادت کے سرگرم حضرات میں اقبال احمد خان مرحوم، محمد فاروق قریشی،

مولانا فتح محمد، ملک محمد اکبر ساقی، قاری نور الحق قریشی ایڈووکیٹ، رانا نذر الرحمٰن، علامہ احسان الٰہی ظہیر اور راقم الحروف نمایاں تھے۔ کچھ دنوں بعد پیر محمد اشرف مرحوم اس منصب سے سبکدوش ہوئے تو مجھے پاکستان قومی اتحاد کا صوبائی سیکرٹری جنرل چن لیا گیا۔ نوابزادہ نصر اللہ خان مرحوم کا دفتر ہی ہمارا دفتر تھا جبکہ اس ٹیم میں سے بھی حمزہ صاحب، رانا نذر الرحمٰن اور راقم الحروف پر مشتمل تکون نے زیادہ تر دفتری اور تنظیمی کام اپنے ذمہ لے رکھا تھا۔ ہم اکٹھے ہی صوبہ کے مختلف حصوں کا دورہ کرتے اور تنظیمی و تحریکی معاملات کو مل جل کر نمٹاتے تھے جس میں نوابزادہ نصر اللہ مرحوم کی سرپرستی ہمیں مسلسل حاصل رہی۔

اس دور کی بہت سی یادیں قابلِ ذکر ہیں مگر یہ کالم ان کا متحمل نہیں ہے، البتہ رانا نذر الرحمٰن مرحوم کی اصول پرستی، شرافت، دیانت داری اور اپنے مشن کے ساتھ بے لچک کمٹمنٹ یاد آتی ہے تو ان کے لیے دل سے بہت دعائیں نکلتی ہیں۔ آج کے دور میں تو یہ باتیں سیاسی ماحول کے لیے اجنبی سی ہو کر رہ گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ رانا صاحب مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دیں اور پسماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

تحریکِ ختمِ نبوت کے سرگرم کردار

(روزنامہ اسلام، لاہور — یکم ستمبر ۲۰۱۳ء)

......یہ تحریک مسلسل جاری رہی، حتیٰ کہ ۱۹۷۴ء میں پاکستان کی منتخب پارلیمنٹ نے ملک گیر عوامی تحریک کے نتیجے میں مفکر پاکستان علامہ محمد اقبالؒ کی تجویز کے مطابق قادیانیوں کو دستوری طور پر غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا۔

- پارلیمنٹ کے اس متفقہ دستوری فیصلے میں اس وقت کے وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم، قائد حزب اختلاف مولانا مفتی محمودؒ، مولانا شاہ احمد نورانیؒ، مولانا عبد الحقؒ، مولانا غلام غوث ہزارویؒ، چودھری ظہور الٰہی مرحوم، مولانا ظفر احمد انصاریؒ، اور پروفیسر غفور احمدؒ کا کردار نمایاں تھا،
- جبکہ عوامی تحریک کے محاذ پر مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ، مولانا عبد الستار خان نیازیؒ، علامہ سید محمود احمد رضویؒ، علامہ احسان الٰہی ظہیرؒ، آغا شورش کاشمیریؒ اور مولانا حافظ عبد القادر روپڑیؒ کی راہنمائی میں ہزاروں علماء کرام اور کارکنوں نے سرگرم کردار ادا کیا۔

مگر قادیانیوں نے اس فیصلہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر رکھا ہے اور وہ دنیا میں ہر سطح پر پاکستان کی منتخب پارلیمنٹ کے اس متفقہ دستوری فیصلے کے خلاف محاذ آرائی میں مصروف ہیں۔ حتیٰ کہ حالیہ انتخابات سے قبل بھی قادیانیوں کے موجودہ سربراہ مرزا مسرور احمد نے واضح طور پر اعلان کیا ہے کہ وہ اس فیصلے کو تسلیم نہیں کرتے، اسی وجہ سے وہ انتخابات میں شریک ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ انہوں نے ووٹروں کی فہرست میں اپنا نام درج کرانے سے انکار جاری رکھا ہوا ہے اور وہ پاکستان میں صرف اس سیاسی جماعت کے ساتھ تعاون کریں گے جو قادیانیوں کو مسلمان تسلیم کرے اور انہیں غیر مسلم اقلیت قرار دینے والے فیصلے کو ختم کرائے، اس کے بغیر وہ پاکستان کے کسی انتخابی عمل میں شریک نہیں ہوں گے۔......

(روزنامہ اسلام، لاہور — ۶ ستمبر ۲۰۱۴ء)

......البتہ اس مطالبہ کی منظوری کے لیے تحریک مسلسل چلتی رہی تا آنکہ ۱۹۷۴ء میں ملک کی منتخب پارلیمنٹ نے طویل بحث و مباحثہ کے بعد اس مطالبہ کو منظور کر کے دستوری ترمیم کے ذریعہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت کا درجہ دے دیا۔ اس موقع پر قادیانیوں کے دونوں گروہوں کے سربراہوں مرزا ناصر احمد

اور مولوی صدر الدین کو پارلیمنٹ کے فلور پر مسلسل چودہ روز تک اپنے موقف کی وضاحت اور سوال و جواب کا موقع دیا گیا۔ اسمبلی میں موجود علماء کرام مولانا مفتی محمودؒ، مولانا غلام غوث ہزارویؒ، مولانا شاہ احمد نورانیؒ، مولانا عبد المصطفی ازہریؒ، مولانا محمد ذاکرؒ، مولانا ظفر احمد انصاریؒ، اور دیگر معزز ارکان کے علاوہ ملک کے اٹارنی جنرل جناب یحییٰ بختیار مرحوم نے بھی اس بحث میں حصہ لیا۔ طویل بحث و تمحیص کے بعد جب پوری اسمبلی قادیانیوں کے مسلمان نہ ہونے پر مطمئن ہوگئی تو وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی قیادت میں پارلیمنٹ نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا متفقہ دستوری فیصلہ صادر کر دیا۔ جبکہ قومی سطح پر بحث و مباحثہ کے علاوہ عالم اسلام کے علمی و دینی مراکز سے بھی راہنمائی کے لیے رابطہ کیا گیا اور امتِ مسلمہ کی نمائندہ تنظیم رابطہ عالم اسلامی نے متفقہ طور پر قادیانیوں کے دائرہ اسلام سے خارج ہونے کی قرارداد منظور کر دی۔......

(روزنامہ اسلام، لاہور — ۱۲اکتوبر ۲۰۱۷ء)

......سرکردہ حضرات کو ایک صف میں دیکھ کر ۱۹۷۴ء کا وہ منظر ایک بار پھر آنکھوں کے سامنے آگیا ہے جب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم، مولانا مفتی محمودؒ، مولانا شاہ احمد نورانیؒ، پروفیسر غفور احمد مرحوم، چودھری ظہور الٰہی مرحوم، حاجی مولا بخش سومرو مرحوم، مولانا عبد الحقؒ، مولانا ظفر احمد انصاریؒ، مولانا غلام غوث ہزارویؒ، مولانا کوثر نیازیؒ، مولانا محمد ذاکرؒ اور دیگر قائدین نے متفقہ طور پر اس مسئلہ کو دستوری طور پر حل کر دیا تھا۔ لیکن پارلیمنٹ کے اس دستوری اور جمہوری فیصلے کو مسترد کرتے ہوئے قادیانیوں نے نہ صرف یہ مسئلہ باقی رکھا ہوا ہے بلکہ اس کے حوالہ سے وہ دنیا بھر میں حکومتِ پاکستان کے خلاف مورچہ بندی بھی قائم رکھے ہوئے ہیں۔......

حکومت اور قومی اتحاد کے درمیان ڈیڈلاک اور سعودی سفیر

(روزنامہ اسلام، لاہور — ۵ اکتوبر ۲۰۱۳ء)

......اس صورتحال میں مذاکرات کا ابھی تک آغاز نہ ہونے کی جو وجہ ہمیں سمجھ آرہی ہے وہ عرض کر دینا ہم مناسب سمجھتے ہیں۔ ایک بات تو یہ ہے کہ حکومت کی خواہش یہ لگتی ہے کہ مذاکرات کی طرف پیشرفت میں پہل طالبان کی طرف سے ہو، جبکہ طالبان بظاہر اس موڈ میں ہیں کہ حکومت انہیں باضابطہ پیشکش کرے اور سلسلۂ جنبانی کا آغاز حکومت کی طرف سے ہو۔

مذاکرات کی دنیا میں ایسے مواقع پر ہمیشہ ایسی شخصیات سامنے آیا کرتی ہیں جو دونوں طرف رابطہ کر کے ''ڈیڈلاک'' کو ختم کرنے میں کردار ادا کرتی ہیں۔ ۱۹۷۷ء میں پاکستان قومی اتحاد کی تحریکِ نظامِ مصطفیٰ میں بھٹو حکومت اور قومی اتحاد کے درمیان ڈیڈلاک کو ختم کرنے کے لیے پاکستان میں سعودی عرب کے سفیر ریاض الخطیب مرحوم درمیان میں آئے تھے اور باہمی رابطہ کا ماحول پیدا کیا تھا، جبکہ اس کے بعد قومی اتحاد ہی کے ایک لیڈر سردار محمد عبدالقیوم خان کو رہا کر کے مذاکرات کی راہ ہموار کرنے کا کردار سونپا گیا تھا جو انہوں نے کمال خوبی کے ساتھ سرانجام دیا تھا۔......

ذوالفقار علی بھٹو کا دورِ سیاست

بھٹو دور کی قومی خدمات

ذوالفقار علی بھٹو مرحوم: مخالفین کا خراجِ عقیدت

(روزنامہ پاکستان، لاہور ۔۔۔ ۷ جنوری ۲۰۰۶ء)

گزشتہ روز ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی سالگرہ منائی گئی اور قوم کے مختلف طبقات اور جماعتوں نے انہیں خراج عقیدت پیش کیا۔

قومی سیاست کا انمٹ کردار

ان کی قومی خدمات کو سراہنے والوں میں ان کے سیاسی کارکن اور ساتھی بھی تھے اور ان حضرات نے بھی اس سلسلے میں بخل سے کام نہیں لیا جو ان کی زندگی میں ان کے مخالف سیاسی کیمپ میں رہے ہیں بلکہ انہیں اقتدار سے ہٹانے کی تحریک میں پیش پیش تھے۔ بھٹو مرحوم کے دنیا سے چلے جانے کے ربع صدی سے بھی زیادہ عرصے کے بعد انہیں اس انداز سے یاد کیا جانا جہاں پاکستان کی قومی سیاست میں ان کے انمٹ کردار کا اعتراف ہے وہاں یہ قوم کی ان سیاسی محرومیوں کا مرثیہ بھی ہے جو بھٹو مرحوم کے منظر سے ہٹ جانے کے بعد پاکستانی قوم کا نصیب بن گئی ہے اور ان میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

مجھے ایک سیاسی کارکن کے طور پر جس دور میں قومی سیاست میں سرگرم کردار ادا کرنے کا موقع ملا وہ وہی دور ہے جو ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے سیاسی سفر کے آغاز اور پھر عروج اور اس کے بعد اقتدار کی سیاست میں ان کے زوال کا دور رہا ہے۔ میں نے اقتدار کی سیاست میں ان کے زوال کی بات جان بوجھ کر کی ہے اس لیے کہ قومی سیاست میں ان کی یاد ابھی تک باقی ہے کہ ان کے نام کے ووٹ بینک میں دراڑیں ڈالنے کی بہت سی کوششوں کو ہم نے دم توڑتے دیکھا ہے۔

بھٹو مرحوم کی سیاسی زندگی کا آغاز

بھٹو مرحوم نے جب ایوب خان مرحوم کی وزارتِ خارجہ سے الگ ہو کر اور بعد ازاں ایک نئی سیاسی جماعت کے اعلان کے ساتھ قومی سیاست میں قدم رکھا تو میں جمعیت علماء اسلام کے نوجوان کارکنوں کی صف میں شامل ہو چکا تھا۔ بھٹو مرحوم کی زبان پر غریب اور کسان کا نام تھا اور وہ سرمایہ داری اور جاگیرداری کو بلند آہنگی کے ساتھ لتاڑتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ جمعیت علماء اسلام کے شعوری کارکنوں کو استعمار دشمنی کے ساتھ ساتھ جاگیردارانہ و سرمایہ دارانہ نظام کی مخالفت بھی ورثے میں ملی، اس لیے جمعیت کا جو کارکن شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے افکار اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ کی جدوجہد سے واقف ہے،

کسی بھی استعمار کے ساتھ اس کی دوستی دائرہ امکان سے خارج ہے اور سرمایہ دارانہ و جاگیردارانہ نظام کے لیے اس کے دل میں کبھی کوئی نرم گوشہ نہیں ہو سکتا۔ البتہ ایسے لوگ اب کم رہ گئے ہیں اور جو کسی کونے میں باقی ہیں انہیں ''معروضی سیاست'' کی جکڑبندیوں نے کسی کام کا نہیں رہنے دیا۔

ایک ''اپ ٹوڈیٹ لیڈر'' کی زبان پر غریب، کسان، مزدور اور محنت کش کے حقوق کا نعرہ میرے جیسے کارکنوں کو بہت اچھا لگا اس لیے ہم نے مرحوم سے ابتدا میں بہت سی توقعات وابستہ کر لیں اور کچھ عرصے تک ان کے ساتھ اس نعرے میں ہماری ہم آہنگی بھی رہی۔

پیپلز پارٹی اور جمعیت علماء اسلام کی کشمکش

مگر سیاست میں ہم زیادہ دیر تک ہم قدم نہ رہ سکے اور جمعیت علماء اسلام بھٹو مرحوم کی قائم کردہ پیپلز پارٹی کی ایسی اپوزیشن بنی کہ بھٹو مرحوم کی زندگی میں ان دونوں جماعتوں کی باہمی محاذ آرائی میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ بھٹو حکومت کے خاتمے کا باعث بننے والی تحریکِ نظامِ مصطفیٰؐ کی قیادت بھی جمعیت علماء اسلام کے قائد مولانا مفتی محمودؒ نے کی۔

اس دوران ایک مرحلہ ایسا آیا جب ان دونوں جماعتوں کے درمیان سیاسی ہم آہنگی کے امکانات نظر آنے لگے جب مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد باقی ماندہ پاکستان میں (۱) پاکستان پیپلز پارٹی (۲) نیشنل عوامی پارٹی اور (۳) جمعیت علماء اسلام کے درمیان سہ فریقی معاہدہ ہوا جس کے تحت تینوں جماعتوں نے قومی سیاست میں مشترکہ کردار ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ میرے جیسے کارکنوں کے لیے بہت خوشی کا باعث بنا، اس لیے کہ اس وقت میرا احساس یہ تھا، جس میں اب تک کوئی تغیر واقع نہیں ہوا، کہ بنگلہ دیش کے قیام کے بعد باقی ماندہ پاکستان کی سیاسی قیادت کے لیے ذوالفقار علی بھٹو، مفتی محمودؒ اور خان عبد الولی خان کے اشتراک سے وجود میں آنے والی اجتماعی لیڈر شپ سے بہتر کوئی سیاسی ٹیم بن ہی نہیں سکتی۔ لیکن تینوں جماعتوں کا یہ ''ہنی مون'' زیادہ دیر تک نہ چل سکا۔ قومی سیاست میں یہ جماعتیں ایک بار پھر آمنے سامنے آگئیں اور بھٹو صاحب کی زندگی میں آمنے سامنے ہی رہیں۔

بھٹو مرحوم کی قومی خدمات

یہ ساری باتیں ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ میں جب تک سیاسی زندگی میں ایک کارکن کے طور پر متحرک رہا، بھٹو صاحب مرحوم کے مخالف کیمپ میں ہی رہا اور بھٹو حکومت کے ہاتھوں کئی بار جیل یاترا بھی کی۔ مگر سچی بات ہے کہ اب جب بھٹو مرحوم کی یاد آتی ہے تو کئی حوالوں سے ان کی قومی خدمات کا اعتراف کیے بغیر کوئی چارہ نہیں پاتا۔

ایٹمی قوت اور دستورِ پاکستان

مجھے محترم مجیب الرحمٰن شامی کے اس ارشاد سے سو فیصد اتفاق ہے کہ بھٹو مرحوم نے ۱۹۷۳ء کے دستور اور ایٹم بم کے حوالے سے پاکستان کو دو گارنٹیاں فراہم کی ہیں اور یہ دونوں گارنٹیاں آج پاکستان کی حفاظت کا سب سے مضبوط حصار بن چکی ہیں۔ ایٹم بم کے بارے میں بھٹو مرحوم کی سوچ صرف پاکستان تک محدود نہیں تھی جسے قومی اسمبلی کے سابق اسپیکر صاحبزادہ فاروق علی خان نے اپنی یادداشتوں میں ان الفاظ کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ

> ''جناب بھٹو ایک دردمندانہ انداز میں یہ بھی اکثر کہا کرتے تھے کہ جب یہودیوں، ہندوؤں، عیسائیوں اور بدھ متوں کے پاس ایٹم بم ہیں تو پھر مسلمانوں کے پاس کیوں نہیں؟ جب میں یہ سنتا ہوں کہ فلاں ملک اور فلاں قوم کے پاس ایٹم بم ہے تو پھر میرے دل میں بھی یہ تڑپ پیدا ہوتی ہے کہ ہم مسلمانوں کے پاس بھی ایٹم بم ہو اور یوں ہم بھی ان اقوام کی ہمسری کرنے کے قابل ہوں اور ہمارا سر بھی فخر سے بلند ہو۔''

پاکستان کو ایٹم بم کی تیاری کی راہ پر ڈالنے والے اور اس کے لیے اسباب و وسائل فراہم کرنے والے پہلے لیڈر بھٹو مرحوم تھے۔ اس لیے آج جبکہ پاکستان کے لیے ایٹم بم رکھنے کا جواز عالمی سطح پر ایک سوالیہ نشان بنتا جا رہا ہے اور ہماری قومی سیاست کے بعض حلقے اس سوال کو مزید گہرا رنگ دینے کی فکر میں ہیں، بھٹو مرحوم کے اس پیغام کو اور زیادہ نمایاں کرنے کی ضرورت ہے کہ ان کا ایٹم بم صرف پاکستان کے حوالے سے نہیں تھا بلکہ اس کے پیچھے پورے عالمِ اسلام کا منظر ان کے ذہن میں موجود تھا۔

مسئلہ قادیانیت کا پارلیمانی حل

مجھے محترم جناب محمد رفیق تارڑ کے اس ارشاد سے بھی اتفاق ہے کہ بھٹو کی نجات کے لیے یہی کافی ہے کہ انہوں نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ فیصلہ اگرچہ قومی اسمبلی کا تھا لیکن اس کے لیے قائدِ ایوان کے طور پر بھٹو مرحوم کے کردار کو کم نہیں کیا جا سکتا۔

تارڑ صاحب کا یہ ارشاد پڑھ کر مجھے ایک پرانا واقعہ یاد آ گیا، بھٹو مرحوم کو پھانسی لگے تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ ساہیوال میں اپنے ایک دوست عبد المتین چودھری ایڈووکیٹ کی شادی پر جانے کا اتفاق ہوا۔ ہمارے ہاں پنجاب میں شادیوں پر بھانڈ حضرات جو شو پیش کرتے ہیں ان میں بعض بہت معنی خیز باتیں ہوتی ہیں۔ اس شادی میں بھی دو بھانڈ آ گئے اور اپنے مکالمے میں دیگر بعض سیاسی لیڈروں کے ساتھ بھٹو مرحوم کا بھی تذکرہ کیا۔ ایک بھانڈ نے اپنے ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میں جنت کی سیر کر کے آیا

ہوں وہاں میں نے بھٹو صاحب کو اِدھر اُدھر گھومتے دیکھا ہے۔ میں نے آگے بڑھ کر ان سے سوال کر دیا کہ بھٹو صاحب آپ جنت میں کیسے آ گئے؟ بھٹو صاحب نے کہا اللہ تعالیٰ نے مجھے کہا کہ تم نے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا ہے اس لیے میں نے تمہیں معاف کیا، جاؤ جنت میں چلے جاؤ۔ ان بھانڈوں کی زبان سے یہ مکالمہ سنتے ہوئے میرا احساس یہ تھا کہ زبانِ خلق نقارۂ خدا ہوتی ہے اور یہ بھانڈ خلقِ خدا کے جذبات کے ترجمان ہوتے ہیں، اس لیے کچھ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بھٹو مرحوم کے ساتھ یہی معاملہ کیا ہو۔

پھر بھٹو مرحوم کا اپنا احساس بھی تو یہی تھا۔ پھانسی سے قبل جیل میں ان کی اسپیشل سکیورٹی کے نگران کرنل رفیع الدین نے ''بھٹو کے آخری ۳۲۳ دن'' کے عنوان سے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ

> ''احمدیہ مسئلہ: یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جس پر بھٹو صاحب نے کئی بار کچھ نہ کچھ کہا۔ ایک بار کہنے لگے، رفیع! یہ لوگ چاہتے تھے کہ ہم ان کو پاکستان میں وہ مرتبہ دیں جو یہودیوں کو امریکہ میں حاصل ہے، یعنی ہماری ہر پالیسی ان کی مرضی کے مطابق چلے۔ ایک بار انہوں نے کہا کہ قومی اسمبلی نے ان کو غیر مسلم قرار دیا ہے اس میں میرا کیا قصور ہے؟ ایک دن اچانک انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کرنل رفیع! کیا احمدی آج کل یہ کہہ رہے ہیں کہ میری موجودہ مصیبتیں ان کے خلیفہ کی بددعا کا نتیجہ ہیں کہ میں کال کوٹھڑی میں پڑا ہوا ہوں۔ ایک مرتبہ کہنے لگے کہ بھئی! اگر ان کے اعتقاد کو دیکھا جائے تو وہ حضرت محمد ﷺ کو آخری پیغمبر ہی نہیں مانتے اور اگر وہ مجھے اپنے آپ کو غیر مسلم قرار دینے کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں تو کوئی بات نہیں۔ پھر کہنے لگے میں تو بڑا گناہ گار ہوں اور کیا معلوم میرا یہ عمل ہی میرے گناہوں کی تلافی کر جائے اور اللہ تعالیٰ میرے تمام گناہ اس نیک عمل کی بدولت معاف کر دیں۔''

کرنل رفیع کا کہنا ہے کہ میں بھٹو صاحب کی باتوں سے یہ اندازہ لگایا کرتا تھا کہ شاید ان کو گناہ وغیرہ کا کوئی احساس نہیں ہے لیکن اس دن مجھے محسوس ہوا کہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔

استعمار کا جال توڑنے کی کوشش

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد — ۲۵ اگست ۲۰۱۸ء)

...... دوسری جنگ عظیم کے بعد جب امریکہ نے مغربی استعمار کی کمان سنبھالی تھی تب سے مسلسل صورتحال یہ ہے کہ امریکہ بہادر عسکری قوت، لابنگ، میڈیا اور معاشی بالادستی کے پورے ہتھیاروں کے ساتھ عالمِ اسلام کو اپنے کنٹرول میں رکھنے اور مغربی فلسفہ و تہذیب کو امتِ مسلمہ پر مسلط کر دینے کے ایجنڈے پر عمل پیرا ہے۔ جبکہ مسلم امہ کے حکمرانوں کا عمومی رویہ ''یس سر'' کے جذبہ کے ساتھ اس کے احکامات کی ہر حال میں تعمیل کرنے کا چلا آرہا ہے۔ مختلف اوقات میں مشرقِ وسطیٰ میں جمال عبدالناصر، شاہ فیصل، مشرق بعید میں ڈاکٹر عبدالرحیم سوئیکارنو، مہاتیر محمد، جبکہ جنوبی ایشیا میں ذوالفقار علی بھٹو مرحومین جیسے لیڈروں نے اس جال کو توڑنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے مگر ''مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا'' کے مراحل سے گزر کر بھی ان کی بغاوت بالآخر دم توڑ گئی۔ اب بھی مشرق وسطیٰ سمیت پورے عالم اسلام میں امریکی پالیسیوں کی حکمرانی ہے اور ڈالر اپنی چمک دمک کا پوری قوت کے ساتھ مظاہرہ کر رہا ہے۔ اس کی تھوڑی بہت جھلک پاکستان کے سابق صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان مرحوم کی کتاب ''فرینڈز ناٹ ماسٹرز'' اور ملائیشیا کے وزیر اعظم ڈاکٹر مہاتیر محمد کی کتاب ''ایشیا کا مقدمہ'' میں دیکھی جا سکتی ہے۔......

پاکستان میں قادیانیت کا ہدف، بھٹو مرحوم کی نظر میں

(روزنامہ پاکستان، لاہور — ۳۰ دسمبر ۲۰۰۸ء)

...... قیامِ پاکستان کے بعد قادیانی گروہ کے سربراہ مرزا بشیر الدین محمود نے اپنے پیروکاروں کو دوبارہ ''اکھنڈ بھارت'' قائم ہونے کی طفل تسلی دی اور عالمی استعمار کے زیر سایہ گروہ آج بھی دنیا بھر میں پاکستان اور پاکستانی قوم کے خلاف لابنگ اور پروپیگنڈے کا بازار گرم کیے ہوئے ہے۔ ایسے شواہد تاریخی ریکارڈ پر موجود ہیں کہ ۱۹۷۱ء میں وطنِ عزیز کو دولخت کرنے کی سازش میں قادیانی گروہ کے سرکردہ افراد بالخصوص مرزا غلام احمد قادیانی کے پوتے ایم ایم احمد (مرزا مظفر احمد) کا نمایاں کردار ہے۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں بھی پاکستان کے مفاد کے خلاف قادیانیوں کی سرگرمیاں اربابِ حل و عقد کے علم میں ہیں جو تاریخی ریکارڈ کا حصہ ہیں۔ جبکہ اس وقت صورتحال یہ ہے کہ ۱۹۷۴ء میں پاکستان کی منتخب پارلیمنٹ نے جناب ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں پاکستانی عوام کے دیرینہ مطالبے اور طویل جدوجہد کے نتیجے میں قادیانیوں کو دستوری طور پر غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا فیصلہ کیا۔ لیکن قادیانی گروہ تب سے عوام کی منتخب پارلیمنٹ کے اس متفقہ فیصلے اور دستور پاکستان کی دفعات کو مسترد کرتے ہوئے دستوری بغاوت کے ماحول میں ملتِ اسلامیہ اور پاکستان کے خلاف دنیا بھر میں کردارکشی کی مہم جاری رکھے ہوئے ہے اور اس کے لیے پاکستان دشمن قوتوں کے ہاتھوں آلۂ کار بنا ہوا ہے۔

چنانچہ پاکستان کے اسلامی تشخص کو ختم کرنے اور اس کو ایک سیکولر ریاست میں تبدیل کرنے کے لیے عالمی استعمار کا جو ایجنڈا اس وقت سامنے ہے اس میں دستورِ پاکستان کی اسلامی دفعات کو ختم کرنے اور نافذ شدہ چند شرعی قوانین کو ترامیم کے ذریعے بے اثر بنانے کے ساتھ ساتھ توہینِ رسالتؐ کے جرم پر سزا کے قانون اور قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے فیصلے کا خاتمہ بھی شامل ہے۔ اس استعماری ایجنڈے کی آڑ میں قادیانی گروہ پاکستان میں خود کو دوبارہ مسلم گروہ تسلیم کرانے اور ملک کی اسٹیبلشمنٹ میں اثر و رسوخ قائم کرنے کے لیے پیش قدمی کر رہا ہے جس کا ہدف جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے بقول یہ ہے کہ:

> ''قادیانی یہ چاہتے ہیں کہ انہیں پاکستان میں وہی مقام حاصل ہو جو امریکہ میں یہودیوں کو حاصل ہے کہ ہماری کوئی پالیسی ان کی مرضی کے بغیر طے نہ ہو۔''

پاکستان بننے کے بعد ۱۹۷۴ء تک اس ہدف کی طرف قادیانیوں نے جتنی پیشرفت کی تھی جناب ذوالفقار علی بھٹو کی وزارتِ عظمیٰ کے دور میں پارلیمنٹ کے متفقہ فیصلے نے نہ صرف اسے بریک لگا دی تھی

بلکہ اسے سبوتاژ کر دیا تھا، لیکن قادیانی گروہ آج بھی اسی ہدف کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جہاں پاکستان کے اسلامی تشخص کو ختم کرنے کی خواہشمند عالمی قوتیں ان کی سرپرستی کر رہی ہیں وہاں ملک کے اندر لادین عناصر اور بیوروکریسی کے دین دشمن حلقے بھی اس مقصد اور پروگرام میں قادیانیوں کے معاون بنے ہوئے ہیں۔ بین الاقوامی رپورٹوں کے مطابق پارلیمنٹ میں حدود آرڈیننس میں کی گئی ترامیم کی طرح قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے دستوری فیصلے کو بے اثر بنانے کے لیے بھی ترمیمی بل لانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔

ان حالات میں یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ۱۹۵۳ء، ۱۹۷۴ء اور ۱۹۸۴ء کی طرح ایک بار پھر ''کُل جماعتی مجلسِ عملِ تحفظِ ختمِ نبوت'' کے فورم کو متحرک کیا جائے اور قادیانیوں کی اس سازش کو ناکام بنانے کے لیے تمام مکاتبِ فکر کے علمائے کرام اور دینی کارکن مشترکہ جدوجہد کا اہتمام کریں۔......

مسئلہ قادیانیت: بھٹو مرحوم کا مفتی محمودؒ سے سوال

(روزنامہ اسلام، لاہور — ۱۴ا اکتوبر ۲۰۱۶ء)

...... مفتی صاحبؒ نے ایک موقع پر بتایا کہ قومی اسمبلی میں قادیانیت کے حوالہ سے بحث طول پکڑ گئی اور قادیانی امت کے سربراہ مرزا ناصر احمد کی طرف سے قرآن کریم کی آیات اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پیش کیے جانے کے باعث اسمبلی کے وہ ارکان تشویش کا شکار ہونے لگے جو قرآن و حدیث کا علم نہیں رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ''خاتم النبیین'' کے مختلف معنوں اور توجیہات نے اس تشویش میں اضافہ کر دیا، حتیٰ کہ خود وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے مفتی صاحبؒ سے کہا کہ دونوں طرف سے آیتیں اور حدیثیں پیش کی جاری ہیں اور حوالے دیے جا رہے ہیں جو ہماری سمجھ میں نہیں آ رہے۔ اس لیے ہمیں تو قرآن کریم سے کوئی سیدھی سی بات بتائیں کہ حضرت محمدؐ کے بعد نبی نہیں آئے گا تب بات ہماری سمجھ میں آ سکتی ہے۔

مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ بھٹو مرحوم کی یہ بات سن کر ایک بار تو مجھے بھی پریشانی سی ہوئی پھر اللہ تعالیٰ نے ذہن میں بات ڈال دی اور میں نے کہا کہ بھٹو صاحب! یہ بات تو قرآن کریم نے آغاز میں ہی واضح کر دی ہے کہ سورۃ البقرہ کی ابتدائی آیات میں اللہ تعالیٰ نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا ہے کہ مومن وہی ہے جو اس وحی پر ایمان لاتا ہے جو آپؐ پر نازل ہوئی ہے اور اس وحی پر بھی ایمان رکھتا ہے جو آپؐ سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ اگر آنحضرتؐ کے بعد وحی نازل ہونا ہوتی تو اس کا بھی یہاں ذکر ہوتا، چونکہ اس کا ذکر نہیں ہے اس لیے حضورؐ کے بعد کسی وحی کا نزول نہیں ہوگا۔ یہ بات سن کر بھٹو مرحوم نے کہا کہ بس بات سمجھ میں آ گئی ہے، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔......

مسئلہ قادیانیت کا حل: بھٹو مرحوم کا تاریخی کارنامہ

(روزنامہ پاکستان، لاہور — ۱۲ستمبر ۲۰۱۱ء)

۷ ستمبر کا دن ملک بھر کے دینی حلقوں میں ''یومِ ختمِ نبوت'' کے طور پر منایا جاتا ہے، اس لیے کہ اس روز ۱۹۷۴ء میں پاکستان کی منتخب پارلیمنٹ نے ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی قیادت میں قادیانیوں کا ۹۰ سالہ مسئلہ حل کرتے ہوئے رائے عامہ اور دینی حلقوں کا یہ متفقہ موقف دستوری طور پر تسلیم کر لیا تھا کہ قادیانی گروہ ایک نئے نبی کا پیروکار ہونے کی وجہ سے امتِ مسلمہ کا حصہ نہیں رہا، اس لیے اسے مسلمانوں کا حصہ سمجھنے کی بجائے ملک کی غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ شمار کیا جائے۔

قومی اسمبلی میں بحث کے دوران مختلف مکاتبِ فکر کے سرکردہ علماء کرام مولانا مفتی محمودؒ، مولانا عبد الحقؒ، مولانا غلام غوث ہزارویؒ، مولانا شاہ احمد نورانیؒ، مولانا عبد المصطفیٰ الازہریؒ، مولانا عبد الحکیمؒ، مولانا محمد ذاکرؒ، مولانا ظفر احمد انصاریؒ، پروفیسر عبد الغفور احمد اور مسلم لیگی رہنما چودھری ظہور الٰہی مرحوم نے بحث میں بھرپور حصہ لیا تھا، جبکہ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی معاونت میں عبد الحفیظ پیرزادہ اور اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار مرحوم پیش پیش رہے۔

قادیانی امت کے دونوں گروہوں کے سربراہوں مرزا ناصر احمد اور مولوی صدر الدین نے کئی روز تک پارلیمنٹ کے فلور پر اپنے موقف کی وضاحت کی اور ارکان قومی اسمبلی کے سوالات کے جوابات دیے۔ اس کے بعد قومی اسمبلی اور پھر سینٹ نے وزیر قانون عبد الحفیظ پیرزادہ کا پیش کردہ مسودۂ قانون منظور کر لیا تھا جس میں طے کیا گیا ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنے والے اور اس پر ایمان رکھنے والے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور و قانون کی نظر میں مسلمان نہیں ہیں، اس لیے پاکستان میں بسنے والے ان تمام لوگوں کو جو مرزا غلام احمد قادیانی کو نبی یا مہدی مانتے ہیں، غیر مسلم اقلیتوں میں شمار کیا جائے گا۔

اس تاریخی فیصلے پر دنیا بھر کے مسلمانوں نے خوشی کا اظہار کیا تھا مگر قادیانیوں نے، جو خود کو احمدی کہلاتے ہیں، یہ فیصلہ قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس انکار پر وہ کم و بیش چار عشرے گزر جانے کے باوجود آج بھی قائم ہیں اور دنیا بھر میں اپنے ہم خیال حلقوں اور لابیوں کے ساتھ مل کر دستور پاکستان کے اس فیصلے کے خلاف مہم جاری رکھے ہوئے ہیں۔

اس پس منظر میں ۷ ستمبر کو یومِ ختمِ نبوت منانے کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ اس دن کی یاد تازہ کی جائے اور فیصلہ کرنے والوں کو خراجِ تحسین پیش کیا جائے، جبکہ دوسرا بڑا مقصد یہ ہے کہ اس دستوری فیصلے کے خلاف عالمی سطح پر جو مہم جاری ہے اس سے باخبر رہا جائے، اور عقیدۂ ختمِ نبوت کے ساتھ ساتھ پاکستانی پارلیمنٹ کے اس دستوری فیصلے کے تحفظ کے لیے رائے عامہ کو بیدار رکھنے کا کام جاری رہے۔......

قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا پارلیمانی فیصلہ

(روزنامہ اسلام، لاہور ــــ ۱۱ اکتوبر ۲۰۱۳ء)

اب سے چار عشرے قبل ۱۹۷۴ء کی بات ہے جب چناب نگر (سابق ربوہ) کے ریلوے اسٹیشن پر نشتر میڈیکل کالج ملتان کے سٹوڈنٹس کے ساتھ قادیانی نوجوانوں کے تصادم کے نتیجے میں ملک بھر میں احتجاجی مظاہروں نے زور پکڑا اور بات قومی اسمبلی تک پہنچی تو اس وقت ملک کے وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم اور قومی اسمبلی میں اپوزیشن لیڈر مولانا مفتی محمودؒ تھے۔

ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی مدبرانہ حکمتِ عملی

قومی اسمبلی میں مسلمانوں کے اس اجتماعی مطالبہ کا ذکر ہوا تو بھٹو مرحوم نے کمال دانش مندی سے کام لیتے ہوئے اسے فرقہ وارانہ عنوان سے پیش کرنے کی بجائے قوم کی اجتماعی سوچ کا رخ دیا اور قائدِ حزبِ اختلاف کے مشورہ سے طے کیا کہ قومی اسمبلی کے پورے ایوان کو خصوصی کمیٹی کا عنوان دے کر اس فورم پر قادیانی امت کے دونوں گروہوں کے قائدین کو اپنا موقف پیش کرنے کا موقع دیا جائے اور ملک کے اٹارنی جنرل جناب یحییٰ بختیار کو کمیٹی کی طرف سے کیس پیش کرنے اور سوال و جواب کے مراحل طے کرنے کے لیے کہا جائے۔ تاکہ پورا ایوان ایک خصوصی کمیٹی کی صورت میں دونوں طرف کے دلائل تفصیل کے ساتھ سن کر متفقہ سفارشات مرتب کر سکے اور اس طرح اس مسئلہ کو قومی اتفاق رائے کے ساتھ طے کیا جائے کہ کسی کو اس فیصلے کے کسی پہلو پر انگلی اٹھانے کا موقع نہ مل سکے۔ یہ ایک انتہائی مدبرانہ فیصلہ تھا جس نے قادیانی مسئلہ کو فرقہ وارانہ دائرے سے نکال کر قومی مسئلہ کی شکل دے دی اور پارلیمنٹ کے لیے اس کے بارے میں فیصلہ کرنا آسان ہو گیا۔

قومی اسمبلی کی اکیس روزہ کاروائی

قومی اسمبلی کے تمام ارکان پر مشتمل خصوصی کمیٹی نے کم و بیش ۲۱ دن تک اس مسئلہ پر غور کیا اور اس دوران قادیانی گروہ کے سربراہ مرزا ناصر احمد اور قادیانیوں کے لاہوری گروپ کے راہنما صدر الدین لاہوری، مسعود بیگ اور عبد المنان لاہوری نے مجموعی طور پر تیرہ دن تک اس فورم پر اپنے عقائد اور موقف کی وضاحت کرتے ہوئے سوالات کے جوابات دیے۔ کمیٹی کے ہر رکن کو سوال کرنے کا حق تھا جس کا طریق کار یہ تھا کہ اٹارنی جنرل جناب یحییٰ بختیار خصوصی کمیٹی کی طرف سے وکیل تھے، سوال ان کے

پاس آتا تھا اور وہ اسے پیش کر کے کمیٹی کے سامنے ان حضرات سے جواب حاصل کرتے تھے۔ اکیس دن کی کاروائی میں تیرہ دن تک ان حضرات سے سوال و جواب ہوتے رہے جبکہ باقی ایام میں کمیٹی نے اپنے طور پر اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا۔

''ملتِ اسلامیہ کا متفقہ موقف''

اس دوران کُل جماعتی مجلسِ تحفظِ ختمِ نبوت کے سربراہ مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ کی راہنمائی میں مسلمانوں کا متفقہ موقف اسمبلی کے سامنے پیش کرنے کے لیے مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، مولانا سمیع الحق، مولانا محمد حیاتؒ، مولانا تاج محمودؒ، مولانا عبدالرحیم اشعرؒ اور مولانا محمد شریف جالندھریؒ پر مشتمل علماء کرام کا گروپ اس موقف کا مسودہ مرتب کرنے کے کام میں مصروف رہا۔ جبکہ مولانا مفتی محمودؒ، مولانا شاہ احمد نورانیؒ، مولانا ظفر احمد انصاریؒ، پروفیسر غفور احمدؒ اور چودھری ظہور الٰہیؒ اس کام کی نگرانی کرتے رہے۔

قومی اسمبلی میں یہ موقف ''ملتِ اسلامیہ کا متفقہ موقف'' کے عنوان سے مولانا مفتی محمودؒ نے اپوزیشن لیڈر کی حیثیت سے دو روز مسلسل پڑھ کر سنایا، جبکہ مولانا غلام غوث ہزارویؒ نے اپنی طرف سے ایک تفصیلی عرضداشت پیش کی جو اُن کے رفیق کار مولانا عبدالحکیمؒ نے ایوان میں پڑھ کر سنائی۔ قومی اسمبلی کے اسپیکر صاحبزادہ فاروق علی خان خصوصی کمیٹی کے بھی چیئرمین تھے اور یہ ساری کاروائی ان کی صدارت میں انجام پائی۔

وزیر قانون جناب عبدالحفیظ پیرزادہ کے ریمارکس

خصوصی کمیٹی نے اکیس دن تک جبکہ قومی اسمبلی نے کم و بیش تین ماہ تک اس مسئلہ پر غور کیا اور کمیٹی کی اکیس روزہ کاروائی کے نچوڑ کے طور پر وزیر قانون جناب عبدالحفیظ پیرزادہ نے کمیٹی سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ:

> ''ہم گزشتہ تین ماہ سے اس موضوع پر بات کر رہے ہیں۔ مجھے اس نقطۂ نظر سے اپنے عدمِ علم کا اعتراف کرنا ہے کہ میں اس مسئلہ کو اتنا گہرائی سے نہیں جانتا جتنا کچھ دوسرے ارکان جانتے ہیں، پوری تفصیل کے ساتھ اس مسئلے کو سننے کے بعد اب ہم محسوس کر سکتے ہیں کہ ایک مسلمان اس مسئلہ سے متعلق اتنا گہرا اور جذباتی ردعمل کیوں ظاہر کرتا ہے؟ ہماری ان نشستوں، مباحث اور غور و فکر کا حاصل یہ ہے کہ ختمِ نبوت جیسا کہ جمہور مسلمانوں کا بھی عقیدہ ہے، تمام مسلمانوں کے ایمان کا جز ہے اور خواہ کچھ بھی وہ جائے مسلمان کسی بھی حوالے سے ختمِ نبوت کے اس بنیادی عقیدے کے معاملہ میں لچک کے روادار نہیں ہو سکتے۔

جناب والا! اس لیے میں نے کہا کہ یہ حکومت یا حزب مخالف کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ ہمیں اسے ایک قومی مسئلہ کے طور پر لینا چاہیے۔ قوم اس بات کی متحمل نہیں ہو سکتی کہ اتنے سنگین مسئلے پر تقسیم ہو جائے اور اس لیے قائد حکومت جناب وزیراعظم پاکستان کے ذریعہ حکومت اور اس ایوان میں براجمان تمام رفقاء کی یہی کوشش رہی ہے کہ اتفاق رائے تک پہنچا جائے۔ یہ میرے لیے ایک اعزاز ہے کہ میں اکثریتی پارٹی اور اپنے دوستوں جنہوں نے مجھے یہ ذمہ داری سونپی ہے، ان کی جانب سے اس معزز کمیٹی کے سامنے یہ قرارداد پیش کروں کہ ہم اتفاق رائے تک پہنچ چکے ہیں، اور یہ قرارداد میں اپنی طرف سے اور مولانا مفتی محمودؒ، مولانا شاہ احمد نورانی صدیقیؒ، پروفیسر غفور احمدؒ، جناب غلام فاروقؒ، چودھری ظہور الٰہیؒ اور سردار مولانا بخش سومروؒ کی جانب سے پیش کرتا ہوں۔"

یہ جناب عبدالحفیظ پیرزادہ کے اس تفصیلی خطاب کا حصہ ہے جو انہوں نے وزیر قانون کی حیثیت سے کمیٹی کے اختتامی سیشن میں کیا۔ اور جو قرارداد انہوں نے مذکورہ بالا رفقاء کی طرف سے پیش کی وہ یہ ہے کہ:

"میں اپنی طرف سے اور اپنے دوستوں کی جانب سے جن دستوری ترامیم کی سفارش کرتا ہوں وہ دو ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ دستوری ترمیم کے ذریعہ اس شخص کی تعریف متعین کر دی جائے جو مسلمان نہیں ہے۔ یہ تعریف آرٹیکل ۲۶۰ میں ایک شق کے اضافے کی صورت میں ہوگی، آئین کے آرٹیکل ۲۶۰ کی دو شقیں ہیں، یہ آرٹیکل تعریف سے متعلق ہے اور ہم اس آرٹیکل میں شق نمبر ۳ کے اضافے کے ذریعہ غیر مسلم کی حسب ذیل تعریف کا اضافہ کریں گے:

"ایسا شخص جو خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حتمی اور غیر مشروط ختم نبوت کو نہیں مانتا، یا لفظ کے کسی بھی مفہوم اور وضاحت میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے یا ایسے دعویدار کو نبی یا مذہبی مصلح مانتا ہے، اس آئین یا قانون کے مقاصد کے لحاظ سے وہ مسلمان نہیں ہے۔"

اس کے ساتھ ہی دوسری ترمیم کا ذکر ہے جس کے تحت اسمبلیوں میں غیر مسلم اقلیتوں کے لیے مخصوص نشستوں کے حوالہ سے قادیانیوں کے دونوں گروہوں کا ذکر بھی شامل کیا گیا ہے۔

قومی اسمبلی کی مذکورہ کارروائی کی اشاعت

قادیانی مسئلہ پر قومی اسمبلی کی خصوصی کمیٹی کے طور پر اس کارروائی کے بارے میں یہ گزارشات پیش کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی ہے کہ خصوصی کمیٹی کی یہ کارروائی قومی اسمبلی کے سیکرٹریٹ کی طرف

سے مکمل طور پر منظرِ عام پر آچکی ہے اور قومی اسمبلی کی ویب سائیٹ پر موجود ہے۔ اس سے قبل یہ کاروائی صیغۂ راز میں تھی اور مسلسل مطالبہ ہو رہا تھا کہ اسے شائع کیا جائے۔ عام طور پر خفیہ دستاویزات کو تیس سال کے بعد اوپن کر دینے کی روایت موجود ہے جس کے تحت قومی اسمبلی کی سابق اسپیکر محترمہ ڈاکٹر فہمیدہ مرزا نے اس کی اشاعت کا حکم دیا تھا۔ البتہ اسے کتابی شکل میں شائع کرنے کی بجائے انٹرنیٹ پر اوپن کر دیا گیا۔

عالمی مجلسِ تحفظِ ختمِ نبوت کے مرکزی راہنما مولانا اللہ وسایا پوری قوم کی طرف سے شکریہ اور مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے یہ ساری کاروائی انٹرنیٹ سے لے کر اسے ایڈیٹ کرنے کے بعد من وعن کتابی شکل میں مرتب کر دی ہے جو پانچ ضخیم جلدوں میں کم وبیش تین ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ عالمی مجلسِ تحفظِ ختمِ نبوت کے مرکزی دفتر حضوری باغ روڈ ملتان نے اسے شائع کیا ہے اور اس طرح قادیانیوں کی طرف سے گزشتہ چالیس سال کے دوران کیے جانے والے اس پروپیگنڈا کا پردہ بھی چاک ہوگیا ہے کہ اس رپورٹ کی اشاعت سے مسلمانوں میں بھونچال آجائے گا اور ان کے خیال میں اسے پڑھ کر پاکستان کی نصف کے لگ بھگ آبادی علماء کرام کا ساتھ چھوڑ دینے پر مجبور ہو جائے گی۔

مولانا اللہ وسایا کی ”احتسابِ قادیانیت“

مولانا اللہ وسایا اور عالمی مجلسِ تحفظِ ختمِ نبوت کی ہمت کی داد ایک اور حوالہ سے دینا بھی ضروری ہے کہ قادیانیت کے آغاز سے اب تک اس کے حوالہ سے مسلمانوں کے مختلف مکاتبِ فکر کے علماء کرام کی طرف سے شائع کی جانے والی تحریروں کا بہت بڑا ذخیرہ ”احتسابِ قادیانیت“ کے عنوان سے شائع کرنے کا سلسلہ جاری ہے جس کی اب تک ۵۳ جلدیں شائع ہو چکی ہیں جو پچیس ہزار سے زائد صفحات کا احاطہ کرتی ہیں اور تین سو سے زائد اصحابِ قلم کی چھ سو سے زائد قلمی نگارشات اس عظیم ذخیرے کا حصہ ہیں۔

قادیانیوں کے حوالہ سے مسلمانوں کے موقف اور جدوجہد کے بارے میں گزشتہ ڈیڑھ سو سال کی تاریخ، اہلِ اسلام کے جذبات اور تحریکی مد وجزر کے ضمن میں معلومات کے لیے یہ دو عظیم دستاویزات انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہیں اور کسی بھی مؤرخ یا محقق کو بہت سی لائبریریوں سے مستغنی کر دینے کے لیے کافی ہیں۔ بالخصوص قومی اسمبلی کی خصوصی کمیٹی کی یہ اکیس روزہ کاروائی تو مسلمانوں میں اس کی اشاعت پر بھونچال آجانے کی قادیانی دھمکی کے جواب میں عالمی مجلسِ تحفظِ ختمِ نبوت کی طرف سے ”گر بھی حاضر ہے میدان بھی حاضر ہے“ کے جوابی چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے جس پر تحریکِ ختمِ نبوت کے ایک کارکن اور تاریخ کے ایک طالب علم کے طور پر مولانا اللہ وسایا کو سلام پیش کرتا ہوں۔

قادیانی فیصلہ: بھٹو مرحوم کے احساسات

(روزنامہ اسلام، لاہور — ۱۳ ستمبر ۲۰۱۶ء)

......۷ ستمبر ۱۹۷۴ء کو پاکستان کی منتخب پارلیمنٹ میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت کیوں قرار دیا گیا تھا؟ اس کے بارے میں ضرورت کے مواقع پر تفصیلی گفتگو کی جاتی ہے مگر میں جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے جذبات و احساسات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو اس فیصلے کے وقت پارلیمنٹ کے قائد ایوان تھے۔ انہوں نے اس فیصلہ کی خود وضاحت کی ہے اور بتایا ہے کہ انہوں نے یہ فیصلہ اس لیے کیا تھا کہ

۱. قادیانی حضرات ہمارے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی تسلیم نہیں کرتے،

۲. قادیانی امت پاکستان میں وہ مقام حاصل کرنے کے لیے تگ و دو کر رہی ہے جو امریکہ میں یہودیوں کو حاصل ہے کہ ملک کی کوئی پالیسی ان کی مرضی کے بغیر تشکیل نہ پا سکے، اور

۳. وہ (بھٹو مرحوم) یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا یہ فیصلہ اور اقدام قیامت کے دن ان کی بخشش کا ذریعہ بنے گا۔

میرے خیال میں اس تاریخی فیصلے کے بارے میں سب مسلمانوں کے جذبات اسی قسم کے ہیں اور یہ صرف دینی حلقوں کا نہیں بلکہ ملتِ اسلامیہ کے ہر طبقہ کا مسئلہ ہے اور ایک قومی مسئلہ کی حیثیت رکھتا ہے۔......

ووٹر فارم سے مذہب کا خانہ اور عقیدۂ ختمِ نبوت کے حلف نامہ کا خاتمہ

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ — مئی ۲۰۰۲ء)

تمام مذہبی مکاتبِ فکر کے سرکردہ علماء کرام نے جداگانہ طرز انتخاب کے خاتمہ اور ووٹر کے اندراج کے فارم میں مذہب کا خانہ اور عقیدۂ ختمِ نبوت کا حلف ختم کرنے کے فیصلوں کو مسترد کر دیا ہے اور حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ یہ فیصلے فی الفور واپس لے کر دستور کی اسلامی دفعات کے تحفظ کو یقینی بنایا جائے۔ یہ فیصلہ عالمی مجلسِ تحفظِ ختمِ نبوت کی دعوت پر ۴ مئی ۲۰۰۲ء کو لاہور میں منعقد ہونے والے ایک اجلاس میں کیا گیا جس میں طے پایا کہ اس سلسلے میں تمام مذہبی جماعتوں کا سربراہی اجلاس طلب کیا جائے گا جس کے لیے جمعیت علماء اسلام (ف) نے میزبانی کی ذمہ داری قبول کر لی ہے۔......

قادیانیوں کو مسلمانوں میں شامل کرنے کا اقدام

اجلاس میں اس بات کو شدت کے ساتھ محسوس کیا گیا کہ امریکی کانگریس کی طرف سے قادیانیوں کو مسلمان تسلیم کرنے کے مطالبہ کے فوراً بعد مسلم اور غیر مسلم ووٹروں کے الگ الگ اندراج اور ووٹر فارم میں مذہب کا خانہ اور عقیدۂ ختمِ نبوت کا حلف نامہ ختم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے جو عملاً قادیانیوں کو مسلمانوں میں شامل کرنے اور سرکاری ریکارڈ میں مسلمانوں اور قادیانیوں کا فرق ختم کر دینے کے مترادف ہے جو اسلامیانِ پاکستان کے لیے قطعی طور پر ناقابلِ برداشت ہے۔

بھٹو مرحوم کے دور سے چلے آنے والا اندراج

جبکہ یہ حلف نامہ اور مذہب کا خانہ نیز مسلم اور غیر مسلم ووٹروں کا الگ الگ اندراج بھٹو حکومت کے دور سے چلا آ رہا ہے جب مخلوط الیکشن کا طریقہ رائج تھا اس لیے اس مسئلہ کا تعلق جداگانہ الیکشن سے نہیں بلکہ قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے دستوری فیصلے پر عمل درآمد سے ہے اور اسے ختم کر کے دستور پاکستان کے اس فیصلے کو غیر مؤثر بنانے کی سازش کی گئی ہے۔ اس لیے یہ اجلاس حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ جداگانہ طرز انتخاب اور ووٹر فارم میں عقیدۂ ختمِ نبوت کا حلف نامہ ختم کرنے کے فیصلے فی الفور واپس لے کر اسلامیانِ پاکستان کو دستور کی اسلامی دفعات کے تحفظ کے حوالے سے مطمئن کیا جائے۔......

قومی اقلیتی کمیشن میں قادیانیوں کی نمائندگی کا معاملہ

(روزنامہ اسلام، لاہور — ۱۲ جون ۲۰۲۰ء)

گزشتہ دنوں قادیانیوں کو قومی اقلیتی کمیشن میں نمائندگی دینے یا کسی قادیانی کو کمیشن کا رکن بنانے کی خبریں منظرعام پر آئیں تو اس پر ملک بھر میں تشویش پیدا ہوگئی کہ یہ قادیانیوں کو چور دروازے سے مین اسٹریم میں داخل کرنے کی سازش ہو سکتی ہے۔ اس پر اعتراضات و خدشات کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ہم نے بھی اس کالم میں تحفظات کا اظہار کیا، چنانچہ وفاقی کابینہ کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ کسی قادیانی کو اقلیتی کمیشن کا ممبر نہیں بنایا جا رہا۔ یہ اعلان دینی حلقوں کے لیے اطمینان کا باعث بنا اور عمومی طور پر اس کا خیر مقدم کیا گیا مگر اسلام آباد کی ’’شہداء فاؤنڈیشن‘‘ نے اسلام آباد ہائیکورٹ میں قادیانیوں کو قومی اقلیتی کمیشن میں نمائندگی نہ دینے کے فیصلے کو چیلنج کر دیا اور باضابطہ رٹ دائر کی جس سے تشویش و اضطراب کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا کہ جب مسئلہ نمٹ گیا تھا تو از سرِ نو اسے دوبارہ کیوں چھیڑا گیا ہے۔......

اس سلسلہ میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر کوئی قادیانی قومی اقلیتی کمیشن کا ممبر بن جاتا تو یہ انہیں سرکاری طور پر اقلیت قرار دینے کے مترادف ہوتا، مگر ہم اس کالم میں اس کی وضاحت کر چکے ہیں کہ بھٹو مرحوم کے دور میں اس کا تجربہ کیا گیا تھا جو ناکام ہو گیا تھا۔ وہ اس طرح کہ ایک قادیانی کو قومی اسمبلی، اور ایک کو صوبائی اسمبلی کا ممبر بنوایا گیا تھا، مگر قادیانی جماعت نے انہیں اپنا نمائندہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور دوٹوک کہہ دیا تھا کہ جب وہ دستور کے اس فیصلہ کو ہی نہیں مانتے جس میں انہیں اقلیتوں میں شمار کیا گیا ہے تو وہ کسی قادیانی کو اقلیتی سیٹ پر اپنا نمائندہ کیسے تسلیم کر سکتے ہیں؟

دینی مدارس کی اسناد کا معاملہ اور بھٹو مرحوم

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ — اجولائی ۲۰۰۳ء)

...... جہاں تک درسِ نظامی کی اسناد کا تعلق ہے اس سلسلہ میں سب سے پہلے ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے دورِ حکومت میں قومی اسمبلی نے ایک قرار داد کے ذریعہ سفارش کی تھی کہ درسِ نظامی کے فضلاء کی اسناد کو ایم اے کے برابر تسلیم کیا جائے کیونکہ تعلیمی معیار کے لحاظ سے درس نظامی کے فضلاء ایم اے کے تقاضے پورے کرتے ہیں۔

اس قرار داد کی بنیاد پر یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے، جو اسناد کی حیثیت متعیّن کرنے کا دستوری ادارہ ہے، دینی مدارس کے مختلف وفاقوں کے ساتھ طویل مذاکرات، دینی مدارس کے تعلیمی اور امتحانی نظام کے مسلسل جائزہ اور اس میں متعدّد اصلاحات و ترامیم تجویز کرنے کے بعد باقاعدہ نوٹیفکیشن جاری کر دیا تھا کہ دینی مدارس کے وفاقوں کی ثانویہ عامہ، ثانویہ خاصہ، عالیہ اور عالمیہ کی اسناد بالترتیب میٹرک، ایف اے، بی اے اور ایم اے کے برابر ہوں گی اور انہیں ملک کے دیگر ادارے تعلیمی مقاصد کے لیے قبول کرنے کے پابند ہوں گے۔ چنانچہ اس نوٹیفکیشن کے مطابق ملک کی مختلف یونیورسٹیوں میں درسِ نظامی کے بہت سے فضلاء نے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے حوالہ سے تعلیمی پیشرفت کی ہے اور انہیں ہر سطح پر تسلیم کیا جا رہا ہے۔

لیکن اب اس بات کو بہانہ بنا کر کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے ان اسناد کو صرف تعلیمی مقاصد کے لیے ایم اے کے برابر تسلیم کیا تھا اس لیے دوسرے شعبوں میں ان اسناد کو ایم اے کے برابر قرار نہیں دیا جا سکتا، ان اسناد کو چیلنج کر دیا گیا ہے۔ جس کا مقصد اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا کہ متحدہ مجلسِ عمل کو دباؤ میں رکھا جائے اور بوقتِ ضرورت ملک کے دینی حلقوں اور علماء کرام کو انتخابی سیاست کے میدان سے کلیتہً خارج کرنے کے لیے اسے بطور ہتھیار استعمال کیا جا سکے۔

(روزنامہ اسلام، لاہور — ۶ جولائی ۲۰۰۳ء)

...... یہ ۱۹۷۳ء کی بات ہے جب جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم قومی اسمبلی میں قائدِ ایوان تھے اور اس طرح قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے ساتھ ساتھ اس کارِ خیر کی سعادت بھی ان کے حصے میں آئی کہ ان کی قیادت میں قومی اسمبلی کے ایوان نے دینی مدارس کی سند کو سرکاری سطح پر تسلیم کرنے کی باقاعدہ سفارش کی۔

اس کے بعد یہ مسئلہ ''یونیورسٹی گرانٹس کمیشن'' کے پاس آیا جو اس سلسلہ میں مجاز اتھارٹی ہے۔ کئی برس تک گفتگو، عرضداشتوں اور وضاحتوں کا معاملہ چلتا رہا اور وفاق المدارس العربیہ پاکستان اور دیگر وفاقوں کے ساتھ طویل گفت وشنید اور بحث وتمحیص کے بعد یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے دینی مدارس کے نصاب کی درجہ بندی کرا کے ان کی مختلف سندات کو میٹرک، ایف اے، بی اے اور ایم اے کے برابر قرار دینے کا باقاعدہ نوٹیفکیشن جاری کر دیا۔ جس کی بنیاد پر مختلف یونیورسٹیوں میں بہت سے فضلاء نے ایم فل، پی ایچ ڈی اور دیگر امتحانات کی طرف پیشرفت کی اور ڈگریاں حاصل کر کے متعدّد شعبوں میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔......

جمعہ کی چھٹی اور شراب پر پابندی کے اقدامات

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ ۔۔۔ مارچ ۲۰۰۰ء)

ہفت روزہ الہلال اسلام آباد ۱۸ فروری ۲۰۰۰ء کی رپورٹ کے مطابق اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر ایس ایم زمان نے حکومت کو سمری بھجوائی ہے جس میں جمعہ کی چھٹی کی بحالی کی تجویز پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ قرآن و سنت کی تعلیمات اور ملتِ اسلامیہ کی روایات کے مطابق ہفتہ وار تعطیل جمعہ کے دن ہی مناسب ہے، اور اس سلسلہ میں ملک بھر کی دینی جماعتیں اور عوامی حلقے ایک عرصہ سے مطالبہ کر رہے ہیں، اس لیے جمعہ کی سرکاری چھٹی بحال کر دی جائے۔

پاکستان میں جمعہ کی سرکاری چھٹی جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے دینی جماعتوں کے مطالبہ پر کی تھی جسے میاں نواز شریف نے اپنے دورِ حکومت میں منسوخ کر کے اتوار کی چھٹی کا اعلان کر دیا تھا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس سلسلہ میں عالمی طاقتوں کا دباؤ تھا جس کی وجہ سے انہوں نے ایسا کیا۔ مگر ملک کے دینی حلقے اس کے بعد سے اس پر مسلسل احتجاج کر رہے ہیں اور اسے مغربی اقدام کی نقالی قرار دے کر جمعہ کی چھٹی کی دوبارہ بحالی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

اس پس منظر میں اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین کی طرف سے حکومت کو بھجوائی جانے والی مذکورہ سمری ایک خوش آئند فیصلہ ہے جس کا خیر مقدم کرتے ہوئے ہم حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ ملک کے دینی و عوامی حلقوں کا مطالبہ پورا کرتے ہوئے جلد از جلد جمعہ کی چھٹی بحال کرنے کا اعلان کیا جائے۔

(روزنامہ پاکستان، لاہور ۔۔۔ ۶ ستمبر ۲۰۰۸ء)

......(امریکہ میں) ایک صاحب نے مجھ سے سوال کیا کہ پاکستان میں نفاذِ شریعت کی جدوجہد کا مستقبل کیا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ نفاذِ شریعت کے لیے جب تک جمہوری عمل اور سیاسی جدوجہد کے ذریعے محنت ہوتی رہی ہم نے مسلسل پیشرفت کی:

- قراردادِ مقاصد جمہوری عمل کا ثمرہ ہے،
- ۱۹۷۳ء کے دستور میں اسلامی دفعات سیاسی جدوجہد کا نتیجہ ہیں،
- قادیانی مسئلہ کا مستقل حل پارلیمنٹ کا کارنامہ ہے،

- حتیٰ کہ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے اپنے اقتدار کے آخری ایام میں شراب پر پابندی اور جمعہ کی چھٹی وغیرہ کے جو اعلانات کیے تھے وہ بھی ایک جمہوری تحریک کے پس منظر میں تھے۔
- پھر جنرل ضیاء الحق مرحوم نے نفاذِ شریعت کے لیے جو چند اقدامات کیے ان کی پشت پر بھی پاکستان قومی اتحاد کی ملک گیر تحریک تھی۔

اس لیے میرا موقف تو واضح ہے کہ جب تک نفاذِ شریعت کے لیے سیاسی عمل کے ذریعے جدوجہد کرتے رہے ہیں، بتدریج اور سست رفتار سہی، مگر کامیابیاں حاصل ہوتی رہیں۔ لیکن جب سے کچھ حلقوں نے تشدد اور قوت کے بے جا استعمال کو تحریکِ نفاذِ شریعت میں شامل کیا ہے، ہم دفاعی پوزیشن پر آ گئے ہیں اور اب صورتحال یہ ہے کہ کسی مزید پیشرفت کی بجائے اب تک کیے جانے والے دستوری اور قانونی اقدامات کا تحفظ بھی ہمارے لیے مسئلہ بنا ہوا ہے۔......

بھٹومرحوم، جنرل مشرف اور قادیانی جماعت

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد ـــ ے مئی ۲۰۰۲ء)

مرزاطاہر احمد اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ جنرل پرویز مشرف کی صورت میں انہیں ایک ایسا حکمران میسر آگیا ہے جس کے ذریعے وہ پاکستان کے حوالہ سے اپنے عزائم کی تکمیل کر سکیں گے، اسی لیے مرزا طاہر احمد اور ان کے ساتھ قادیانی جماعت مختلف دائروں میں پہلے سے زیادہ متحرک اور سرگرم دکھائی دے رہے ہیں۔

جنرل پرویز مشرف کا کہنا ہے کہ وہ پاکستان کو مذہبی انتہا پسندی سے پاک کرنا چاہتے ہیں، جبکہ مذہبی دہشت گردوں کے خلاف مہم کے عنوان سے جنوبی ایشیا میں امریکہ اور اس کی قیادت میں عالمی اتحاد کی سرگرمیوں کا دائرہ دن بدن وسیع ہوتا جا رہا ہے، جس سے سیکولر حلقوں اور قادیانیوں کو یہ امید ہونے لگی ہے کہ پاکستان کے بارے میں ان کے ایجنڈے کی طرف عملی پیشرفت کا وقت آگیا ہے۔......

اس سے قبل مرحوم ذوالفقار علی بھٹو کو بھی ایک سیکولر سیاستدان اور سوشلسٹ لیڈر تصور کرتے ہوئے قادیانیوں نے ان سے یہ امید وابستہ کر لی تھی کہ وہ پاکستان کے دینی حلقوں کے مسلسل دباؤ کے خلاف قادیانیوں کے مفاد کا تحفظ کریں گے اور ان کے عزائم کی تکمیل میں معاون ہوں گے، مگر مرحوم بھٹو کی تمام تر روشن خیالی اور لبرل خیالات کے باوجود قادیانیوں کی یہ توقع پوری نہیں ہوئی تھی اور مختلف مواقع پر بھٹو مرحوم کے ساتھ بھرپور تعاون کے باوجود قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جانے کے دستوری فیصلے کا سامنا بھٹو کے دورِ حکومت میں ہی کرنا پڑا تھا۔

اس سلسلہ میں بھٹو مرحوم کے اپنے خیالات کیا تھے؟ اس کے لیے میں ان کی زندگی کے آخری ایام میں جیل میں قید کے دوران ان کے تاثرات و جذبات کا حوالہ دینا چاہوں گا جو ان کی نگرانی پر مامور کرنل (ر) رفیع الدین نے کتاب "بھٹو کے آخری ۳۲۳ دن" میں ان الفاظ میں نقل کیے ہیں کہ:

> "احمدیہ مسئلہ! یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جس پر بھٹو صاحب نے کئی بار کچھ نہ کچھ کہا۔ ایک دفعہ کہنے لگے "رفیع یہ لوگ چاہتے تھے کہ میں ان کو پاکستان میں وہ مرتبہ دوں جو یہودیوں کو امریکہ میں حاصل ہے یعنی ہماری پالیسی ان کی مرضی کے مطابق چلے۔" ایک بار انہوں نے کہا کہ "قومی اسمبلی نے ان کو غیر مسلم قرار دیا ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟" ایک دن اچانک مجھ سے پوچھا کہ "کرنل رفیع کیا احمدی آج کل یہ کہہ رہے ہیں کہ میری موجودہ مصیبتیں ان کے خلیفہ کی بد دعا کا

نتیجہ ہیں کہ میں کال کوٹھڑی میں پڑا ہوں؟" ایک مرتبہ کہنے لگے کہ "ان کے اعتقاد کو دیکھا جائے تو وہ حضرت محمد ﷺ کو آخری پیغمبر ہی نہیں مانتے اور اگر وہ مجھے اپنے آپ کو غیر مسلم قرار دینے کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں تو کوئی بات نہیں" پھر کہنے لگے "میں تو بڑا گناہگار ہوں اور کیا معلوم کل یہ عمل ہی میرے گناہوں کی تلافی کر جائے اور اللہ تعالیٰ میرے تمام گناہ اس نیک عمل کی بدولت معاف فرما دے"۔ میں بھٹو صاحب کی ان باتوں سے پہلے یہ اندازہ لگایا کرتا تھا کہ شاید ان کو گناہ وغیرہ کا کوئی خاص احساس نہیں تھا لیکن اس دن مجھے احساس ہوا کہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔"

کرنل رفیع الدین کی ان باتوں سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بھٹو مرحوم کا یہ فیصلہ صرف مسلمانوں کے دباؤ کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ ان کے داخلی دینی جذبات اور حبِ نبی ﷺ کا آئینہ دار بھی تھا۔ اس لیے مجھے مرزا طاہر احمد اور ان کی جماعت کی اس خوش فہمی پر حیرت ہو رہی ہے جو انہوں نے جنرل پرویز مشرف سے وابستہ کر رکھی ہے، حالانکہ جس دن بھٹو کی طرح جنرل پرویز مشرف کے اندر کا مسلمان جاگ اٹھا تو قادیانیوں اور ان کی سرپرست بین الاقوامی لابیوں کی ساری منصوبہ بندی دھری کی دھری رہ جائے گی۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور ایٹمی پروگرام

(روزنامہ اسلام، لاہور — ۱۳ اپریل ۲۰۰۶ء)

...... ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے نیٹ ورک کا پس منظر تو یہ ہے کہ وہ ایک ایٹمی سائنس دان ہیں اور پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں، اسلام سے وابستگی میں پختہ ہیں اور ملتِ اسلامیہ کی زبوں حالی پر ان کا دل کڑھتا ہے۔ انہیں بیرونِ ملک اپنے شعبہ میں تعلیمی اور تحقیقی پیشرفت کا موقع ملا تو ان کے دل میں خیال آیا کہ ایٹمی توانائی اور اس کی عسکری افادیت سے ان کے اپنے ملک کو محروم نہیں رہنا چاہیے۔

انہوں نے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کا سوچا تو معلوم ہوا کہ ان کا ملک اور اس جیسے اور بہت سے ممالک جن کے نام کے ساتھ اسلام یا مسلمان کا کوئی سابقہ یا لاحقہ موجود ہے ان کے لیے ایٹمی توانائی اور اس کی عسکری افادیت شجرِ ممنوعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ دنیا کے چند بڑوں نے اپنے سوا دوسروں کے لیے اس کے بارے میں سوچنا تک حرام قرار دے رکھا ہے اور خاص طور پر مسلمانوں کے کسی ملک کے لیے اس کا خواب دیکھنے کی بھی ممانعت ہے۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے دیکھا کہ یہ گھی سیدھی انگلی سے نہیں نکل سکتا تو انہوں نے انگلیوں کو تھوڑا سا ٹیڑھا کر لیا جو کہ اکثر لوگ کر لیا کرتے ہیں، اور وہ اپنے ملک کے لیے تھوڑا سا گھی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ انہیں اس میں اپنے ملک کے حکمرانوں ذوالفقار علی بھٹو، جنرل محمد ضیاء الحق، غلام اسحاق خان اور میاں محمد نواز شریف کی سرپرستی حاصل رہی، اور ان سب کی کوششوں سے پاکستان ایٹمی تجربہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جو ایٹمی توانائی کے اجارہ داروں کے نزدیک ایک ناقابلِ معافی جرم کی حیثیت رکھتا ہے اور اس پر پاکستان مسلسل سزا اور مواخذہ کے مرحلہ سے گزر رہا ہے۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا یہ جرم ہی ان عالمی اجارہ داروں کے نزدیک خوفناک تھا کہ ان کے ہاتھ میں ایک اور الزام آ گیا کہ ڈاکٹر عبدالقدیر دنیا کے دیگر ممالک کو بھی یہ گھی حاصل کرنے کے لیے انگلیاں ٹیڑھی کرنے کا طریقہ سکھا رہے ہیں اور ایٹمی توانائی کی عسکری افادیت کا دائرہ وسیع کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ یہ الزام فی الواقع درست ہے یا نہیں، یہ ایک الگ مسئلہ ہے، لیکن اس چارج شیٹ کے ساتھ ڈاکٹر عبدالقدیر کو جس صورتحال سے دوچار کر دیا گیا ہے اس کی ایک جھلک امریکی سفیر کے مذکورہ بیان میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے جس کا لہجہ ان کے بیان کے بین السطور کی وضاحت کر رہا ہے کہ ان کے خیال میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو اس حد تک نشانِ عبرت بنا دیا گیا ہے کہ اب کوئی پاکستانی ڈاکٹر عبدالقدیر بننے کا حوصلہ نہیں کر پائے گا۔......

پاکستان اسٹیل ملز کا پس منظر

(روزنامہ پاکستان، لاہور — ۲۶ اگست ۲۰۰۶ء)

۱۹۷۰ء کے عام انتخابات سے پہلے جب ملک میں انتخابی سرگرمیوں کا آغاز ہوا تو وہ میری سیاسی اور خطابتی زندگی کا ابتدائی دور تھا۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی قدس اللہ سرہ العزیز سے عقیدت زیادہ تھی جواب بھی ہے، ان کی سیاسی جدوجہد اور سیاسی افکار سے سب سے زیادہ متاثر تھا اور اسی مناسبت سے استعمار دشمنی کی بات کسی طرف سے بھی ہو، اچھی لگتی تھی۔ جمعیت علمائے اسلام کا اجتماعی ذوق بھی یہی تھا، اس حوالے سے لیفٹ کے سیاسی کارکنوں کے ساتھ ہمارا میل جول زیادہ رہتا تھا اور ہم مختلف معاملات میں ایک دوسرے کو سپورٹ کیا کرتے تھے۔

- امریکہ ہماری سیاسی گفتگو بلکہ تابڑ توڑ حملوں کا سب سے بڑا ہدف ہوتا تھا۔ اس وقت پاکستان میں امریکہ کے سفیر جوزف فارلینڈ کو ناپسندیدہ قرار دے کر واپس بھیجنے کا مطالبہ ہماری سیاسی تقریروں کا پسندیدہ موضوع تھا۔ ان پر الزام یہ تھا کہ وہ امریکی امداد کی رقوم بالخصوص پی ایل ۴۸۰ کے فنڈ کو اپنی صوابدید کی بنیاد پر پاکستان کے سیاسی راہنماؤں اور کارکنوں میں خفیہ طور پر تقسیم کر کے پاکستان کی قومی سیاست میں مداخلت کی راہ ہموار کر رہے ہیں اور اپنے استعماری شکنجے کو مضبوط بنانے میں مصروف ہیں۔
- اس کے بعد ہمارا دوسرا اہم موضوع پاکستان میں اسٹیل مل لگانے کا مطالبہ ہوتا تھا۔ ہم اپنی تقاریر اور بیانات میں اس بات پر زور دیا کرتے تھے کہ فولاد کسی بھی ملک کی صنعت اور دفاع دونوں کے حوالے سے بنیادی ضرورت کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے بغیر نہ کوئی ملک ترقی کر سکتا ہے اور نہ ہی اپنے دفاع میں خود کفیل ہو سکتا ہے۔ ہم اس پر قرآن کریم کی آیات اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے ساتھ بین الاقوامی حالات اور اعداد و شمار سے دلائل دیا کرتے تھے اور حکومت سے پرزور مطالبہ کرتے تھے کہ فوری طور پر ملک میں فولادی صنعت کا اہتمام کیا جائے اور فولاد ڈھالنے کا کارخانہ لگا کر اس سمت میں پیشرفت کی جائے۔

پاکستان اسٹیل ملز کراچی کی نجکاری کے بارے میں سپریم کورٹ آف پاکستان کا فیصلہ اور گزشتہ دنوں قومی اسمبلی میں اس سلسلہ میں ہونے والی بحث اخبارات میں نظر سے گزری تو یہ سارا منظر ایک بار پھر

نگاہوں کے سامنے گھوم گیا اور ۱۹۷۰ء سے قبل کی سیاسی گہما گہمی اور لیفٹ اور رائٹ کی کشمکش کے مناظر ذہن میں تازہ ہو گئے۔......

پاکستان اسٹیل ملز کے قیام کا اصولی فیصلہ ۱۹۶۸ء میں ہو گیا تھا لیکن اس کا سنگ بنیاد ۱۹۷۳ء میں ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے وزیراعظم کی حیثیت سے رکھا۔ ۷۶-۱۹۷۵ء میں گراؤنڈ ورک کا آغاز ہوا اور ۱۹۸۱ء میں پہلے پیداواری یونٹ نے کام کا آغاز کیا۔ اسٹیل ملز کی مشینری سوویت یونین سے خریدی گئی، سوویت یونین نے اس مل کی تعمیر اور مشینری کی فٹنگ میں مسلسل تعاون کیا اور کئی سال تک سوویت یونین کے فنی ماہرین اور کاریگر بڑی تعداد میں مل میں کام کرتے رہے۔ اسٹیل ملز پر کُل لاگت چوبیس ارب ستر کروڑ بتائی جاتی ہے جس میں گیارہ ارب کے لگ بھگ کے قریب رقم بینکوں سے قرض کے طور پر لی گئی جبکہ باقی رقم قومی خزانہ سے ادا کی گئی۔ اس طرح پاکستان اسٹیل ملز کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اسٹیل ملز کے لیے مخصوص کی گئی زمین کا رقبہ ساڑھے چار ہزار ایکڑ سے زیادہ بتایا جاتا ہے جس میں مشینری کم و بیش ایک ہزار ایکڑ کے دائرے میں نصب ہے اور باقی زمین خالی ہے۔......

ریڈ کراس کی بجائے ہلال احمر: صدارتی کابینہ کا فیصلہ

(ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور — ۱۳ جولائی ۱۹۷۳ء)

صدارتی کابینہ نے ایک اجلاس میں ''ریڈ کراس سوسائٹی'' کا نام تبدیل کر کے ''انجمن ہلال احمر'' رکھنے کا فیصلہ کیا ہے اور قومی حلقوں میں اس مناسب فیصلہ کو سراہا جا رہا ہے۔

عوامی حلقوں کی طرف سے قیامِ پاکستان کے بعد ہی سے یہ مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ ملک میں فرنگی اقتدار و تسلط کے دور کی تمام یادگاروں اور نشانات کو مٹا دیا جائے اور اسلامی قانون و سیاست، اخلاق و معاشرت، اقتصاد و معیشت، تہذیب و تمدن اور روایات و اقدار کو فروغ دیا جائے۔ آزادی کی جنگ لڑنے والوں کا مطمح نظر بھی یہی تھا اور قیامِ پاکستان کا بنیادی محرک بھی یہی سوال بنا۔ مگر ہمارے اربابِ سیاست نے، جنہوں نے فرنگیت کے سوا اور کچھ سیکھا ہی نہیں، ربع صدی سے ملک و قوم کو فرنگی نظام سے چھٹکارا دلانے کی بجائے قوم کی اجتماعی و انفرادی زندگی پر فرنگیت کی چھاپ کو اور زیادہ گہرا کرنے کی سعیٔ مذموم شروع کر رکھی ہے۔ اور اس بات کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ تحریکِ آزادی اور قیامِ پاکستان کے بنیادی محرکات سے نئی نسل کسی طور آگاہ نہ ہونے پائے۔ یہی وجہ ہے کہ نئی پود نہ صرف آزادی اور پاکستان کے محرکات بلکہ ملی تشخص کے حقیقی شعور تک سے مجموعی طور پر ناآشنا ہے۔ حالانکہ ضرورت اس امر کی تھی کہ نئی نسل کو شعوری طور پر اس قابل بنایا جاتا کہ وہ آزادی کی جنگ لڑنے والے عظیم مجاہدین کے ساتھ وفا کرتے ہوئے اسلامی تہذیب و اقدار کی پاسداری کرتی۔ فرنگی نشانات اور یادگاروں کے ضمن میں ہی ریڈ کراس کی بات بھی آتی ہے۔ شکر ہے کہ حکومتِ پاکستان نے ضمنی طور پر ہی سہی ایک صحیح بات کو تسلیم کرتے ہوئے ریڈ کراس کا نام تبدیل کر کے ہلال احمر سوسائٹی رکھ دیا ہے۔ اللہ کرے پاکستان کو فرنگی نظام اور اس کی تمام علامات سے کُلی نجات حاصل ہو، آمین۔

ذوالفقار علی بھٹو کا دورِ سیاست

قومی سیاست، بھٹو کے حوالے سے

پاکستان کے سیاسی طبقات

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد ـــ ۱۲ جنوری ۲۰۰۱ء)

گزشتہ ایک کالم میں میاں محمد نواز شریف اور ان کے خاندان کی سعودی عرب جلاوطنی پر تبصرہ کرتے ہوئے طاقت اور دولت کی کشمکش کے حوالہ سے کچھ عرض کرنے کا وعدہ کیا تھا اس لیے آج اسی سلسلہ میں کچھ گزارشات پیش کی جا رہی ہیں۔

جاگیردار، بیوروکریٹس اور جرنیلوں کی تکون

پاکستان بننے کے بعد ملک کی باگ ڈور جن طبقات کے ہاتھوں میں چلی گئی وہ تین تھے:

(۱) جاگیردار اور زمیندار (۲) بیوروکریٹس (۳) اور جرنیل صاحبان۔

جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کی آمد تک ملک کی اسٹیبلشمنٹ انہی تین طبقات سے عبارت رہی ہے۔ قائداعظم مرحوم جلد دنیا سے رخصت ہوگئے اور وہ ویسے بھی ان میں سے کسی طبقہ سے تعلق نہیں رکھتے تھے اس لیے ان کی وفات کے بعد کوئی ایسی شخصیت باقی نہ رہی جو ان طبقات کو اپنے اپنے دائرہ کار تک محدود رکھنے اور ان کے درمیان توازن قائم کرنے میں کوئی کردار ادا کر سکتی۔ اس لیے ان تینوں نے باہمی تعلقات کار خود طے کیے اور باری باری اس ملک پر حکمرانی کرتے رہے۔

جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے پہلی بار اس تکون کو توڑنے اور اس میں دو نئے طبقات کو داخل کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے تاجروں و صنعتکاروں اور علماء کرام کو اقتدار کے اس دائرہ میں شامل کرنا چاہا، اور تاجروں و صنعتکاروں کی حد تک وہ کامیاب رہے کہ میاں محمد نواز شریف کی صورت میں تاجروں اور صنعتکاروں کے ایک نمائندہ کو وہ اقتدار کے اعلیٰ ایوانوں تک پہنچانے میں کامیاب ہوگئے، مگر علماء کرام اپنی انتہائی سادگی یا بہت زیادہ ہوشیاری کی وجہ سے اس گیم کا حصہ نہ بن سکے اور جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم تمام تر کوشش کے باوجود انہیں شریک کار بنانے میں کامیاب نہ ہوئے۔

اقتدار کی دوڑ میں صنعتکار طبقہ کی شمولیت اور اس کا ردعمل

چنانچہ جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے بعد اقتدار کی باگ ڈور میں جاگیرداروں، زمینداروں، بیوروکریٹس اور جرنیلوں کے ساتھ تاجر و صنعتکار بھی خود کو برابر کا شریک سمجھنے لگے اور انہوں نے اقتدار اعلیٰ پر فائز ہوتے ہی ملک کو صنعتی ترقی کی شاہراہ پر گامزن کرنے اور اس طریقہ سے اپنی بالادستی اور برتری

قائم کرنے کا خواب دیکھنا شروع کر دیا۔ دیگر طبقات کو اقتدار اور اختیارات میں ایک نئے طبقے کی شرکت ویسے ہی ہضم نہیں ہو رہی تھی اس لیے جب اس نئے طبقے نے اس شرکت کو مستحکم کرنے بلکہ بالاتر حیثیت دینے کے لیے اقدامات شروع کیے تو قوتِ ہاضمہ مزید کمزور ہو گئی اور یہ اسی بدہضمی کا نتیجہ ہے کہ نہ صرف میاں محمد نواز شریف اپنے خاندان سمیت ملک بدر ہو چکے ہیں بلکہ صنعت و تجارت سے تعلق رکھنے والے بہت سے افراد ملک چھوڑنے پر مجبور ہوئے ہیں اور تاجروں اور صنعتکاروں کے لیے تجارت و صنعت کے روایتی سسٹم کو برقرار رکھنا مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔

جنوبی ایشیا میں استعماری قوتوں کا ایجنڈا

جنوبی ایشیا میں پاکستان کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی خواہشمند قوتوں اور اس خطہ کو معاشی لوٹ کھسوٹ کا میدان بنانے کے لیے کوشاں بین الاقوامی مالیاتی اداروں کا مفاد بھی اسی میں تھا کہ وہ اس طبقاتی کشمکش کو نہ صرف برقرار رہنے دیں بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کرتے رہیں، اور کبھی ایک کی اور کبھی دوسرے کی پیٹھ تھپتھپا کر اپنا کام نکالتے رہیں۔

شخصِ واحد میں اختیارات کے ارتکاز کا تصور

اگر سابق گورنر جنرل غلام محمد مرحوم کو بیوروکریسی کا، جنرل محمد ایوب خان مرحوم کو جرنیلوں کا، ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کو جاگیرداروں کا اور میاں محمد نواز شریف کو تاجروں اور صنعتکاروں کا نمائندہ سمجھ کر اب تک کی صورتحال کا تجزیہ کیا جائے تو ان میں سے ہر ایک کی شخصی خوبیوں اور ذاتی کردار سے قطع نظر ایک بات سب میں قدر مشترک نظر آتی ہے اور وہ ہے شخصِ واحد میں اختیارات کا ارتکاز اور شخصی وفاداریوں کا نیٹ ورک قائم کرنے کی مسلسل کوشش۔ جس میں ان میں سے کسی نے کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی اور ہر ایک نے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو شخصی وفاداری کے دائرہ میں شامل کرنے کے لیے ملک کے تمام تر وسائل کو ہر ممکن حد تک استعمال کیا۔

اسی وجہ سے ملک میں اسلام یا جمہوریت میں سے کسی کو پاؤں جمانے کا موقع نہیں مل سکا کیونکہ صاف ستھری جمہوریت قائم ہونے کی صورت میں عوام کے منتخب نمائندوں کے سامنے صحیح معنوں میں جواب دہ ہونے کا تصور مطلق العنانیت کے اس فلسفہ کے منافی ہے جو اُن سب طبقات کے نمائندوں کا نصب العین قرار پا چکا تھا۔ اور اسلام کا عادلانہ نظام عملاً نافذ ہونے کی صورت میں طے شدہ اور ناقابلِ ترمیم اصولوں کی بہرحال پابندی نے بھی اس فلسفہ کو کھوکھلا کر دینا تھا۔ اس لیے ان سب میں یہ انڈر اسٹینڈنگ موجود رہی ہے کہ اسلام یا جمہوریت میں سے کسی کو پاکستان میں قدم نہ جمانے دیا جائے۔ اور نصف صدی

کے ناقابلِ تردید شواہد اور حقائق گواہ ہیں کہ اس معاملہ میں ان سب نے وقت آنے پر ایک دوسرے سے بھرپور تعاون کیا۔

میاں محمد نواز شریف کا اندازِ سیاست اور اس کا انجام

اس پس منظر میں میاں محمد نواز شریف جنرل محمد ضیاء الحق کی شہ پر اعلیٰ سطح پر اقتدار کی اس دوڑ میں شریک ہوئے اور خود کو تاجر و صنعتکار طبقہ کا نمائندہ سمجھتے ہوئے انہوں نے اقتدار کے معاملات کو ڈیل کرنا شروع کیا۔ چونکہ تاجر تھے اور ہر معاملہ پیسوں سے حل کرنے کے عادی تھے اس لیے انہوں نے یہاں بھی دولت ہی کا ہتھیار سب سے زیادہ استعمال کیا اور انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ اقتدار کی چوکور میں شریک دوسرے طبقات کو پیچھے دھکیلنے میں مصروف ہو گئے۔

- غلام اسحاق خان کو ایوانِ صدر سے رخصت کرنے کی مہم میں انہیں خود بھی وزیر اعظم ہاؤس چھوڑنا پڑا مگر انہیں حوصلہ ہوا کہ بیوروکریسی سے محاذ آرائی ان کے لیے کچھ زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔
- فاروق احمد لغاری کو پہلے اختیارات سے محروم کر کے اور پھر ایوانِ صدر سے رخصت کر کے وہ یہ سمجھے کہ جاگیردار طبقہ کو بھی انہوں نے شکست دے دی ہے،
- اور جب وہ جنرل جہانگیر کرامت سے استعفیٰ لینے میں کامیاب ہو گئے تو اپنے خیال میں وہ پوری طرح فارم میں آ چکے تھے بلکہ انہوں نے اس سے قبل ایک چوتھا محاذ بھی جسٹس سجاد علی شاہ کو گھر بھجوا کر سر کر لیا تھا۔

اس لیے انہیں اپنے راستے میں فوج کے سوا اور کوئی مؤثر رکاوٹ اب دکھائی نہیں دے رہی تھی اور اسی رکاوٹ کو دور کرنے کی غرض سے انہوں نے بارہ اکتوبر ۱۹۹۹ء کے وہ اقدامات کیے جن کا نتیجہ آج ساری قوم کے سامنے ہے۔

اگرچہ میاں نواز شریف ملک میں واپس آنے، سیاست میں حصہ لینے اور اپنے سیاسی کیریئر کو بچانے کے عندیہ کا اظہار کر رہے ہیں اور وہ غالباً کوشش بھی کریں گے مگر ہمارے خیال میں معاملات پھر جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم سے پہلے کی پوزیشن پر واپس چلے گئے ہیں اور اقتدار کی سابقہ تکون نہ صرف بحال ہو گئی ہے بلکہ کسی نئے طبقہ کی شمولیت کے بارے میں پہلے سے زیادہ حساس بھی ہو چکی ہے۔ اس تکون کو توڑنا تاجروں اور صنعتکار طبقہ کے بس کی بات نظر نہیں آ رہی کہ پہلے راؤنڈ میں ہی اس کا سانس پھولنے لگا ہے۔ اس لیے قومی، سیاسی اور اقتدارِ اعلیٰ کی دوڑ میں شریف خاندان کی واپسی کی بات کم از کم ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ البتہ مسلم لیگ کے اس دوڑ میں شریک رہنے کا امکان موجود ہے لیکن وہ تاجروں اور صنعتکاروں

کی نمائندہ نہیں ہوگی بلکہ حسبِ سابق جاگیرداروں اور زمینداروں کے مفادات کے تحفظ کا رول سنبھال لے گی اور وہی اس کا اصلی رول ہے۔

دینی جماعتوں سے توقعات

جاگیرداروں، نوکر شاہی اور جرنیلوں کی اس تکون کو توڑنے کی صلاحیت صرف ایک طبقہ کے پاس ہے اور وہ ہے دینی جماعتیں۔ جن کے پاس عقیدہ ہے، مستقل فلسفہ حیات ہے، متبادل نظام ہے اور ہر سطح پر عقیدہ و ایثار کے جذبہ سے سرشار کارکنوں کی کھیپ ہے۔ لیکن ان کی موجودہ قیادت شخصی ترجیحات اور وقتی مفادات کے خول سے باہر نکلنے کے لیے تیار نہیں ہے بلکہ بعض دینی قائدین کی سرگرمیاں دیکھ کر تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ دوسروں کے سامنے دینی حلقوں کی نمائندگی کرنے کی بجائے دینی حلقوں کے سامنے دوسروں کی ترجمانی کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ اس لیے جب تک دینی جماعتوں کو بلند حوصلہ قیادت نہیں ملتی اور ان کی ترجیحات درست نہیں ہوتیں اس وقت تک نہ صرف یہ کہ اسٹیبلشمنٹ کی اس تکون کے عزائم اور پروگرام کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے بلکہ ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف جیسے اداروں کا راستہ بھی پوری طرح کلیئر ہے کیونکہ جب رکاوٹیں خود ہی ساتھ بہنے کے لیے تیار ہوں تو سیلاب کو گھروں میں داخل ہونے سے کون روک سکتا ہے؟

قومی سیاست کی چند یادیں

(روزنامہ پاکستان، لاہور — ۴ مئی ۲۰۱۱ء)

پاکستان قومی اتحاد میں چوہدری ظہور الٰہی مرحوم کے ساتھ کچھ عرصہ کام کرنے کا موقع ملا تھا، گجرات کے ظہور الٰہی پیلس میں ہمارا آنا جانا رہتا تھا۔ حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے ہمراہ بھی جانا ہوا اور ویسے بھی چودھری صاحب مرحوم کے ساتھ پاکستان قومی اتحاد کی مختلف مجالس میں ملاقات ہوتی تھی۔ ایک مرحلہ پر وہ قومی اتحاد کے پارلیمانی بورڈ کے چیئرمین تھے اور مجھے پارلیمانی بورڈ میں جمعیت علماء اسلام کی نمائندگی کرنا ہوتی تھی۔ آج ان کی یاد پاکستان مسلم لیگ (ق) کی پاکستان پیپلز پارٹی کے ساتھ اقتدار میں شراکت کے لیے ہونے والے مذاکرات اور اس کے نتیجے میں ان کی جماعت کی حکومت میں شمولیت کے فیصلے سے تازہ ہو گئی اور ایک واقعہ بطور خاص یاد آ گیا۔

جنرل ضیاء الحق مرحوم اور پاکستان قومی اتحاد

جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے پاکستان قومی اتحاد کو اقتدار میں شرکت کی پیشکش کر رکھی تھی اور خبروں سے معلوم ہو رہا تھا کہ پاکستان مسلم لیگ اور جماعت اسلامی اپنے طور پر اس پیشکش کو قبول کرنے کے لیے پر تول رہی ہیں۔ بعد میں ہوا بھی ایسے ہی کہ پاکستان مسلم لیگ اور جماعت اسلامی نے پیشکش قبول کر لی اور پاکستان قومی اتحاد کی دیگر جماعتوں نے بھی اتحاد کو بچانے کے نام پر وفاقی کابینہ میں شمولیت اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

مجھے اس سلسلہ میں جمعیت علماء اسلام کی مرکزی مجلسِ شوریٰ کا وہ اجلاس یاد ہے جو حکومت میں شریک ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کرنے کے لیے دارالعلوم حنفیہ عثمانیہ (ورکشاپی محلہ، راولپنڈی) میں ہوا تھا۔ مجلسِ شوریٰ کے ارکان کی رائے ملی جلی تھی۔ کچھ شریک ہونے کے حق میں تھے اور کچھ مخالف تھے۔ میں مخالفین میں سے تھا۔ شوریٰ کے اجلاس میں مولانا قاضی عبد اللطیفؒ کے ساتھ میرا اس مسئلہ پر طویل مباحثہ ہوا اور مجلس کا عمومی رخ شرکت کے حق میں جاتا دیکھ کر میں نے مجلسِ شوریٰ کی کارروائی میں اپنا اختلافی نوٹ لکھوانے کا حق استعمال کیا تھا۔

مجلسِ شوریٰ نے فیصلے کا اختیار مولانا مفتی محمودؒ کو دے دیا اور مفتی صاحبؒ نے یہ فرما کر وفاقی کابینہ میں جمعیت علماء اسلام کے شریک ہونے کا اعلان کر دیا کہ پاکستان قومی اتحاد کو متحد رکھنے کے لیے ایسا کرنا

ضروری ہو گیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ پاکستان قومی اتحاد اس سے قبل ہی ٹوٹ چکا تھا اور تحریکِ استقلال اور جے یو پی نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ مگر اس سے پہلے اس مرحلہ میں، جبکہ ابھی پاکستان مسلم لیگ اور جماعتِ اسلامی نے عملاً حکومت میں شمولیت اختیار نہیں کی تھی، لیکن اس قسم کی خبریں آرہی تھیں۔

چودھری ظہور الٰہی مرحوم سے مولانا مفتی محمودؒ کا سوال

اس دوران مولانا مفتی محمودؒ کراچی میں تھے اور جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن میں قیام پذیر تھے، میں بھی وہیں تھا کہ چودھری ظہور الٰہی مرحوم مفتی صاحبؒ سے ملنے کے لیے وہاں تشریف لائے، سلام و آداب کے بعد مفتی صاحب نے ہنستے ہنستے چودھری صاحب مرحوم سے سوال کیا کہ چودھری صاحب آپ نے وزارتوں میں جانے کا فیصلہ کر لیا؟ چودھری صاحب مرحوم نے بھی اسی بے ساختگی سے جواب دیا کہ مفتی صاحب! آپ ایک مسلم لیگی سے کیا پوچھ رہے ہیں؟ ہم تو پیدا ہی وزارتوں کے لیے ہوئے ہیں، مسلم لیگی کو وزارت کی پیشکش ہو اور وہ قبول نہ کرے، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

چنانچہ ایسا ہی ہوا، پہلے مسلم لیگ اور جماعتِ اسلامی وفاقی کابینہ میں شامل ہوئیں، پھر پاکستان قومی اتحاد کو بچانے کے عنوان سے قومی اتحاد حکومت کا حصہ بنا، مگر اس کے بعد قومی اتحاد کا شیرازہ دوبارہ مجتمع نہ ہو سکا اور ۱۹۷۷ء کی زبردست عوامی تحریک کی قیادت کرنے والا پاکستان قومی اتحاد اقتدار کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر رہ گیا۔

اسٹیبلشمنٹ کی شکار تین عوامی تحریکیں

ایک سیاسی کارکن کے طور پر میرا مشاہدہ اور تجزیہ یہ ہے کہ پاکستان کی تاریخ میں تین مواقع ایسے آئے ہیں جب سیاسی جماعتوں نے عوامی تحریکی قوت کی حیثیت اختیار کی مگر تینوں مواقع پر اسٹیبلشمنٹ کی چالیں غالب رہیں اور سیاسی جماعتیں زبردست عوامی قوت کا درجہ حاصل کر کے بھی اپنا عوامی وجود قائم نہ رکھ سکیں:

۱۹۴۷ء کی پاکستان مسلم لیگ

قیامِ پاکستان کے بعد پاکستان کی بانی مسلم لیگ کو یہ مقام حاصل تھا کہ ایک زبردست عوامی قوت اس کی پشت پر تھی اور وہ اس نوزائیدہ ملک کو ایک اچھا سیاسی نظام اور ماحول فراہم کر سکتی تھی، لیکن بیوروکریسی کی آکاس بیل نے اسے اس طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا کہ قائداعظمؒ کی وفات اور لیاقت علی خان مرحوم کی

شہادت کے بعد بیوروکریسی پر ہی اس کا دارومدار رہ گیا۔ چنانچہ بیوروکریسی کی مکروہ چالوں کے تسلسل نے ملک کے اقتدار کی کنجی بالآخر جرنیلوں کے ہاتھ میں تھما دی۔

۱۹۷۰ء کی پاکستان کی پیپلز پارٹی

دوسرا مرحلہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات اور پاکستان کے دولخت ہوجانے کے بعد باقی ماندہ پاکستان میں اس صورت میں آیا کہ پاکستان پیپلز پارٹی کے پاس بہرحال ایک عوامی سیاسی قوت موجود تھی جو ملک کے نظام میں بہت سی مثبت تبدیلیوں کا باعث بن سکتی تھی۔ مگر پاکستان پیپلز پارٹی کا عام کارکن بھی، جو بھٹو مرحوم کا دیوانہ اور بھٹو کے سیاسی فلسفہ پر فریفتہ تھا، بیوروکریسی کے ہتھے چڑھ گیا اور پاکستان پیپلز پارٹی کی قیادت کی اقتدار کی ترجیحات نے ایسا رخ اختیار کر لیا کہ ایک عوامی سیاسی قوت نے حکومت اور اپوزیشن کا روایتی ذوق رکھنے والی سیاسی پارٹی کا روپ اختیار کر لیا، اور ایک عرصہ کے بعد کسی عوامی سیاسی قوت کے سیاسی منظر پر نمودار ہونے سے جو توقعات پیدا ہوگئی تھیں وہ دم توڑ کر رہ گئیں۔

اس دور کے حوالہ سے میں ایک رائے کا اظہار بسا اوقات کیا کرتا ہوں کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے فوراً بعد ذوالفقار علی بھٹو مرحوم، مولانا مفتی محمودؒ اور خان عبدالولی خان مرحوم کے مابین جو سہ فریقی معاہدہ ہوا تھا وہ اگر قائم رہتا اور اسے ملک کے سیاسی مستقبل کی از سر نو تعمیر کے لیے کام کرنے کا موقع مل جاتا تو میرے خیال میں اس سے اچھی ٹیم نہ اس وقت ملک کو مل سکتی تھی اور نہ شاید آئندہ اس کی توقع کی جا سکتی ہے۔ مگر ہمارے ہاں ابھی تک ٹیم ورک کا ذوق پیدا نہیں ہو سکا اور اگر کبھی ٹیم ورک کا کوئی موقع قومی سیاست میں پیدا ہوتا ہے تو ہم اسے بھی گروہی ترجیحات کی بھینٹ چڑھا دینے سے گریز نہیں کرتے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ''ٹیم'' تو کچھ دیر تک باقی رہتی ہے مگر ''ورک'' کی کوئی صورت نہیں بن پاتی اور ہم ایڈہاک ازم کے ماحول میں زیرو پوائنٹ پر ہی کھڑے رہ جاتے ہیں۔

۱۹۷۷ء کا پاکستان قومی اتحاد

تیسرا مرحلہ میرے خیال میں اس وقت آیا جب پاکستان قومی اتحاد کی عوامی تحریک کے نتیجے میں فوج نے اقتدار سنبھالا اور جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے تین ماہ کے اندر انتخابات کرا کے اقتدار منتخب نمائندوں کے سپرد کر دینے کے اعلان کے ساتھ حکومت سنبھالی۔ میرے خیال میں پاکستان قومی اتحاد کو

۱. یہ صورتحال قبول نہیں کرنی چاہیے تھی کیونکہ اس وقت اس کے پاس اتنی عوامی قوت موجود تھی کہ وہ مارشل لاء کو قبول نہ کرنے کا اعلان کر دیتا،

۲. یا کم از کم فوجی حکومت کو ۹۰ دن کے اندر الیکشن کرانے کے وعدے کا پابند رکھنے کے لیے مؤثر کردار ادا کرتا،

۳. یا پھر اگر مارشل لاء کو قبول ہی کر لیا تھا تو اس کے ساتھ اقتدار میں شریک ہونا بہر حال سیاسی خودکشی کے مترادف تھا، مگر ہم نے یہ بھی کر ڈالا۔ اس کے اسباب کچھ بھی تھے ان پر بحث و مباحثہ ہونا چاہیے مگر یہ حقیقت ہے کہ پاکستان قومی اتحاد نے مارشل لاء ٹیم کا حصہ بن کر اس ملک میں عوامی سیاست کا آخری دروازہ بھی بند کر دیا۔

عملی سیاست سے کنارہ کشی کیوں؟

آج بہت سے دوست مجھ سے پوچھتے ہیں کہ آپ اس دور میں سیاست میں قومی سطح پر بہت متحرک تھے، اب آپ غیر فعال کیوں ہیں؟ میں ان سے گزارش کیا کرتا ہوں کہ:

۱. اول تو اس ملک میں میرے نزدیک اب سرے سے سیاست کا وجود ہی نہیں رہا۔ جس طرح ہم قومی سطح پر اپنے فیصلوں میں خود مختار نہیں رہے اسی طرح سیاسی پارٹیاں بھی اپنے فیصلوں میں خود مختار نہیں ہیں۔ نادیدہ قوتیں اس حد تک دخیل ہیں کہ انہیں نادیدہ کہنا بھی تکلّف لگتا ہے۔

۲. دوسری وجہ یہ ہے کہ سیاست اس قدر مہنگی کر دی گئی ہے کہ غریب بلکہ متوسط درجے کے شہری کے لیے بھی سیاست میں کوئی کردار ادا کرنا ممکن نہیں رہا۔ اور میں تو فقیر آدمی ہوں، مسجد کے مکان میں رہتا ہوں اور بمشکل اپنے گھریلو اخراجات پورے کر پاتا ہوں۔

۳. اس کے ساتھ یہ مشکل بھی ہے کہ سیاست کے لیے وسائل جن ذرائع سے آج کے دور میں عام طور پر میسر آتے ہیں ان کی طرف دیکھنا بھی گناہ سمجھتا ہوں۔

البتہ مجھے یہ سہولت حاصل ہے کہ ایک دو جرائد میں کالم کے نام پر "غصہ" نکالنے کا موقع مل جاتا ہے اور اس ذریعے سے اپنی بات کسی نہ کسی طرح قوم کے سامنے پیش کر دیتا ہوں۔ مسلم لیگ (ق) اور پاکستان پیپلز پارٹی کے درمیان شراکت اقتدار اور کابینہ میں شمولیت کے حوالے سے یہ چند یادیں ذہن میں تازہ ہو گئیں جو قلم کی نوک سے پھسل گئی ہیں، خدا جانے اب ان باتوں کا بھی موقع یا وقت باقی رہ گیا ہے یا نہیں!

پاکستان پر عالمی دباؤ:
ذوالفقار علی بھٹو مرحوم اور میاں محمد نواز شریف

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ — جنوری ۲۰۱۷ء)

وزیراعظم پاکستان میاں محمد نواز شریف نے گزشتہ روز بوسنیا کے دورہ کے موقع پر سرائیوو میں گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے کہ پاکستان کئی سالوں سے یکطرفہ عالمی دباؤ کی زد میں ہے۔ وزیراعظم کا یہ ارشاد بجا ہے اور اس بات سے دباؤ کی شدت اور سنگینی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انہیں یہ بات غیر ملکی دورے کے موقع پر کہنا پڑی ہے۔

پاکستان اپنے قیام کے بعد سے ہی عالمی دباؤ کا شکار چلا آرہا ہے مگر ہمارے مقتدر طبقات کو اس کا صحیح طور پر احساس نہیں ہوا، یا وہ اسے معمول کی بات سمجھتے رہے ہیں، لیکن جوں جوں معاملات آگے بڑھ رہے ہیں اس دباؤ کی سنگینی میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ چنانچہ یہ ضروری ہو گیا ہے کہ اس عالمی دباؤ کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لے کر اس کی نوعیت اور سطح کو واضح کیا جائے اور اس دباؤ کا سامنا کرنے کیلئے قوم کو تیار کیا جائے۔

عالمی قوتوں کی توقعات اور مایوسی

پاکستان جب ۱۹۴۷ء کے دوران دنیا کے نقشے پر ایک نئی ریاست کے طور پر نمودار ہوا تو دنیا میں عام طور پر یہ سمجھا گیا کہ جنوبی ایشیا کے اس خطہ کے مسلمانوں نے جذباتیت کا اظہار کر کے اسلام کے نام پر ایک الگ ملک کے قیام کا مقصد تو حاصل کر لیا ہے مگر اسے ایک مستحکم نظریاتی ریاست بنانے کے مراحل شاید وہ نہیں طے کر پائیں گے اور بھارت کے اردگرد موجود دیگر چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی طرح یہ ملک بھی اسی طرز کی ایک ریاست کی صورت اختیار کر جائے گا۔ مگر قیامِ پاکستان کے بعد اس نئے ملک کے عوام کی غالب اکثریت نے جس انداز میں اپنی ''جذباتیت'' کا تسلسل قائم رکھا ہے اس سے ان لوگوں کی توقعات مجروح ہوئی ہیں۔ اس لیے انہیں پاکستان کو اس سمت آگے بڑھنے سے روکنے کے لیے نئی منصوبہ بندی کرنا پڑی ہے اور اسے دباؤ میں رکھنے کے نت نئے حربے اختیار کرنا پڑے ہیں۔

۱. عالمی منصوبہ بندوں کی یہ توقع نہیں تھی کہ پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی قراردادِ مقاصد کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیتِ اعلیٰ کی بات کرے گی اور قرآن و سنت کو ملک کے دستور و قانون کی بنیاد قرار دینے کا حوصلہ کرے گی۔

۲. یہ توقع بھی ان حضرات کو نہیں تھی کہ پاکستان کے بنتے ہی عالمی استعمار کے اس خطہ کے لیے تیار کردہ گروہ کو ۱۹۵۳ء میں شدید عوامی نفرت کا سامنا کرنا پڑے گا اور پاکستان کو امریکہ کی جھولی میں ڈالنے والے وزیر خارجہ کے لیے اپنے مشن کو جاری رکھنا مشکل ہو جائے گا۔

۳. عالمی استعماری حلقوں کے لیے یہ بات بھی قطعی طور پر خلافِ توقع تھی کہ ۱۹۷۳ء میں تشکیل پانے والے ملکی دستور کی بنیاد قراردادِ مقاصد اور دیگر دوٹوک اسلامی نکات پر ہوگی۔ اور وہ بھی مسٹر ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے ہاتھوں ہوگی جن کے بارے میں یہ سمجھا جا رہا تھا کہ ان کا ایجنڈا ہی قوم کو سوشلزم کے نام پر دین سے دور لے جانا ہے۔

۴. اور پھر بھٹو مرحوم کے ذریعہ ہی قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا تاریخی فیصلہ بھی ملک کے دستور و قانون کا حصہ بن جائے گا۔

۵. ان عالمی لابیوں کے خیال میں پاکستان کو ایٹمی قوت بنانے کی کوشش بھی محض ایک خام خیالی تھی مگر ان کی توقعات کے برعکس پاکستانی قوم نے یہ مرحلہ بھی طے کر لیا۔

آج ان تمام حوالوں سے پاکستان کو ”ریورس گیئر“ کی کیفیت میں لے جانے کی تگ و دو جاری ہے اور اس کے گرد سازشوں کے جال بنے جا رہے ہیں جسے میاں نواز شریف نے ”عالمی دباؤ“ سے تعبیر کیا ہے۔

بلاشبہ میاں محمد نواز شریف کے ذہن میں اس عالمی دباؤ کا بڑا حوالہ ایٹمی پروگرام اور سی پیک کے دو پروگرام ہیں جو ان کے دور میں ہوئے ہیں اور جنہیں ختم کرنے یا کمزور کرنے کے لیے سازشوں کے تانے بانے انہیں اپنے اردگرد دکھائی دے رہے ہیں۔ مگر پاکستان کا اسلامی تشخص اور نظریاتی بنیادیں بھی اسی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ اس دباؤ کی زد میں ہیں جس کی تازہ ترین مثال ایمنسٹی انٹرنیشنل کی وہ حالیہ رپورٹ ہے جو ابھی چند روز قبل سامنے آئی ہے۔ اس رپورٹ میں دستورِ پاکستان کی ان تمام دفعات کے خاتمہ یا کم از کم ان میں ایمنسٹی کے نقطۂ نظر کے مطابق ردوبدل کو ناگزیر قرار دیا گیا ہے جن کا تعلق پاکستان کے اسلامی تشخص سے ہے، مسلم قوم کی تہذیبی اقدار سے ہے، اسلام کے خاندانی اور عدالتی نظام سے ہے اور قرآن و سنت کے ساتھ مسلمانوں کی عقیدت و وابستگی سے ہے۔

پاکستان کی اسلامی حیثیت اور عالمی ایجنڈا

عالمی دباؤ کے پیچھے متحرک قوتوں کی سب سے بڑی خواہش اور کوشش یہ ہے کہ پاکستان بھی دنیا کے دوسرے ملکوں کی طرح اپنے دستوری و قانونی نظام کو اسلامی تعلیمات و ہدایات سے لاتعلق کر لے، اسلام کے خاندانی نظام و روایات سے دستبردار ہو جائے، حلال و حرام کے دینی دائروں کی پروا کرنا چھوڑ دے، اور مذہبی عقائد و اخلاقیات کو خیرباد کہہ دے۔ ہمارے مقتدر طبقات اور رولنگ کلاس کے بس میں ہوتا تو یہ کام خدانخواستہ بہت پہلے ہو چکا ہوتا، مگر پاکستان کے عوام اس کے لیے تیار نہیں ہیں جس کا اظہار عام انتخابات کے ساتھ ساتھ وقتاً فوقتاً اس سلسلہ میں پیش کی جانے والی سروے رپورٹوں کی صورت میں ہوتا رہتا ہے۔ جیسا کہ ابھی گزشتہ سال ایک بین الاقوامی ادارے کی سروے رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ پاکستان کے عوام کی ۹۸ فی صد اکثریت ملک میں اسلامی احکام و قوانین کا عملی نفاذ چاہتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ملک کے دینی حلقے بھی یکسر بے خبر اور بے حس نہیں ہے اور ضرورت کے وقت نہ صرف متحد ہو جاتے ہیں بلکہ اپنے مشترکہ اہداف کے لیے متحرک بھی ہو جاتے ہیں۔

ہم اس موقع پر محترم وزیراعظم سے یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اگر وہ فی الواقع اس عالمی دباؤ کو محسوس کر رہے ہیں تو اس کا سرسری ذکر کر دینا کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لیے قومی یکجہتی اور ہم آہنگی کے فروغ کے لیے مؤثر اور مربوط اقدامات کی بھی فوری ضرورت ہے۔ ہمارے خیال میں اس وقت جن مسائل میں عالمی دباؤ کا سامنا ہے ان کی ایک سرسری سی فہرست یہ ہے:

- پاکستان کے اسلامی اور نظریاتی تشخص کو ختم کر کے اسے دستوری طور پر سیکولر ریاست کی حیثیت دی جائے۔
- مختلف قومی شعبوں میں جو چند شرعی قوانین برائے نام موجود ہیں انہیں ترمیم و تبدیلی کے ذریعہ غیر مؤثر کر دیا جائے۔
- مسلمانوں کا خاندانی نظام جو قرآن و سنت کے احکام و قوانین اور مذہبی روایات پر قائم ہے، اسے بتدریج شرعی احکام و قوانین کی پابندی سے آزاد کرا کے مغربی فلسفہ و ثقافت کو نکاح و طلاق اور دیگر خاندانی ضابطوں کی بنیاد بنا دیا جائے۔
- پاکستان کی معاشی ترقی کے لیے سی پیک منصوبہ جس قدر اہمیت اختیار کر گیا ہے اسے جس حد تک ہو سکے کمزور کر دیا جائے۔
- پاکستان کی فوج دنیا کی مانی ہوئی فوج سمجھی جاتی ہے، اس کے سائز اور صلاحیت دونوں کو مجروح کیا جائے۔

- توہینِ رسالتؐ کی سزا کا قانون ختم کر دیا جائے۔
- قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا دستوری و قانونی فیصلہ واپس کرایا جائے۔
- رقص و سرود اور نام نہاد فنونِ لطیفہ کی آڑ میں اسلامی تہذیب و ثقافت کے اثرات کو کم کیا جائے۔
- عریانی، فحاشی اور مخلوط اجتماعات کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیا جائے۔
- میڈیا، این جی اوز اور لابیوں کے ذریعہ فکری، اعتقادی اور تہذیبی خلفشار کو مسلسل بڑھایا جائے۔
- دینی مدارس اور اداروں اور دینی روایات و اقدار کی تضحیک و استہزا اور حوصلہ شکنی کا کلچر عام کیا جائے۔
- دینی حلقوں کو مختلف حوالوں سے مسلسل دباؤ میں رکھا جائے اور انہیں کسی سطح پر آزادی کے ساتھ کام نہ کرنے دیا جائے۔
- پاکستان کی ایٹمی صلاحیت کو جس طرح بھی ممکن ہو ختم یا کمزور کیا جائے، وغیر ذٰلک۔

یہ صرف چند پہلو ہیں جو ہم نے عرض کیے ہیں۔ اصل ضرورت اس امر کی ہے کہ سنجیدہ اربابِ فکر و دانش مشترکہ سوچ بچار کے ذریعہ پاکستان کو درپیش عالمی دباؤ کی نوعیت، دائرہ، سطح اور طریق کار کا جائزہ لے کر ایک جامع رپورٹ مرتب کریں اور اس کی روشنی میں قوم کو اس کے مقابلہ کے لیے تیار کیا جائے اور اگر بالفرض ریاستی ادارے اس کے لیے آمادہ نہ ہوں تو پرائیویٹ سطح پر سنجیدہ علمی ادارے اس کام کے لیے آگے بڑھیں اور قوم کی صحیح سمت راہنمائی کا اہتمام کریں۔

ضیاء الحق مرحوم، بھٹو مرحوم اور میاں محمد نواز شریف

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ — ۲۶ فروری ۲۰۱۷ء)

...... ملکی تاریخ یہ بتاتی ہے اور پرانے دینی وسیاسی کارکن جانتے ہیں کہ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم اور جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے دور میں ایسا نہیں تھا۔ یہ دونوں حکمران ایک دوسرے کے مخالف اور ضد شمار ہوتے ہیں لیکن دونوں کے دور میں دینی مطالبات کو دینی نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا رہا ہے، دینی حلقوں کی رائے کو اہمیت دی جاتی تھی اور ملک کے اسلامی تشخص کے بارے میں بیرونی دباؤ کی ایک حد سے زیادہ پروا نہیں کی جاتی تھی:

- ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کو قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے فیصلے میں کس قدر بیرونی دباؤ کا سامنا کرنا پڑا تھا اس سے واقفانِ حال بے خبر نہیں ہیں۔ لیکن جب انہیں یہ بات سمجھ میں آگئی کہ قادیانیوں کو مسلم سوسائٹی کا حصہ سمجھنا شرعی اور سماجی دونوں حوالوں سے غیر منصفانہ بات ہے اور یہ پوری قوم کا متفقہ مطالبہ ہے کہ قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ غیر مسلم اقلیتوں میں شمار کیا جائے تو انہوں نے ہر قسم کے دباؤ کو مسترد کرتے ہوئے پارلیمنٹ سے یہ قومی مطالبہ منظور کرایا اور آخر دم تک اس پر قائم رہے۔
- جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے بھٹو مرحوم کے اسی فیصلے کے تسلسل کو آگے بڑھایا اور امتناعِ قادیانیت آرڈیننس نافذ کر کے پارلیمنٹ کے فیصلے پر قانونی طور پر عملدرآمد کو یقینی بنایا۔

اس کے برعکس آج ہمیں مختلف صورتحال کا سامنا ہے اور بدقسمتی سے میاں محمد نواز شریف کے گزشتہ ادوارِ حکومت کی طرح اس مرتبہ بھی ان کی پالیسیوں کے گرد بیرونی دباؤ کے گہرے سائے موجود ہیں۔ ملک کے اسلامی تشخص کے حوالہ سے موجودہ حکومت کی بے پروائی انتہا کو چھوتی دکھائی دے رہی ہے اور قومی معاملات میں دینی حلقوں کی آواز کو نظر انداز کرنے بلکہ غیر مؤثر بنانے کے ساتھ ساتھ مختلف طریقوں سے انہیں دباؤ میں رکھنے کا وتیرہ بھی واضح نظر آ رہا ہے۔ حتیٰ کہ بعض مجالس میں سنجیدہ و دینی کارکنوں کی طرف سے اس تاثر کا اظہار کیا گیا ہے کہ

- دینی مطالبات اور دینی حلقوں کی اہمیت و احترام کے لحاظ سے پیپلز پارٹی کا دورِ حکومت مسلم لیگ کے دورِ حکومت سے بہتر رہا ہے،

- اور کہا جاتا ہے کہ پاکستان میں دینی مطالبات و مسائل کے بارے میں جس قدر بڑے بڑے کھلواڑ ہوئے ہیں مسلم لیگی حکومتوں کے دور میں ہوئے ہیں۔

اگر ان پہلوؤں کے حوالہ سے مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی کے مختلف ادوارِ حکومت کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے کوئی صاحبِ قلم اس کا تجزیہ پیش کر سکیں تو کچھ بعید نہیں کہ یہ تاثرات مبنی بر حقیقت ہوں۔ چنانچہ اب یوں لگ رہا ہے کہ حدود آرڈیننس کی طرح تحفظِ ختمِ نبوت اور تحفظِ ناموسِ رسالت کے قوانین کے بارے میں بھی کوئی بڑا کھلواڑ ہونے جا رہا ہے اور اسی لیے اعلیٰ ترین دینی قیادت کے متفقہ مطالبے پر مسلم لیگی حکومت نے چپ سادھ رکھی ہے۔

آل پارٹیز تحفظِ ناموسِ رسالت کانفرنس نے اپنے مطالبات کی منظوری کے لیے حکومت کو ایک ماہ کی مہلت دی تھی، یہ مہینہ بھی اتفاق سے ۲۸ دن کا ہے اور ختم ہونے کے قریب ہے، دینی طبقات انتظار میں ہیں کہ یکم مارچ کے بعد مرکزی رابطہ کمیٹی کے کسی اجلاس سے یہ معلوم ہو کہ ہماری دینی قیادت عوامی جدوجہد اور تحریک کے لیے سنجیدہ ہے یا حسبِ سابق ''اسی تنخواہ'' پر گزارا کرنے کا پروگرام ہے۔......

استنبول اعلامیہ

(روزنامہ اسلام، لاہور — ۱۶ دسمبر ۲۰۱۷ء)

......پہلی خبر اسلامی تعاون تنظیم (او آئی سی) کے استنبول میں ہونے والے سربراہی اجلاس کی ہے جس میں امریکہ کا سفارت خانہ بیت المقدس میں منتقل کرنے کے بارے میں امریکی صدر ٹرمپ کے اعلان کو مسترد کرتے ہوئے اعلان کیا گیا ہے کہ ''القدس''فلسطین کا دارالحکومت ہے اور امریکی صدر کا یہ اعلان غیر قانونی اور قابلِ مذمت ہے۔ کانفرنس کے اعلامیہ میں عالمی برادری سے اپیل کی گئی ہے کہ مشرقی بیت المقدس کو فلسطین کا دارالحکومت تسلیم کرنے کا اعلان کیا جائے۔

امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے مذکورہ اعلان کے بعد مسلم سربراہوں کے مل بیٹھنے کا پوری دنیا میں شدت کے ساتھ انتظار کیا جا رہا تھا جس کے لیے ترک صدر رجب طیب اردگان نے متحرک کردار ادا کیا ہے اور ان کی سرگرمیاں دیکھ کر عالمِ اسلام کے بیشتر حلقوں کو یہ اطمینان ہوا ہے کہ ہم اپنی عالمی قیادت سے یکسر محروم نہیں ہیں۔ صدر اردگان کو عالمِ اسلام کے اجتماعی مسائل کے لیے مضطرب اور بے چین دیکھ کر شاہ فیصلؒ، ذوالفقار علی بھٹوؒ اور مہاتیر محمد یاد آرہے ہیں جو امتِ مسلمہ کے اجتماعی مسائل پر گفتگو کرتے تھے اور ان کے لیے اپنے اپنے دائرہ میں کوشاں بھی ہوتے تھے۔ اول الذکر دونوں اللہ تعالیٰ کے حضور جا چکے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ مغفرت اور رحمت کا معاملہ فرمائیں جبکہ آخر الذکر مہاتیر محمد علیل ہیں اور ہم ان کی صحت یابی کے لیے بارگاہ ایزدی میں دعاگو ہیں، آمین یارب العالمین۔

- ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی خدمات میں لاہور کی مسلم سربراہ کانفرنس تاریخی سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے،
- جبکہ شاہ فیصل شہیدؒ نے مغربی ملکوں کو تیل کی سپلائی بند کر کے دنیا کو یہ احساس دلایا تھا کہ مسلم دنیا اور عالم عرب اگر آج بھی متحد و بیدار ہو جائیں تو عالمی معاملات پر مغرب کی اجارہ داری کو چیلنج کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔
- ملائیشیا کے وزیرِاعظم مہاتیر محمد نے او آئی سی کے سربراہ کے طور پر یہ مہم چلائی تھی کہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں مسلم امہ کو ویٹو پاور کا حق دلانے اور متنازعہ بین الاقوامی معاہدات پر نظرِ ثانی کے لیے مضبوط موقف اختیار کرنے کی ضرورت ہے جس کے لیے انہوں نے اقوامِ متحدہ کی

پچاس سالہ تقریبات کا بائیکاٹ کرنے کی تجویز دی تھی مگر بیشتر مسلم حکومتوں کی سرد مہری نے ان کی اس تجویز کو آگے نہیں بڑھنے دیا تھا۔

- ان کے بعد اب رجب طیب اردگان سامنے آئے ہیں جو حوصلہ و تدبر کے ساتھ عالمِ اسلام کے مسائل و مشکلات پر بات کر رہے ہیں اور ان کی پشت پر چونکہ "خلافتِ عثمانیہ" کا شاندار ماضی ہے اس لیے ہم جیسے نظریاتی کارکنوں کو ان کی باتیں زیادہ بھلی لگ رہی ہیں اور ان سے توقعات بھی زیادہ وابستہ ہو گئی ہیں، خدا کرے کہ وہ ان توقعات پر پورا اتریں، آمین یارب العالمین۔

جہاں تک استنبول کانفرنس کے اعلامیہ کا تعلق ہے ہمارے نزدیک یہ خوش آئند اور عالمِ اسلام کے جذبات کا ترجمان ہے۔ لیکن اعلامیہ سے آگے بھی کچھ کرنے کی ضرورت ہے، اس سلسلہ میں پاکستان کے سابق وزیر داخلہ جناب رحمان ملک کی یہ تجویز زیادہ مناسب لگتی ہے کہ او آئی سی میں شامل تمام ممالک امریکہ کا چند روز کے لیے عملی بائیکاٹ کر کے اس کو اپنی سنجیدگی کا احساس دلائیں۔ یہ بائیکاٹ اگرچہ علامتی ہو گا لیکن اگر اتنا بھی عملاً ہو جائے تو صدر ٹرمپ کو اپنے اعلان پر نظر ثانی کے لیے آمادہ کرنے میں مؤثر ثابت ہو سکتا ہے ورنہ اسرائیلی رویہ کے خلاف قراردادیں تو اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے بھی منظور کر رکھی ہیں جن سے صدر ٹرمپ بے خبر نہیں ہیں۔......

جنرل مشرف کی مجوزہ سیاسی اصلاحات، تاریخ کے آئینے میں

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد ــ ۷ اجولائی ۲۰۰۲ء)

صدر جنرل پرویز مشرف نے ریڈیو اور ٹی وی پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے جن اصلاحات کا اعلان کیا ہے وہ نئی نہیں ہیں بلکہ یہ اس دستوری آنکھ مچولی کا لازمی حصہ بن چکی ہیں جو قیامِ پاکستان سے لے کر اب تک مسلسل جاری ہے، اور جس میں ہمارے حکمران طبقات باری باری طاقت کو اپنے ہاتھ میں لینے اور پھر اسے کنٹرول میں رکھنے کا تجربہ کرتے آرہے ہیں۔

اقتدار پر قبضے کا کھیل

گورنر جنرل غلام محمد سے اس کھیل کا آغاز ہوا اور اسکندر مرزا، جنرل محمد ایوب خان، جنرل محمد یحییٰ خان، ذوالفقار علی بھٹو اور جنرل ضیاء الحق، بے نظیر بھٹو اور میاں محمد نواز شریف کے ادوار سے گزرتا ہوا اب یہ کھیل جنرل پرویز مشرف کی کپتانی میں ایک نئے دور کا آغاز کر رہا ہے۔ سیاستدان، بیوروکریٹس اور جنرل صاحبان اس کھیل کی اصل ٹیمیں ہیں۔ اور جس ٹیم نے بھی وکٹ سنبھالی ہے، کھیل کے ضوابط اور اخلاقیات کی کوئی پروا کیے بغیر وکٹ پر قبضہ برقرار رکھنے کے لیے جو کچھ اس کے بس میں ہوا وہ کر گزری ہے۔

درمیان میں ۱۹۵۶ء اور ۱۹۷۳ء کے دساتیر کی منظوری کے دو مراحل ایسے آئے ہیں جن میں قوم کو یہ توقع ہو چلی تھی کہ شاید اب قومی سیاست کی گاڑی طاقت کی کشمکش سے نجات پا کر اصول اور ضوابط و قواعد کی پٹڑی پر چل پڑے گی۔ مگر اصول، قانون، ضابطہ اور اخلاقیات کا دورانیہ بہت مختصر رہا اور قوت و طاقت کے حصول اور اس کے اندھا دھند استعمال کی روش پھر قوم کو سیاسی دھینگا مشتی کے دور میں واپس لے گئی۔

فردِ واحد میں اختیارات کے ارتکاز کا تصور

اختیارات کے ایک ہاتھ میں ارتکاز کا تصور بہت پرانا ہے:

- غلام محمد نے اسی فلسفہ کے تحت دستور ساز اسمبلی کا کریاکرم کیا تھا اور سپریم کورٹ آف پاکستان نے اسے سندِ جواز بھی فراہم کر دی تھی۔

- جنرل محمد ایوب خان نے بھی یہی فارمولا اپنایا اور عدالت عظمیٰ اس کی پشت پر رہی۔
- اس کے بعد جنرل محمد یحییٰ خان کے دور میں فرد واحد کے فیصلوں نے ملک کو دولخت کر دیا۔
- مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد باقی ماندہ پاکستان میں ۱۹۷۳ء کا دستور منظور ہوا تو محب وطن حلقوں نے اطمینان کا سانس لیا کہ اب ملک میں فرد واحد کے فیصلوں کی بجائے پارلیمنٹ اور اداروں کی حکمرانی کا دور شروع ہوگا اور طاقت کی بالادستی کے فلسفہ سے نجات ملے گی۔ مگر بدقسمتی سے ۱۹۷۳ء کے دستور کو منظور کرنے والے سیاستدان جناب ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں ہی یکطرفہ دستوری ترامیم کے ذریعے اختیارات کو ایک ہاتھ میں مرتکز کرنے اور اختلاف کرنے والے نمائندوں کو اٹھا کر پارلیمنٹ ہاؤس سے باہر پھینک دینے کی کارروائی سامنے آئی تو اصول و قانون کی بالادستی اور اداروں کی حکمرانی کا خواب ایک بار پھر پریشان ہوگیا اور پاکستان دوبارہ غلام محمد کے دور میں واپس چلا گیا۔
- جنرل ضیاء الحق آئے اور انہوں نے دستور کی بساط لپیٹ کر تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے تو ان کے دلائل بھی وہی تھے جو آج نئی سیاسی اصلاحات کے حق میں پیش کیے جا رہے ہیں۔ یہ دلائل اس سے قبل جناب غلام محمد اور جنرل محمد ایوب خان کے کام آچکے تھے، چنانچہ انہی دلائل کی بنیاد پر عدالت عظمیٰ نے جنرل محمد ضیاء الحق کی شخصی حکومت کو بھی تحفظ فراہم کر دیا۔
- اس کے بعد بے نظیر بھٹو اور میاں محمد نواز شریف نے دو دو باریاں لیں مگر طرز وہی رہا کہ حکومت کی کرسی پر ہیں تو تمام اختیارات اور طاقت کو مٹھی میں رکھتے ہوئے مخالفین کو آزادانہ سیاسی زندگی اور کردار کے مواقع سے محروم کرنا، اور اقتدار سے باہر ہیں تو برسراقتدار گروہ کو ہر قیمت پر اقتدار سے ہٹانا اور کسی طرح بھی آرام سے حکومت نہ کرنے دینا ان دونوں سیاسی قوتوں کی اولین ترجیح رہی۔ اور بالآخر اسی کشمکش نے جنرل پرویز مشرف کی تشریف آوری کی راہ ہموار کی جس کے نتیجے میں پوری قوم اور خاص طور پر سیاسی قوتوں کو ان اصلاحات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، جن میں ایک طرف جنرل پرویز مشرف ہیں اور دوسری طرف اے آر ڈی اور متحدہ مجلس عمل کے دو پلیٹ فارموں کی صورت میں ملک کی کم و بیش تمام اہم دینی و سیاسی جماعتیں ہیں جو ان اصلاحات کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، لیکن عدالت عظمیٰ کی فراہم کردہ چھتری نے ان اصلاحات کے نفاذ کو یقینی بنا دیا ہے۔
- جنرل پرویز مشرف کے سیاسی فارمولے، اصلاحات، قوم سے خطاب اور اقدامات میں کوئی ایسی نئی بات نظر نہیں آ رہی جو اس سے قبل غلام محمد، جنرل محمد ایوب خان اور جنرل ضیاء الحق

کے فارمولوں میں شامل نہ رہی ہو۔ صرف نیشنل سیکیورٹی کونسل کے بارے میں جنرل پرویز مشرف کہہ سکتے ہیں کہ نیا سیاسی اقدام ہے، لیکن جب بات طاقت اور صرف طاقت کی بالادستی کے حوالے سے ہو رہی ہے اور ہر معاملہ میں طاقت ہی کو حرفِ آخر قرار دیا جارہا ہے تو قومی سلامتی کونسل کے قیام سے بھی صورتحال میں کوئی فرق رونما نہیں ہوگا۔ جس کے ہاتھ میں طاقت ہوگی، سلامتی کونسل بھی اسی کے ہاتھ میں ہوگی۔ کسی مرحلہ میں اس قومی سلامتی کونسل نے ''طاقتور'' کے ہاتھ سے پھسلنے کی کوشش کی تو اس کے پاس طاقت کے اظہار کے اور ذرائع بھی موجود ہوں گے، اور بدقسمتی سے ہمارے ہاں یہ روایت بالاتر قانون کا درجہ اختیار کر چکی ہے کہ جب ''طاقتور'' اپنی طاقت کے اظہار اور استعمال کا فیصلہ کر لیتا ہے تو مذہب، سیاست، عدالت یا کسی بھی دوسرے فورم کے لیے اس بات کا کوئی امکان باقی نہیں رہ جاتا کہ وہ اس طاقت کو آگے بڑھنے سے روک سکے یا کم از کم اسے کہہ ہی سکے کہ جناب والا! آپ جو کچھ کر رہے ہیں، درست نہیں ہے۔

مستقبل کا متوقع نقشہ

ہمیں مستقبل کا نقشہ بھی اسی طرح نظر آرہا ہے کہ اگر جنرل پرویز مشرف کی اصلاحات کے مطابق اکتوبر کے انتخابات منعقد ہو جاتے ہیں تو اسمبلیاں وجود میں آئیں گی۔ وہ جنرل موصوف کے آئینی اقدامات کو آٹھویں دستوری ترمیم کی طرز پر تحفظ فراہم کریں گی، اس کے بعد سیاسی عمل آگے بڑھے گا اور ایک دو انتخابات کے بعد کسی بھی سیاسی جماعت نے پارلیمنٹ میں مضبوط پوزیشن اختیار کر لی تو جنرل پرویز مشرف کی سیاسی اصلاحات اور ان کے آئینی تحفظات کا تیا پانچہ اور اختیارات کی کشمکش ہوگی۔ جو اس قدر طول پکڑے گی کہ پھر کسی جنرل کے انتظار میں لوگوں کی نگاہیں جی ایچ کیو کی طرف اٹھنے لگیں گی، اور اس کے بعد پردۂ غیب سے ایک اور جنرل محمد ایوب خان نمودار ہوں گے جو قوم کو سیاست دانوں کی بدعنوانیوں اور بے اصولیوں سے نجات دلانے کی پرانی گیم کا از سرِ نو آغاز فرما دیں گے۔

اسلامی نظام کی ضرورت

اسلام کے سیاسی نظام میں اور آج کے سیاسی فلسفوں میں یہی فرق ہے کہ اسلام میں اصول و ضوابط پہلے سے طے شدہ ہیں جن میں ردوبدل کا کسی کو اختیار نہیں ہے۔ حکومت نے جس پٹڑی پر چلنا ہے، وہ متعیّن ہے اور اس کا کانٹا بدلنا کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ جبکہ جمہوریت سمیت آج کے تمام سیاسی نظاموں کی بنیاد اس پر ہے کہ انسانوں نے اصول بھی خود طے کرنے ہیں اور ان پر عملدرآمد کا اہتمام بھی

خود کرنا ہے۔ یہ اصول وضوابط اور اخلاق وقوانین فردِ واحد طے کرے، کوئی گروہ یا طبقہ انہیں ترتیب دے، یا کوئی منتخب پارلیمنٹ ان کا خاکہ مرتب کرے، بہرحال انسانوں نے ہی طے کرنے ہوتے ہیں۔ اور جن کے ہاتھوں میں طے کرنے کا اختیار ہوتا ہے، ان کے ذہنی رجحانات، گروہی یا شخصی مفادات اور سیاسی ترجیحات کی چھاپ بہرحال ان اصولوں اور ضوابط پر نمایاں ہوتی ہے۔

خلافتِ راشدہ کا آغاز خلیفۂ اول حضرت سیدنا صدیق اکبرؓ کے اس خطبہ سے ہوتا ہے جب انہوں نے اقتدار سنبھالنے کے بعد مسجد نبویؐ میں کھلے بندوں قوم سے خطاب کیا اور اپنی پالیسیوں کا اعلان فرمایا۔ اس میں انہوں نے کوئی سیاسی فارمولا نہیں پیش کیا اور نہ ہی دستوری اصلاحات کے بکھیڑے میں پڑنے کی ضرورت محسوس کی، بلکہ یہ فرمایا کہ اصول وضوابط اللہ تعالیٰ کے احکام اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی شکل میں طے شدہ ہیں، اگر میں ان کے مطابق چلوں تو میرا ساتھ دو اور اگر ٹیڑھا چلوں تو مجھے پکڑ کر سیدھا کر دو۔ خدا کرے کہ یہ فلسفہ پاکستانی حکمرانوں کی سمجھ میں بھی آجائے کیونکہ دستوری اکھاڑ پچھاڑ اور طاقت کی کشمکش سے نجات کا اس کے سوا کوئی راستہ نہیں۔

امریکی کانگریس کا ناشتہ اور انڈونیشیا کے مسلم راہنما

(روزنامہ اسلام، مظفر آباد ــ جنوری ۲۰۰۳ء)

”آن لائن“ کی ایک رپورٹ کے مطابق انڈونیشیا کی دو اسلامی تنظیموں کے سربراہوں نے امیگریشن قوانین اور عراق کے خلاف امریکی موقف پر احتجاج کرتے ہوئے امریکی کانگریس کی طرف سے دی جانے والی ناشتے کی دعوت کو مسترد کر دیا ہے۔

- اسلامی تنظیموں کے سربراہ ہاشم موزاذی نے کہا ہے کہ میں عراق کے خلاف اختیار کی گئی امریکی پالیسی کے خلاف احتجاج کے طور پر اس دعوت میں نہیں جا رہا۔
- انڈونیشیا کی ایک اور بڑی اسلامی تنظیم ”محمدیہ“ کے چیئرمین صارفی معارف نے بھی اس دعوت کو مسترد کر دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے امریکی کانگریس کی طرف سے ناشتے کی دعوت کو اس لیے بھی مسترد کیا ہے کہ امریکہ میں مقیم انڈونیشیا کے باشندوں کو رجسٹریشن کرانے کا پابند بنایا گیا ہے۔

انڈونیشیا آبادی کے لحاظ سے عالمِ اسلام کا سب سے بڑا ملک ہے اور مشرقِ بعید میں ہزاروں جزیروں پر مشتمل ہے۔ اس خطہ میں آباد مسلمانوں کی غالب اکثریت حضرت امام شافعیؒ کی فقہ کی پیروکار ہے اور مختلف اسلامی تنظیمیں وہاں دینی مقاصد کے لیے کام کر رہی ہیں جن میں سب سے قدیمی جماعت ”نہضۃ العلماء“ ہے۔ انڈونیشیا ایک عرصہ تک ولندیزی استعمار کے تحت ہالینڈ کی نوآبادی رہا ہے اور وہاں کے علماء نے بھی استعماری تسلط کے خلاف آزادی کی جنگ میں سرگرم کردار ادا کیا ہے۔

سرد جنگ کے ماحول میں غیر جانبدارانہ عالمی بلاک کی تشکیل اور انجام

انڈونیشیا نے معروف قوم پرست راہنما ڈاکٹر عبد الرحیم احمد سوئیکارنو مرحوم کی قیادت میں ولندیزی استعمار سے آزادی حاصل کی تھی اور وہی آزاد انڈونیشیا کے پہلے صدر قرار پائے تھے۔ لیکن چونکہ ان کا رجحان بائیں بازو کی طرف زیادہ تھا اور انہیں ایک سوشلسٹ لیڈر کے طور پر پہچانا جاتا تھا اس لیے ان کا شمار ابتدا سے ہی امریکہ کے معتوب مسلمان لیڈروں میں ہونے لگا۔ وہ دبنگ آدمی تھے اور نہ صرف انڈونیشیا کی قومی خود مختاری کو برقرار رکھنے کے علمبردار تھے بلکہ انہوں نے عالمی سطح پر بھی امریکہ اور روس کی سرد جنگ میں کسی ایک کا حاشیہ بردار نہ بننے والے ملکوں کو متحد کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ عالمی سطح پر

غیر جانبدار بلاک کی تشکیل میں ان کا اہم حصہ رہا ہے بلکہ غیر جانبدار ممالک کی سب سے پہلی کانفرنس انڈونیشیا کے شہر بنڈونگ میں ہوئی تھی جس میں ان ممالک کو ایک فورم پر جمع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

اس مہم میں ان کے ساتھ یوگوسلاویا کے مارشل ٹیٹو، بھارت کے پنڈت جواہر لال نہرو اور مصر کے صدر جمال عبدالناصر مرحوم نے بھی نمایاں حصہ لیا تھا۔ ابتدا میں اس گروپ کی اٹھان ایسی تھی کہ لگتا تھا آئندہ دنیا کی قیادت یہی لیڈر کریں گے۔ یہ میرا بچپن کا دور تھا مگر اخبار بینی کا شوق اور سیاسیات سے دلچسپی اس وقت بھی اس حد تک ضرور تھی کہ عالمی لیڈروں کے بیانات اور سرگرمیاں پڑھ کر ذہن ان کے بارے میں ترجیحات قائم کر لیتا تھا۔ سچی بات ہے کہ اس دور میں مارشل ٹیٹو، ڈاکٹر عبدالرحیم احمد سوئیکارنو، جمال عبدالناصر، پنڈت جواہر لال نہرو، الجزائر کے احمد بن بیلا، سوڈان کے ابراہیم عبود اور پاکستان کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے بیانات شوق سے پڑھا کرتا تھا اور مجھے یہ بیانات بہت اچھے لگا کرتے تھے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ استعمار دشمنی ہم دیوبندیوں کے خمیر میں داخل ہے، اس لیے استعمار اور سامراج کے خلاف جس منہ سے بھی کوئی آواز سنائی دے ہمیں وہ چہرہ اچھا لگنے لگتا ہے۔ اس حوالہ سے دیوبندی ذوق کا اندازہ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے اس جملہ سے کیا جا سکتا ہے کہ

"میں ان چیونٹیوں کو شکر کھلانے کے لیے تیار ہوں جو انگریز کو کاٹیں"۔

بلکہ شاہ جیؒ سے منسوب یہ جملہ بھی بعض احرار خطباء سے میں نے سنا ہے کہ

"میں ان سوروں کا ریوڑ چرانے کے لیے تیار ہوں جو انگریز سامراج کی کھیتی اجاڑیں"۔

مذکورہ بالا مسلم لیڈر چونکہ استعمار کے خلاف بات کرتے تھے اور قومی خود مختاری اور آزادی کے نعرے ان کی زبان پر ہوتے تھے اس لیے باقی تمام امور سے قطع نظر ان کی اس بات پر جی خوش ہوتا تھا۔ مگر "غیر جانبدار بلاک" جس عزم اور دعوے کے ساتھ اٹھا تھا اس کا وہ طمطراق زیادہ دیر تک قائم نہ رہا۔ علاقائی تضادات اور لوکل سیاست کے مفادات کا جال شاطر استعمار نے اس ہوشیاری کے ساتھ پھیلایا کہ یہ سارا گروپ تتر بتر ہو کر رہ گیا:

- پنڈت نہرو کے غبارے سے ہوا چین کا ہوا دکھا کر نکال دی گئی۔
- الجزائر کے احمد بن بیلا داخلی سیاست کی نذر ہو گئے۔
- جمال عبدالناصر کے دانت اسرائیل کے ذریعے کھٹے کر دیے گئے۔
- سوڈان کے مرد آہن جنرل ابراہیم عبود کو انقلاب نے چاٹ لیا۔
- ذوالفقار علی بھٹو اعلانِ تاشقند کی بھینٹ چڑھ گئے۔

- جبکہ ڈاکٹر سوئیکار نو کے خلاف امریکی سی آئی اے نے خود محاذ سنبھال لیا اور انہیں اقتدار سے ہٹانے کے لیے انڈونیشیا کے لاکھوں عوام موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔

مسلمان ملکوں کی آزادی اور خود مختاری کے ساتھ ڈاکٹر سوئیکار نو مرحوم کی دلچسپی کا عالم یہ تھا کہ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں وہ کھل کر پاکستان کی حمایت کے لیے میدان میں آ گئے، خود اس کی پشت پر کھڑے ہو گئے، اپنی بحریہ کا کنٹرول پاکستان کے سپرد کر دینے کی پیشکش کی اور ''گنجنگ انڈیا'' (انڈیا کو تباہ کر دو) کا نعرہ مستانہ بلند کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کو ملنے والی سزا کے اسباب و جرائم میں ایک بڑا سبب اور جرم یہ بھی تھا۔

آج انڈونیشیا میں ڈاکٹر سوئیکار نو مرحوم کی بیٹی میگاوتی سوئیکار نو پتری حکمران ہیں، جیسے پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی بیٹی بے نظیر بھٹو دو بار وزیر اعظم رہ چکی ہیں۔ لیکن اگر ان بیٹیوں کی سیاسی کارکردگی کی رپورٹ ان کے باپوں کو آج بھی پیش کر دی جائے تو عالمِ برزخ میں ان دونوں لیڈروں کی گردنیں شرم و ندامت سے جھک جائیں۔

موجودہ دور کا انڈونیشیا: مسیحی مشنریاں، مشرقی تیمور، قادیانیت

انڈونیشیا اس کے بعد سے مسلسل سازشوں کی زد میں ہے، مسیحی مشنریوں کا سب سے بڑا نیٹ ورک اس وقت انڈونیشیا کے مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لیے سرگرمِ عمل ہے۔ پورے انڈونیشیا میں ہزاروں این جی اوز کا جال بچھا ہوا ہے جو لادینیت کے فروغ، مغربی کلچر کے پرچار اور دینی اقدار کو کمزور کرنے کے ساتھ ساتھ فوج اور سول سروس میں مسیحی افسروں کو منظم اور مربوط بنانے کے لیے کام کر رہی ہیں۔

مشرقی تیمور انہی سازشوں کے نتیجہ میں انڈونیشیا سے الگ ہو کر ایک آزاد مسیحی ریاست کا روپ دھار چکا ہے جس کی اقوامِ متحدہ اور عالمی برداری نے مکمل حمایت بلکہ پشت پناہی کی ہے اور بعض دیگر جزائر میں بھی اس نوعیت کی سرگرمیاں بڑھ رہی ہیں۔

قادیانیوں کا ایک بڑا نیٹ ورک بھی اس وقت انڈونیشیا میں ہے، وہ وہاں کی سیاست میں خاصے دخیل ہیں، پارلیمنٹ میں ان کی نمائندگی موجود ہے، مرزا طاہر احمد چند سال قبل جب انڈونیشیا گئے تو انہیں سرکاری پروٹوکول دیا گیا اور پارلیمنٹ ہاؤس میں ایک تقریب سے انہوں نے خطاب بھی کیا۔

مشرقِ وسطیٰ کے لیے امریکی ایجنڈا

اس پس منظر میں انڈونیشیا سے یہ خبر آئی ہے کہ وہاں کی دو اسلامی جماعتوں نے امریکی پالیسیوں کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے امریکی کانگریس کی طرف سے دی جانے والی ناشتے کی دعوت کو مسترد کر دیا

ہے۔ امریکی کانگریس کی ناشتے کی اس دعوت کا کافی دنوں سے چرچا ہے اور اس کی خبریں اخبارات کی زینت بن رہی ہیں۔ پاکستانی لیڈروں میں محترمہ بے نظیر بھٹو اس دعوت میں شرکت کا اعلان کر چکی ہیں۔ پاکستان مسلم لیگ کے لیڈر میاں شہباز شریف کے اچانک امریکہ پہنچنے کے پیچھے بھی ہمیں یہی دعوت کارفرما دکھائی دیتی ہے۔ امریکی کانگریس عراق پر حملے اور مشرقِ وسطیٰ کی نئی جغرافیائی تقسیم کے عملی آپریشن سے قبل عالمِ اسلام کی مسلم لیڈرشپ کو اعتماد میں لینا چاہتی ہے اور اس کا ممکنہ ردعمل معلوم کرنا چاہتی ہے۔ اسی مقصد کے لیے ناشتے کی یہ میز بچھائی جا رہی ہے اور عالمِ اسلام کے مختلف حصوں کے مسلمان لیڈر اسے اپنے لیے اعزاز سمجھتے ہوئے بھاگم بھاگ امریکہ پہنچ رہے ہیں۔

مسلمانوں لیڈروں کو ناشتے پر اکٹھا کرنے کی یہ تگ و دو بتاتی ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں امریکی ایجنڈے کی تکمیل کی طرف پیش قدمی کا فیصلہ کن مرحلہ آ پہنچا ہے۔ عراق صرف بہانہ ہے اور سلامتی کونسل کی قراردادیں صرف آڑ ہیں، اصل مقصد تیل کے چشموں کا کنٹرول حاصل کرنا ہے، مشرقِ وسطیٰ کا جغرافیہ تبدیل کرنا ہے، ''عظیم تر اسرائیل'' کے نقشے میں رنگ بھرنا ہے، اور عالمِ اسلام کے قلب میں اس پر ایک ایسا خوفناک وار کرنا ہے کہ وہ اس کے بعد صدیوں تک کچھ کرنے بلکہ کچھ کہنے کے قابل بھی نہ رہے۔ یہ استعمار کا پروگرام ہے، دجالی گروہوں کا ایجنڈا ہے اور قبضہ گروپ کی منصوبہ بندی ہے۔ کائنات کے اصل حاکم کا پروگرام کیا ہے، یہ پردۂ راز میں ہے اور ہمیشہ آخر وقت تک پردۂ راز میں ہی رہتا ہے، اس کا علم دنیا کو اسی وقت ہوتا ہے جب ''انا ربکم الاعلیٰ'' کا نعرہ لگانے والا فرعون بحیرۂ قلزم میں ڈبکیاں کھا رہا ہوتا ہے۔

ہم انڈونیشیا کی دو مسلم تنظیموں کے سربراہوں کو ان کے اس اعلان پر مبارکباد دیتے ہیں، ان کا یہ بائیکاٹ امریکی کانگریس کے ناشتے کی میز بچھنے میں تو رکاوٹ نہیں بنے گا اور نہ ہی اس ناشتے میں شریک ہونے والے نام نہاد مسلم لیڈروں کے کانوں پر کوئی جوں رینگے گی لیکن اس سے اسلامی غیرت کا اظہار ضرور ہوتا ہے، یہی غیرت ہمارا آخری اثاثہ ہے اور یہی ان شاء اللہ تعالیٰ ملتِ اسلامیہ کی نشاۃِ ثانیہ کا نقطۂ آغاز ہوگی۔

۱۹۷۷ء کی تحریکِ نظامِ مصطفیٰؐ اور جناب حامد میر

(روزنامہ اسلام، لاہور ـــ ۱۹ اپریل ۲۰۱۱ء)

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ حامد میر صاحب اس حد تک بھی جا سکتے ہیں کہ ایک ریٹائرڈ بریگیڈیئر کی یادداشتوں کا سہارا لے کر حضرت مولانا عبید اللہ انور رحمہ اللہ تعالیٰ جیسے درویش صفت بزرگ پر ایک سیاسی تحریک میں غیر ملکی حکومتوں کے ساتھ ساز باز کا الزام عائد کر دیں گے۔ حامد میر صاحب سینئر صحافی اور کالم نگار ہیں، مطالعہ و تحقیق اور تجزیہ کی دنیا کے آدمی ہیں، البتہ مطالعہ وتحقیق کو کسی بھی موقع پر اپنے ڈھب پر ڈھال لینے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہیں، اسی لیے جب وہ کوئی بات خود سے کہنا چاہتے ہیں تو انہیں کوئی نہ کوئی حوالہ مل جاتا ہے اور وہ یہ تحقیق کیے بغیر کہ یہ حوالہ سند کی دنیا میں کیا درجہ رکھتا ہے اور درایت میں اس کی کیا حیثیت ہے، اس کی بنیاد پر اپنی بات کہہ جاتے ہیں۔ انہوں نے بھٹو مرحوم کی پھانسی کے کیس کو ''ری اوپن'' کیے جانے کی درخواست پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے ایک حالیہ کالم میں ۱۹۷۷ء کی تحریکِ مصطفیٰؐ کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ تحریک بھٹو مرحوم کے خلاف امریکہ کے کہنے پر چلائی گئی تھی اور اس میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور مولانا عبید اللہ انورؒ کے ساتھ لاہور کے برطانوی قونصل جنرل کا مسلسل رابطہ تھا۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ کون سی تحریک کس کے کہنے پر چلائی گئی تھی، اس کا دائرہ بہت وسیع ہے اور جنوبی ایشیا کی کوئی سیاسی تحریک بھی ایسی نہیں ہے جس کے بارے میں یہ نہ کہا گیا ہو کہ وہ فلاں قوت کے اشارے پر چلائی گئی تھی، حتیٰ کہ تحریکِ پاکستان کے بارے میں خان عبدالولی خان مرحوم اور لاہور ہائی کورٹ کے ایڈووکیٹ جناب محمد نورالحق قریشی کے پیش کردہ بھاری بھرکم حوالہ جات پر اعتماد کیا جائے اور حامد میر صاحب کے طرزِ استدلال کو اختیار کیا جائے تو اس کے پیچھے بھی امریکہ اور برطانیہ کے سیاسی مقاصد اور ایجنڈے کی جھلک صاف نظر آنے لگتی ہے۔ یہ بات ہمارے سیاسی کلچر کا حصہ بن گئی ہے کہ ہم اپنے سوا کسی اور کو کوئی سیاسی موقف طے کرنے کا حق دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے اور جس سے ہمیں اختلاف ہوتا ہے، اس کی دیانت پر اعتماد کرنے کی بجائے اس کے ڈانڈے کسی نہ کسی دشمن کے ساتھ ملا دینے میں نفسیاتی تسکین محسوس کرتے ہیں۔

چند سال پہلے کی بات ہے کہ اسلام آباد میں اسلامی نظریاتی کونسل کے ایک سیمینار میں ملک کے ایک معروف دانشور نے بعض معاشی مسائل کے حوالے سے چند معروف علماء کے موقف پر یہ کہہ کر تنقید کی

کہ انہوں نے فلاں قوت سے پیسے لے کر یہ موقف اختیار کیا ہے۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ میں نے اپنے خطاب میں گزارش کی کہ جب ہمارے ملک کی اعلیٰ سطح پر پائی جانے والی دانش کا یہ حال ہے کہ بعض حضرات خود سے اختلاف رکھنے والوں کو کسی دوسرے کا ایجنٹ بتائے بغیر اپنا موقف پیش کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے تو ایک غریب اور عام شخص کا کیا حال ہوگا؟ ہم میں یہ حوصلہ اور اخلاقی جرأت ہی نہیں رہی کہ ہم کسی دوسرے کے موقف اور رائے کو اس کا حق سمجھتے ہوئے اس کی دیانت پر اعتماد کریں اور یہ کہہ کر اس سے اختلاف کریں کہ اس نے اپنی صوابدید اور دیانت کے مطابق جو موقف خلوص کے ساتھ اختیار کیا ہے ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے، اور اس پر کوئی الزام عائد کیے بغیر ہم دلیل کے ساتھ اس اختلاف کا اظہار کر رہے ہیں۔

اہلِ علم کے ہاں راوی اور روایت کا درجہ دیکھنے کے ساتھ ساتھ درایت کو بھی روایت کے قبول یا عدمِ قبول کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ حامد میر صاحب نے اس واقعہ میں جن صاحب کو بطور راوی پیش کیا ہے، ان کا اخلاقی حدود اربعہ کیا ہے؟ مگر میں حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ کو جانتا ہوں اور اتنا قریب سے جانتا ہوں کہ شاید ہی ان کا کوئی اور رفیق کار اس درجے میں اس بات کا دعویٰ کر سکے۔ وہ اس مزاج کے بزرگ ہی نہیں تھے۔ یہ بات کسی لطیفے سے کم نہیں ہے کہ مولانا عبید اللہ انور کے ساتھ کسی سفارت کار کے مسلسل رابطے تھے، اس لیے کہ وہ تو گوشہ نشین اور خلوت پسند قسم کے بزرگ تھے۔ بالخصوص ایوبی آمریت کے خلاف لاہور میں ایک احتجاجی جلوس کی قیادت کے دوران پولیس کے لاٹھی چارج سے ان کی ریڑھ کی ہڈی متاثر ہونے کے بعد سے وہ معذور بھی ہو گئے تھے اور ان کا زیادہ تر وقت اپنے گھر کے بالاخانے میں گزرتا تھا۔ ہاں وہ مطالعہ اور ذکرِ الٰہی میں شب و روز مصروف رہتے تھے۔ ہم چند لوگ جو ان کے قریب ترین ساتھی شمار ہوتے تھے، کسی اشد ضرورت کے بغیر انہیں ملاقات اور تشریف آوری کی زحمت نہیں دیا کرتے تھے اور وہ کئی کئی دن اپنے خاص مریدوں اور ساتھیوں کو بھی میسر نہیں آتے تھے۔ ان کے گھر کے زیرِ سایہ مدرسہ قاسم العلوم میں جمعیت علماء اسلام کے اہم اجلاس ہوتے تھے اور ہمیں ان سے دریافت کرنا پڑتا تھا کہ وہ اجلاس میں شریک ہونے کی پوزیشن میں ہیں یا نہیں؟ ان کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ ایک غیر ملکی سفارت کار کے ساتھ مسلسل رابطے میں تھے اور سیاسی تحریک کو مخصوص رخ پر چلانے کے لیے کوئی متحرک کردار ادا کر رہے تھے، لطیفہ اور ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے؟

حامد میر صاحب سے گزارش ہے کہ وہ اپنی ''سیاسی چاند ماری'' کا شوق ضرور پورا کریں کہ آج کل سیاست دانوں کے ساتھ ساتھ کالم نویسوں کے پاس بھی اس کے سوا کوئی مشغلہ باقی نہیں رہا، لیکن کم از کم ایسے بزرگوں کو تو معاف کر دیا کریں کہ جن کی شرافت، دیانت اور ثقاہت کے سہارے ہمارے معاشرے

میں ان مقدس الفاظ کا کچھ نہ کچھ بھرم قائم ہے۔ کیا وہ اس رہے سہے بھرم کو بھی ختم کر دینے کی خواہش رکھتے ہیں؟

جمعیت علماء اسلام اور قومی سیاست

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۳فروری ۱۹۷۸ء)

......اور جب انگریز ان بزرگوں اور ان کے بے شمار رفقاء کی مسلسل جدوجہد کے نتیجہ میں یہاں سے رخصت ہوگیا اور دنیا کے جغرافیے پر پاکستان کے نام سے ایک عظیم الشان نئی سلطنت ابھری تو پاکستان میں اس قافلہ کے افراد نے اسلامی نظام وقوانین کے نفاذ پر اپنی تمام تر توجہات مرکوز کر دیں۔

''قراردادِ مقاصد'' کی منظوری

پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی میں جمعیت علماء اسلام کے بزرگ رہنما حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے ''قراردادِ مقاصد'' منظور کرا کے پاکستان کو ہمیشہ کے لیے اسلامی نظام کے لیے ایک دستوری بنیاد فراہم کر دی۔ اس کے بعد جمعیت کے رہنماؤں نے تمام مکاتبِ فکر کے ۳۱ سرکردہ علماء کرام کو جمع کر کے ۲۲ دستوری نکات پر اتفاق کا اعلان کرایا اور اس جھوٹ کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا کہ علماء اسلامی نظام کے بارے میں متفق نہیں ہیں۔

قادیانی مسئلہ

پاکستان میں جب انگریزوں کے خود کاشتہ پودے قادیانیت کی گمراہ کن سرگرمیوں اور سازشوں میں اضافہ ہوا تو علماء کرام نے ۱۹۵۳ء میں عظیم الشان تحریک چلائی جس میں ہزاروں مسلمانوں نے خون کی قربانی دی۔ اس تحریک میں جمعیت علماء اسلام کے رہنماؤں نے بھی قائدانہ کردار ادا کیا اور گرفتار ہوئے۔ ۱۹۵۷ء حضرت مولانا مفتی محمود صاحب کی تحریک پر ملتان میں پورے ملک کے علماء کرام کا ایک نمائندہ اجتماع ہوا جس میں جمعیت علماء اسلام کو از سر نو منظم کرنے اور ملکی سالمیت میں فعال اور مؤثر کردار ادا کرنے کا فیصلہ ہوا۔ چنانچہ امام الاولیاء حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کو جمعیت کا سربراہ چنا گیا اور ان کی سربراہی میں اس قافلہ نے سفرِ نو کا آغاز کیا۔

جنرل محمد ایوب خان کا دور

اس وقت ملک میں ۱۹۵۶ء کا دستور نافذ تھا، جمعیت علماء اسلام کی دستوری کمیٹی نے مولانا مفتی محمود کی سرکردگی میں اس دستور کی غیر اسلامی شقوں کی نشاندہی کر کے اسلامی دستور و نظام کے لیے جدوجہد کا آغاز

کیا اور آئندہ انتخابات میں بھرپور حصہ لینے کا اعلان کر دیا۔ مگر ۱۹۵۸ء میں جنرل محمد ایوب خان کے مارشل لاء کی وجہ سے یہ انتخابات نہ ہو سکے اور دیگر سیاسی جماعتوں کے ساتھ ساتھ جمعیت علماء اسلام کو بھی خلافِ قانون قرار دے دیا گیا۔ علماء حق کے اس قافلہ نے حضرت اقدس حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کی سربراہی میں ''نظام العلماء'' کے نام سے ایک مذہبی پلیٹ فارم قائم کر لیا اور اس پلیٹ فارم سے خلافِ اسلام حرکات کے خلاف جدوجہد جاری رکھی۔ چنانچہ جب ایوب خان نے عائلی قوانین نافذ کیے تو نظام العلماء نے انہیں خلافِ اسلام قرار دے دیا۔ مارشل لاء کے دوران دہلی دروازے لاہور میں جلسہ عام کر کے حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ نے ان قوانین کو کھلم کھلا چیلنج کیا۔ اسی طرح جب ایوب خان نے نئے دستور کی تیاری کا اعلان کیا تو نظام العلماء نے اسلامی دستور کا خاکہ مرتب کر کے پیش کیا اور اس کے لیے ملک بھر میں دستخطوں کی مہم چلائی۔

جب ایوب خان نے اسمبلیوں کے انتخابات کرائے تو نظام العلماء کے سرگرم رہنما حضرت مولانا مفتی محمود اپنے آبائی حلقہ ڈیرہ اسماعیل خان سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ اسی دوران سیاسی جماعتوں کی بحالی کے باعث جمعیت علماء اسلام بھی دوبارہ میدان عمل میں آگئی اور حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستی اور حضرت مولانا مفتی محمود کی سرکردگی میں دورِ نو کا آغاز کیا۔ اس طرح حضرت علامہ شبیر احمدؒ عثمانی کے بعد آپ جمعیت کے دوسرے مرکزی رہنما تھے جنہوں نے مرکزی اسمبلی میں جمعیت علماء اسلام کے موقف اور مشن کی ترجمانی کی۔

مولانا مفتی محمود نے خداداد صلاحیتوں کی بنا پر جمعیت علماء اسلام کی سیاسی حیثیت کو دوسری سیاسی قوتوں سے تسلیم کروایا۔ جمعیت نے ایوب خان مرحوم کی آمریت کے خلاف لاہور میں علماء کی آل پاکستان کانفرنس منعقد کی اور ہزاروں علماء پر مشتمل ایک احتجاجی جلوس نکال کر آمریت کے خلاف جرأتمندانہ پیش قدمی کی۔ حتیٰ کہ ایوب خان مرحوم کی آمریت کے خلاف منظم ہونے والی آٹھ پارٹیوں پر مشتمل جمہوری مجلسِ عمل میں جمعیت بھی شامل ہوئی۔ جمعیت علماء اسلام کے کارکنوں اور رہنماؤں نے بحالیٔ جمہوریت کی تحریک میں نمایاں کردار ادا کیا اور جمعیت کے مرکزی رہنما حضرت مولانا عبیداللہ انور مدظلہ لاہور میں ایک احتجاجی جلوس کی قیادت کرتے ہوئے پولیس کے شدید لاٹھی چارج سے زخمی ہو گئے اور کافی عرصہ میو ہسپتال میں زیرِ علاج رہے۔

صدر ایوب خان مرحوم کے ساتھ اپوزیشن جماعتوں کی گول میز کانفرنس میں قائد جمعیت علماء اسلام مولانا مفتی محمود جمعیت علماء اسلام کے نمائندہ کی حیثیت سے شریک ہوئے اور مشترکہ مطالبات کے علاوہ

جمعیت علماء اسلام کی طرف سے یہ مطالبہ بھی کیا کہ تمام مکاتبِ فکر کے ۳۱ دستوری نکات کو دستور میں شامل کیا جائے اور دستور میں مسلمان کی تعریف متعیّن کی جائے۔

جنرل محمد یحییٰ خان کا دور اور سقوطِ مشرقی پاکستان

ایوب خان مرحوم کے اقتدار سے دستبردار ہوجانے کے بعد جنرل محمد یحیی خان برسرِاقتدار آئے اور انہوں نے ملک میں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر پہلے عام انتخابات کا اہتمام کیا۔ جمعیت علماء اسلام نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں اپنا منشور پیش کرکے بھرپور حصہ لیا جس کے نتیجے میں اسے صوبہ سرحد آمبلی میں ۵، بلوچستان آمبلی میں ۳، پنجاب آمبلی میں ۲ اور قومی آمبلی میں ۷ نشستیں حاصل ہوئیں۔ جبکہ سرحد و بلوچستان میں بلینس پاور جمعیت کے حصہ میں آئی۔ ان انتخابات میں مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ کو فیصلہ کن اکثریت حاصل ہوئی لیکن جنرل یحییٰ خان نے انتقالِ اقتدار میں ٹال مٹول کی پالیسی اختیار کی اور حالات دگرگوں ہوتے گئے۔

چنانچہ جب یحییٰ خان نے ڈھاکہ میں قومی آمبلی کا اجلاس طلب کیا اور پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو نے لاہور میں تقریر کرتے ہوئے ''اِدھر تم اُدھر ہم'' کا نعرہ لگاکر اجلاس کا بائیکاٹ کردیا اور دھمکی دی کہ جو ممبر ڈھاکہ جائے گا اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی، اس نازک مرحلہ پر جمعیت علماء اسلام کے قائد مولانا مفتی محمود نے اعلان کیا کہ جمعیت کے ارکان آمبلی ڈھاکہ سیشن میں شرکت کے لیے جائیں گے کیونکہ ان کے خیال میں ڈھاکہ سیشن کا بائیکاٹ ملک کو تقسیم کرنے کی طرف ایک قدم ہے۔ پھر مولانا مفتی محمود نے آمبلی کے چھوٹے گروپوں کی کانفرنس لاہور میں بلائی اور بحران کو سیاسی بنیادوں پر حل کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ اس کے ساتھ ہی مولانا مفتی محمود نے جنرل یحییٰ خان، شیخ مجیب الرحمٰن اور ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ متعدّد ملاقاتیں کرکے معاملات کو سلجھانے کی مسلسل کوشش کی، لیکن ملک کو توڑنے کی منظم سازش کامیاب ہوکر رہی اور بالآخر ایک طویل سازشی عمل کے بعد ملک دولخت ہوگیا۔

ذوالفقار علی بھٹو کا دور

سقوطِ ڈھاکہ کے بعد بچے کھچے پاکستان میں مسٹر بھٹو کی حکومت قائم ہوئی تو باقی ماندہ ملک کی سلامتی کے تحفظ کے لیے جمعیت علماء اسلام نے مسٹر بھٹو کی حمایت کی اور ان سے بھرپور تعاون کیا، حتیٰ کہ نیشنل عوامی پارٹی کی معیّت میں پیپلز پارٹی کے ساتھ سہ فریقی معاہدہ میں شریک ہوگئی۔ لیکن جمعیت اور نیپ کی طرف سے مارشل لاء کو ختم کرنے کے مسلسل مطالبہ پر یہ معاہدہ توڑ دیا گیا اور صوبہ سرحد و بلوچستان میں جمعیت علماء اسلام اور نیشنل عوامی پارٹی کی مخلوط حکومتیں قائم ہوگئیں۔ صوبہ سرحد میں وزیراعلیٰ مولانا مفتی محمود

منتخب ہوئے جنہوں نے دس ماہ کے مختصر دور حکومت میں شراب پر پابندی، جوا پر پابندی، اردو کو سرکاری زبان قرار دینے، شلوار قمیض کو سرکاری لباس قرار دینے، تقاوی قرضوں پر سود کے خاتمہ اور کالجوں میں اسلامی تعلیمات کے اہتمام جیسی درجنوں اصلاحات کیں۔ اور دفعہ ۱۴۴ و دیگر امتناعی قوانین کے استعمال کے بغیر کامیابی کے ساتھ حکومت چلا کر یہ ثابت کر دیا کہ علماء کرام زیادہ کامیابی کے ساتھ حکومت چلا سکتے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی مولانا مفتی محمود نے دستور ساز اسمبلی میں نئے دستور کی ترتیب و تدوین میں بھرپور کردار ادا کیا اور دستور کو اسلامی سانچہ میں ڈھالنے کے لیے اپنی علمی و فقہی بصیرت اور خداداد صلاحیتوں سے دستور ساز اسمبلی کو بھرپور فائدہ پہنچایا۔

ذوالفقار علی بھٹو نے بلوچستان اسمبلی میں اکثریت ہونے کے باوجود نیپ اور جمعیت کی مخلوط حکومت کو برطرف کر دیا۔ اس ظلم اور جبر کے خلاف احتجاج کے طور پر مولانا مفتی محمود نے بھی صوبہ سرحد کی وزارتِ اعلیٰ سے استعفیٰ دے دیا۔ اور اس کے بعد ملک کی دیگر جماعتوں کے ساتھ ''متحدہ جمہوری محاذ'' تشکیل دیا جو سالہاسال تک بھٹو آمریت کے خلاف جمہوریت کی سربلندی کے لیے ایک مضبوط پلیٹ فارم کا کردار ادا کرتا رہا۔

۱۹۷۴ء میں قادیانیت کے خلاف شیخ الاسلام علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ کی قیادت میں فیصلہ کن تحریک چلی تو قومی اسمبلی میں مجلسِ عمل تحفظِ ختمِ نبوت کی ترجمانی کرنے والے گروپ کی قیادت مولانا مفتی محمود نے کی اور قادیانی مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی، حتیٰ کہ قومی اسمبلی نے متفقہ طور پر قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا آئینی مطالبہ تسلیم کر لیا۔ قومی اسمبلی میں قائد حزبِ اختلاف خان عبد الولی خان کی گرفتاری کے بعد حزبِ اختلاف نے جمعیت علماء اسلام کے قائد مولانا مفتی محمود کو اپنا لیڈر چن لیا اور وہ اسمبلی کے اختتام تک یہ فرائض سرانجام دیتے رہے۔

بھٹو حکومت نے ۱۹۷۷ء میں ملک میں عام انتخابات کا اعلان کیا تو ملک کی ۹ سیاسی جماعتوں نے ''پاکستان قومی اتحاد'' کے نام سے ایک مشترکہ محاذ تشکیل دیا جس کا سربراہ جمعیت کے قائد مولانا مفتی محمود کو چنا گیا۔ مولانا مفتی محمود کی قیادت میں پاکستان قومی اتحاد نے شاندار انتخابی مہم چلائی جس سے بوکھلا کر مسٹر بھٹو کو وسیع تر دھاندلیوں کا سہارا لینا پڑا۔ لیکن ۷ مارچ کے انتخابی نتائج کو، جن کی بنیاد ہمہ گیر دھاندلیوں پر تھی، قوم نے مسترد کر دیا اور پاکستان قومی اتحاد کی اپیل پر نہ صرف ۱۰ مارچ کے صوبائی انتخابات کا بے مثال بائیکاٹ کیا بلکہ ملک گیر ہڑتال کر کے یہ ثابت کر دیا کہ پوری قوم پاکستان قومی اتحاد کے ساتھ ہے۔

اس کے بعد پاکستان قومی اتحاد کی اپیل پر تاریخ ساز عوامی تحریک چلی جس میں لاکھوں افراد نے خود کو گرفتاری کے لیے پیش کیا، ہزاروں افراد بھٹو حکومت کے تشدد کا نشانہ بن کر جمہوریت کی بحالی اور نظامِ مصطفٰی کے نفاذ کے جذبوں کے ساتھ شہید ہوئے۔ مولانا مفتی محمود اور دیگر قائدین گرفتار کر لیے گئے لیکن تشدد کے تمام تر ہتھکنڈوں کے باوجود بھٹو حکومت مولانا مفتی محمود اور ان کے رفقاء کو رہا کر کے مذاکرات پر مجبور ہو گئی۔

مذاکرات کی میز پر بھی مولانا مفتی محمود اور ان کے رفقاء نوابزادہ نصر اللہ خان اور پروفیسر غفور احمد نے خداداد صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا اور قومی اتحاد کے ۳۳ مطالبات میں سے ۳۱ مطالبات تسلیم کرانے میں کامیاب ہو گئے لیکن مسٹر بھٹو نے ان مطالبات کو دستوری تحفظ فراہم کرنے سے انکار کر دیا جس کے نتیجہ میں ملک ایک بار پھر مارشل لاء کی نذر ہو گیا۔

پاکستان قومی اتحاد نے مولانا مفتی محمود کی قیادت پر ایک بار پھر اعتماد کا اظہار کر کے انہیں آئندہ سال کے لیے بھی اپنا سربراہ چن لیا ہے اور مفتی صاحب کی قیادت میں جمعیت علماء اسلام ملک میں اسلام کے عادلانہ نظام کے نفاذ کے لیے پاکستان قومی اتحاد کے پلیٹ فارم پر اپنا کردار مؤثر اور مثبت طور پر سرانجام دے رہی ہے۔

بے نظیر بھٹو کا دورِ سیاست

اسلام کی تشریح اور پیپلز پارٹی

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور —۲۶ فروری ۱۹۸۸ء)

پیپلز پارٹی کی چیئر پرسن بے نظیر بھٹو نے پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ میں ترامیم کے خلاف سپریم کورٹ میں جو آئینی پٹیشن دائر کر رکھی ہے اس پر سپریم کورٹ کے گیارہ رکنی فل بینچ نے گیارہ روز بحث کے بعد فیصلہ محفوظ کر لیا ہے۔ رٹ پٹیشن کے دوران بے نظیر بھٹو کے وکیل اور پیپلز پارٹی کے راہنما جناب یحییٰ بختیار نے دیگر متعلقہ امور کے علاوہ نظریۂ پاکستان کے حوالہ سے اسلام کی تعبیر وتشریح کے بارے میں اپنی پارٹی کا نقطۂ نظر بھی عدالت کے سامنے پیش کیا ہے، جو بلاشبہ اس اہم اور نازک مسئلہ پر پیپلز پارٹی کے باضابطہ اور ذمہ دارانہ موقف کی حیثیت رکھتا ہے۔ جناب یحییٰ بختیار نے اس ضمن میں جو کچھ کہا اس کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

- جہاں تک نظریۂ اسلام اور نظریۂ پاکستان کا تعلق ہے تو ہم ان دونوں پر یقین رکھتے ہیں اور اپنی فکر کے مطابق اسلام اور نظریۂ اسلام کی تشریح کا حق محفوظ رکھتے ہیں۔
- اسلام مکمل دین ہے اس لیے ہر مسلمان کو قرآن کریم کی تشریح کرنے کا حق حاصل ہے۔ کوئی مولوی، شوریٰ، اسلامی نظریاتی کونسل یا شرعی عدالت اس بات کی پابندی نہیں لگا سکتی کہ قرآن و سنت کے بارے میں اسی کی تشریح کو قبول کیا جائے۔
- قرآن و سنت کی تشریح کا اسلامی طریقہ اجماع ہے جو عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعے ہی ممکن ہے۔
- شریعت کی تشریح صرف منتخب نمائندوں کا حق ہے۔
- ہم اسلام کے خلاف نہیں تھیوکریسی اور ملائیت کے خلاف ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے واضح طور پر کہا تھا کہ آج کے دور میں اجتہاد صرف منتخب نمائندوں کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

(بحوالہ روزنامہ جنگ، لاہور۔ ۱۸ فروری ۱۹۸۸ء)

یہ نقطۂ نظر نیا نہیں بلکہ اس سے پہلے ”شریعت بل“ کی بحث کے دوران حکمران حلقوں کی طرف سے بھی کم و بیش یہی موقف پیش کیا جا چکا ہے اور سپریم کورٹ کے جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال اور ان کے رفقاء کی طرف سے اس موقف پر مسلسل اصرار کیا جا رہا ہے۔ لیکن ملک کی سیاسی جماعتوں میں پاکستان پیپلز پارٹی

وہ پہلی جماعت ہے جس نے اس نقطۂ نظر کو باضابطہ پارٹی موقف کی حیثیت دے کر ملک کی اعلیٰ ترین عدالت میں پیش کر دیا ہے۔

دورِ حاضر میں قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح کے حق اور دائرہ کار کی بحث جو سنجیدہ اور عملی رخ اختیار کرتی جا رہی ہے وہ تمام مکاتبِ فکر کے سرکردہ علماء کرام کی گہری اور بھرپور توجہ کی مستحق ہے۔ اگر علماء کرام نے اس کی اہمیت و نزاکت کا بروقت ادراک و احساس نہ کیا تو اس کے فکری و عملی نتائج کی ذمہ داری سے وہ خود کو بری الذمہ قرار نہیں دے سکیں گے۔

مسز بے نظیر زرداری اور علماء کرام

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۱۶ ستمبر ۱۹۸۸ء)

بدقسمتی سے ہماری سیاست اس وقت مکمل طور پر غیر ملکی حصار میں جکڑی ہوئی ہے۔ بڑے سیاسی راہنما غیر ملکی آقاؤں کی خوشنودی کے لیے ان کے اشارۂ ابرو پر چلنے کو اپنے لیے باعثِ افتخار سمجھتے ہیں۔ اس تگ و دو میں وہ دینی مسلّمات اور صریح احکامات تک کو ہدفِ تنقید بنانے سے گریز نہیں کرتے۔ لادین سیاسی نظریات کی حامل تنظیمیں تو ہمیشہ سے اسلامی تعلیمات اور قوانین و ضوابط کی تضحیک کو اپنا بہترین مشغلہ بنائے ہوئے ہیں مگر افسوس تو ان دینی عناصر پر ہے جو اپنی سیاست کو دین کے تابع قرار دیتے ہیں مگر تضحیک آمیز رویوں اور دین دشمن مشاغل و سرگرمیوں میں کھلم کھلا ملوث تنظیموں کی ہمدرد اور رفیق بنے ہوئے ہیں۔

پیپلز پارٹی کی چیئرپرسن مسز بے نظیر زرداری نے حال ہی میں ایک انگریزی اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے اسلامی سزاؤں کو ظالمانہ اور وحشیانہ قرار دیا ہے۔ مسز زرداری تو خیر کبھی اسلامی تعلیمات سے وابستہ ہی نہیں رہیں، ان سے اس کے علاوہ توقع بھی کیا کی جا سکتی ہے؟ مگر مسز زرداری کا تسلسل سے یہ رویہ ان علماء اور دینی کارکنوں کے لیے لمحۂ فکریہ ہے جو خود کو انبیاءؑ کا وارث قرار دیتے ہیں اور مسجد و محراب و منبر کے امین اور اسلامی نظام کے عملی نفاذ کے نقیب ہیں، انہیں اپنے اس دین بیزار رویہ کو ترک کرتے ہوئے اور مسز زرداری سمیت تمام لادین اور سیکولر سیاستدانوں اور سیاسی تنظیموں سے لاتعلقی کا اعلان کرتے ہوئے ان کے خلاف مشترکہ محاذ بنانا چاہیے اور پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کی جدوجہد کو تیز تر کر دینا چاہیے۔ دینی طبقہ پہلے ہی کافی بدنام ہو چکا ہے، اب اسے سیکولر اور لادین سیاستدانوں کے دامن میں پناہ لینے کی بجائے باہمی اتحاد کی راہ کو اختیار کرنا چاہیے۔

پیپلز پارٹی کے مستقبل کے عزائم، منشور کے آئینے میں

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۲۱ اکتوبر ۱۹۸۸ء)

پاکستان پیپلز پارٹی کی چیئرپرسن بیگم نصرت بھٹو اور شریک چیئرپرسن مسز بے نظیر زرداری نے ۱۳/ اکتوبر کو ایک پریس کانفرنس میں اپنے انتخابی منشور کا اعلان کیا ہے۔ اخبارات کے مطابق دونوں بیگمات نے اپنے منشور میں اسلام کو دین، جمہوریت کو سیاست، سوشلزم کو معیشت، شہادت کو نصب العین اور عوامی اختیارات کو بنیاد قرار دیا ہے۔

معمولی لفظی ہیر پھیر کے ساتھ یہ وہی الفاظ ہیں جو مسٹر بھٹو نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں کہے تھے اور جن کا عملی مظاہرہ ان کے دورِ اقتدار میں خوب کیا گیا تھا۔

- اسلام کو دین قرار دینے والوں نے غیر ملکی سربراہوں کے ساتھ رقص و سرود کی محفلیں جمانے، شراب نوشی میں مدہوش ہو کر ہوش و تمیز گنوانے، لادین نظریات کو فروغ دینے، اور ہر طرح کی عریانی و فحاشی کو عام کرنے جیسے اقدامات کر کے اسلام کا جس طرح مذاق اڑایا اور مساجد و مدارس اور قرآن مجید کی جس طرح بے حرمتی کی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ علماء کرام کی تضحیک اور ڈاڑھیاں نوچنے کے واقعات تو اب بھی لوگوں کے ذہنوں پر نقش ہیں۔
- جہاں تک جمہوریت کو سیاست قرار دینے کا معاملہ ہے اس کا اندازہ اپوزیشن کو دبانے، اسمبلیوں سے اٹھا کر پھینکنے، اجتماعات، جلوسوں اور اظہار رائے کی آزادی سے محروم کرنے، اخبارات و جرائد پر سنسر لگانے، مارشل لاء اور کرفیو تک کو اپنانے اور اپوزیشن ارکان، ان کے اہلِ خانہ اور دوستوں کو اغوا کر کے ان کے ساتھ انسانیت سوز سلوک کرنے، معصوم طالبات کو تعلیمی اداروں سے اٹھا کر انہیں عصمت ہی نہیں زندگی تک سے محروم کرنے جیسے بے رحمانہ اقدامات کی مثالوں سے ہو جاتا ہے۔ سید شمس الدین شہید، خواجہ رفیق شہید، عبدالصمد اچکزئی شہید، احمد مینگل کے خون اور شیرپاؤ کے جلسہ میں بموں کے دھماکوں اور نیشنل عوامی پارٹی پر پابندی لگانے کے اقدامات کو کون بھول سکتا ہے۔ پھر سرحد میں جمعیت نیپ کی جمہوری حکومت کو آمرانہ اقدامات سے ختم کرنے کا جو جمہوری طریقہ پی پی نے اپنایا اس سے اس کی جمہوریت کا نقاب خود بخود سرک جاتا ہے۔

پی پی پی نے نام نہاد مظلومیت کے دور میں اسلام کی تسبیح اتنی مرتبہ کی اور ایک دینی جماعت نے اپنوں کو چھوڑ کر جس طرح اس کے ساتھ حقِ رفاقت ادا کیا، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ پی پی پی نے شاید اپنا قبلہ بدل لیا ہے۔ موت سے زندگی کا سفر طے کرنے کے بعد اس نے اس دینی جماعت کو جو ہاتھ دکھایا سو دکھایا، اس نے اسلام کو جس طرح استعمال کیا ہے اس سے تو ضیاء الحق بھی طفلِ مکتب ہی دکھائی دیتا ہے کہ بیگمات نے بڑی صفائی سے اسلام کو سرسری سی جگہ دے کر سوشلزم کو معیشت کی کرسی پر بٹھا دیا ہے۔ کیونکہ اگر اسلام کو معیشت، سیاست، اقتصادیات، جمہوریت اور معاشرت پر "مسلط" کر دیا جائے تو اس سے جو انقلابات نمودار ہوتے ہیں اور غریب کو جو سکھ کی نیند ملتی ہے وہ پی پی کا مقصد کبھی نہیں رہا۔ انہوں نے ہمیشہ سوشلزم کو آگے کیا ہے اور سوشلزم کے اصطلاحی کے بجائے لفظی مفہوم پر زور دے کر غریب طبقہ کو بے وقوف بنانے کا جو مظاہرہ کیا ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔

سیٹوں کی تقسیم میں وہ پرانے اور غریب کارکنوں کو قربانی کے بکرے کا درجہ دے کر جاگیرداروں، سرمایہ داروں، زمینداروں، وڈیروں، ٹوانوں، دولتانوں، نوابوں، خانوں، ملکوں اور سرداروں کو آگے لائی ہے۔ جبکہ اس نے غریب کارکنوں کو "سوشلزم" کے نعرے کے حصار میں مقید رکھنے کی مذموم کوشش کی ہے۔

پیپلز پارٹی نے اپنے منشور میں "حدود آرڈیننس سمیت عورتوں کے خلاف تمام امتیازی قوانین ختم کر دیے جائیں گے" کو بھی اپنایا ہے۔ پی پی کے نزدیک امتیازی قوانین سے مراد ہمیشہ شرعی قوانین رہے ہیں۔ پھر حدود آرڈیننس کے خلاف کھلم کھلابات کر کے اس نے اپنے خبثِ باطن کو نمایاں کر دیا ہے۔ پی پی سے کسی خیر کی ہمیں تو کبھی بھی توقع نہیں رہی، اب اسے زندگی دینے والوں کو سوچنا ہوگا کہ انہیں مستقبل میں کیا کرنا ہوگا۔ ہمارے نزدیک پی پی کے مستقبل کے عزائم ہمیشہ سے ملک و ملت اور اسلام کے مفادات سے متصادم رہے ہیں۔ اس نے دھوکہ اور فریب کو اپنا کر لادینیت، آمریت، دہریت، لاقانونیت، اخلاقی انارکیت اور معاشی ناہمواری کو ہی فروغ دیا ہے اور مستقبل میں بھی اس کے عزائم یہی ہیں۔

عوام کو آئندہ انتخابات میں سوچ سمجھ کر ووٹ کا استعمال کرنا ہوگا اور اپنے مستقبل کو تابناک بنانے کے لیے اسلام پسند امیدواروں کو کامیاب کرانا ہوگا۔ جمعیت علماء اسلام کے کارکنوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ عوام کو حقائق سے آگاہ کریں اور پی پی پی اور دیگر لادین عناصر کی مذموم سرگرمیوں سے پردہ اٹھائیں۔

اسلامی جمہوری اتحاد اور پاکستان پیپلز پارٹی

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۴ نومبر ۱۹۸۸ء)

عام انتخابات کا دن جوں جوں قریب آرہا ہے سیاسی جماعتوں کی انتخابی مہم میں شدت اور جوش و خروش پیدا ہو رہا ہے:

- ایک طرف پاکستان پیپلز پارٹی ہے جو اپنے نو سالہ سیاسی حلیفوں پر مشتمل ایم آر ڈی کا تیاپانچہ کر کے اکیلی میدان انتخاب میں ڈٹی ہوئی ہے،
- اور دوسری طرف اسلامی جمہوری اتحاد ہے جو اسلامی قوانین کی بالادستی، جہادِ افغانستان کی مکمل حمایت، اور ایٹمی قوت کے حصول کے عزم کے ساتھ انتخابی مہم میں پیپلز پارٹی کا سامنا کر رہا ہے۔

اگرچہ مولانا نورانی اور جناب محمد اصغر خان کی قیادت میں پاکستان عوامی اتحاد بھی میدان میں موجود ہے، اور پیپلز پارٹی کی بے وفائی کا تمغہ سینے سے لگائے ایم آر ڈی کی جماعتیں بھی ہاتھ پاؤں مار رہی ہیں، لیکن قومی اور بین الاقوامی سیاسی حلقوں کی رائے میں اصل مقابلہ اسلامی جمہوری اتحاد اور پی پی پی کے درمیان ہے۔ اور واضح طور پر محسوس ہو رہا ہے کہ اسلامی جمہوری اتحاد نے عین وقت پر میدان انتخاب میں کود کر پی پی پی کا اقتدار پر قبضہ کرنے کا خواب پریشان کر دیا ہے۔

جمعیت علماء اسلام پاکستان اسلامی جمہوری اتحاد میں شامل ہے اور قائد جمعیت مولانا سمیع الحق نائب صدر کی حیثیت سے اتحاد کی قیادت میں مؤثر کردار ادا کر رہے ہیں۔ ملک کے مختلف حصوں میں جمعیت کے متعدّد ارکان اتحاد کی ٹکٹ پر انتخابات میں حصہ لے رہے ہیں اور جماعتی کارکن جوش اور جذبے کے ساتھ انتخابی مہم میں شریک و متحرک ہیں۔......

عورت کی حکمرانی اور مولانا فضل الرحمٰن کا موقف

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور ـــ ۷امارچ ۱۹۸۹ء)

عورت کی حکمرانی کے بارے میں تمام مکاتبِ فکر کے جمہور علماء ایک طرف ہیں کہ قرآن و سنت کے صریح احکام اور امتِ مسلمہ کے چودہ سو سالہ تواترِ عملی کے باعث کسی مسلمان ملک پر عورت کے حکمران بننے کا شرعاً کوئی جواز نہیں ہے۔ جبکہ علماء کہلانے والے چند افراد دوسری طرف ہیں جو کسی منطق، استدلال اور جواز کے بغیر سرکاری ذرائع ابلاغ کے ذریعہ اس پراپیگنڈا میں مصروف ہیں کہ عورت کے حکمران بن جانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ خیر یہ تو تاریخ کا فطری عمل اور ہر دینی جدوجہد کا ناگزیر حصہ ہے کہ کوئی اپنے لیے امام احمد بن حنبلؒ، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور حضرت مجدد الفؒ ثانی کا کردار پسند کرتا ہے اور کسی کے سر پر ابوالفضل اور فیضی کی دستار سج جاتی ہے۔ لیکن اس ساری کشمکش میں قومی اسمبلی میں علماء کے ایک گروپ کی قیادت کرنے والے مولانا فضل الرحمٰن کا موقف اور رویہ ملک کے دینی حلقوں کے لیے معمہ بنا ہوا ہے کیونکہ مولانا موصوف عورت کی حکمرانی شرعاً جائز نہ ہونے کے بارے میں علماء کے متفقہ فتویٰ سے اختلاف کی ہمت نہیں پا رہے اور انہیں یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ علماء کا فتویٰ درست ہے لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں اس فتویٰ کی اہمیت اور وزن کو کم کرنے کا فکر بھی دامن گیر ہے اور یہ مقصد وہ فتویٰ دینے والے علماء کی کردار کشی کی مہم چلا کر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

مولانا موصوف نے گزشتہ دنوں اپنے بیرونی دورہ سے واپسی پر اس مہم کا آغاز کیا اور ملتان میں اخباری نمائندوں سے بات چیت کرتے ہوئے بہت کچھ کہا جس کا خلاصہ روزنامہ نوائے وقت ملتان اور امروز ملتان (۷مارچ) کے حوالہ سے درج ذیل ہے:

- عورت کی حکمرانی کے خلاف علماء کا فتویٰ درست ہے لیکن اس میں عوامی کشش نہیں ہے۔
- عورت کی حکمرانی کے خلاف راولپنڈی میں منعقد ہونے والے "علماء کنونشن" کے شرکاء کی اکثریت نے ۱۹۶۴ء کے صدارتی الیکشن میں محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت کی تھی۔
- فتویٰ دینے والوں میں وہ علماء بھی شامل ہیں جو ضیاء حکومت کے اقدامات کی حمایت کرتے رہے ہیں۔

حالانکہ خود مولانا موصوف بخوبی یہ سمجھتے ہیں کہ کسی فتویٰ کے درست ہونے کے بعد اس کے لیے عوامی کشش ضروری نہیں ہوتی اور اس قسم کی شرط لگانا فتویٰ کے شرعی تقاضوں کی نفی کے مترادف ہے۔

اسی طرح وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ۱۹۶۴ء میں علماء کی تینوں بڑی جماعتوں جمعیت علماء اسلام پاکستان، جمعیت علماء پاکستان اور جمعیت اہلِ حدیث پاکستان نے یہ کہہ کر محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت سے انکار کر دیا تھا کہ چونکہ عورت شرعاً حکمران نہیں بن سکتی اس لیے محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت نہیں کی جا سکتی۔ جبکہ متحدہ علماء کنونشن راولپنڈی میں شریک ہونے والے دو ہزار سے زائد علماء میں سے ایسے بیس افراد کی نشاندہی کرنا بھی مولانا فضل الرحمٰن کے بس میں نہیں ہے جن پر وہ محترمہ فاطمہ جناح کی (صدارتی مہم کی) حمایت کا الزام ثابت کر سکیں۔

جہاں تک جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے اقدامات کی حمایت کا تعلق ہے بلاشبہ علماء کی ایک بڑی تعداد نے:

۱. قراردادِ مقاصد کو آئین کا حصہ بنانے،
۲. حدود آرڈیننس،
۳. امتناعِ قادیانیت آرڈیننس،
۴. احترامِ رمضان آرڈیننس،
۵. احترامِ صحابہ کرامؓ و اہلِ بیتؓ آرڈیننس

اور جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے اس جیسے بہت سے اسلامی اقدامات کی حمایت کی ہے۔ لیکن ان اقدامات کی حمایت اور ان کے تحفظ کی بات تو خود مولانا فضل الرحمٰن بھی آٹھویں ترمیمی بل کی بحث کے حوالہ سے کر رہے ہیں، اور مسلسل آٹھ سال تک مخالفت کے باوجود انہیں انہی علماء کے موقف پر آنا پڑا ہے جن پر وہ ضیاء حکومت کے اقدامات کی حمایت کا الزام عائد کر رہے ہیں۔ اس لیے یہ الزام ان کی زبان سے جچتا نہیں ہے۔ اور اب روزنامہ امروز لاہور (۱۷ مارچ) کی رپورٹ کے مطابق مولانا فضل الرحمٰن نے ڈیرہ اسماعیل خان میں اخباری نمائندوں سے بات چیت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ

> ”وہ لوگ جو عورت کی حکمرانی کے بارے میں شور و غوغا کر رہے ہیں اور ہم پر پیپلز پارٹی سے تعاون کا الزام لگا رہے ہیں انہوں نے ایک ایسے بیوروکریٹ سیاستدان کو اپنا صدارتی امیدوار نامزد کیا جس نے ایک عورت کو نامزد کیا تھا۔ ہمارے آئین میں عورت کی حکمرانی کی گنجائش موجود ہے اور اس آئین میں ان لوگوں نے کوئی ترمیم نہیں کی جنہیں مجلسِ شوریٰ اور دوسرے غیر جمہوری اداروں میں نمائندگی حاصل تھی۔“

ہم مولانا موصوف کی خدمت میں بصد ادب و احترام عرض کریں گے کہ

- عورت کی حکمرانی کے بارے میں علماء کی جدوجہد ''شور وغوغا''نہیں بلکہ قرآن وسنت اور اجماعِ امت کی صریح خلاف ورزی پر دینی حمیت اور احساسِ فرض کا فطری اظہار ہے جو علماء کی دینی و شرعی ذمہ داری ہے۔ اگر ادائے فرض کی اس دینی جدوجہد میں شرکت کی توفیق مولانا موصوف کو نہیں ہے تو کم از کم اس کے خلاف ان لوگوں کی زبان استعمال کرنے سے گریز کریں جن کے ساتھ تعاون کے الزام سے بچنے کی وہ ناکام کوشش کر رہے ہیں۔
- آئین میں عورت کو حکمران بنانے کی گنجائش نہیں ہے، آئین اس بارے میں خاموش ہے۔ یہ خاموشی قراردادِ مقاصد کو آئین کا حصہ بنانے سے قبل تو کسی درجہ میں دلیل بن سکتی تھی لیکن جب سے قراردادِ مقاصد کو آئین کا باضابطہ حصہ بنا دیا گیا ہے تو آئینی طور پر اس امر کی پابندی ضروری ہوگئی ہے کہ کوئی فیصلہ قرآن وسنت کے خلاف نہ کیا جائے۔ اس لیے عورت کو حکمران بنانا قراردادِ مقاصد کی طرف سے عائد کی جانے والی اس آئینی پابندی کے منافی ہے۔
- علماء نے جمہوری اور غیر جمہوری دونوں قسم کے اداروں میں عورت کی حکمرانی کے بارے میں شرعی موقف کی وضاحت اور ترجمانی کی ہے۔ ۱۹۷۳ء کی دستور ساز اسمبلی میں شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحقؒ کی پیش کردہ آئینی ترامیم اور ۱۹۸۵ء کی مجلسِ شوریٰ کی قائم کردہ آئینی کمیٹی میں مولانا قاضی عبد اللطیف کا اس مسئلہ پر اختلافی نوٹ ان دونوں اداروں کے ریکارڈ میں موجود ہے جسے مولانا موصوف باآسانی ملاحظہ کر سکتے ہیں۔
- بیوروکریٹ سیاستدان جناب غلام اسحاق خان کو صدارت کے لیے نامزد کرنے اور ووٹ دینے کا پس منظر بھی وہ نہیں ہے جو مولانا فضل الرحمٰن ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اصل صورتحال یہ ہے کہ ملک کے محبِ وطن سیاسی و غیر سیاسی قوتوں کے لیے یہ صورتحال قابلِ قبول نہیں تھی کہ ملک کی صدارت اور وزارتِ عظمیٰ دونوں ایک ہی سیاسی کیمپ (ایم آر ڈی) کے پاس چلی جائیں، اور اگر خدانخواستہ ایسا ہو جاتا تو ''ضیاء دشمنی'' کی بنیاد پر تشکیل پانے والا یہ سیاسی کیمپ آٹھویں ترمیمی بل سمیت بہت سے اقدامات کا جھٹکا کر کے ملک کے سیاسی توازن کو تباہ کر دیتا۔ اس لیے یہ ضروری تھا کہ صدارت پر کسی ایسے شخص کو لایا جائے جو مطلوبہ ووٹ حاصل کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو اور اس کا تعلق ضیاء دشمنی کے سیاسی کیمپ سے نہ ہو تاکہ سیاسی توازن برقرار رہے اور پیپلز پارٹی کی حکومت کو ضیاء دشمنی کے بہانے عوامی مسائل کو فٹ بال بنانے کا موقع نہ مل سکے۔

جہاں تک پیپلز پارٹی کی طرف سے جناب غلام اسحاق خان کی حمایت کا تعلق ہے تو یہ کوئی ڈھکی

چھپی بات نہیں ہے کہ اس میں پیپلز پارٹی کے داخلی عوامل کی بجائے خارجی محرکات کا دخل زیادہ تھا۔ اگر پیپلز پارٹی ملک کی صدارت کے بارے میں آزادانہ فیصلہ کرنے میں خود مختار ہوتی تو اس کا فیصلہ یقیناً جناب غلام اسحاق خان کے حق میں نہ ہوتا لیکن اسے اپنے اقتدار کی بقا و استحکام کے لیے قومی سیاست میں توازن کی اس شرط کو بادلِ ناخواستہ قبول کرنا پڑا۔ باقی رہی بات عورت کی حکمرانی کے بارے میں جناب غلام اسحاق خان کے کردار کی تو علماء نے اس کی کبھی حمایت نہیں کی۔

ایک خاتون کو وزیرِ اعظم نامزد کرنے سے قبل علماء کی طرف سے قائد جمعیت علماء اسلام مولانا سمیع الحق نے جناب غلام اسحاق خان سے ملاقات کر کے انہیں شرعی موقف سے آگاہ کیا اور اب بھی علماء صدرِ پاکستان کو اس ذمہ داری سے بری الذمہ قرار نہیں دے رہے بلکہ علماء کے نزدیک جناب غلام اسحاق خان اور پیپلز پارٹی کی ہائی کمان دونوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ عورت کی غیر شرعی حکمرانی کے بارے میں علماء کے متفقہ موقف کو تسلیم کرتے ہوئے حکمران پارٹی کے کسی مرد لیڈر کو وزیرِ اعظم بنانے کا اہتمام کریں۔

ان گزارشات کے بعد ہم مولانا فضل الرحمٰن کی خدمت میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ ایک خالص دینی مسئلہ کے بارے میں ان کا یہ طرزِ عمل کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔ یہ بجا کہ پیپلز پارٹی کے ساتھ گزشتہ نو سال کی سیاسی رفاقت کے ساتھ ساتھ دوستی کی قدرِ مشترک بھی پیپلز پارٹی کے خلاف کوئی واضح موقف اختیار کرنے میں ان کے لیے رکاوٹ ہے، لیکن اسلامی اصول و احکام اور شرعی تقاضوں کی پاسداری کے لیے ایسی رکاوٹوں کو عبور کرنا ہی ایک ایسا درست طرزِ عمل ہے جو علماء کے شایانِ شان ہے اور جس کی توقع ملک کے دینی حلقے "علماء" کے عنوان سے کام کرنے والی جماعت سے بجا طور پر رکھتے ہیں۔

پیپلز پارٹی کے عزائم اس کی پالیسیوں کے آئینے میں

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۷ امارچ ۱۹۸۹ء)

پیپلز پارٹی کی وفاقی حکومت نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد گزشتہ چار ماہ سے بھی کم عرصہ کے دوران اپنی پالیسیوں کو جس رخ پر چلانے کی کوشش کی ہے اس سے اس کے عزائم کھل کر سامنے آگئے ہیں۔ اور ان سیاسی عناصر کی خوش فہمیاں اب ہوا میں تحلیل ہو رہی ہیں جنہوں نے گزشتہ دس سالہ دور میں پی پی پی کی سیاسی رفاقت کا راستہ اس خیال سے اپنالیا تھا کہ اس رفاقت کے ذریعے وہ اس پارٹی کو شاید اپنا مزاج اور فکر تبدیل کرنے پر آمادہ کرسکیں گے۔ پی پی پی کی ہائی کمان نے برسر اقتدار آتے ہی:

- قرآن وسنت کے خلاف ایک خاتون کو حکمران نامزد کر دیا۔
- عدالتوں سے سزا یافتہ ڈاکوؤں، قاتلوں اور تخریب کاروں کو رہا کر دیا۔
- پی پی کی چیئر پرسن نے اسلامی سزاؤں کو وحشیانہ قرار دیا۔
- پی پی کی وزیراعظم نے اسلام کو خدا اور بندے کے درمیان ذاتی معاملہ قرار دے کر سیکولرازم کے پرچار کی کوشش کی،
- اور عورت کی گواہی کے مسئلہ پر قرآن کریم کے صریح حکم کے خلاف بیان بازی کر کے اپنے اصل نظریات کو آشکارا کر دیا۔
- پی پی کی حکومت نے سابقہ حکومت کی طرف سے قائم کیے جانے والے خواتین کمیشن کی رپورٹ کو شائع کیا جسے سابقہ حکومت نے داخل دفتر کر دیا تھا، جبکہ اس رپورٹ کی متعدّد سفارشات قرآن وسنت کے منافی ہیں۔

یہ صرف ساڑھے تین ماہ کی کارکردگی ہے جس سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ پی پی پی کی پالیسیوں کا اصل رخ سیکولرازم اور لادینیت کی طرف ہے اور وہ تمام تر کوششوں کے باوجود اپنے عزائم پر اسلام کے ساتھ برائے نام تعلق کے اظہار کا پردہ ڈالنے میں ناکام رہی ہے۔

ان حالات میں محبِ وطن اور اسلام دوست عوامی حلقوں بالخصوص تمام مکاتبِ فکر کے علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس صورتحال کا سنجیدگی سے نوٹس لیں اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کو سیکولرازم کی راہ پر گامزن کرنے کی مذموم کوششوں کا پورے نظم اور حوصلہ کے ساتھ سامنا کریں۔

جہادِ افغانستان: ولی خان اور بے نظیر بھٹو کی مہم

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۳۱ مارچ ۱۹۸۹ء)

جہادِ افغانستان کے بارے میں پاکستان کا جو متوازن اور جرأتمندانہ موقف گزشتہ گیارہ سال سے چلا آرہا ہے اسے نہ صرف پاکستان کے عوام اور عالمِ اسلام کی بھرپور تائید حاصل ہے بلکہ عالمی رائے عامہ بھی اقوامِ متحدہ کی متعدّد قراردادوں کی صورت میں اس اصولی موقف کو درست قرار دے چکی ہے۔ پاکستان نے نہ صرف افغان مہاجرین کو اپنے ملک میں پناہ دے کر انسانی ہمدردی اور اسلامی بھائی چارے کی بنیاد پر ان کی حتی المقدور خدمت کی بلکہ جہاد افغانستان کی اخلاقی اور سیاسی پشت پناہی کر کے افغان مجاہدین کو یہ حوصلہ بخشا کہ وہ روسی افواج کو اپنے وطن سے دریائے آموں کے دوسری طرف دھکیلنے میں کامیاب ہو گئے۔

افغان مجاہدین روسی افواج کو سرحدوں سے باہر دھکیلنے کے بعد روسی جارحیت کے بچے کھچے اثرات اور روس کے چھوڑے ہوئے اسلحہ اور اس کے محافظوں سے نمٹنے میں مصروف ہیں مگر کابل پر افغان مجاہدین کی نظریاتی اسلامی حکومت قائم ہوجانے کا خوف امریکہ، روس، بھارت اور اسرائیل کو مضطرب کیے ہوئے ہے اور عالمی سطح پر یہ سازشیں ہورہی ہیں کہ افغان مجاہدین کی جدوجہد کو آخری مرحلہ میں سبوتاژ کر دیا جائے۔

- خان عبد الولی خان کی طرف سے عالمی راہنماؤں کے نام خطوط میں افغان مجاہدین کی جدوجہد کے خلاف جو زہر افشانی کی گئی ہے وہ اسی سازش کی ایک کڑی ہے۔
- اور اب یہ خبر اخبارات کی زینت بنی ہے کہ پیپلز پارٹی کی چیئر پرسن بے نظیر بھٹو افغان پالیسی پر نظر ثانی کی خواہشمند ہیں اور انہوں نے اپنے ایک حالیہ بیان میں خان عبد الولی خان کی مہم کی بالواسطہ حمایت کا عندیہ دیا ہے۔

اگرچہ اس فیصلہ کن مرحلہ میں کوئی سازش بھی افغان مجاہدین کو کابل کی طرف بڑھنے سے نہیں روک سکتی لیکن ہم اس کے باوجود حکومتِ پاکستان اور دیگر طبقات کو خبردار کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ پاکستان کے عوام، عالمِ اسلام اور عالمی رائے عامہ افغان مجاہدین کے ساتھ ہیں، اس لیے وہ افغان مجاہدین کی جدوجہد اور پاکستان کے کامیاب اور باوقار موقف کو سبوتاژ کرنے کی ناپاک سازش میں شریک نہ ہوں اور اپنے گروہی مفادات کی خاطر پاکستان کی اصول پسندی اور حق پرستی کو داؤ پر لگانے سے باز رہیں۔

عورت کی سربراہی اور مولانا فضل الرحمٰن

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۲۱ اپریل ۱۹۸۹ء)

یادش بخیر مولانا فضل الرحمٰن نے ڈیرہ اسماعیل خان میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

> ''اصل مسئلہ عورت کی سربراہی کا نہیں ہے بلکہ موجودہ جمہوری نظام ایک غلاظت ہے جس پر خود بخود مکھی آکر بیٹھے گی۔ اگر تم کہو کہ یہ مکھی غلاظت پر کیوں بیٹھتی ہے تو مکھی نے غلاظت پر بیٹھنا ہے چاہے وہ کسی شکل میں ہو۔''

(روزنامہ جسارت کراچی ۔ ۱۹ اپریل ۱۹۸۹ء)

جہاں تک عورت کی سربراہی کا مسئلہ ہے اس مسئلہ کی اہمیت کو کم کرنا اور اس سلسلہ میں تمام علماء کرام کی مشترکہ جدوجہد کو سبوتاژ کرنا مولانا فضل الرحمٰن کا مشن بن چکا ہے۔ اور اس مشن کے مقاصد بیگم بے نظیر بھٹو کے ساتھ مولانا موصوف کے تازہ ترین مذاکرات اور آٹھویں ترمیم کے خاتمہ پر سمجھوتہ کے بعد اب کچھ زیادہ مخفی نہیں رہے۔ لیکن جس ''جمہوری نظام'' کو غلاظت قرار دے کر انہوں نے اس پر مکھی کے بیٹھنے کو ناگزیر قرار دیا ہے ہم بڑے ادب کے ساتھ گزارش کریں گے کہ اس جمہوری نظام ہی کی خاطر مولانا موصوف گزشتہ دس سال سے مسلسل جدوجہد کر رہے ہیں۔ ایم آر ڈی (تحریکِ بحالیٔ جمہوریت) کے پلیٹ فارم پر مولانا فضل الرحمٰن کی جدوجہد کو سامنے رکھا جائے تو یہ ایک حقیقت ہے کہ اسی جمہوری نظام کی پرستش کے شوق میں انہوں نے ہر دینی و قومی تقاضے کو نظر انداز کیا ہے۔

مولانا فضل الرحمٰن کو بروقت آگاہ کر دیا گیا تھا کہ جس ''جمہوری عمل'' کو وہ اپنی معراج قرار دے رہے ہیں اس کے نتیجہ میں اس ملک پر خاتون کی حکمرانی مسلط ہوگی، مگر انہوں نے اسے جمہوری عمل کے لیے ناگزیر قرار دے کر اس سے آنکھیں بند کیے رکھیں۔ اس لیے آج انہیں عورت کی حکمرانی کا باعث یہی جمہوری نظام نظر آرہا ہے تو اس میں خود ان کی اپنی جدوجہد کا بھی حصہ ہے اور ہم اس موقع پر اس کے سوا اور کیا عرض کر سکتے ہیں کہ

ع اے باد صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

محترمہ بے نظیر بھٹو کی ''شریعت''

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور ــ ۵ مئی ۱۹۸۹ء)

لاہور کے روزنامہ ''آوازِ خلق'' نے ۱۴/اپریل ۱۹۸۹ء کی اشاعت میں مغربی جرمنی کے ایک جریدہ کے لیے پیپلز پارٹی کی چیئر پرسن محترمہ بے نظیر بھٹو کے تفصیلی انٹرویو کا ترجمہ شائع کیا ہے جس میں انہوں نے اپنی پالیسیوں کا دوٹوک انداز میں اظہار کیا ہے۔ اس انٹرویو کے مطابق:

- محترمہ بے نظیر بھٹو نے چور کا ہاتھ کاٹنے اور کوڑے مارنے کی سزاؤں کے بارے میں کہا ہے کہ ظالمانہ اور وحشیانہ قوانین کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔
- ان کی حکومت اسلامی ہے کیونکہ وہ عوام کے ووٹوں سے بنی ہے۔
- میرا عقیدہ ہے کہ اسلام نے مردوں اور عورتوں کو یکساں حقوق دیے ہیں اور ہماری حکومت میں عدالتوں میں عورت کی گواہی کو مرد کی گواہی کے برابر سمجھا جائے گا۔
- عورت کی حکمرانی کو شرعاً ناجائز قرار دینے کا تصور غلط ہے، اسلامی تاریخ میں کئی عورتیں ریاست اور حکومت کی سربراہ رہی ہیں۔

محترمہ بے نظیر بھٹو اس قسم کے خیالات کا اظہار اس سے قبل بھی متعدّد بار کر چکی ہیں اور ان کے یہ نظریات کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی۔ اس پس منظر میں جب ان کی طرف سے یہ اعلان سامنے آتا ہے کہ

> ''ان کی حکومت شریعت کے جلد از جلد نفاذ کے لیے ہر ممکن اقدامات کرے گی۔'' (جنگ لاہور۔ ۲٦ اپریل)

تو معاً ذہن میں یہودی لابی کی اس سازش کا تصور ابھرتا ہے جو عالمِ اسلام میں اسلام کے نام پر اور شریعت کے لیبل کے ساتھ غیر اسلامی نظریات و تصورات کو فروغ دینے اور کافرانہ نظاموں کو مسلط رکھنے کے لیے منظم کی گئی ہے۔ اور مسلمان ممالک میں اس لابی کے کارندوں نے اب اسلامی قوانین اور شرعی احکام سے انکار کی بجائے اپنی ہر بات کو شریعت کے نام پر پیش کرنے کی حکمتِ عملی اختیار کر لی ہے۔

کیا بے نظیر بھٹو کے ذریعے اسلام کے نفاذ کی خواہش رکھنے والے علماء کرام صورتحال کے اس پہلو پر غور کی زحمت فرمائیں گے؟

جمہوری ممالک کی ایسوسی ایشن اور وزیر اعظم بے نظیر بھٹو

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور ــــ ۱۱ اگست ۱۹۸۹ء)

پاکستان پیپلز پارٹی کی چیئر پرسن بیگم بے نظیر بھٹو نے اپنے دورۂ امریکہ کے موقع پر جمہوری ممالک کی ایسوسی ایشن قائم کرنے کی تجویز پیش کی تھی جس پر امریکہ، برطانیہ اور فرانس کے حکومتی حلقوں کی طرف سے مثبت ردعمل کا اظہار کیا گیا ہے اور مغربی پریس اس تجویز کو اس انداز سے اچھال رہا ہے جیسے یہ خود اس کے اپنے دل کی آواز ہو۔

اس تجویز کا پس منظر یہ ہے کہ پاکستان میں نفاذِ اسلام کی مسلسل جدوجہد اور اس کے اردگرد ایران اور افغانستان میں مغربی حکمرانوں کے بقول بنیاد پرست عناصر کے غلبہ نے مغربی جمہوریت کے پاسداروں کو اس پریشانی سے دوچار کر رکھا ہے کہ اگر پاکستان میں بھی نفاذِ اسلام کی جدوجہد آگے بڑھتی ہے تو اسلام ایک زندہ اور متحرک نظام کی صورت میں ایک بار پھر عالمی افق پر نمودار ہو سکتا ہے جس کے سامنے مغربی جمہوریت کا طلسم اپنا وجود شاید زیادہ دیر تک برقرار نہ رکھ سکے۔ اس لیے یہ شاطرانہ چال سوچی گئی ہے کہ پاکستان کو ”بنیاد پرستی“ کی تحریک کے اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے اس کا عملی رشتہ عالمِ اسلام سے کاٹ کر اسے مغربی ممالک کے ساتھ جوڑ دیا جائے۔

دولتِ مشترکہ میں واپسی اور جمہوری ممالک کی ایسوسی ایشن کے قیام کی تجویز اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں جن پر عملدرآمد کے بعد پاکستان نہ صرف مغربی ممالک کے ساتھ نتھی ہو جائے گا بلکہ جمہوریت کے تحفظ کے نام پر پاکستان میں مغربی ممالک کی براہ راست مداخلت کا جواز بھی فراہم ہو جائے گا۔ اس لیے ہم اس تجویز کو عالمی صیہونی لابی کی سازش سمجھتے ہیں اور اسے پاکستان کے نظریاتی تشخص کے منافی قرار دیتے ہوئے یکسر مسترد کرتے ہیں۔

مولانا قاضی عبداللطیف پر بغاوت کا مقدمہ؟

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور ـــ ۲۵ اگست ۱۹۸۹ء)

روزنامہ جنگ لاہور ۲۷ اگست کی ایک خبر کے مطابق وفاقی وزارتِ قانون جمعیت علماء اسلام صوبہ سرحد کے امیر مولانا قاضی عبداللطیف کے خلاف بغاوت کا مقدمہ درج کرنے کا جائزہ لے رہی ہے۔ خبر کے مطابق قاضی صاحب موصوف نے گزشتہ دنوں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے فوج کو موجودہ صورتحال میں مداخلت کی دعوت دی تھی جس کا وفاقی حکومت نے سنجیدگی سے نوٹس لیا ہے۔

جہاں تک مولانا قاضی عبداللطیف کی مذکورہ پریس کانفرنس کا تعلق ہے اس کے حوالہ سے قاضی صاحب کی طرف یہ بات منسوب کرنا غلط ہے کہ انہوں نے فوج کو اپنی طرف سے مداخلت کی دعوت دی ہے۔ کیونکہ انہوں نے اس پریس کانفرنس میں یہ کہا تھا کہ بیگم بے نظیر بھٹو نے فوج کو تمغۂ جمہوریت سے نوازا ہے اس لیے فوج کی ذمہ داری ہے کہ وہ موجودہ بگڑتے ہوئے حالات میں جمہوریت کو بچانے کے لیے کردار ادا کرے۔ اور یہ کردار جس کا تقاضہ مولانا قاضی عبداللطیف نے فوج سے کیا ہے خود بیگم بے نظیر بھٹو کا تجویز کردہ ہے۔ اس لیے اگر یہ بغاوت ہے تو اس کا مقدمہ سب سے پہلے بیگم بے نظیر بھٹو کے خلاف درج ہونا چاہیے۔

ہمیں وفاقی وزارتِ قانون کے بزرجمہروں پر تعجب ہے کہ انہیں مخصوص اقلیتی نشستوں کے انتخاب کے حوالہ سے قادیانیوں کا دستور کو تسلیم کرنے سے انکار تو نظر نہیں آیا، اور مقتدر سیاسی راہنماؤں کی طرف سے اسلامی حدود و قوانین کو وحشیانہ اور ظالمانہ قرار دینے میں بھی دستور سے بغاوت کے جراثیم دکھائی نہیں دیے مگر مولانا قاضی عبداللطیف نے فوج کو تمغۂ جمہوریت سے نوازے جانے پر جس منطقی ردعمل کا اظہار کیا ہے وہ ان کے نزدیک بغاوت کے مقدمہ کی بنیاد قرار پا گیا ہے

ع جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

وفاق اور صوبوں کی کشمکش کا افسوسناک پہلو

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۸ ستمبر ۱۹۸۹ء)

وفاق اور صوبوں کے درمیان کشمکش جس انتہا کو چھو رہی ہے اس نے ملک کے ہر باشعور شہری کو اضطراب سے دوچار کر دیا ہے۔ اور نہ صرف ملک کا نظام اس کشمکش کے ہاتھوں تعطل کا شکار ہے بلکہ جمہوری عمل اور ملکی سالمیت کے لیے خطرات کا اظہار بھی اب سنجیدہ زبانوں سے ہو رہا ہے۔

اس افسوسناک کشمکش کا آغاز گزشتہ انتخابات کے بعد اس وقت ہوا جب پیپلز پارٹی کی وفاقی حکومت نے برسرِاقتدار آتے ہی صوبوں میں برسرِاقتدار آنے والی مخالف حکومتوں کے خلاف کارروائیوں کا آغاز کر دیا۔ بلوچستان اسمبلی توڑ دی گئی، پنجاب میں آئی جے آئی کی حکومت کی حلف برداری میں رکاوٹیں ڈالنے کی کوشش کی گئی، اور وفاقی حکمرانوں نے پنجاب اور بلوچستان کی حکومتوں کے خلاف مسلسل محاذ آرائی کا بازار گرم کر دیا۔ اس کا جواب ان حکومتوں نے بھی اسی زبان میں دیا اور پھر جواب اور جواب در جواب کا سلسلہ اس حد تک دراز ہوتا چلا گیا کہ آج اس کے نتائج کا تصور بھی ملک کے شریف شہریوں کے لیے کربناک ہو گیا ہے۔

محاذ آرائی کے دونوں فریق شاید اپنی اپنی جگہ اس بات پر خوش ہوں کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف اپنے داؤ پیچ کامیابی کے ساتھ آزما رہے ہیں، لیکن صورتحال کا یہ پہلو غالباً ان میں سے کسی کی نظر میں نہیں ہے کہ ان کا یہ طرزِ عمل سیاست اور جمہوری عمل کے مستقبل کو تاریک کر رہا ہے اور اس پر عوام کے اعتماد کو کمزور کرنے کا باعث بن رہا ہے جس کے نتائج ملکی سالمیت اور قومی وحدت کے لیے خطرناک ہو سکتے ہیں۔ اے کاش کہ حالات کا یہ رخ بھی ان "پہلوانوں" کی نگاہوں کے سامنے آ جائے۔

پاکستان میں اسلامی قوانین اور وزیراعظم بے نظیر بھٹو

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۱۶ اکتوبر ۱۹۸۹ء)

روزنامہ جنگ لندن یکم اکتوبر کی ایک خبر کے مطابق پیپلز پارٹی کی چیئرپرسن بیگم بے نظیر بھٹو نے امریکی ٹیلی ویژن کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا ہے کہ وہ اسلامی قوانین کی تبدیلی میں جلدی نہیں کریں گی کیونکہ اس سے دباؤ بڑھے گا۔ خبر کے مطابق پی پی حکومت کے وزیر قانون سید افتخار گیلانی نے بھی انٹرویو میں اپنے اس سابقہ موقف کا اعادہ کیا ہے کہ زنا کے جو قوانین پاکستان میں نافذ ہیں وہ غیر منصفانہ اور غیر منطقی ہیں۔

پی پی کی حکومت پہلے دن سے اسلامی قوانین کو وحشیانہ، ظالمانہ، غیر منصفانہ اور انسانی حقوق کے منافی قرار دینے پر نہ صرف مصر ہے بلکہ جو چند قوانین گزشتہ حکومت کے دور میں نافذ کیے گئے تھے انہیں ختم کرنے کی راہ تلاش کر رہی ہے۔ اور مذکورہ بالا انٹرویو کے مندرجات اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ حدود آرڈیننس اور اس قسم کے دیگر شرعی قوانین کی منسوخی میں اگر کوئی رکاوٹ ہے تو وہ صرف عوامی دباؤ اور مخالفت میں اضافہ کا خوف ہے ورنہ حکومت کی اپنی پالیسی بہرحال انہیں ختم کرنے کی ہے۔

ہمیں تو پہلے دن سے ہی پی پی کی قیادت سے اسلام کے حوالے سے کوئی توقع نہیں تھی اس لیے ہم نے ایم آر ڈی میں شمولیت اور پی پی کی خاندانی قیادت کا سہارا بننے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن جو لوگ اس خوش فہمی کا شکار رہے ہیں اور کسی حد تک اب بھی ہیں کہ وہ پی پی کی قیادت کو اسلام کے نفاذ میں مثبت رویہ اپنانے پر آمادہ کر سکیں گے، ان کی آنکھیں بہرحال کھل جانی چاہئیں اور حالات کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ اپنے گزشتہ آٹھ سالہ سیاسی رول پر نظر ثانی کرتے ہوئے حضرت الامیر مولانا محمد عبد اللہ درخواستی مدظلہ کے بصیرت افروز موقف اور درویشانہ قیادت کے دامن میں واپس آجائیں کیونکہ اس کے سوا اب اور کوئی راستہ باقی نہیں رہ گیا۔

نو تشکیل شدہ اسلامی نظریاتی کونسل کو وزیراعظم بے نظیر بھٹو کی ہدایت

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ — اپریل ۱۹۹۰ء)

اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان ایک آئینی ادارہ ہے جس کے قیام کی گنجائش ۱۹۷۳ء کے دستور میں اس مقصد کے لیے رکھی گئی تھی کہ پاکستان میں مروجہ قوانین کا شرعی نقطۂ نظر سے جائزہ لے کر خلافِ اسلام قوانین کو اسلام کے سانچے میں ڈھالا جائے اور قانون سازی کے اسلامی تقاضوں کے سلسلہ میں قانون ساز اداروں کی راہنمائی کی جائے۔ ۱۹۷۳ء میں دستور کے نفاذ کے موقع پر اس مقصد کے لیے سات سال کی مدت طے کی گئی تھی لیکن ۱۹۷۷ء تک کونسل نے اس سمت کوئی پیشرفت نہ کی تو جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے اپنے دورِ اقتدار میں اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیلِ نو کر کے اسے نہ صرف متحرک بنایا بلکہ اسلامی نظریاتی کونسل ہی کی سفارشات کی بنیاد پر حدود آرڈیننس اور دیگر اسلامی قوانین کے نفاذ کا آغاز کیا۔

اس دور میں نافذ ہونے والے اسلامی قوانین کے نامکمل ہونے اور عملدرآمد کا پہلو خاصا کمزور ہونے کے بارے میں دینی حلقے مسلسل آواز اٹھاتے رہے لیکن یہ بات طے شدہ ہے کہ چند اسلامی قوانین جس حد تک بھی نافذ ہوئے وہ تمام مکاتبِ فکر کے سربرآوردہ علماء کرام کی مشاورت اور اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کی بنیاد پر تھے اور اصولی اور شرعی لحاظ سے درست تھے۔ ہماری معلومات کے مطابق اس دور میں اسلامی نظریاتی کونسل نے اسلامی قانون سازی کے حوالے سے ۸۰ فیصد کام مکمل کر کے قوانین کے مسودات مرتب کر دیے تھے جو نفاذ و عملدرآمد کے لیے حکمرانوں کی میز پر تیار پڑے ہیں۔

مگر بدقسمتی سے ہمارے موجودہ حکمرانوں کو اسلام کے نفاذ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، بلکہ ان کی پالیسیوں کا رخ یہ نظر آرہا ہے کہ اسلام کی جدید تعبیر و تشریح اور نام نہاد اجتہاد کے نام پر مغربی افکار و نظریات کو اسلام کے لیبل کے ساتھ مسلط کر دیا جائے، لیکن اسلامی نظریاتی کونسل کا ٹھوس علمی و فکری کام ان کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہے۔ چنانچہ اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیلِ نو کر کے اس میں درباری قسم کے نام نہاد علماء اور ملحدین کو شامل کر دیا گیا ہے اور نئی کونسل کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے حکمران پارٹی کی سربراہ بیگم بے نظیر بھٹو نے اسلامی نظریاتی کونسل کو ہدایت کی ہے کہ وہ حدود آرڈیننس اور

دیگر اسلامی قوانین پر نظر ثانی کرے اور انہیں اجتہاد کے نام پر حکمران پارٹی کے مزعومہ رجحانات اور تقاضوں کے مطابق ڈھالے۔

ہمارے نزدیک اسلامی نظریاتی کونسل کی یہ رجعتِ قہقری نہ صرف قانون سازی کے اسلامی تقاضوں سے متصادم ہے بلکہ اجتہاد اور تعبیر جدید کے نام پر ملک کو الحاد کی آماجگاہ بنانے کی بھی ایک کوشش ہے جس کا علمی و دینی حلقوں کو سنجیدگی سے نوٹس لینا چاہیے۔

ایک اور ''دینِ الٰہی''؟

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ ـــ اگست ۱۹۹۰ء)

روزنامہ جنگ لاہور ۲۰ جولائی ۱۹۹۰ء کی رپورٹ کے مطابق حکمران پارٹی کی سربراہ بیگم بے نظیر بھٹو نے لاہور ایئرپورٹ پر اخبار نویسوں سے گفتگو کرتے ہوئے شریعت بل کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں کہا ہے کہ:

> ''ہم ایسا اسلام چاہتے ہیں جو واقعی اللہ کی ہدایات کے مطابق ہو۔ پوری دنیا اللہ کی ہے۔ عوام اللہ کے نمائندے ہیں۔ منتخب پارلیمنٹ اللہ کی امانت ہوتی ہے۔ ہم پارلیمنٹ کی بالادستی قائم رکھیں گے۔ ہم انسانوں کے کان یا ہاتھ کاٹنے کو مناسب نہیں سمجھتے۔''

قومی اسمبلی میں ''شریعت بل'' کے زیر بحث آنے سے قبل حکمران پارٹی کی سربراہ کا یہ بیان جہاں حکمران پارٹی کی پالیسی اور عزائم کی عکاسی کرتا ہے وہاں ملک کے دینی حلقوں کے لیے یہ لمحۂ فکریہ بھی مہیا کرتا ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں ملک کی باگ ڈور ہے اسلام کے بارے میں خود ان کا نقطۂ نظر کیا ہے اور وہ اسلام کا نام لے کر ملک کو کس ڈگر پر چلانا چاہتے ہیں۔ بیگم بے نظیر بھٹو اور ان کے وزیر قانون اس سے قبل بھی اسلامی قوانین اور شرعی حدود کو متعدد مواقع پر وحشیانہ اور انسانی حقوق کے منافی قرار دے چکے ہیں اور اب پھر قدرے نرم الفاظ کے ساتھ ان کی طرف سے اسی موقف کا اظہار کیا گیا ہے۔

ہم اس موقع پر حکمران پارٹی سے صرف یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ اس کے پاس ''اللہ تعالیٰ کی واقعی ہدایات'' حاصل کرنے کے متبادل ذرائع آخر کونسے ہیں؟ کیونکہ جو ہدایات اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب قرآن کریم میں مسلمانوں کو عطا فرمائی ہیں ان میں ہاتھ، کان، ناک اور دیگر اعضا (بطور قصاص) کاٹنے کے واضح احکام موجود ہیں اور شرعی احکام کے بارے میں پارلیمنٹ یا کسی بھی انسانی ادارہ کی بالادستی کی قطعی نفی کر دی گئی ہے۔ کہیں اکبر بادشاہ کی طرح یہ ''نیا دین الٰہی'' نافذ کرنے کا پروگرام تو نہیں؟ حکمران پارٹی کو یہ بات ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں بھولنی چاہیے کہ اکبر بادشاہ کے درباری اجتہاد یا مرزا غلام احمد قادیانی کی خود ساختہ وحی کے ذریعے شرعی احکام کو بدلنے کا کوئی تجربہ یہاں نہیں چل سکتا اور نہ ہی واشنگٹن، لندن اور ماسکو کے افکار و نظریات پر اسلام کا لیبل لگا کر انہیں ملک کے عوام سے قبول کروایا جا سکتا ہے۔

عورت کی سربراہی اور میاں محمد نواز شریف

اکتوبر ۱۹۹۳ء کے دوران جامع مسجد صدیقیہ سیٹلائیٹ ٹاؤن گوجرانوالہ میں
''علماء اور قومی سیاست'' کے عنوان پر خطاب کا کچھ حصہ

......اب میں آتا ہوں حالیہ انتخابات میں مذہبی جماعتوں کے رول کی طرف جو آج ملک کا سب سے اہم موضوعِ گفتگو ہے اور کم و بیش ہر مجلس میں اس پر اظہارِ خیال ہو رہا ہے:

اس کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ ملک میں پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہو گئی ہے اور محترمہ بے نظیر بھٹو وزارتِ عظمیٰ کے منصب پر فائز ہو چکی ہیں جس سے عورت کی حکمرانی کی افسوسناک صورتحال پھر سے سامنے آگئی ہے۔ ملک کے دینی حلقے اس سے پریشان ہیں اور علماء کی جماعتوں کو اس کا ذمہ دار قرار دے رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ علماء نے میاں نواز شریف کی مسلم لیگ کا ساتھ نہیں دیا جس کی وجہ سے بے نظیر دوبارہ وزیراعظم بن گئی ہیں۔ اس کے بارے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مذہبی جماعتوں پر یہ اعتراض درست نہیں ہے، اس لیے کہ میاں نواز شریف کی پالیسیوں کے باعث مذہبی جماعتوں کے لیے ان کی حمایت کرنا ممکن ہی نہ تھا۔

مذہبی جماعتوں نے مسلم لیگ کا ساتھ کیوں نہیں دیا

- یہ بات ایک تاریخی حقیقت ہے کہ عورت کی حکمرانی کے خلاف دینی جماعتوں کی جدوجہد کے نتیجہ میں اور دینی جماعتوں کی انتخابی رفاقت کے ساتھ میاں محمد نواز شریف وزارتِ عظمیٰ تک پہنچے لیکن جب ان سے کہا گیا کہ اسمبلی میں انہیں اکثریت حاصل ہے اس لیے عورت کی حکمرانی کا راستہ قانون سازی کے ذریعے روک دیں تو انہوں نے واشگاف الفاظ میں اعلان کیا کہ وہ بنیاد پرست نہیں ہیں اور نہ بنیاد پرستوں کے زیراثر ہیں اس لیے وہ عورت کی حکمرانی کے مخالف نہیں ہیں۔
- پھر شریعت بل کے ساتھ جو حشر ان کی حکومت نے کیا اس کے بارے میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ میاں نواز شریف پیپلز پارٹی کے دورِ اقتدار میں شریعت بل کے حامیوں میں تھے، اس کی حمایت میں کانفرنسوں میں تقریریں کرتے رہے اور خود ان کی مسلم لیگ کی پارلیمانی پارٹی نے

سینٹ میں اسے منظور کرایا۔ مگر جب اپنی حکومت آئی تو میاں محمد نواز شریف نے شریعت بل کو ''کفر بل'' میں تبدیل کر دیا۔

- اس کے بعد سود کے بارے میں وفاقی شرعی عدالت کے فیصلہ کا مرحلہ آیا تو میاں محمد نواز شریف سے گزارش کی گئی کہ اسے چیلنج کرنے کا راستہ اختیار نہ کریں، یہ قرآن و سنت کا فیصلہ ہے۔ لیکن ان کی کابینہ کے وزراء نے کھلم کھلا اس فیصلہ کے خلاف بیان بازی کی اور سود کے حوالہ سے علماء کے بارے میں توہین آمیز زبان اختیار کی گئی۔ بلاسود بینکاری کے بارے میں اسلامی نظریاتی کونسل کی جامع رپورٹ حکومت کی میز پر پڑی رہی جس کی اشاعت پر پابندی تھی، مگر میاں صاحب کے وزراء مسلسل یہ کہتے رہے کہ علماء کے پاس بینکاری کا کوئی متبادل نظام نہیں ہے اور پھر میاں نواز شریف کی حکومت نے اس فیصلہ کو سپریم کورٹ میں چیلنج بھی کر دیا۔

اس کے بعد علماء سے توقع رکھنے کی کون سی بات باقی رہ گئی تھی؟ اور یہ بات بھی نہیں کہ میاں محمد نواز شریف نے یہ سب کچھ کسی مجبوری کے تحت کیا ہو بلکہ یہ سب کچھ ان کی پالیسی کا حصہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حالیہ الیکشن میں انہوں نے اسلام اور شریعت کا نام تک اپنی انتخابی مہم میں نہیں لیا۔ اس کے برعکس وہ یہ کہتے رہے کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہی اسلام ہے۔ اس کے علاوہ ان کے منشور میں، ان کی انتخابی تقریروں میں اسلام کے نفاذ کا، شریعت کی بالادستی کا اور قرآن و سنت کے احکام کی عملداری کا کہیں کوئی تذکرہ نہیں تھا۔ اس لیے اگر علماء نے اور مذہبی جماعتوں نے اس الیکشن میں نواز لیگ کا ساتھ نہیں دیا تو کوئی غلط کام نہیں کیا بلکہ اپنی ذمہ داری کو نبھایا ہے۔ اس کے برعکس اگر دینی جماعتیں اس ساری صورتحال کے باوجود الیکشن میں میاں محمد نواز شریف کا ساتھ دیتیں تو میرے نزدیک یہ دینی بے حمیتی کا مظاہرہ ہوتا۔

مذہبی جماعتوں کا اصل قصور

البتہ مذہبی جماعتوں کا اصل قصور کچھ اور ہے جس نے انہیں موجودہ مقام تک پہنچایا ہے اور وہ قومی سیاست میں عبرت کا عنوان بن کر رہ گئی ہیں۔ اس میں اور کسی کا کوئی قصور نہیں ہے، جو کچھ ہے سب مذہبی جماعتوں کا اپنا کیا دھرا ہے۔ میں اس الیکشن کے دوران ملک میں موجود نہیں تھا، جون کے آغاز میں برطانیہ چلا گیا تھا اور اکتوبر کے وسط میں واپس آیا ہوں لیکن الیکشن سے لاتعلق نہیں رہا، اپنا حصہ ادا کر کے گیا ہوں اور اسے اب آپ کے سامنے لانا چاہتا ہوں تاکہ ریکارڈ میں آجائے۔ پاکستان کی تاریخ یہ ہے کہ اس ملک کے عوام نے مذہبی قوتوں کو کبھی مایوس نہیں کیا لیکن اس وقت جب مذہبی قوتیں متحد ہو کر سامنے آئی ہیں۔ ایسا بار بار ہوا ہے کہ کسی دینی اور قومی مسئلہ پر مذہبی قوتیں متحد ہوئیں تو پوری قوم ان کی پشت پر

آکھڑی ہوئیں، لیکن مذہبی جماعتیں متحد نہ رہ سکیں۔ جس کی وجہ سے اب ان کے اکٹھے ہونے پر بھی لوگ آسانی سے اعتماد نہیں کرتے۔

اس سال جب جناب غلام اسحاق خان نے پہلی بار قومی اسمبلی توڑی اور میر بلخ شیر مزاری صاحب نے نگران وزیر اعظم کی حیثیت سے ملک میں عام انتخابات کا اعلان کیا ہے تو میں پاکستان میں تھا۔ اس موقع پر لاہور میں متحدہ علماء کونسل کے دفتر میں مختلف مکاتبِ فکر کے سرکردہ حضرات کا اجتماع ہوا، میں بھی اس میں شریک تھا۔ اس بات پر غور وخوض ہوا کہ الیکشن میں مذہبی قوتوں کو ایک پلیٹ فارم پر مجتمع کرنے کی کوئی صورت کی جائے۔ ہمارا تجزیہ یہ تھا کہ اگر مذہبی قوتیں متحد ہو کر ایک پرچم تلے اس الیکشن میں حصہ لیتی ہیں تو قومی اسمبلی میں بیس سے پچیس تک سیٹیں ان کے پاس ہوں گی، اس طرح توازن کی قوت ان کے ہاتھ میں ہو گی اور وہ حکومت سازی اور قانون سازی میں مؤثر کردار ادا کر سکیں گی۔ اور اگر وہ اس کے بعد اگلے الیکشن تک متحد رہنے کا کارنامہ سرانجام دے سکیں تو اگلے انتخابات میں فیصلہ کن پوزیشن حاصل کرنا بھی ان کے لیے مشکل نہیں ہو گا۔

اس تجزیہ کو بنیاد بنا کر ہم نے دینی جماعتوں کے قائدین سے ملاقاتیں کرنے کا فیصلہ کیا۔ سب سے پہلا وفد جو پندرہ سولہ ذمہ دار حضرات پر مشتمل تھا، منصورہ میں جناب قاضی حسین احمد صاحب سے ملا۔ وفد نے متکلّم کی ذمہ داری مجھے ہی سونپ دی اور میں نے قاضی صاحب موصوف کے ساتھ اپنے تعلقات کی گرم جوشی بلکہ ایک حد تک بے تکلفی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کسی تمہید کے بغیر کھلی کھلی گزارشات پیش کر دیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم چاہتے ہیں بلکہ قوم چاہتی ہے کہ مذہبی جماعتیں متحد ہو کر ایک پلیٹ فارم سے انتخاب میں حصہ لیں اور اس سلسلہ میں ہم آپ کے پاس یہ درخواست لے کر آئے ہیں کہ مہربانی فرما کر آپ پروٹوکول چھوڑ کر دینی جماعتوں کے قائدین کے پاس خود تشریف لے جائیں اور کسی عنوان سے بھی انہیں یکجا بٹھا کر اس اتحاد کے لیے مل جل کر کوئی عملی صورت نکالیں، اگر آپ فرمائیں تو ہم بھی اس کام لیے آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہیں۔ قاضی صاحب نے ہمارے موقف سے اصولی طور پر اتفاق کیا اور فرمایا کہ جماعتِ اسلامی کی مجلسِ شوریٰ ان دنوں اسی مسئلہ پر بحث کر رہی ہے اس کے لیے ایک کمیٹی قائم کر دی گئی ہے جس کے اجلاس جاری ہیں، میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اس کمیٹی کی رپورٹ آنے کے بعد آپ حضرات کو اعتماد میں لے کر اس سلسلہ میں حتمی فیصلہ کیا جائے گا۔ ہم قاضی صاحب موصوف سے یہ بات سن کر اطمینان کے ساتھ گھروں میں آگئے کہ اب اگلا مرحلہ قاضی صاحب کی طرف سے ہمیں اعتماد میں لینے کے بعد سامنے آئے گا لیکن چند ہی دنوں بعد قاضی حسین احمد صاحب کی طرف سے ''پاکستان

اسلامک فرنٹ'' کے قیام کا اعلان سامنے آگیا جس کے لیے نہ کسی اور مذہبی جماعت سے مشورہ کی ضرورت محسوس کی گئی تھی اور نہ ہمارے ساتھ ہمیں اعتماد میں لینے کا وعدہ پورا کیا گیا تھا۔

پاکستان اسلامک فرنٹ کس طرح بنا، اسے آگے بڑھانے کے لیے کون سے طریقے اختیار کیے گئے اور الیکشن میں اس کا کیا حشر ہوا، یہ ایک الگ موضوع گفتگو ہے۔ لیکن اس مرحلہ میں اتنی گزارش ضرور کرنا چاہتا ہوں کہ میرے نزدیک قاضی صاحب کی اس حکمتِ عملی کے دو مقاصد تھے، ایک میں وہ کامیاب ہوئے ہیں جبکہ دوسرے میں انہیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

- ایک طرف انہوں نے میاں محمد نواز شریف کو یہ بتانا چاہا کہ میاں صاحب! جماعتِ اسلامی کے بغیر وزیراعظم کے منصب تک نہیں پہنچ سکتے کیونکہ جماعتِ اسلامی میں زیادہ نشستیں حاصل کرنے کی نہ سہی لیکن مسلم لیگ کی پندرہ بیس سیٹیں خراب کرنے کی صلاحیت ضرور موجود ہے۔ اور انتخابی نتائج گواہ ہیں کہ قاضی صاحب کو اس مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔
- جبکہ دوسری طرف قاضی صاحب کا مقصد مذہبی جماعتوں پر یہ واضح کرنا تھا کہ جماعتِ اسلامی ملک کی سب سے بڑی مذہبی قوت ہے اس لیے دوسری مذہبی جماعتیں جماعتِ اسلامی کے ساتھ برابر کی جماعتوں کی حیثیت کا اظہار نہ کریں بلکہ اسی کے پیچھے چل کر اپنا سیاسی مستقبل اس کے ساتھ وابستہ کر لیں۔ اس میں قاضی صاحب کو مکمل ناکامی ہوئی ہے اور ان کے تمام اندازے اور خوش فہمیاں نقش بَر آب ثابت ہوئی ہیں۔

قاضی حسین احمد صاحب کے علاوہ ہم اور رہنماؤں سے بھی ملے۔ مولانا عبد الستار خان نیازی سے ملاقات کی، مولانا فضل الرحمٰن سے ملے، مولانا سمیع الحق کی خدمت میں حاضری دی اور مولانا اعظم طارق کا دروازہ بھی کھٹکھٹایا مگر مذہبی جماعتوں کو انتخابات کے لیے ایک پلیٹ فارم پر متحد کرنے کا کوئی دروازہ ہمیں کھلا دکھائی نہ دیا۔

حضرات محترم! اگر آپ اجازت دیں تو تھوڑی سی گھر کی بات بھی کر لوں۔ جمعیت علماء اسلام میرا گھر ہے اور گھر کے حوالہ سے بھی دل کے زخموں کو کریدنا چاہتا ہوں۔ مولانا عبد الحفیظ مکی ہمارے محترم دوست ہیں، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ کے خلیفہ مجاز ہیں اور مکہ مکرمہ میں رہتے ہیں۔ وہ مکہ مکرمہ سے تشریف لائے تو ہم دونوں اکٹھے مولانا فضل الرحمٰن اور مولانا سمیع الحق سے ملے اور جماعتی اتحاد کے لیے گزارش کی۔ دونوں کا جواب ایک ہی تھا، انداز بیان میں فرق ہو سکتا ہے لیکن مفہوم و مقصد ایک ہی تھا کہ جمعیت علماء اسلام کا اتحاد کوئی قابلِ عمل تجویز نہیں ہے۔ دونوں راہنماؤں سے ہماری دوسری گزارش یہ تھی جو میں نے ''اضعف الایمان'' کہہ کر ان کی خدمت میں پیش کی کہ کم از کم انتخابی نشستوں پر ہی مفاہمت کر

لیں کیونکہ ۱۹۹۰ء کے الیکشن میں جمعیت کے دونوں دھڑوں کے باہمی مقابلہ کی وجہ سے کئی نشستیں ضائع ہو گئی تھیں۔ دونوں راہنماؤں نے اس پر اتفاق کیا کہ سیٹوں پر انتخابی مفاہمت ہو سکتی ہے اور ہم اس کے لیے کوئی عملی صورت ضرور اختیار کر لیں گے۔ لیکن بدقسمتی ہم پر غالب آ گئی اور ایسا بھی نہ ہو سکا۔

میں اپنے جماعتی راہنماؤں کی سیاسی بصیرت کو آخر کن الفاظ سے تعبیر کروں کہ جو سیٹیں ۱۹۹۰ء کے الیکشن میں باہمی مقابلہ کی وجہ سے ضائع کی گئی تھیں، وہ اور ان کے ساتھ کچھ اور سیٹیں اس الیکشن میں بھی اسی گروہی کشمکش کی وجہ سے ضائع کر دی گئی ہیں۔ انتخابی نتائج کے مطابق اگر جمعیت کے دونوں دھڑے ہی انتخابی مفاہمت کر لیتے تو اس وقت قومی اسمبلی میں جمعیت کے پاس ایک درجن سے زائد نشستیں ہوتیں لیکن راہنماؤں کی شخصی انا اور دھڑے بندی کی ترجیحات نے غریب کارکنوں کی محنت اور آرزوؤں کا سر بازار خون کر دیا ہے اور کوئی ان سے پوچھنے والا نہیں ہے۔......

گلگت بلتستان: سردار عبدالقیوم اور بے نظیر بھٹو

(روزنامہ پاکستان، اسلام آباد — ۱۳اکتوبر۲۰۰۹ء)

...... اس کے بعد ۱۹۹۴ء میں بے نظیر بھٹو مرحومہ کے دورِ حکومت میں اس طرف پیشرفت ہوئی اور شمالی علاقہ جات میں ناردرن ایریا کونسل قائم کر کے وہاں کے عوام کو ووٹ کا حق دیا گیا اور اس نوعیت کی دیگر اصلاحات کا اعلان کیا گیا۔ کشمیری رہنماؤں کی طرف سے اس موقع پر بھی تحفظات کا اظہار کیا گیا کہ گلگت بلتستان کے عوام کو سیاسی حقوق اور شہری سہولتوں سے بہرہ ور کرنا ضروری ہے لیکن اس خطہ کو پاکستان کا حصہ ظاہر کرنے کی بجائے آزاد کشمیر کا انتظامی حصہ بنا دیا جائے، یا آزاد کشمیر کی طرز پر عارضی طور پر الگ انتظامی بندوبست کر دیا جائے، لیکن اس کے بارے میں ایسا تاثر نہ دیا جائے کہ اسے پاکستان کا حصہ بنایا جا رہا ہے کیونکہ اس سے بہرحال مسئلہ کشمیر کو نقصان پہنچے گا۔

اس مرحلہ میں کشمیری قیادت کے تاثرات کیا تھے؟ اس کے بارے میں اس وقت کے آزاد جموں و کشمیر کے وزیراعظم سردار محمد عبدالقیوم خان کے ایک بیان کا حوالہ دینا چاہوں گا جو لندن کے روزنامہ جنگ میں ۲۹اپریل ۱۹۹۴ء کو شائع ہوا تھا:

> ”آزاد جموں وکشمیر کے وزیراعظم سردار محمد عبدالقیوم خان نے وزیراعظم بے نظیر بھٹو سے کہا کہ وہ اس بات کا اعلان کریں کہ گلگت اور بلتستان ریاست جموں وکشمیر کا جزولاینفک ہیں اور تمام ریاست کی حیثیت اس وقت تک متنازعہ اور غیر طے شدہ ہے جب تک ریاست کے لوگوں کو اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کا موقع میسر نہیں آتا۔ انہوں نے صدرِ مملکت سردار فاروق خان لغاری کو ارسال کردہ خط میں کہا ہے کہ یہ بات خوش آئند ہے کہ آخر گلگت بلتستان کے عوام کو قانون ساز کونسل منتخب کرنے کے لیے ووٹ دینے کا حق مل گیا ہے لیکن وفاقی وزیر اطلاعات نے اصلاحات کے جس پیکیج کا اعلان کیا ہے ہم اس کے مفہوم اور مضمرات کا جائزہ لے رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ وزیراعظم پاکستان ریکارڈ درست رکھنے کے لیے اس بات کا اعلان کریں کہ اصلاحات کا پیکیج ایک عبوری اقدام ہے جس کا مقصد ان علاقوں کے عوام کی روزمرہ انتظامی اور دوسری مشکلات کا ازالہ کرنا ہے۔“

آزاد کشمیر کے وزیراعظم کی حیثیت سے سردار محمد عبدالقیوم خان کے اس خط اور بیان نے یہ بات واضح کر دی کہ کشمیری رہنماؤں کو اس بات سے اختلاف نہیں کہ گلگت بلتستان کے عوام کو سیاسی اور شہری حقوق

دیے جائیں، البتہ وہ اس کی کسی ایسی عملی صورت کے بارے میں تحفظات رکھتے ہیں جس سے بین الاقوامی فورم پر مسئلہ کشمیر کو اور اس کے بارے میں پاکستان کے موقف کو نقصان پہنچ سکتا ہو۔......

فوجی افسران کی گرفتاری اور سرکاری موقف

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ — دسمبر ۱۹۹۵ء)

پاک فوج کے بعض افسروں کی گرفتاری کے تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد وزیراعظم اور وزیر دفاع کے بیانات نے اس سلسلہ میں ملکی اور عالمی سطح پر ہونے والی بحث کو ایک نیا رخ دے دیا ہے اور حکومت کی مسلسل خاموشی سے پیدا ہونے والے شکوک و خدشات ختم ہونے کی بجائے مزید سوالات و شبہات کو جنم دینے کا باعث بن گئے ہیں۔ میجر جنرل ظہیر الاسلام اور بریگیڈیر مستنصر باللہ سمیت دو درجن کے لگ بھگ افراد اس وقت زیر حراست ہیں جن میں فوجی افسران کے علاوہ بعض علماء کرام بھی شامل ہیں۔

گرفتاریوں کے متعلق قیاس آرائیاں

ان گرفتاریوں کے بارے میں مختلف حلقوں کی طرف سے جو قیاس آرائیاں اب تک سامنے آئی ہیں وہ کچھ اس طرح ہیں کہ:

- آنریبل امریکہ بہادر پاکستان کی مسلح افواج میں تخفیف، عسکری استعداد کی تحدید اور نظریاتی رجحانات کو کنٹرول کرنے کے لیے ایک عرصہ سے سرکاری طور پر باضابطہ دباؤ ڈال رہا ہے جبکہ ہمارے حکمران بھی امریکہ کو خوش رکھنے اور اسے اپنی وفاداری کا یقین دلانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔ اس پس منظر میں یہ کاروائی پاک فوج کو اسلام اور پاکستان کے ساتھ نظریاتی وابستگی رکھنے والے افسروں سے صاف کرنے کے لیے عمل میں لائی گئی محسوس ہوتی ہے اور اس قسم کی منصوبہ بندی امریکہ کے خفیہ اداروں کے لیے کوئی مشکل بات نہیں ہے۔
- پاک فوج کے یہ افسر مسئلہ کشمیر کے بارے میں موجودہ حکومت کی پالیسیوں سے مطمئن نہیں تھے اور کشمیریوں کی جنگ آزادی کو آنریبل امریکہ بہادر کی خواہشات و مفادات کی بھینٹ چڑھانے کی ان افواہوں پر مضطرب تھے جو اس وقت بین الاقوامی پریس کے ذریعے سامنے آ رہی ہیں، اس لیے انہوں نے مجاہدین کشمیر کو سرکاری پالیسی سے ہٹ کر اپنے طور پر اسلحہ سپلائی کرنے اور سپورٹ دینے کے لیے ڈسپلن کی پروا نہیں کی اور وہ ڈسپلن کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پکڑے گئے۔

- پاک فوج کے داخلی ڈسپلن اور مصلحتوں کے تحت ان افسروں کو وہ ترقی نہیں ملی جس کی وہ توقع کر رہے تھے، اس لیے انہوں نے انتقامی طور پر بغاوت کی منصوبہ بندی کی۔

وزیراعظم بےنظیر بھٹو اور وزیر دفاع آفتاب شعبان میرانی کے بیانات

یہ تو وہ قیاس آرائیاں ہیں جو مختلف حلقوں کی طرف سے ملکی اور بین الاقوامی پریس کے ذریعے سامنے آئی ہیں، لیکن وزیر دفاع جناب آفتاب شعبان میرانی نے سینٹ میں سینیٹر حافظ حسین احمد کے سوال پر سرکاری پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے جو کچھ کہا ہے اور بعد میں وزیراعظم محترمہ بےنظیر بھٹو نے بھی سینیٹروں کے اعزاز میں دی گئی ایک دعوت میں گفتگو کرتے ہوئے اس کی تصدیق کی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

> ''یہ افسر ملک میں اسلامی انقلاب لانے کی سازش کر رہے تھے، انہوں نے کور کمانڈرز کی میٹنگ میں فوجی قیادت کو اور بعد میں صدر اور وزیراعظم کو قتل کر کے اقتدار پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا اور ملک میں نافذ کرنے کے لیے ''خود ساختہ شریعت'' کا مسودہ بھی تیار کر لیا تھا۔''

لیکن وزیر دفاع نے ملک میں ''مسلح اسلامی انقلاب'' اور ''اقتدار پر قبضہ'' کی منصوبہ بندی کرنے والے افسروں سے جس اسلحہ کی برآمدگی ظاہر کی ہے وہ کسی کالج کے ہاسٹل پر قبضہ کرنے کے لیے بھی ناکافی ہے جبکہ وزیر دفاع کا اصرار ہے کہ یہ افسران اس اسلحہ کے ذریعے ملک کی فوجی اور سیاسی قیادت کا صفایا کرنا چاہتے تھے۔ وزیر دفاع کا کہنا ہے کہ ان افسروں پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے گا اور انہیں سزا ملے گی۔

قوم کو اعتماد میں لینے کی ضرورت

جہاں تک فوجی عدالت میں مقدمہ کا تعلق ہے وہ فوج کا داخلی معاملہ ہے اور ہم اس کے بارے میں کوئی رائے نہیں دینا چاہتے۔ لیکن اسلام، کشمیر اور آنریبل امریکہ بہادر کا حوالہ سامنے آجانے کے بعد مجموعی تناظر میں یہ مسئلہ فوج کا داخلی مسئلہ نہیں رہا بلکہ پوری قوم کے جذبات و احساسات اس سے وابستہ ہو گئے ہیں اور وہ بجا طور پر حقائق سے براہ راست واقف ہونا چاہتی ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ان فوجی افسران کی گرفتاری کے بعد قیاس آرائیوں یا سرکاری موقف کی صورت میں ان کے بارے میں جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ سب یکطرفہ ہے اور اس سلسلہ میں ان کا اپنا موقف نہ اس وقت تک سامنے آیا ہے اور نہ موجودہ حالات میں اس کے سامنے آنے کی کوئی قابلِ اعتماد صورت موجود ہے۔

گرفتار شدگان کی دینداری اور حب الوطنی

گرفتار شدگان کے بارے میں یکطرفہ اظہار رائے اور قیاس آرائیاں اس وقت اور زیادہ ذہنی الجھن کا باعث بن جاتی ہیں جب یہ بات سامنے آتی ہے کہ گرفتار فوجی افسران دینی رجحانات کے حامل اور محبِ وطن افراد ہیں۔

- بالخصوص میجر جنرل ظہیرالاسلام وہ افسر ہیں جنہیں دہلی کے پاکستانی سفارت خانہ میں ڈیوٹی کے دوران بھارتی حکومت نے تشدد کا نشانہ بنانے کے بعد ناپسندیدہ شخصیت قرار دے کر وہاں سے نکال دیا تھا، ان کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے پاکستان پر بھارتی حملہ کا منصوبہ قبل از وقت معلوم کر کے اس کی ساری تفصیلات پاکستان بھجوادی تھیں اور پاکستان اس کی وجہ سے بھارتی جارحیت کا شکار ہونے سے بچ گیا تھا۔
- جبکہ بریگیڈیر مستنصر باللہ کے بارے میں یہ بات ریکارڈ پر آچکی ہے کہ انہوں نے مجاہدین کشمیر کی امداد کے لیے اپنا ذاتی پلاٹ فروخت کر کے دس لاکھ روپیہ کا عطیہ کچھ عرصہ قبل دیا تھا۔

فوج کے نظام پر سوالیہ نشان

پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اسلحہ کی جو مقدار اور انقلاب کی منصوبہ بندی ان افسروں سے منسوب کی جارہی ہے اگر وہ واقعی درست ہے تو پھر ان افسروں کی انکوائری سے زیادہ پاک فوج کے اس سسٹم کا از سرِ نو جائزہ لینا ضروری ہو جائے گا جس کے تحت یہ افراد کرنل، بریگیڈیر اور میجر جنرل جیسے مناصب تک پہنچ گئے ہیں۔ کیونکہ اس طرح کی بچگانہ منصوبہ بندی کی توقع تو کسی کالج کے ان کھلنڈرے نوجوانوں سے بھی نہیں کی جا سکتی جو کوئی جاسوسی ناول پڑھ کر یا جاسوسی فلم دیکھ کر اپنے مخالفوں کے کیمپ پر قبضے کے منصوبے بنانے بیٹھ جاتے ہیں۔

اپوزیشن راہنماؤں کا موقف اور مطالبہ

یہی وجہ ہے کہ ملک کے بیشتر دینی حلقوں کے ساتھ ساتھ سینٹ اور قومی اسمبلی کے اپوزیشن لیڈروں نے بھی سرکاری موقف کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

- چنانچہ نوائے وقت لاہور ۲۱ نومبر ۱۹۹۵ء کے مطابق قومی اسمبلی میں قائد حزب اختلاف میاں محمد نواز شریف نے پشاور میں اخبار نویسوں سے گفتگو کرتے ہوئے گرفتار فوجی افسران کے بارے میں سرکاری موقف کو جھوٹ پر مبنی قرار دیا ہے۔

- جبکہ ۱۵ نومبر کو سینٹ کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے اپوزیشن لیڈر راجہ محمد ظفر الحق نے اس سلسلہ میں سرکاری موقف کو مسترد کرتے ہوئے گرفتار فوجی افسران کے خلاف کھلی عدالت میں مقدمہ چلانے کا مطالبہ کیا ہے۔

الغرض گرفتار فوجی افسران کے بارے میں وزیر اعظم اور وزیر دفاع کے بیانات نے شکوک و شبہات کا ازالہ کرنے کی بجائے معاملہ کو مزید الجھا دیا ہے اور گرفتار شدگان کا موقف سامنے آئے بغیر ان کے بارے میں یکطرفہ قیاس آرائیوں اور بیانات نے انصاف کی رہی سہی توقعات کو بھی دھندلا کر رکھ دیا ہے۔ ان حالات میں انصاف کے مسلمہ تقاضوں کو پورا کرنے اور ملکی و عالمی رائے عامہ کو مطمئن کرنے کی اس کے سوا کوئی صورت باقی نہیں رہ جاتی کہ گرفتار شدہ فوجی افسران کو اپنا موقف اور پوزیشن واضح کرنے کے لیے ذرائع ابلاغ تک رسائی کے مواقع فراہم کیے جائیں، اور ان پر مقدمہ بے شک فوجی عدالت میں چلایا جائے لیکن ملک کے شہریوں اور اخبارات کے نمائندوں کو عدالتی کاروائی سننے اور اس سے رائے عامہ کو باخبر رکھنے کی اجازت دی جائے۔ ورنہ یکطرفہ پراپیگنڈا اور کسی بند عدالت کی کاروائی سے حکومت وقتی مقاصد حاصل کرنے میں تو شاید کامیاب ہو جائے لیکن ایسی کوئی کاروائی انصاف اور اخلاق کی عدالت سے جواز کی سند حاصل نہیں کر پائے گی۔

وزیراعظم بے نظیر بھٹو اور اسلامی انقلاب

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ — ستمبر ۱۹۹۶ء)

روزنامہ نوائے وقت لاہور ۱۶ اگست ۱۹۹۶ء کے مطابق وزیراعظم بے نظیر بھٹو نے اسلام آباد میں سینیٹر اعتزاز احسن کی کتاب ”دی انڈس ساگا اینڈ دی میکنگ آف پاکستان“ کی رونمائی کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ

> ”مہذب معاشرہ کو ایک مخصوص طبقے نے کھوکھلا کر دیا ہے اور آج بھی وہ نام نہاد اسلامی انقلاب کے نام پر پروپیگنڈے کے ذریعے جمہوری ڈھانچے کو تباہ کرنے کے درپے ہیں۔“

محترمہ بے نظیر بھٹو اس سے قبل بھی کئی مواقع پر اس قسم کے خیالات کا اظہار کر چکی ہیں اور اپنے اس نقطۂ نظر کے اظہار کی مسلسل کوشش کر رہی ہیں کہ اسلامی انقلاب اور اسلامی نظام کی بات کرنے والے لوگ جس قسم کا نظام لانے کی تگ و دو کر رہے ہیں وہ نظام اگر آ گیا تو موجودہ جمہوری ڈھانچہ تباہ ہو جائے گا اور معاشرہ تہذیب وثقافت کی بجائے جہالت کے دور کی طرف واپس چلا جائے گا۔

محترمہ بے نظیر بھٹو کے ان خیالات کو اسلام اور مغربی ثقافت کے درمیان عالمی کشمکش کے تناظر میں دیکھا جائے تو ان کی اس پوزیشن کو سمجھنے میں زیادہ دقت محسوس نہیں ہوتی کہ وہ ایک بڑے مسلم ملک کی وزارتِ عظمیٰ کے منصب پر فائز ہو کر مغربی ثقافت اور نظریات کی کامیابی کے ساتھ وکالت کر رہی ہیں، اور اس پر انہیں مغربی میڈیا اور لابیوں کے ہاں مطلوبہ پذیرائی بھی حاصل ہے۔ لیکن اسلام کے نام پر بننے والے ملک کے حکمران کے منہ سے اس قسم کی باتیں بہرحال ایک المیہ سے کم نہیں اور یہ ملک کے دینی و سیاسی حلقوں کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔

اس حوالہ سے ہم محترمہ بے نظیر بھٹو سے یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ جہاں تک موجودہ ڈھانچے کا تعلق ہے اور جسے وہ جمہوریہ ڈھانچہ قرار دے رہی ہیں، وہ جاگیرداری، ناانصافی، کرپشن، نااہلیت، بدعنوانی، لوٹ کھسوٹ اور مار دھاڑ کا ڈھانچہ ہے، اور اسلامی انقلاب اس ڈھانچے کو ختم کر کے اس کی جگہ عدل و انصاف اور امن و مساوات کے فطری نظام کو نافذ کرنے سے ہی مکمل ہوگا۔ یہ ڈھانچہ ختم ہو جانا چاہیے اور اسے ختم کرنے میں ہی سب کا بھلا ہے، اس ظالمانہ نظام پر جمہوری اور مہذب کا لیبل چسپاں کر کے اس کے دفاع کی کوشش اپنے ملک کے عوام اور انسانی اقدار دونوں کے ساتھ ناانصافی ہے۔

آزاد کشمیر کے مفتی صاحبان کی ملازمت سے فراغت

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ — اکتوبر ۱۹۹۶ء)

آزاد کشمیر میں حالیہ انتخابات کے بعد قائم ہونے والی پیپلز پارٹی کی حکومت نے گزشتہ حکومت کے بھرتی کیے ہوئے سینکڑوں ملازمین کو سبکدوش کر دیا ہے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہیں ایڈہاک بنیادوں پر ملازم رکھا گیا تھا۔ ان میں تحصیل اور ضلع کی سطح کے مفتی صاحبان بھی ہیں جو ''محکمہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر'' کے تحت فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ ضلع اور تحصیل کی سطح پر ان مفتی صاحبان کو سرکاری مفتی کی حیثیت حاصل تھی اور سرکاری محکمے اور عوام دینی مسائل معلوم کرنے کے لیے ان سے رجوع کرتے تھے۔ لیکن موجودہ حکومت نے ان سب مفتی صاحبان کو بیک جنبشِ قلم فارغ کر دیا ہے اور آزاد کشمیر کے دینی حلقے اس پر مسلسل احتجاج کر رہے ہیں۔

اس قسم کی صورتحال اس سے قبل پاکستان میں بھی پیش آچکی ہے کہ سپریم کورٹ آف پاکستان کے شریعت ایپلیٹ بینچ کے دو معزز ارکان جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی اور جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری کو اچانک فارغ کر دیا گیا اور اس کی وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ ان کا تقرر ایڈہاک بنیادوں پر ہوا تھا اس لیے انہیں فارغ کر دیا گیا ہے۔

جہاں تک حکومتی پالیسی کا تعلق ہے یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ یہ دونوں اقدام ایک ہی پالیسی کا تسلسل ہیں کہ قومی زندگی کے مختلف شعبوں کو نظریاتی اور پختہ کار دینی لوگوں سے خالی کیا جائے، اور موجودہ حکومت مختلف حیلوں بہانوں سے سرکاری محکموں میں موجود ''بنیاد پرستوں'' سے نجات حاصل کرنے کے لیے مسلسل پیشرفت کر رہی ہے۔

لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ پاکستان کے سپریم کورٹ کے جج صاحبان اور آزاد کشمیر کے ضلع اور تحصیل سطح کے مفتی صاحبان آخر ''ایڈہاک'' ہی پر کیوں تھے، اور انہیں باضابطہ حیثیت دینے میں آخر کون سی بات رکاوٹ تھی؟ جن حکومتوں نے ان حضرات کا بطور جج یا مفتی کے تقرر کیا انہیں نفاذِ اسلام کی حامی حکومتیں تصور کیا جاتا ہے، لیکن ان کے یہ اقدامات اس قدر کمزور ثابت ہوئے کہ بعد میں آنے والی حکومتوں کو انہیں ختم کرنے میں کوئی رکاوٹ محسوس نہیں ہوئی۔ حتیٰ کہ ہمارے ہاں پاکستان میں تو یہ صورتحال اس قدر تکلیف دہ ثابت ہوئی کہ وفاقی شرعی عدالت کا قیام عمل میں لایا گیا تو اس کے سروس رولز میں پائی جانے والی خامیوں کے باعث دوسری اعلیٰ عدالتوں سے شرعی عدالت میں تبادلہ کو فخر

اور اعزاز کی بجائے سزا اور تنزلی سمجھا جانے لگا۔ اور اس طرح شرعی عدالتوں کا تصور قانونی حلقوں میں جس طرح مجروح کیا گیا وہ ایک الگ دلخراش داستان ہے۔

ہم موجودہ حکومت کے ان اقدامات پر دینی حلقوں کے احتجاج کی تائید کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ یہ کہنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ اس صورتحال کی ذمہ داری ان حکومتوں پر بھی عائد ہوتی ہے جنہوں نے بے دلی، تذبذب اور ایڈہاک ازم کی فضا میں ادھورے اسلامی اقدامات کر کے نفاذِ اسلام کی طرف پیشرفت کرنے کی بجائے اس کی بدنامی اور کمزوری کا سامان فراہم کیا۔

بے نظیر حکومت کی برطرفی اور احتساب و انتخاب کا چکر

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ ــــ دسمبر ۱۹۹۶ء)

صدر سردار فاروق احمد لغاری کی طرف سے بے نظیر حکومت کی برطرفی اور قومی اسمبلی توڑ کر ۳ فروری کو نئے انتخاب کے اعلان کے بعد یہ بحث ایک بار قومی حلقوں میں چل پڑی ہے کہ پہلے انتخاب ہونا چاہیے یا پہلے احتساب کو مکمل کیا جانا چاہیے۔

یہ بحث ایک بار پہلے بھی ۱۹۷۷ء میں "پاکستان قومی اتحاد" کی تحریک کے بعد جنرل ضیاء الحق مرحوم کے مارشل لاء کے دور میں چھڑی تھی اور بہت سے سیاسی راہنماؤں نے مطالبہ کیا تھا کہ انتخابات سے پہلے احتساب کا عمل مکمل کیا جائے، جس پر جنرل ضیاء الحق مرحوم نے انتخابات ملتوی کر دیے تھے اور احتساب کا عمل بہت جوش و خروش کے ساتھ شروع ہو گیا تھا۔ لیکن عملاً یہ ہوا کہ احتساب کا عمل بھی کسی نتیجے پر پہنچنے کی بجائے راستہ میں ہی ٹائیں ٹائیں فش ہو کر رہ گیا اور انتخابات بھی دس سال تک نہ ہو سکے۔

پھر ۱۹۸۵ء میں انتخابات کا عمل شروع ہوا اور کہا گیا کہ سب سے بہتر احتساب وہ ہے جو عوام ووٹ کے ذریعے کرتے ہیں، لیکن ۱۹۸۵ء سے ۱۹۹۳ء تک آٹھ سال کے عرصہ میں قوم چار مرتبہ عام انتخابات کے مرحلہ سے گزری اور بار بار انتخابات کا یہ عمل بھی حالات میں کوئی بہتری نہ لا سکا، بلکہ حالات کا تجزیہ کیا جائے تو صورتحال پہلے سے زیادہ بدتر ہوتی چلی گئی ہے۔ ملک کا حکمران طبقہ ابھی تک وہی ہے، نظامِ حکومت اور طرزِ حکومت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے، اور چہرے بھی وہی ہیں جو تھوڑے بہت فرق کے ساتھ باری باری سامنے آ رہے ہیں۔

اس لیے ایک عام آدمی کے لیے تو انتخاب یا احتساب میں سے کسی میں بھی کوئی کشش یا امید کا کوئی پہلو باقی نہیں رہا، اور وہ حیران و پریشان ہے کہ کونسا راستہ اختیار کرے؟ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اصل مسئلہ نہ انتخاب ہے نہ احتساب، بلکہ مسائل کی اصل جڑ یہ ہے کہ ملک کا اجتماعی نظام بدستور وہی چلا آ رہا ہے جو فرنگی استعمار نے نوآبادیاتی دور میں اپنے مخصوص مفادات کے لیے ہم پر مسلط کیا تھا۔ اور اس نظام کو چلانے والی کلاس بھی متعیّن ہے جو جاگیرداروں، جرنیلوں اور بیوروکریٹس کی صورت میں باری باری عوام پر حکمرانی کرنے اور نوآبادیاتی نظام کے تحفظ کے لیے سامنے آتی رہی ہے۔

گزشتہ دس برس میں تھوڑی سی تبدیلی یہ آئی ہے کہ اس تکون کو توڑ کر ملک کے صنعتکار طبقہ نے بھی اقتدار کی لائن میں لگنے اور اپنی باری پکی کرانے کے لیے تگ و دو شروع کر رکھی ہے۔ اس کے علاوہ گزشتہ

نصف صدی کے دوران ملک کے نظام، اور نظام کو چلانے والے مخصوص گروہوں میں کوئی تبدیلی سامنے نہیں آئی۔ اور یہ طبقات انتخاب یا احتساب دونوں صورتوں میں باہمی مفادات کے تحفظ کے لیے اندرون خانہ اکٹھے ہوجاتے ہیں، جس کی وجہ سے نہ انتخاب ملک میں کسی تبدیلی کا ذریعہ بنتا ہے اور نہ احتساب کا کوئی عمل کسی نتیجے تک پہنچتا ہے۔

اس لیے ضرورت ایک ایسی عوامی جدوجہد کی ہے جو عوام کو نظام کی تبدیلی اور ''حکمران طبقہ'' سے نجات کے لیے تیار کرے، اور رائے عامہ کی منظم قوت کے ساتھ نوآبادیاتی سسٹم اور اس کے محافظوں کو راستہ سے ہٹایا جائے۔ تاکہ ملک میں صحیح معنوں میں ایک نظریاتی اسلامی حکومت قائم ہو جو اسلام کے عادلانہ نظام کا نفاذ کر کے لوگوں کے دکھوں اور تکالیف کا مداوا کر سکے، اس کے علاوہ ملک میں حالات کی تبدیلی کا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

صدر محترم محمد رفیق تارڑ کی داڑھی

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد — ۲۵ مارچ ۱۹۹۸ء)

...... بات صدر محترم جناب محمد رفیق تارڑ کی داڑھی سے چلی تھی جو بلاشبہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے سربراہ کے چہرے پر بھلی معلوم ہوتی ہے۔ مگر اسے دیکھ کر ناک بھوں چڑھانے والے بھی کم نہیں ہیں حتیٰ کہ ملک کی اپوزیشن لیڈر محترمہ بے نظیر بھٹو نے بھی اپنے جذبات کا اظہار اچھے انداز میں نہیں کیا تھا جس کا نقد جواب قدرت کی طرف سے انہیں مل گیا ہے کہ جس سیاسی اتحاد کے لیے وہ ایک عرصہ سے سرگرمِ عمل تھیں اس کا قیام ایک داڑھی والے کی صدارت میں عمل میں لایا گیا ہے، اور محترمہ کو کم از کم ایک سال کے لیے داڑھی والے کی قیادت قبول کرنا پڑ گئی ہے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ خود داڑھی والے حضرات بھی جب صدر محمد رفیق تارڑ کا تذکرہ کرتے ہیں تو داڑھی کے ذکر کے بغیر بات آگے نہیں بڑھتی۔ گزشتہ دنوں صدر محترم گوجرانوالہ تشریف لائے تو سرکٹ ہاؤس میں ان کے ساتھ مقامی علماء کرام کی ایک نشست کا اہتمام کیا گیا جن میں راقم الحروف بھی شامل تھا۔ مختلف مکاتبِ فکر کے علماء کرام موجود تھے اور ان میں اکثر نے صدر سے بات کرتے ہوئے ان کی داڑھی کا ذکر کیا اور اس پر مسرت اور خوشی کا اظہار کیا کہ پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار دیندار اور داڑھی والا صدر ملا ہے۔ مجھے جب بات کرنے کا موقع ملا تو میں نے بھی یہ عرض کیا کہ صدر محترم کی داڑھی کے ساتھ ملک بھر کے سب داڑھی والوں کی عزت بھی شامل ہوگئی ہے، اس لیے ہم ہر وقت دعاگو رہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس عزت کی حفاظت فرمائیں اور بھرم قائم رکھیں، آمین یارب العالمین۔

خدمت کمیٹیاں: نازی پارٹی یا پاسدارانِ انقلاب؟

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد — ۲۳ اپریل ۱۹۹۸ء)

مفتی محمودؒ، بھٹو مرحوم اور ہٹلر کی سوانح حیات

حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے ایک دفعہ ذکر کیا کہ شاہ فیصل شہید کے جنازے میں شرکت کے لیے جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم سعودی عرب گئے تو قومی اسمبلی کے اپوزیشن لیڈر کے طور پر مفتی صاحبؒ بھی ان کے ہمراہ تھے۔ دورانِ سفر گفتگو میں بھٹو مرحوم نے مفتی صاحبؒ سے دریافت کیا کہ مفتی صاحب آپ نے ہٹلر کی سوانح حیات کا مطالعہ کیا ہے؟ مفتی صاحبؒ نے جواب دیا کہ میں نے تو نہیں پڑھی، کیا آپ نے پڑھی ہے؟ بھٹو صاحب نے کہا کہ میں نے کئی بار پڑھی ہے اور وہ ہر وقت میرے مطالعہ کی مخصوص کتابوں میں موجود رہتی ہے۔ مفتی صاحبؒ نے پوچھا کہ کیا اس کا آخری باب بھی پڑھا ہے؟ مولانا مفتی محمودؒ کا کہنا تھا کہ بھٹو مرحوم نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور گفتگو کا رخ کسی اور طرف موڑ دیا۔

یہ مکالمہ کل شام اس وقت اچانک یاد آگیا جب گوجرانوالہ کے ایک قانون دان محمد اقبال بھٹی ایڈووکیٹ میرے پاس بیٹھے ''خدمت کمیٹیوں'' کے متوقع کردار اور اس کے نتائج پر بحث کر رہے تھے۔ اور اس خیال کا اظہار کر رہے تھے کہ مسلم لیگی حکومت ان کمیٹیوں سے وہی کام لینا چاہ رہی ہے جو ہٹلر نے سوسائٹی کے مختلف شعبوں پر گرفت قائم رکھنے کے لیے نازی پارٹی کے کارکنوں سے لیا تھا۔

وزیر اعظم میاں محمد نواز شریف کی خدمت کمیٹیاں

وزیر اعظم میاں محمد نواز شریف نے جس روز اسلام آباد کی فیصل مسجد میں خدمت کمیٹیوں کے ارکان سے حلف لیا راقم الحروف بھی اس روز وفاقی دارالحکومت میں تھا۔ برطانیہ سے ہمارے دو محترم دوست مولانا رضاء الحق سیاکھوی اور مولانا اورنگزیب خان آئے ہوئے تھے۔ مولانا رضاء الحق کا تعلق آزاد کشمیر کے علاقہ سیاکھ سے ہے، وہ ورلڈ اسلامک فورم کے سیکرٹری جنرل ہیں اور برطانیہ کے شہر ٹونگھم میں جامعہ الہدیٰ کے نام سے ایک دینی ادارہ چلا رہے ہیں، جبکہ مولانا اورنگزیب خان ان کے معاون ہیں۔ آخر الذکر نے فیصل مسجد اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی اور ہم انہیں فیصل مسجد دکھانے کے لیے عصر کی نماز سے کچھ دیر بعد وہاں گئے، مولانا اللہ وسایا قاسم بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ہم فیصل مسجد پہنچے تو حلف برداری کی تقریب ختم ہو چکی تھی اور اس کے شرکاء واپس جا رہے تھے، اس لیے ہم اس تقریب کا منظر تو نہ دیکھ سکے

البتہ تقریب کے شرکاء اور خدمت کمیٹیوں کے ارکان میں سے بہت سے چہرے دیکھ لیے۔ مولانا اورنگزیب خان نے گھوم پھر کر مسجد کا معائنہ کیا اور اسی دوران میرے جوتے گم ہو گئے جو مسجد کے مین ہال کے ایک دروازے پر جوتوں کے لیے بنے ہوئے ریک میں رکھے تھے مگر واپسی پر دیکھا تو غائب تھے۔ مولانا اللہ وسایا قاسم نے اپنے جوتے مجھے پہنا دیے اور خود ننگے پاؤں چل پڑے۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا، بات خدمت کمیٹیوں پر محمد اقبال بھٹی ایڈووکیٹ کے تبصرے کی ہو رہی تھی جو اس بات پر مصر ہیں کہ یہ خدمت کمیٹیاں صرف حکومتی پارٹی کے ایک ''لابنگ گروپ'' کے طور پر سامنے لائی گئی ہیں جن کا عام آدمی کو تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا البتہ حکمران جماعت بیوروکریسی کے جس فرد کو کارنر کرنا چاہے گی اس کے خلاف یہ خدمت کمیٹیاں ایک اچھی آڑ بن سکیں گی، اور اس طرح مسلم لیگی حکومت نوکر شاہی کے جن کو قابو میں لانے کے لیے اپنے پروگرام کو آگے بڑھا سکے گی۔ اقبال بھٹی کے ذہن میں یہ اشکال بھی ہیں کہ ان خدمت کمیٹیوں کے لیے جن اختیارات کی بات کی جارہی ہے ان کا فریم ورک کیا ہوگا؟ اور انہیں اختیارات تفویض کیے جانے کے بعد مختلف محکموں میں احتساب اور باز پرس کا پہلے سے چلا آنے والا داخلی سسٹم کہاں جائے گا؟ اور اگر وہ موجود رہے گا تو فائنل پوزیشن کسے حاصل ہوگی؟ اگر فائنل اتھارٹی وہی سابقہ سسٹم رہے گا تو پھر اتنے لمبے چکر کا کیا فائدہ کہ بات تو شرعی عدالتوں کی طرح گھوم گھما کر اسی جگہ آجائے گی کہ اصل اتھارٹی وہی پہلے سے چلا آنے والا سسٹم ہے اور یہ نیا نظام محض ایک ''شو پیس'' ہے جو نیا پن دیکھنے کے خواہش مند لوگوں کو خوش کرنے کے لیے پیش کیا گیا ہے۔

اقبال بھٹی نے اپنی بات مکمل کرنے کے بعد مجھے تبصرہ کرنے کے لیے کہا تو میں نے عرض کیا کہ مجھے ان کی ''لابنگ گروپ'' والی بات زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ میاں محمد نواز شریف حکومتی نظام اور قومی زندگی کے مختلف شعبوں کو ''پارٹی'' کے ذریعے کنٹرول کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ اور انہیں کسی ستم ظریف نے ''نازی پارٹی'' کے طریق کار پر کوئی کتاب پڑھا دی ہے یا کم از کم ایران کے ''پاسدارانِ انقلاب'' کا تصور ان کے ذہن کے کسی گوشے میں ضرور موجود ہے۔ کیونکہ جس طرح انہوں نے اپنے اختیارات میں اضافہ کیا ہے اور تمام اہم آئینی اختیارات اپنی ذات میں مرکوز کر لیے ہیں، اس کے بعد مسلم لیگی کارکنوں اور بہی خواہوں پر مشتمل خدمت کمیٹیوں کے مجوزہ اسٹرکچر کا اس کے سوا کوئی مقصد متعیّن نہیں کیا جاسکتا۔ مگر یہ سب کچھ ایک خوبصورت خواب اور خوش فہمی کے سوا کچھ حقیقت نہیں رکھتا، کیونکہ بات کسی پارٹی یا تحریک کے طریق کار کو اسٹڈی کرنے اور اسے اختیار کر لینے سے نہیں بن جاتی بلکہ اس کے لیے مطلوبہ قیادت اور تربیت یافتہ کارکنوں کی کھیپ کی بھی ہر سطح پر ضرورت ہوتی ہے جو بدقسمتی سے مسلم لیگ کے پاس نہیں ہے۔ مسلم لیگ کے پاس پہلے اور آخری لیڈر قائداعظم تھے جن کی

وفات کے بعد اس جماعت کو آج تک کوئی لیڈر نہیں ملا اور اس کے نظریاتی کارکن یا تو قبروں میں جا چکے ہیں اور یا پھر چوہدری محمد حسین چٹھہ طرز کے اِکاّ دُکاّ حضرات حسرت اور بے بسی کی تصویر بنے ''کھڈے لائن'' لگے ہوئے ہیں۔

اب یہ بات میاں محمد نواز شریف کو کون سمجھائے کہ نہ وہ ''ہٹلر'' ہیں اور نہ ہی مسلم لیگ کی موجودہ کھیپ میں ''نازی پارٹی'' کی سی صلاحیتوں اور استعداد کار کا دور دور تک کوئی سراغ ملتا ہے۔ اس لیے محض ''نسخہ ہاتھ لگ جانے'' سے کچھ نہیں ہوگا، یہ غریب قوم اس قسم کے تجربات کے بیلنے سے کئی بار گزر چکی ہے، اسے ایک بار پھر اس میں سے گزارنے کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ اور اگر کچھ عناصر انہیں ''ہٹلر'' بنانے پر تل ہی گئے ہیں اور مصنوعی ذرائع اور سہاروں سے ''ہلاشیری'' دے کر انہیں اس راستے پر بہر حال آگے لے جانا چاہتے ہیں تو ہم ان کے لیے وہی مشورہ دہرانا چاہیں گے جو مولانا مفتی محمود نے بھٹو مرحوم کو دیا تھا کہ ہٹلر کی کتاب حیات کا آخری باب بھی پڑھ لیں کہ اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہوگا۔

محترمہ بے نظیر بھٹو! معاملات کو گڈمڈ نہ کریں

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ —۱۶ فروری ۱۹۹۹ء)

قائدِ حزبِ اختلاف محترمہ بے نظیر بھٹو نے ایک حالیہ مضمون میں موجودہ حکومت کی پالیسیوں پر تنقید کرتے ہوئے دیگر مسائل کے ساتھ ساتھ مالاکنڈ ڈویژن میں نفاذِ شریعت آرڈیننس اور سی ٹی بی ٹی پر دستخط کے معاملات پر بھی بحث کی ہے۔

ایٹمی معاہدہ سی ٹی بی ٹی پر دستخط کی حمایت

محترمہ کا موقف ہے کہ پاکستان کو سی ٹی بی ٹی پر دستخط کر دینا چاہئیں بلکہ یہ کام بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا۔ جبکہ ہماری معلومات کے مطابق خود حکومتِ پاکستان نے بھی سی ٹی بی ٹی پر دستخط کرنے کا فیصلہ کر رکھا ہے اور اس کے لیے حالات کو سازگار بنانے پر کام کیا جا رہا ہے۔ مگر دینی اور قومی نقطۂ نظر سے یہ موقف درست نہیں ہے اور ہمارے نزدیک اس معاملہ میں حکومت اور اپوزیشن دونوں اسلام اور پاکستان کے مفادات کی نگہبانی کرنے کی بجائے عالمی استعمار کے ایجنڈے پر کام کر رہی ہیں، کیونکہ سی ٹی بی ٹی پر دستخط کا اصولی مطلب ایٹمی پروگرام پر عالمی اداروں کی نگرانی اور کنٹرول کو قبول کرنا ہے۔ وہ عالمی ادارے جو اقوامِ متحدہ کے ٹائٹل کے ساتھ صرف اور صرف امریکی مفادات کے محافظ بنے ہوئے ہیں اور انہیں دنیا پر امریکہ کی چودھراہٹ مسلط کرنے اور اس کے نیو ورلڈ آرڈر کی عملداری کے سوا اور کسی بات سے دلچسپی نہیں ہے، اس لیے کوئی باشعور مسلمان اور محبِ وطن پاکستانی اس کی حمایت نہیں کر سکتا۔

افغانستان اور مالاکنڈ میں اسلامی اقدامات کی مخالفت

محترمہ بے نظیر بھٹو نے طالبان کے اسلامی اقدامات کو ہدفِ تنقید بناتے ہوئے مالاکنڈ ڈویژن میں نفاذِ شریعت کے حالیہ اقدامات پر بھی نکتہ چینی کی ہے اور ان کا کہنا ہے کہ:

> ”پاکستان ایک مسلم ریاست ہے جو اعتدال پسند ملکوں کے جھرمٹ میں ہے، یہ جھرمٹ بحر اوقیانوس میں انڈونیشیا سے شروع ہو کر ملیشیا، بنگلہ دیش، ترکی، اردن اور مصر سے ہوتا ہوا بحر الکاہل کے ساحلوں پر مراکش میں جا کر ختم ہوتا ہے۔ مالاکنڈ میں ایک چھوٹی سی چنگاری جنگل کی آگ کی طرح درہ خنجراب سے ہوتی ہوئی چین کے صوبہ سنکیانگ تک پھیل سکتی ہے۔ طالبان برانڈ طرزِ زندگی کا رائیونڈ کے جنوب میں کوئی وجود نہیں۔ یہ تنگ نظری اور متعصبانہ نظام اس

دھرتی کے لیے قابلِ قبول نہیں ہے جہاں اسلام کا پیغام صوفیوں اور اولیاء کے ذریعے پھیلا ہے جن کے محبت اور بھائی چارے کا پیغام دیتے ہوئے نغمے حضرت فرید گنج شکرؒ کے مزار، ملتان کی خانقاہوں، اوچ شریف، شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ، سچل سرمستؒ اور لال شہباز قلندرؒ کے مزاروں پر گائے اور سنے جاتے ہیں۔ پاکستان ایک کثیر الاقساط معاشرہ ہے جو ایران اور افغانستان کی صورتحال سے مختلف ہے جہاں یکرنگی پائی جاتی ہے۔ ایک خاص متعصبانہ نظام قائم کرنے کی کوشش سے جنوبی پاکستان شمالی پاکستان سے جدا ہو جائے گا۔" (بحوالہ روزنامہ اوصاف اسلام آباد۔ ۷ فروری ۱۹۹۹ء)

محترمہ بے نظیر بھٹو اچھی طرح جانتی ہیں کہ مالاکنڈ میں شرعی قوانین کے نفاذ کا جو ڈھانچہ دیا گیا ہے وہ مروجہ نوآبادیاتی سسٹم کے نیٹ ورک کے اندر ہے اس لیے اس سے ملک میں طالبان طرز کے اسلامی انقلاب یا تبدیلی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ چھوٹے سے چھوٹے امکان کو بھی نظر انداز کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اور انہوں نے اس "چنگاری" کو جس طرح "شعلہ جوالہ" بنا کر پیش کیا ہے اس کی روشنی میں ملک کے حکمران طبقات کی سوچ کے ساتھ ساتھ ان کی آئندہ عزائم کی جھلک اور جنوبی پاکستان میں سرائیکی، سندھی، مہاجر اور بلوچی قومیتوں کے نام پر اٹھائے جانے والے طوفان کے اصل رخ کا بھی بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

مغربی فکر و فلسفہ کی نمائندگی

محترمہ بے نظیر بھٹو جس فکر و دانش کی نمائندگی کر رہی ہیں اس کے نزدیک

- سوسائٹی میں اسلامی احکام و قوانین کی پابندی کا اہتمام اور اس میں ریاستی اداروں کا کردار "تعصب" کہلاتا ہے،
- اور قرآن و سنت کے قواعد و ضوابط سے آزاد معاشرہ اور اسلام کی بجائے مغربی فلسفہ و نظام کی نمائندگی کرنے والے ریاستی ادارے "اعتدال پسند" کے میڈل کے مستحق سمجھے جاتے ہیں۔

اور یہ منطق نئی نہیں بلکہ گزشتہ تین سو برس سے مغرب ہمیں یہی سبق پڑھانے میں مصروف ہے، اس لیے ہمیں ان کی طرف سے مغرب کی ترجمانی پر کوئی تعجب نہیں ہے۔ البتہ اس ترجمانی اور نمائندگی میں صوفیائے کرامؒ اور اولیائے عظامؒ کو بلاوجہ گھسیٹنا اور انہیں "فری سوسائٹی" کے علمبردار کے طور پر پیش کرنا سراسر زیادتی ہے۔ خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ، شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ، لال شہباز قلندر اور دیگر صوفیائے کرام ہماری تاریخ کا قابلِ فخر سرمایہ ہیں مگر ان کا میدان غیر مسلم معاشرہ کو اسلام سے متعارف کرانے، غیر

مسلموں کو اسلام کی دعوت دینے، اور فرد کی بحیثیت فرد اصلاح کا میدان تھا۔ اس کے تقاضے وہی تھے جو انہوں نے کمال حکمت و تدبیر سے پورے کیے اور اس میدان میں آج بھی ان کی تعلیمات اور اسوہ ہم سب کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ مگر ایک اسلامی معاشرہ کی تشکیل، اسلامی ریاست کا قیام اور اسلامی احکام و قوانین کی عملداری کا میدان اس سے مختلف ہے، اس کے تقاضے اس سے بالکل الگ ہیں، اور اس کے قائدین بھی قطعی طور پر مختلف بزرگ ہیں۔ یہ میدان حضرت عمر بن الخطابؓ، عمر بن عبد العزیزؒ اور اورنگزیب عالمگیرؒ کا میدان ہے اور اس میں انہی کی راہنمائی کام آئے گی۔

محترمہ بے نظیر بھٹو سے گزارش ہے کہ وہ معاملات کو گڈمڈ نہ کریں اور فوج کے کمانڈر کو عدالت کا جج، اور پولیس کے افسر کو ڈپلومیٹ اور سفارتکار بنانے کی کوشش نہ کریں کہ یہ فطرت اور انصاف کے تقاضوں سے انحراف اور اسلام کے اجتماعی کردار سے بغاوت ہے۔

مذہب اور ریاست: محترمہ بے نظیر بھٹو کا موقف

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد — ۲۹ اپریل ۲۰۰۰ء)

محترمہ بے نظیر بھٹو نے گزشتہ دنوں آکسفورڈ یونیورسٹی میں ایک مباحثہ میں مسلمان مقرر کے طور پر خطاب کرتے ہوئے جو کچھ کہا ہے وہ اگرچہ ان کی طرف سے کوئی نئی بات نہیں اور اس سے قبل بھی وہ متعدّد مواقع پر ''نیو سوشل کنٹریکٹ'' کے عنوان سے یہ سب کچھ کہہ چکی ہیں، لیکن اسلام اور مغرب کے درمیان روز افزوں اور تیزی سے بڑھتی ہوئی کشمکش کے حالیہ تناظر میں اس کی اہمیت پہلے سے بڑھ گئی ہے۔ مباحثہ کا عنوان تھا کہ ''اس ایوان کی رائے میں اسلام اور مغرب کے درمیان بقائے باہم ممکن نہیں''۔ اس موضوع پر خطاب کرتے ہوئے محترمہ بے نظیر بھٹو نے جو بات بطور اصول کہی وہ یہ ہے کہ:

> ''مغرب نے چرچ اور ریاست، یا مذہب اور ریاست کے درمیان جنگ بہت پہلے جیت لی تھی لیکن عالمِ اسلام ابھی یہ جنگ نہیں جیت سکا اور یہی اس کی خامیوں، کمزوریوں اور ناکامیوں کا سب سے اہم سبب ہے۔''

گویا محترمہ بے نظیر بھٹو کے نزدیک عالمِ اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مسلم دنیا اپنی اجتماعی زندگی میں مذہب اور مسجد کے کردار سے دستبردار نہیں ہو سکی اس لیے وہ موجودہ مشکلات سے دوچار ہے، اور اگر مسلمان یورپ کی طرح مذہب کو اجتماعی زندگی سے بے دخل کر دیتے تو وہ بھی مغربی اقوام کی طرح ترقی یافتہ ہوتے، خوشحال ہوتے اور زندگی کے جدید وسائل اور اسلوب سے بہرہ ور ہوتے۔

اس پر یہ سوال اگرچہ اپنی جگہ موجود ہے کہ ترکی نے تو مذہب کو گزشتہ پون صدی سے اپنی اجتماعی زندگی سے بے دخل کر رکھا ہے اور اس بے دخلی کو طاقت کے زور پر قائم رکھنے کی بدستور کوشش جاری ہے، حتیٰ کہ ترکی کے موجودہ صدر جناب سلیمان ڈیمرل نے قرآن کریم کی دو سو تین آیات کو (معاذ اللہ) ناقابلِ عمل قرار دے دیا ہے لیکن اس کے باوجود ترکی نہ یورپی یونین میں شامل ہو سکا ہے اور نہ ہی جدید ترقی، وسائل اور خوشحالی میں اسے شرکت نصیب ہوئی ہے۔ لیکن اس سے قطع نظر محترمہ بے نظیر بھٹو کی اطلاع کے لیے ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ انہیں ان اسباب کا بھی جائزہ لینا چاہیے جن کی وجہ سے یورپ نے چرچ اور مذہب کو اجتماعی معاملات سے بے دخل کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے، جبکہ عالمِ اسلام میں اس قسم کی سوچ رکھنے والے عناصر اس مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے اور نہ ہی آئندہ کامیاب ہو سکتے ہیں۔

مغربی دنیا اور مسلم دنیا کی تاریخ کا موازنہ

ہمارے نزدیک تین بنیادی اسباب ہیں جن کی وجہ سے مسلم دنیا میں مذہب اور مسجد کا تعلق عام معاشرہ اور اجتماعی زندگی سے منقطع نہیں ہو سکا، اور ان اسباب کی موجودگی میں ایسا ہونا ممکن بھی نہیں ہے۔

اصلی آسمانی تعلیمات صرف اسلام کے پاس ہیں

پہلا سبب یہ ہے کہ یورپ کی مذہبی قیادت کے پاس انجیل کی تعلیمات اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ارشادات اصلی حالت میں موجود نہیں تھے جس کی وجہ سے چرچ مذہبی معاملات میں پہلے سے طے شدہ کسی اصول کا پابند نہیں رہا تھا، اور چرچ کی رائے کو ہر معاملہ میں حرفِ آخر کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی، اسی وجہ سے ٹکراؤ کی فضا پیدا ہوئی۔

اس کے برعکس مسلمانوں کے پاس قرآن کریم اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اصلی اور محفوظ حالت میں موجود ہیں جس کی وجہ سے مسجد اور مولوی کی حیثیت مطلق العنان اور خود مختار ادارے کی نہیں رہی اس لیے مسجد اور معاشرہ میں ٹکراؤ کا کوئی امکان نہیں ہے۔

مسلم دینی قیادت نے ہمیشہ عوامی جدوجہد کا ساتھ دیا ہے

دوسرا سبب یہ ہے کہ یورپی معاشرہ میں جاگیرداری اور بادشاہت کے مظالم کے خلاف جب عوامی بغاوت منظم ہوئی تو چرچ نے غریب آدمی کا ساتھ دینے کی بجائے بادشاہ اور جاگیردار کا ساتھ دیا اور ظالم گروہوں کے ظلم وجبر کو مذہبی تحفظ فراہم کرنے کی کوشش کی، جس کی وجہ سے کامیاب عوامی بغاوت میں بادشاہت اور جاگیرداری کے ساتھ چرچ کا بوریا بستر بھی لپیٹ دیا گیا۔

جبکہ مسلم معاشرہ میں مسجد اور مولوی کی یہ پوزیشن نہیں ہے، خود ہمارے ہاں جنوبی ایشیا میں مسجد نے آزادی کے مرکز اور مولوی نے جنگِ آزادی کے کارکن کا کردار ادا کیا، عوام کے ساتھ مل کر ان کی آزادی کے لیے بے پناہ قربانیاں پیش کیں، اور استحصالی طبقوں کا ساتھ دینے کی بجائے غریب عوام میں رہنے کو ترجیح دی۔ اس لیے عوام کے دلوں میں مسجد اور مولویوں کے خلاف وہ جذبات نہیں ہیں جو یورپ میں چرچ اور پادری کے خلاف پیدا ہو گئے تھے۔

مسلمانوں کے ہاں سائنس مذہبی مسلّمات کی مؤید ہے

تیسرا سبب یہ ہے کہ یورپ میں سائنسی دور آیا تو چرچ سائنسی انکشافات کے خلاف فریق بن گیا، سائنس دانوں کو خدائی کاموں میں دخل دینے والے ملحدین قرار دے کر ان کے خلاف فتوے دیے گئے،

اور بہت سے سائنس دانوں کو چرچ کے فتویٰ پر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ جس کی وجہ سے جدید ترقی، سائنسی علم اور نئے افکار کے ساتھ چرچ کی محاذ آرائی اور مخاصمت کا ماحول بن گیا اور چرچ کو شکست خوردہ فکر اور فلسفہ کا نمائندہ قرار دے کر مسترد کر دیا گیا۔

جبکہ مسلم علماء نے سائنس اور اس کے انکشافات کے خلاف محاذ آرائی نہیں کی بلکہ اس موضوع پر کتابیں لکھی گئیں اور مقالات پیش کیے گئے کہ سائنس کا مذہب سے کوئی ٹکراؤ نہیں ہے بلکہ وہ مذہبی مسلّمات کی مؤید ہے۔ حتیٰ کہ مسلم علماء نے

- خلا کی طرف انسان کے سفر کو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزۂ معراج کی تائید قرار دیا،
- ہوائی جہاز کو حضرت سلیمانؑ کے معجزاتی ہوائی تخت کی تائید بتایا جو ہوا میں اڑتا تھا اور جس پر بیٹھ کر حضرت سلیمانؑ مہینوں کا سفر گھنٹوں میں طے کر لیا کرتے تھے،
- اور ہوا کے ذریعے پیغام رسانی کو حضرت عمر بن الخطابؓ کی اس کرامت کی تائید سمجھا جس کے ذریعے انہوں نے مدینہ منورہ سے ہزاروں میل دور محاذِ جنگ پر حضرت ساریہؓ کو جنگ کی صورتحال سے آگاہ کیا تھا۔

اس لیے اسلام اور سائنس کے درمیان تصادم اور ٹکراؤ کی وہ فضا پیدا نہ ہو سکی جو یورپ میں چرچ اور سائنس دانوں کے درمیان صدیوں تک میدان کارزار بنی رہی۔

محترمہ بے نظیر بھٹو کی خام خیالی

محترمہ بے نظیر بھٹو کا یہ ارشاد بجا ہے کہ عالمِ اسلام میں مسجد اور ریاست، یا مذہب اور ریاست کے درمیان تعلق منقطع کرنے کی کوشش کامیاب نہیں ہو سکی لیکن انہیں یہ توقع ہے کہ آئندہ شاید ایسا ہو جائے اور اسی وجہ سے انہوں نے اپنے مذکورہ خطاب میں عالمِ اسلام کی موجودہ صورتحال کو ایک ارتقائی مرحلہ قرار دیا ہے۔ لیکن ہم بصد ادب محترمہ سے یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ وہ اس خام خیالی کو ذہن سے جتنی جلدی ممکن ہو نکال دیں کیونکہ ایسا ہونا ممکن نہیں، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اسلام ایک زندہ، طاقتور، توانا اور متحرک فلسفہ حیات ہے جس نے یونانی فلسفہ کو شکست فاش دینے کے بعد سائنس کو بھی اپنے مقابل صف آرائی کا موقع نہیں دیا، اور اب مغرب کے سیکولر فلسفہ سے اس کی آخری اور فیصلہ کن محاذ آرائی ہے جس میں اسلام کی فتح اور غلبہ کے امکانات صبح روشن کی طرح ہویدا ہوتے جا رہے ہیں۔ اس لیے شکست خوردہ مغربی فلسفہ کے دامن میں پناہ لینے کی بجائے اسلام کے سایۂ عاطفت میں آجائیں کہ اب اس کے سوا اور کوئی محفوظ پناہ گاہ نہیں ہے۔

سرحد اسمبلی کا شریعت بل، حکومتی کیمپ اور محترمہ بے نظیر بھٹو

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد ــــ ۱۱ جون ۲۰۰۳ء)

سرحد اسمبلی میں شریعت بل پیش کیے جانے کے ساتھ بلکہ اس سے بھی پہلے اس پر ردعمل کے اظہار کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور اس میں دن بدن شدت آ رہی ہے۔

۱. ایک طرف وہ عملی اقدامات ہیں جو سرحد حکومت کو ناکام بنانے اور اسے نت نئے مسائل میں الجھانے کے لیے کیے جا رہے ہیں۔ جن میں صوبائی حکومت کو اعتماد میں لیے بغیر چیف سیکرٹری اور آئی جی پولیس کے تبادلوں کا فیصلہ اور ضلعی ناظموں کی طرف سے استعفوں کا اعلان سرفہرست ہیں۔

۲. اور دوسری طرف وفاقی حکومت کے ذمہ دار حضرات کی طرف سے صوبہ سرحد میں متحدہ مجلسِ عمل کی حکومت کے اس اقدام کے خلاف بیان بازی کا سلسلہ جاری ہے۔

حتیٰ کہ پیپلز پارٹی کی سربراہ محترمہ بے نظیر بھٹو نے بھی اس معاملہ میں حکمرانوں کی ہاں میں ہاں ملانا ضروری سمجھا ہے، اور افغانستان پر امریکی حملہ کے بعد یہ دوسرا مسئلہ ہے جس پر حکمران کیمپ اور محترمہ بے نظیر بھٹو یک آواز اور ہم آہنگ دکھائی دے رہے ہیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کو افغانستان میں طالبان حکومت کے خاتمہ کے لیے مسلح امریکی مداخلت پر بھی اعتراض نہیں تھا بلکہ انہیں صرف یہ شکایت تھی کہ یہ کام ان کے ذریعے کیوں نہیں لیا جا رہا، اور افغانستان میں روسی جارحیت کے خلاف جہاد کے نتیجے میں ابھرنے والے اسلامی رجحانات کو ختم کرنے کے لیے امریکہ بہادر نے ان کی خدمات پر بھروسہ کرنے کی بجائے جنرل پرویز مشرف کی ٹیم کا انتخاب کیوں کیا ہے؟ اور اب بھی ان کا کہنا ہے کہ صوبہ سرحد کی اسمبلی میں شریعت بل کی منظوری جنرل پرویز مشرف کی پالیسیوں کا نتیجہ ہے ورنہ اگر وہ ان کی جگہ پاکستان میں برسراقتدار ہوتیں تو اس کی نوبت ہی نہ آتی۔

متحدہ مجلسِ عمل افغان طالبان کے نقشِ قدم پر؟

محترمہ بے نظیر بھٹو نے سرحد اسمبلی کے منظور کردہ شریعت بل کو ''طالبان بل'' قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ یہ طالبان طرز کے اسلام کو نافذ کرنے کی طرف پیشرفت ہے۔ حالانکہ وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتی ہیں

کہ طالبان کے طرزِ حکومت اور صوبہ سرحد میں ایم ایم اے کی حکومت کے طرزِ عمل میں زمین و آسمان کا فرق ہے:

- طالبان افغانستان میں جہادی کمانڈروں کی باہمی کشمکش اور خانہ جنگی کی وجہ سے بذریعہ قوت افغانستان کے اقتدار پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ جبکہ متحدہ مجلسِ عمل نے انتخابی عمل کے ذریعے عوامی ووٹ حاصل کر کے صوبائی حکومت حاصل کی ہے۔
- طالبان کا نظام امارت کا نظام تھا جس میں امیر کے شخصی احکامات ہی قانون کا درجہ رکھتے ہیں۔ جبکہ سرحد کی صوبائی حکومت نے منتخب اسمبلی میں بل پیش کر کے عوامی نمائندوں کے ذریعے اس کا نفاذ کیا ہے۔
- طالبان نے افغانستان کے سابقہ نظام کو مکمل طور پر اکھاڑ پھینکا تھا اور اس کی جگہ ایک نیا نظام نافذ کرنے کی طرف پیشرفت کی تھی۔ جبکہ سرحد حکومت نے ملک کے دستور اور مروجہ سسٹم کے دائرہ میں رہتے ہوئے اس کی طرف سے ملنے والے اختیارات اور حدود میں نفاذِ شریعت کے اقدامات کیے ہیں۔
- طالبان نے اسلام کے نفاذ اور اس کی تعبیر و تشریح کے لیے اپنے امیر اور ان کی مجلسِ مشاورت کو فائنل اتھارٹی قرار دیا تھا۔ جبکہ صوبہ سرحد کی حکومت نے اس سلسلہ میں دستورِ پاکستان کے تحت پہلے سے قائم اداروں اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت کے فیصلوں کو بنیاد بنایا ہے اور انہیں اتھارٹی تسلیم کیا ہے۔
- طالبان کا نظام ہمہ گیر اور قومی زندگی کے تمام شعبوں پر محیط تھا۔ جبکہ سرحد اسمبلی کا منظور کردہ شریعت بل صاف طور پر اعلان کر رہا ہے کہ اس کا تعلق صرف ان معاملات سے ہے جن میں دستور کے تحت صوبائی حکومت کو قانون سازی اور نفاذِ قانون کا حق حاصل ہے، اس کے علاوہ باقی معاملات سے اسے کوئی سروکار نہیں ہے۔

اس پس منظر میں اس بات پر تو بحث کی گنجائش موجود ہے کہ نفاذِ اسلام کے لیے طالبان کا طرزِ عمل زیادہ مفید اور مؤثر تھا یا متحدہ مجلسِ عمل کا طریق کار زیادہ فائدہ مند ہے، مگر سرحد اسمبلی کے منظور کردہ شریعت بل کو ''طالبان بل'' قرار دینا اور اس کے بارے میں یہ کہنا کہ اس سے طالبان طرز کے اسلام کے نفاذ کی راہ ہموار ہوگی، سراسر مغالطہ نوازی اور کج فہمی کی بات ہے جس کی محترمہ بےنظیر بھٹو جیسی ذہین و فطین خاتون اور تجربہ کار سیاستدان سے قطعی طور پر توقع نہیں کی جا سکتی۔ اور اس پر اس کے سوا اور کسی تبصرہ کی گنجائش نہیں ہے کہ محترمہ بےنظیر بھٹو ساری صورتحال کو اچھی طرح سمجھتے ہوئے بھی جان بوجھ کر سرحد اسمبلی

کے شریعت بل کو عالمی حالات کے تناظر میں انتہائی خوفناک شکل میں پیش کر کے اعلیٰ ترین قوتوں کو یقین دلانا چاہ رہی ہیں کہ اگر انہیں یعنی محترمہ بے نظیر بھٹو کو نظر انداز کیا جاتا رہے گا تو حالات اسی رخ پر آگے بڑھتے رہیں گے۔

''شریعت بل''کی منظوری پر وفاقی حکومت کا ردعمل

دوسری طرف حکمران کیمپ کی صورتحال یہ ہے کہ سرحد اسمبلی میں ''شریعت بل''کی منظوری پر اس کی بے چینی اور اضطراب قابلِ دید ہے:

صدر پرویز مشرف نے اس پر اپنے ردعمل کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ وفاقی حکومت کو چاہیے کہ وہ پاکستان کو ایک روشن خیال اسلامی ریاست بنانے کے تصور کو مجروح کرنے کی کوشش کو کامیاب نہ ہونے دے۔

وزیراعظم میر ظفر اللہ جمالی نے جہلم میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے یہ کہہ کر اپنے غصے کا اظہار کیا ہے کہ ''مسجدوں کے پیسے کھانے والے ملک کا کیا حشر کریں گے؟

حکمران مسلم لیگ کے سربراہ چوہدری شجاعت حسین نے فرمایا ہے کہ سرحد اسمبلی میں شریعت بل پیش کرنے کی سرے سے کوئی ضرورت نہیں تھی کیونکہ جب اسلامی نظریاتی کونسل قائم ہے اور وفاقی شرعی عدالت موجود ہے تو اس کے بعد نفاذِ اسلام کے لیے اور کوئی قدم اٹھانے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ حالانکہ یہ بات چوہدری صاحب موصوف کے علم میں یقیناً ہوگی کہ صوبہ سرحد کی اسمبلی نے اسی اسلامی نظریاتی کونسل کے فیصلوں اور سفارشات کو صوبائی اختیارات کی حدود میں نافذ کرنے کی بات کی ہے جس کا ذکر انہوں نے فرمایا ہے اور جسے وہ خود بھی نفاذِ اسلام کی علامت قرار دے رہے ہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابلِ توجہ ارشادات وفاقی وزیر اطلاعات جناب شیخ رشید احمد کے ہیں جنہوں نے متحدہ مجلسِ عمل کے خلاف گولہ باری کے محاذ کی کمان سنبھال رکھی ہے اور وہ بھی محترمہ بے نظیر بھٹو ہی کے لہجے میں سرحد کی صوبائی حکومت کے لتے لیے جا رہے ہیں۔ شیخ رشید احمد نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز اسلام کے نعرہ سے کیا تھا، شیخ القرآن حضرت مولانا غلام اللہ خانؒ کی سرپرستی میں سیاسی پیش قدمی کی راہ ہموار کی تھی، اور راجہ بازار راولپنڈی خصوصاً دارالعلوم تعلیم القرآن میں اسلام کے حق میں شیخ رشید احمد کے پرجوش خطابات کی گونج آج بھی پرانے سیاسی کارکنوں کے کانوں میں سنائی دے رہی ہے۔ مگر اب وہ وزارتِ اطلاعات کے منصب پر فائز ہونے کے بعد فرما رہے ہیں کہ اسلام کو اسلام آباد سے دور رکھو۔ ان کا ارشاد ہے کہ وہ اسلام کے لیے متحدہ مجلسِ عمل کے ساتھ ہیں لیکن متحدہ مجلسِ عمل اسلام آباد کے لیے

فٹ نہیں ہے اس لیے اسے اسلام آباد سے دور رہنا چاہیے۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ وہ اسلام اور اسلام آباد کے درمیان فاصلہ قائم رکھنا چاہتے ہیں، وہی فاصلہ جو محترمہ بے نظیر بھٹو کے نزدیک اسلام اور اسلام آباد کے درمیان قائم رہنا ضروری ہے، اور وہی فاصلہ جسے آج کے عالمی حکمرانوں نے نہ صرف اسلام اور اسلام آباد کے درمیان بلکہ دنیا کے ہر مسلمان ملک کے دارالحکومت اور اسلام کے درمیان ضروری قرار دے رکھا ہے۔ انہی عالمی حکمرانوں کی خوشنودی کی خاطر عالمِ اسلام کے اکثر و بیشتر حکمرانوں اور سیاستدانوں نے اسلام کے سیاسی اور حکومتی کردار کی نفی کو اپنا فریضہ قرار دیا ہے۔

شیخ رشید احمد نے فرمایا ہے کہ متحدہ مجلسِ عمل کو عالمی حالات اور خطہ کی صورتحال کی سنگینی کا احساس کرنا چاہیے۔ ان کی خدمت میں مؤدبانہ گزارش ہے کہ اگر ملک کے مقتدر طبقات اسلام کا راستہ اسی طرح روکتے رہیں گے تو حالات کی سنگینی میں کمی کی بجائے اضافہ ہوگا۔ یہ ملک اسلام کی خاطر بنا ہے، ملک کے عوام ایک سے زیادہ بار اسلامی نظام کے حق میں واضح فیصلہ دے چکے ہیں، متحدہ مجلسِ عمل نے گزشتہ الیکشن میں نفاذِ اسلام کے وعدہ پر ووٹ لیے ہیں اور عوامی مینڈیٹ کا احترام اس کی ذمہ داری ہے۔ دستورِ پاکستان نے ملک کے تمام قوانین کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کی گارنٹی دے رکھی ہے، اسلامی نظریاتی کونسل نے دستور کے تفویض کردہ اختیارات کے تحت مروجہ قوانین کو قرآن و سنت کے مطابق بنانے کے لیے سفارشات مرتب کی ہیں اور سرحد اسمبلی نے انہی سفارشات پر صوبائی اختیارات کے دائرہ میں عمل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

اگر شیخ رشید احمد اور ان کا کیمپ عالمی حالات اور خطہ کی صورتحال یا دوسرے الفاظ میں امریکہ اور بھارت کی خوشنودی کی خاطر مذکورہ بالا تمام حقائق کو کراس کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں تو یہ فیصلہ انہیں مبارک ہو۔ لیکن ایک بات انہیں ہر وقت یاد رکھنی چاہیے کہ پاکستان کے عوام کو اسلام سے دستبردار کرانے کی کوشش کبھی کامیاب نہیں ہوگی اور اگر جمہوری اور سیاسی عمل کے ذریعے نفاذِ اسلام کا راستہ روکنے کی غیر جمہوری کوششیں اسی طرح جاری رہیں تو اس کے ردعمل میں خطہ کی صورتحال جو رخ اختیار کرے گی اس کا سامنا کرنا شیخ محترم اور ان کے کیمپ کے بس کی بات نہیں ہوگی۔

حدود آرڈیننس کے خاتمہ کی مہم میں پیپلز پارٹی کی شرکت

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ ۔۔۔ افروری ۲۰۰۵ء)

......روزنامہ نوائے وقت لاہور میں ۵ جنوری ۲۰۰۵ء کو شائع ہونے والی ایک خبر کے مطابق پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرینز نے حدود آرڈیننس کو غیر اسلامی قرار دے کر اس کے بارے میں قرار داد سینٹ میں جمع کرا دی ہے۔ یہ قرار داد سینیٹر فرحت اللہ بابر نے سینٹ میں جمع کرائی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ حدود آرڈیننس امتیازی قانون ہے جس کا حدود اللہ سے کوئی تعلق نہیں اور یہ بنیادی انسانی حقوق اور مروجہ قوانین کے خلاف ہے۔

گویا حدود آرڈیننس کے خاتمہ کی اس مہم میں پیپلز پارٹی بھی موجودہ حکومت کی اس مہم میں شریک ہو گئی ہے بلکہ اس نے ایک قدم آگے بڑھ کر حدود کے قوانین کو اللہ تعالیٰ کے حدود کے منافی اور غیر اسلامی بھی قرار دے دیا ہے۔ یہ صورتحال ملک بھر کے دینی حلقوں، جماعتوں اور مراکز کی سنجیدہ توجہ کی مستحق ہے اور تمام مکاتبِ فکر کی دینی قیادت سے ہماری گزارش ہے کہ وہ اس مسئلہ کا نوٹس لے اور حدود قوانین کے بارے میں مختلف حلقوں کی طرف سے پھیلائے جانے والے شکوک و شبہات کے ازالہ اور نافذ شدہ چند شرعی قوانین کے تحفظ کے لیے مؤثر آواز اٹھانے کا اہتمام کرے۔

میاں نواز شریف اور بے نظیر بھٹو کا میثاقِ جمہوریت

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ — جون ۲۰۰۶ء)

میاں محمد نواز شریف اور محترمہ بے نظیر بھٹو صاحب کے درمیان طے پانے والا ''میثاق جمہوریت'' اس وقت نہ صرف قومی بلکہ بین الاقوامی حلقوں میں زیر بحث ہے اور اس کے مثبت اور منفی پہلوؤں پر مسلسل اظہارِ خیال کیا جا رہا ہے، توقعات کا اظہار بھی ہو رہا ہے اور خدشات کا تذکرہ بھی جاری ہے۔

اقتدار کی رسہ کشی

میاں نواز شریف اور محترمہ بے نظیر بھٹو دو دفعہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے وزیراعظم رہ چکے ہیں۔ ہر بار ایسا ہوا ہے کہ ایک نے دوسرے کو اقتدار سے محروم کرنے کے لیے ہر ممکن جتن کیا ہے اور اسٹیبلشمنٹ کے ہاتھوں، جس کا بڑا حصہ فوج ہے، اپنے حریف کی اقتدار سے محرومی پر خوشی منائی ہے۔ ہر بار ایسا ہوا ہے کہ اپوزیشن نے یہ طے کر لیا ہے کہ برسرِ اقتدار پارٹی کو اپنی مدت پوری کرنے کا موقع نہیں دینا اور ایسے حالات ہر حال میں پیدا کرنے ہیں کہ فوج مداخلت پر آمادہ ہو اور براہ راست یا بالواسطہ دخل دے کر اسے اقتدار سے محروم کر دے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو اور میاں محمد نواز شریف کے چاروں ادوار حکومت میں یہی کھیل کھیلا گیا ہے اور دونوں محترم لیڈر دو دو بار وزیراعظم بننے کے باوجود اپنی ٹرم پوری نہیں کر پائے۔ اس مکروہ کھیل کا نتیجہ آج نہ صرف پاکستانی قوم بلکہ عالمِ اسلام بھگت رہا ہے اور ہمارے پاس اپنے زخم چاٹنے کے سوا اور کوئی راستہ باقی نہیں رہ گیا۔

بانیٔ پاکستان قائدِ اعظمؒ کا عزم اور وعدہ

۱۹۴۷ء میں جب پاکستان وجود میں آیا تھا تو بانیٔ پاکستان قائد اعظم محمد علی جناحؒ نے اسلام اور جمہوریت کو پاکستان کی بنیاد قرار دیا تھا اور اس عزم اور وعدے کے ساتھ قیامِ پاکستان کی جدوجہد کو منزل مقصود تک پہنچایا تھا کہ

۱. پاکستان ایک جمہوری ریاست ہوگی جو اسلامی اصولوں کے دائرے میں کام کرے گی،

۲. اور نئے دور میں دنیا کو اسلامی اصولوں کے تحت ایک جمہوری ریاست اور فلاحی معاشرے کا عملی نمونہ دکھائے گی،

لیکن قیامِ پاکستان کے بعد سے اب تک اسلام اور جمہوریت دونوں کے ساتھ مسلسل گلی ڈنڈا کھیلا جا رہا ہے اور یہ دونوں سنہری اصول ہمارے مقتدر حلقوں کے درمیان اقتدار کی کشمکش میں سینڈوچ بنے ہوئے ہیں۔

سیاسی ڈھانچے پر مسٹر اور مولوی کا اصولی اتفاق

پاکستان بننے کے بعد یہ خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ مولوی لوگ جمہوریت پر صاد نہیں کریں گے اور مسٹر لوگوں کو مولوی کا پیش کردہ اسلام قبول نہیں ہو گا، اس لیے یہ نوزائیدہ ریاست پہلے مرحلے میں خدانخواستہ ناکامی کا شکار ہو سکتی ہے، لیکن بحمداللہ ایسا نہیں ہوا۔ مولوی لوگوں نے قرآن و سنت کی پاسداری کی شرط پر جمہوریت کو حکومت کی بنیاد تسلیم کر لیا اور مسٹر لوگوں نے جمہوریت کی پاسداری کی شرط پر اسلام کی بالادستی پر صاد کر دیا۔ جس کی دستاویزی شہادت قراردادِ مقاصد، تمام مکاتبِ فکر کے ۳۱ سرکردہ علمائے کرام کے ۲۲ متفقہ دستوری نکات، اور ۱۹۷۳ء کے دستور پر سب کے اتفاق کی صورت میں موجود ہے۔ جن کے ذریعے یہ بات طے پا گئی کہ حکومت عوام کے منتخب نمائندے کریں گے لیکن وہ مملکت کی پالیسیوں کے تعین میں قرآن و سنت کے احکام کے پابند ہوں گے۔ اس طرح جس بڑی کشمکش کا خطرہ تھا وہ ہمیشہ کے لیے ٹل گئی۔ لیکن اس کی جگہ پاور پالیٹکس نے لے لی اور اقتدار کے سرچشمہ پر کنٹرول کی ہوس نے اسلام اور جمہوریت دونوں کو گزشتہ نصف صدی سے اس ملک میں سوالیہ نشان بنا رکھا ہے۔

پاور پالیٹکس کی عملداری

ہم نے اسلام اور جمہوریت کے لیے اس سے قبل بھی بہت اعلانات کیے ہیں، بڑے وعدے کیے ہیں، قوم کو بڑے سبز باغ دکھائے ہیں، ہم نے قراردادِ مقاصد کی صورت میں قوم سے وعدہ کیا، ہر دستور میں اسلام اور جمہوریت کی پاسداری کا عہد کیا، ہر الیکشن کے موقع پر ہر سیاسی پارٹی نے اپنے اپنے انتخابی منشور میں ان دو سنہری اصولوں کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ اور سب سے بڑھ کر ۱۹۷۳ء کے دستور میں ہم نے اسلام، جمہوریت، وفاقیت، فلاحی ریاست اور رفاہی پاکستان کے تقاضوں کو خوبصورت انداز میں سمویا۔ ۱۹۷۳ء کے دستور میں کون سی بات نہیں ہے اور اسلام، جمہوریت، صوبائی خودمختاری اور فلاحی ریاست کے تقاضوں میں ہم آہنگی اور توازن کا کون سا پہلو تشنہ ہے؟ لیکن اس دستور کا ہم نے اپنے ہاتھوں جو حشر کیا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ یہ دستور ہمیں سیدھے راستے پر چلانے کی بجائے اپنے وجود اور بقا کے حوالے سے ہمارے رحم و کرم پر ہے۔ ہم ملک کے اقتدار پر مکمل کنٹرول کرنے کے بعد اس

دستور کو باقی رہنے دیتے ہیں تو سمجھا جاتا ہے کہ ہم نے اس غریب کی رحم کی اپیل منظور کر لی ہے اور اسے مزید کچھ دیر زندہ رہنے کا حق دے دیا ہے، خواہ اسے کئی سال ''کومے'' میں ہی گزارنا پڑیں۔

میثاقِ جمہوریت کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

ہمیں محترم میاں محمد نواز شریف اور محترمہ بے نظیر بھٹو کے ''میثاقِ جمہوریت'' کے مندرجات سے اختلاف نہیں ہے، ہم ان کے جذبے کی قدر کرتے ہیں کہ بدیر سہی لیکن انہیں جمہوریت کے اعلیٰ اصولوں کی پاسداری کا خیال تو آیا، انہیں احساس تو ہوا کہ جمہوریت صرف اقتدار کے حصول کے لیے سیڑھی یا اس کے تحفظ کے لیے بیساکھی کا نام نہیں ہے بلکہ اپنے کچھ اصول رکھتی ہے، اس کے کچھ قواعد وضوابط ہوتے ہیں، اس کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں، کچھ لوازمات ہوتے ہیں اور وہ آگے بڑھنے کے لیے سیاستدانوں سے ایک مخصوص ماحول اور کچھ قربانیوں کا تقاضا کرتی ہے۔ ہم دونوں لیڈروں کے اس ادراک اور احساس کا خیر مقدم کرتے ہیں اور اسے خوش آمدید کہتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ان اصولوں پر پہلے کبھی اختلاف رہا ہے؟ کیا ان دونوں پارٹیوں کے انتخابی منشوروں اور ۱۹۷۳ء کے دستور میں یہ باتیں شامل نہیں ہیں؟ اگر یہ سب کچھ پہلے سے موجود ہے اور ان کے ساتھ کمٹمنٹ کا پہلے بھی کئی بار اظہار ہو چکا ہے تو انہیں ایک نئے میثاق کی شکل دینے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟ اصل بات اصولوں، میثاقوں اور الفاظ کی نہیں بلکہ طرزِ عمل کی ہے، سیاسی مزاج کی ہے اور مستقبل کے عزائم کی ہے۔ اگر ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہے تو یہ میثاقِ جمہوریت ۱۹۷۳ء کے دستور سے زیادہ مقدس دستاویز نہیں ہے۔

آزمائش شرط ہے!

حالات کی ناہمواری انسان کو ایک رخ پر لے آتی ہے، وہ رخ کبھی مستقل نہیں ہوتا اور اصل صورتحال کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب حالات نارمل ہوتے ہیں اور پھر دیکھا جاتا ہے کہ ناہموار حالات میں ایک رخ اختیار کرنے والوں کا اصل رخ کیا ہے؟ مزاج اور جبلت کبھی نہیں تبدیل ہوتے۔

اس پر ایک کہاوت کا حوالہ دینا شاید نامناسب نہ ہو کہ کسی بادشاہ کا اپنے وزیر کے ساتھ اس بات پر اختلاف ہو گیا کہ فطرت تبدیل ہو سکتی ہے یا نہیں؟ بادشاہ کا موقف تھا کہ تربیت اور ماحول کے ساتھ فطرت تبدیل ہو جاتی ہے مگر وزیر اس سے متفق نہیں تھا اور وہ بضد تھا کہ فطرت کسی حالت میں نہیں بدلتی۔

بادشاہ نے وزیر کو قائل کرنے کے لیے چند بلیاں پالیں، انہیں اس طرح تربیت دلوائی کہ وہ بڑے ادب اور ترتیب کے ساتھ اگلے ہاتھوں میں جلتی ہوئی شمعیں اٹھائے دو پاؤں پر چلتی ہوئی دربار میں آتیں اور

بادشاہ کے گرد گھیرا ڈال کر باادب کھڑی ہو جاتیں۔ وزیر کو یہ منظر دکھا کر بادشاہ نے وزیر سے دریافت کیا کہ کیا خیال ہے، فطرت تبدیل ہوتی ہے یا نہیں؟ وزیر نے کہا کہ بادشاہ سلامت! اس کا جواب کل دوں گا۔ دوسرے روز وزیر چند چوہے آستین میں چھپا کر دربار میں لے آیا اور جونہی بلیاں اپنی ٹریننگ کے مطابق باادب چلتے ہوئے بادشاہ کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑی ہوئیں، وزیر نے چپکے سے چوہوں کو دربار میں کھلا چھوڑ دیا۔ بلیوں نے چوہوں کو دوڑتے دیکھا تو جلتی ہوئی شمعیں وہیں پھینکیں اور چوہوں کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ شمعیں قالینوں پر گرنے سے بہت سی جگہوں سے قالین جل گئے اور آگ کو پھیلنے سے بڑی مشکل سے روکا گیا۔ وزیر نے بادشاہ سے کہا کہ حضور! یہ بلیوں کی اصل فطرت ہے اور آپ نے دیکھ لیا ہے کہ فطرت کبھی تبدیل نہیں ہوتی۔

اس لیے اس میثاقِ جمہوریت کی اصلیت اس وقت سامنے آئے گی جب دونوں لیڈر ملک میں ہوں گے، اقتدار کا چوہا ان کے سامنے ہوگا اور دونوں کی یکساں دسترس میں ہوگا۔ تب پتہ چلے گا کہ میثاقِ جمہوریت کا کون سا جملہ ان میں سے کس کو یاد رہ گیا ہے اور کون سا لندن اور دوبئی کی فضاؤں میں تحلیل ہو چکا ہے۔ ویسے ہمارے خیال میں اتنے لمبے چوڑے میثاقِ جمہوریت کے تکلف کی ضرورت نہیں تھی، اگر دونوں لیڈر صرف اتنا اعلان کر دیتے کہ دونوں دستور کی پاسداری کریں گے، ایک دوسرے کے وجود کو تسلیم کریں گے، ایک دوسرے کا احترام کریں گے، ایک دوسرے کو جمہوری اصولوں کے مطابق آگے آنے کا موقع دیں گے اور اقتدار میں آنے کی صورت میں ٹرم پوری ہونے تک اس کے لیے مشکلات کھڑی نہیں کریں گے تو یہ چند جملے شاید بھاری بھرکم میثاقِ جمہوریت سے زیادہ وزنی ثابت ہوتے۔

محترمہ بے نظیر بھٹو کا المناک قتل

(روزنامہ پاکستان، لاہور ۔۔۔ ۲۹ دسمبر ۲۰۰۷ء)

محترمہ بے نظیر بھٹو گزشتہ روز ایک خودکش حملہ میں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھی ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ پورا ملک سوگ میں ڈوب گیا ہے، ہر باشعور شہری اشک بار ہے اور اس کا دل ایک عوامی راہنما کے المناک قتل کے غم کے ساتھ ساتھ ملک اور قومی سیاست کے مستقبل کے حوالہ سے انجانے خدشات سے دوچار ہو گیا ہے۔

میں کل نماز عصر کے بعد الشریعہ اکادمی سے گھر کی طرف آرہا تھا کہ ایک صاحب راستہ میں ساتھ ہو لیے اور چلتے چلتے سوال کیا کہ مولانا صاحب آپ بھی کہتے ہیں کہ لال مسجد والوں کا طریقہ ٹھیک نہیں تھا اور امریکہ بھی کہتا ہے کہ وہ دہشت گرد ہیں، دونوں میں فرق کیا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ ہم لال مسجد والوں کے مقصد سے نہیں بلکہ طریق کار سے اختلاف کر رہے ہیں اور اب بھی کہتے ہیں کہ ان کا طریق کار درست نہیں تھا۔ کہنے لگے کہ سوات اور وزیرستان والوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟ میں نے عرض کیا کہ ملک کے اندر کسی قومی یا دینی مقصد کے لیے ہتھیار اٹھانے کو میں جائز نہیں سمجھتا، وہ کہیں بھی ہو اور کسی عنوان سے بھی ہو ہمارے نزدیک جائز نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ جہاد کا وقت کب آئے گا؟ میں نے کہا کہ جہاد تو ہو رہا ہے، فلسطین میں، عراق میں اور افغانستان میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ جہاد ہی ہے اور اس جہاد کے لیے میدانِ جنگ میں خودکش حملہ کو بھی میں بے بس اور مجبور و مظلوم مجاہد کا آخری ہتھیار سمجھتا ہوں۔ لیکن ایک مسلمان ملک میں اپنی حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھانے اور بے گناہ اور غیر متعلق لوگوں کی جانیں لینے کو میں جہاد نہیں سمجھتا کیونکہ یہ جہاد نہیں ہے بلکہ "خروج" ہے جس کی اسلامی تعلیمات میں اجازت نہیں ہے۔ کہنے لگے کہ آپ لوگ آخر کب اس خروج کا فتویٰ دیں گے، یہ تو آپ کو دینا ہی ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ خروج کی شرائط ہیں اس کا ایک شرعی طریق کار ہے، اس کے بغیر اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی اور نہ ہی میں پاکستان میں ہتھیار اٹھانے اور خودکش حملوں کے ذریعہ لوگوں کی جانیں لینے کو جہاد کہنے کے لیے تیار ہوں۔

اس گفتگو کے بعد وہ صاحب اپنی راہ پر ہو لیے جبکہ میں نے نکاح کی ایک تقریب میں جانا تھا ادھر چلا گیا۔ وہاں سے فارغ ہو کر گھر واپس پہنچا، نماز مغرب ادا کی تو فون پر ایک دوست نے یہ اندوہناک خبر سنا دی کہ محترمہ بے نظیر بھٹو راولپنڈی کے لیاقت باغ میں جلسہ عام سے خطاب کے بعد واپس جاتے ہوئے

خودکش حملہ کا نشانہ بن کر جاں بحق ہو گئی ہیں۔ زبان پر بے ساختہ اناللہ وانا الیہ راجعون جاری ہوا اور دل کی دھڑکن میں اس سوچ و خیال کے ساتھ ہی اضافہ ہو گیا کہ اس کے اثرات کیا ہوں گے؟ رد عمل کیسا ہو گا؟ اور قومی سیاست کے مستقبل پر یہ المناک سانحہ کس حد تک اثرانداز ہو گا؟

محترمہ سے ایک ملاقات کا قصہ

میری محترمہ بے نظیر بھٹو سے ایک ہی بار ملاقات ہوئی ہے۔ میاں محمد نواز شریف کی وزارتِ عظمیٰ کا دوسرا دور تھا اور نوابزادہ نصر اللہ خان مرحوم حسبِ معمول حکومت کے خلاف اپوزیشن کو منظم اور متحرک کرنے کے لیے سرگرمِ عمل تھے۔ میں اپنے کسی کام سے اسلام آباد گیا تو معلوم ہوا کہ نوابزادہ صاحب اسلام آباد میں ہیں۔ میری ان سے پرانی نیاز مندی تھی، جس زمانے میں پاکستان قومی اتحاد کی سرگرمیاں عروج پر تھیں میں پنجاب قومی اتحاد کا سیکرٹری جنرل تھا۔ ہمارا صوبائی دفتر نکلسن روڈ پر نوابزادہ صاحب کے دفتر کے ساتھ ہوتا تھا اور اکثر ملاقاتیں رہتی تھیں۔ جبکہ ۱۹۹۰ء کے بعد سے میں نے انتخابی اور گروہی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر رکھی ہے۔ نوابزادہ صاحب سے ملنے کو جی چاہا تو میں اسلام آباد میں ان کی رہائش گاہ پر جا پہنچا، وہ زیادہ تر ارشد چودھری کے ہاں قیام پذیر ہوتے تھے۔ وہ مل کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ آپ بروقت آئے ہیں، میں نے کچھ دوستوں کو دوپہر کے کھانے پر بلا رکھا ہے آپ بھی شریک ہو جائیں، گپ شپ رہے گی۔ نوابزادہ صاحب کے کہنے پر میں وہاں رک گیا لیکن یہ سوال نہ کر سکا کہ اس محفل کی نوعیت کیسی ہے؟ بہرحال بہت سے دوست آئے، ان میں محترمہ بے نظیر بھٹو بھی تھیں۔ نوابزادہ صاحب نے ان سے میرا تعارف کرایا اور جونہی انہوں نے میرا نام لیا تو بے نظیر بھٹو فوراً بول اٹھیں "علماء کونسل والے؟" میں نے کہا جی ہاں علماء کونسل والا۔ اس پر وہ مسکرائیں اور حال احوال دریافت کرنے لگیں۔

متحدہ علماء کونسل کا پس منظر

یہ متحدہ علماء کونسل کا بھی ایک خاص پس منظر ہے۔ ۱۹۸۸ء میں جب وہ پہلی بار ملک کی وزیراعظم منتخب ہوئیں تو ملک کے دینی حلقوں نے "خاتون وزیراعظم" کے حوالہ سے ان کے خلاف اچھی خاصی تحریک کھڑی کر دی، میں بھی اس میں پیش پیش تھا۔ لاہور کے مولانا عبد الرؤف ملک کے ساتھ مل کر ہم نے مختلف مکاتبِ فکر کے علماء کرام پر مشتمل "متحدہ علماء کونسل" قائم کی تھی جس نے مختلف عنوانات پر جدوجہد کی اور خاص طور پر عورت کی حکمرانی کے خلاف اس کی تحریک خاصی معروف ہوئی۔ مولانا مفتی ظفر علی نعمانی، صاحبزادہ حاجی فضل کریم، مولانا معین الدین لکھوی، مولانا قاضی عبد اللطیف، مولانا عبد المالک خان، پروفیسر محمد یحییٰ اور اس سطح کے سرکردہ علماء کرام اس کا حصہ تھے۔ ہم نے محترمہ کی وزارتِ

عظمٰی کے خلاف راولپنڈی صدر کے جامعہ اسلامیہ میں ملک بھر کے علماء کرام کا ایک بھرپور اور نمائندہ کنونشن منعقد کیا تھا جس کی صدائے بازگشت کافی دنوں تک قومی سیاست میں سنی جاتی رہی۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کو وہ تحریک اور اس میں کام کرنے والے سرکردہ حضرات کے نام یاد تھے اور اسی لیے میرا نام سنتے ہی انہوں نے پوچھ لیا تھا کہ ''علماء کونسل والے؟''

محترمہ بے نظیر بھٹو کے ساتھ اس کے علاوہ مجھے کبھی ملنے کا موقع نہیں ملا مگر قومی سیاست میں اور قومی پریس میں ہمیشہ آمنا سامنا رہتا تھا۔ ہم ان کے مخالف کیمپ میں تھے، جمعیت علماء اسلام درخواستی گروپ اور متحدہ علماء کونسل میں سیاسی بیانات کا شعبہ زیادہ تر میرے پاس ہی رہتا تھا اور محترمہ بے نظیر بھٹو اکثر ہمارے بیانات کا ہدف ہوتی تھیں اس لیے سیاسی نوک جھونک اور چھیڑ چھاڑ میں خوب لطف آتا تھا۔۔

ایک دور میں محترمہ نصرت بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو دونوں پاکستان پیپلز پارٹی کی چیئرپرسن ہوتی تھیں اور محترمہ بے نظیر بھٹو کو پی پی پی کی ''کو چیئرپرسن'' (شریک چیئرپرسن) کہا جاتا تھا۔ کراچی کے نشتر پارک میں جمعیت علماء اسلام درخواستی گروپ کا جلسہ تھا، میں نے اس میں خطاب کے دوران پھبتی کسی کہ محترمہ بے نظیر بھٹو ایک مرد کی جگہ دو عورتوں کی گواہی کے شرعی قانون پر تحفظات کا اظہار کرتی ہیں لیکن انہوں نے اپنی پارٹی میں ایک چیئرپرسن کی جگہ دو چیئرپرسن کی صورت میں اس شرعی ضابطہ کو خود بھی عملاً تسلیم کیا ہوا ہے۔ اس کا قومی پریس میں کئی دن تک چرچا رہا اور پھر بالآخر شریک چیئرپرسن کی صورتحال پس منظر میں چلی گئی۔

ایک مسلّمہ قومی راہنما سے محرومی

اس سب کچھ کے باوجود ایک دانشور سیاستدان کے طور پر ہمیشہ میرے دل میں ان کا احترام رہا، وہ پڑھی لکھی خاتون تھیں، صاحب مطالعہ تھیں، حالات اور مسائل کا دانشورانہ تجزیہ کرتی تھیں، تاریخ اور تاریخ کے عمل پر ان کی نظر تھی اور اپنی سیاست کی راہیں طے کرتے وقت وہ اپنے علم و مطالعہ سے استفادہ بھی کرتی تھیں جس کا ہماری قومی سیاست میں رجحان بہت کم ہے۔ ان کی سیاست اور پالیسیوں سے مجھے بہت کم اتفاق رہا ہے اور اب بھی ان کے سیاسی رخ اور بیانات پر میں شدید تحفظات رکھتا تھا لیکن بہرحال وہ قوم کے ایک بڑے حلقے کی مسلّمہ لیڈر تھیں، ایک واضح سوچ، رائے اور پروگرام رکھتی تھیں جس کے لیے وہ پورے حوصلہ اور جرأت کے ساتھ سرگرمِ عمل تھیں۔ اور یہ ان کے حوصلہ اور جرأت کا ہی اظہار تھا کہ کراچی کے خوفناک حملہ میں بچ جانے کے بعد وہ آرام سے نہیں بیٹھیں بلکہ مشن اور پروگرام کو وہ اپنی سیاسی

جدوجہد کے لیے ضروری سمجھتی تھیں، اس کے لیے نکل کھڑی ہوئیں اور بالآخر اس پر اپنی جان بھی قربان کر دی۔

میں اس المناک سانحہ پر بھٹو خاندان، پاکستان پیپلز پارٹی اور ملک بھر کے سوگوار عوام کے غم میں شریک ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت مرحومہ کو جوارِ رحمت میں جگہ دیں اور جملہ پسماندگان کو صبرِ جمیل کے ساتھ اس صدمہ سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور — ۳۱ دسمبر ۲۰۰۷ء)

پاکستان پیپلز پارٹی کی چیئرپرسن محترمہ بے نظیر بھٹو گزشتہ روز راولپنڈی میں ایک خودکش حملہ کے نتیجہ میں جاں بحق ہو گئیں، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ ملک بھر میں ان کا سوگ منایا جا رہا ہے اور ہر طبقہ کے افراد ان کے اس المناک قتل کی مذمت کرتے ہوئے اس سوگ میں شریک ہیں۔ حکومت نے قومی سطح پر تین دن اور پاکستان پیپلز پارٹی نے چالیس روز تک سوگ منانے کا اعلان کیا ہے۔ اور اس دوران احتجاجی مظاہروں، تعزیتی اجتماعات اور قرآن خوانی کی محافل کے ساتھ ساتھ کاروباری زندگی تین روز سے تا دمِ تحریر معطل ہے، توڑ پھوڑ کا سلسلہ جاری ہے، ریلوے کے انجن، گاڑیاں، بسیں، کاریں اور کوچیں سینکڑوں کی تعداد میں جلائی جا چکی ہیں اور بینک، دفاتر اور پٹرول پمپ بھی اس توڑ پھوڑ کی زد میں ہیں۔

حملہ کا واقعہ اور اس کا تجزیہ

اب تک سامنے آنے والی میڈیا رپورٹوں کے مطابق محترمہ بے نظیر بھٹو نے زندگی کے آخری روز اسلام آباد میں افغانستان کے صدر حامد کرزئی سے ملاقات کی اور لیاقت باغ میں ایک انتخابی جلسہ سے خطاب کیا لیکن جب وہ جلسہ سے خطاب کے بعد اپنی رہائش گاہ پر جانے کے لیے لیاقت باغ سے باہر نکل رہی تھیں تو حملہ کا نشانہ بن گئیں۔ کارکن ان کو دیکھ کر جوش و خروش سے نعرے لگانے لگے جس پر انہوں نے کارکنوں کے نعروں کا جواب دینے کے لیے گاڑی کی چھت کھلوائی اور سر باہر نکال کر ہاتھ ہلاتے ہوئے کارکنوں کے لیے خوشی کا اظہار کرنے لگیں۔ اس دوران ان پر فائرنگ ہوئی اور ساتھ ہی ایک خوفناک دھماکہ ہوا اور وہ گاڑی کے اندر گر گئیں، انہیں فوری طور پر ہسپتال لے جایا گیا مگر وہ جانبر نہ ہو سکیں اور ڈاکٹروں نے کم و بیش نصف گھنٹہ تک ان کی جان بچانے کی کوشش کے بعد ان کی موت کا اعلان کر دیا۔

- وزارتِ داخلہ کے ترجمان اور ان کے ساتھ آخری وقت بے نظیر بھٹو کا علاج کرنے والے ڈاکٹر صاحبان کا کہنا ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کو کوئی گولی نہیں لگی بلکہ وہ گاڑی کی کھلنے والی چھت کا لیور

سر پر لگنے سے زخمی ہوئیں اور ان کے سر کا یہ شدید زخم ان کی موت کا باعث بن گیا۔ ڈاکٹر صاحبان کے بقول گاڑی کے لیور سے لگنے والے اس زخم کے علاوہ ان کے جسم پر اور کسی قسم کے زخم کا کوئی نشان نہیں تھا۔

- مگر پاکستان پیپلز پارٹی کی سیکرٹری اطلاعات شیری رحمان نے وزارتِ داخلہ کے اس موقف کو جھٹلاتے ہوئے کہا کہ وہ اس بات کی عینی شاہد ہیں کہ بےنظیر بھٹو کی گردن پر گولی لگی تھی اور وہ ان کے غسل میں بھی شریک تھیں اور اس موقع پر بھی انہوں نے گولی لگنے سے ہونے والے زخم سے خون رستے دیکھا ہے۔

ان دو متضاد بیانات سے محترمہ بےنظیر بھٹو کی موت کا سبب متعیّن کرنا بظاہر مشکل نظر آرہا ہے جبکہ بہت سے حلقوں کی طرف سے، جن میں امریکہ کی صدارتی امیدوار ہیلری کلنٹن بھی شامل ہیں، اس سانحہ کی عالمی سطح پر تحقیقات کا مطالبہ کیا ہے۔ جس کے جواب میں وزارتِ داخلہ کے ترجمان بریگیڈیر (ر) جاوید اقبال چیمہ نے کہا ہے کہ ایسا کرنا ممکن نہیں ہے البتہ اگر بےنظیر بھٹو کے ورثاء چاہیں تو ان کا شک دور کرنے کے لیے قبر کشائی کر کے محترمہ بےنظیر بھٹو کی لاش کا پوسٹ مارٹم کرایا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اخبار میں شائع ہونے والی یہ خبر بھی قابلِ توجہ ہے کہ ہسپتال سے محترمہ بےنظیر بھٹو کے علاج سے متعلقہ تمام ریکارڈ غائب کر دیا گیا ہے۔

ذمہ دار کون؟

دوسری طرف اس المناک سانحہ کی ذمہ داری کے حوالہ سے پہلے یہ خبر منظر عام پر آئی کہ ''القاعدہ'' نے اس کی ذمہ داری قبول کر لی ہے اور اس کے ترجمان نے کہا ہے کہ ہم نے ایسا کر کے امریکہ کا ایک قیمتی اثاثہ ختم کر دیا ہے لیکن اس کے بعد القاعدہ کی طرف سے اس کی تردید بھی آگئی ہے کہ اس کے کسی ترجمان نے یہ بیان نہیں دیا۔ اس کے ساتھ ہی وزارتِ داخلہ کے ترجمان کی طرف سے وزیرستان کے ایک کمانڈر بیت اللہ محسود کی ایک اور صاحب کے ساتھ ہونے والی ٹیلی فون گفتگو کی تفصیل جاری کی ہے جس میں انہوں نے ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہوئے اس کو بڑا کارنامہ قرار دیا ہے اور یہ کام کرنے والے کارکنوں کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

مرحومہ کے جانشین کا انتخاب

محترمہ بےنظیر بھٹو کو ان کے والد محترم ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے پہلو میں سپرد خاک کر دیا گیا ہے اور ان سطور کی اشاعت تک پیپلز پارٹی کی ہائی کمان ان کے جانشین کا انتخاب کر چکی ہوگی جس کے بارے میں

اخباری قیاس آرائیاں یہ ہیں کہ آصف زرداری کی طرف سے پارٹی کی قیادت سنبھالنے سے معذرت کے بعد محترمہ بےنظیر بھٹو کی بہن صنم بھٹو یا ان کے فرزند بلاول زرداری میں سے کسی کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔

ملک کی سیاسی صورتحال اور جنرل پرویز مشرف کا مستقبل

جبکہ بےنظیر بھٹو کے اس المناک قتل کے بعد ۸ جنوری کو عام انتخابات کا انعقاد بھی سوالیہ نشان بن کر رہ گیا ہے، ملک بھر میں تمام انتخابی سرگرمیاں معطل ہیں، پاکستان مسلم لیگ (ن) کے سربراہ میاں محمد نواز شریف نے انتخابات کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا ہے، ان سطور کی اشاعت تک پیپلز پارٹی کی ہائی کمان بھی الیکشن کے بارے میں کوئی فیصلہ کر چکی ہوگی اور غالب گمان یہ ہے کہ اگر پی پی پی نے بھی انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا تو ۸ جنوری کو عام انتخابات کا انعقاد ممکن نہیں رہے گا۔ مگر اس صورت میں آئینی الجھنوں سے نمٹنے کے لیے دوبارہ ایمرجنسی کا نفاذ بھی امکان سے باہر نہیں ہے۔

اس کے ساتھ ہی بین الاقوامی حلقوں میں صدر مشرف کی حکومت کے مستقبل کا سوال بھی زیر بحث ہے اور کہا جا رہا ہے کہ جنرل (ر) پرویز مشرف پر اقتدار سے الگ ہونے کے لیے دباؤ بڑھتا جا رہا ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہ اب اس دباؤ کا مزید مقابلہ نہ کر سکیں۔ شاید یہی صورتحال سامنے رکھ کر میاں نواز شریف نے الیکشن کے التوا اور ایک ایسی قومی حکومت کے قیام کا مطالبہ کیا ہے جس میں پرویز مشرف کا کوئی کردار نہ ہو۔

بہرحال اس پس منظر میں آج اور کل کا دن بہت زیادہ اہم ہیں اور ملک کی قومی سیاست کے ساتھ ساتھ قومی وحدت اور ملکی سالمیت کے مستقبل کا سوال بھی آج اور کل کے فیصلوں سے منسلک ہے، اس لیے کہ پنجاب میں سندھ سے تعلق رکھنے والے وزیراعظم کے قتل کی بات بعض حلقوں کی طرف سے بار بار کہی جا رہی ہے اور یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش ہو رہی ہے کہ اس قتل کی ذمہ داری پنجاب پر عائد ہوتی ہے۔ یہ بات اس تناظر میں اور بھی زیادہ خطرناک ہو جاتی ہے کہ بلوچستان میں پہلے ہی پنجاب کے خلاف سیاسی جذبات کو ابھارنے کا عمل جاری ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جنوبی ایشیا کے سیاسی نقشے میں بعض عالمی طاقتوں کی مزعومہ تبدیلی اور پاکستان کو اس کے موجودہ مقام و حیثیت سے محروم کرنے کے پلان کو دھیرے دھیرے آگے بڑھایا جا رہا ہے۔ اور نواب اکبر بگٹی مرحوم کے قتل کے بعد محترمہ بےنظیر بھٹو کے قتل سے پیدا شدہ صورتحال کو بھی اس کے لیے بڑی مہارت کے ساتھ استعمال کرنے کی منصوبہ بندی کر لی گئی ہے۔

یہ صورتحال ملک کے دینی اور سیاسی حلقوں کے لیے حقیقی معنوں میں لمحۂ فکریہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ملک جس اندرونی خلفشار کا شکار ہے اور وطنِ عزیز کے خلاف عالمی سطح پر سازشوں کے جو تانے بانے بنے جا رہے ہیں اس سے ملک و قوم کو بحفاظت باہر نکالنے اور اس کے مستقبل کے بارے میں پیدا کیے جانے والے شکوک و سوالات کو عملاً رد کر کے ایک بہتر مستقبل کی طرف قوم کی راہنمائی کرنے کی ذمہ داری بہر حال سیاسی اور دینی زعماء پر عائد ہوتی ہے۔ اس کے لیے انہیں گروہی، علاقائی، طبقاتی اور جماعتی مفادات سے بالاتر ہو کر سر جوڑنا ہوگا اور ایک ایسی قومی مفاہمت کا راستہ اختیار کرنا ہوگا جو "اسلامی جمہوریہ پاکستان" کے مقصدِ قیام اور اس کے دستور و آئین کی بالادستی کی طرف پیشرفت کے ساتھ ساتھ ملکی سالمیت اور قومی وحدت کے لیے بھی ضمانت بن سکے۔ یہ اس وقت ہماری قومی سطح کی دینی و سیاسی قیادت کا کڑا امتحان ہے اور اگر ہمارے راہنما اس وقت بھی اپنے محدود دائروں کے خول سے نہ نکل سکے اور قومی مفاہمت کے ساتھ ملک و قوم کی قیادت کی ذمہ داری نہ نبھا سکے تو تاریخ انہیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔

ان گزارشات کے ساتھ ہم محترمہ بے نظیر بھٹو کے المناک قتل کی شدید مذمت کرتے ہوئے ان کے خاندان اور پارٹی کے ساتھ ان کے غم میں شرکت کا اظہار کرتے ہیں۔ اور دعاگو ہیں کہ اللہ رب العزت مرحومہ کو جوارِ رحمت میں جگہ دیں اور وطنِ عزیز کی سالمیت اور مظلوم پاکستانی قوم کی وحدت کی حفاظت فرمائیں، آمین یا الہ العالمین۔

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ جنوری ۲۰۰۸ء)

پاکستان پیپلز پارٹی کی چیئرپرسن محترمہ بے نظیر بھٹو ۲۷ دسمبر کو راولپنڈی کے لیاقت باغ میں انتخابی جلسہ عام سے خطاب کرنے کے بعد واپس جاتے ہوئے ایک خودکش حملے میں جاں بحق ہو گئی ہیں، انا للہ و انا الیہ راجعون۔

نوسالہ جلاوطنی کے بعد وطن واپسی

محترمہ بے نظیر بھٹو گزشتہ ماہ جب اپنی نوسالہ خود ساختہ جلاوطنی ختم کر کے وطن واپس آئی تھیں تو کراچی میں استقبالیہ جلوس کے دوران بھی ایک خودکش حملہ کا نشانہ بنی تھیں جس میں بہت سے دیگر افراد جاں بحق ہوئے تھے مگر وہ خود محفوظ رہی تھیں، لیکن راولپنڈی کے جلسہ کے بعد ان پر ہونے والا حملہ اس قدر اچانک اور منظم تھا کہ وہ اس سے بچ نہ سکیں اور حملہ آور اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو پاکستان کے سابق وزیر اعظم اور عوامی لیڈر جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی بیٹی اور جانشین تھیں۔ وہ خود بھی دو مرتبہ وزیر اعظم کے منصب پر فائز رہی ہیں اور ان کی پارٹی آئندہ انتخابات کے بعد انہیں ایک بار پھر وزیر

اعظم بنانے کا عزم ظاہر کر رہی تھی، مگر اسی مہم کے دوران ان کی زندگی کا تسلسل ایک خودکش حملہ آور کے ہاتھوں منقطع ہوگیا اور وہ خالق حقیقی سے جاملیں۔

اظہارِ اختلاف کا ناجائز اور مذموم طریقہ

پاکستان پیپلز پارٹی اور محترمہ بے نظیر بھٹو کے سیاسی افکار و نظریات، اہداف و مقاصد اور پالیسیوں سے ملک کے بہت سے لوگوں کو اختلاف تھا اور خود ہمیں بھی ان کی بہت سی باتوں سے اختلاف رہا ہے، لیکن اختلاف کے اظہار کا یہ طریقہ کہ مخالف کی جان لے لی جائے اور اس طرح کے خودکش حملوں کے ذریعے اسے راستے سے ہٹا دیا جائے، نہ صرف یہ کہ سراسر ناجائز اور ظلم ہے بلکہ ملک و قوم کے لیے بھی انتہائی خطرناک اور تباہ کن ہے اور اس کی جس قدر مذمت کی جائے کم ہے۔

ہم نے ان صفحات میں بار بار عرض کیا ہے کہ حکومت یا کسی بھی جماعت، طبقہ اور شخصیت کے ساتھ اختلاف کا ہر شہری کو حق حاصل ہے اور اس اختلاف کے اظہار اور اس کے لیے رائے عامہ کو ہموار کرنے کا بھی ہر شخص کو حق ہے، لیکن اس کے لیے طاقت کا استعمال، ہتھیار اٹھانا اور کسی کی جان کے درپے ہونا کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے، نہ اسلامی تعلیمات اس کی اجازت دیتی ہیں اور نہ ہی آج کا معروف جمہوری کلچر اس کا متحمل اور روادار ہے۔ اس لیے ہم محترمہ بے نظیر بھٹو کا اس المناک قتل کی شدید مذمت کرتے ہوئے ان کے خاندان، پارٹی اور دیگر متعلقین کے ساتھ اس غم میں شریک ہیں اور دعاگو ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جوارِ رحمت میں جگہ دیں اور تمام متعلقین و پسماندگان کو صبر و حوصلہ کے ساتھ اس صدمہ سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

ہمیں امید ہے کہ حکومت اس سلسلے میں اپنی قانونی و اخلاقی ذمہ داریوں کو پورا کرے گی اور اس قسم کی افسوسناک وارداتوں کی روک تھام کے لیے مؤثر اقدامات کرے گی۔

خلافتِ عثمانیہ اور بے نظیر بھٹو مرحومہ

(روزنامہ اسلام، لاہور — ۳ جولائی ۲۰۱۴ء)

......خلافتِ اسلامیہ امتِ مسلمہ کی دینی ضرورت تو ہے ہی، ملی اور عالمی ضرورت بھی ہے کہ عالمِ اسلام اس وقت زخموں سے چور ہے مگر عالمی سطح پر اس کی آواز اٹھانے والا کوئی نہیں ہے۔ جبکہ امتِ مسلمہ پوری کی پوری عالمی استعماری قوتوں کے رحم و کرم پر ہے۔

اس کا اندازہ ایک بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو مرحومہ نے ایک انٹرویو میں عالمِ اسلام کی بے بسی کا ذکر کرتے ہوئے انتہائی حسرت کے ساتھ یہ جملہ کہا تھا کہ

"اب تو کوئی اوتومان ایمپائر (خلافتِ عثمانیہ) بھی نہیں ہے جو عالمی سطح پر مسلمانوں کی آواز اٹھا سکے"۔

اس ساری صورتحال میں سُنی ممالک کی حکومتوں کا رویہ کیا ہے اور سُنی دنیا کی علمی و فکری قیادتیں کس مزے سے خوابِ خرگوش میں مست ہیں، اس پر یہ شعر ان کی نذر کرنے کو جی چاہ رہا ہے کہ

گلۂ جفائے وفا نما جو حرم کو اہلِ حرم سے ہے
کسی بتکدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری

آصف علی زرداری اور بلاول بھٹو
کا دورِ سیاست

بلاول بھٹو زرداری سے دو گزارشات

(روزنامہ پاکستان، لاہور — یکم جنوری ۲۰۰۸ء)

محترمہ بے نظیر بھٹو مرحومہ کی جگہ ان کے بیٹے بلاول بھٹو زرداری کو پاکستان پیپلز پارٹی کا چیئرمین منتخب کر لیا گیا ہے اور ان کی تعلیم و تربیت مکمل کرنے تک ان کے والد جناب آصف علی زرداری کو شریک چیئرمین کی ذمہ داری سونپ دی گئی ہے، جبکہ مخدوم امین فہیم کو آئندہ وزارتِ عظمیٰ کے لیے پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدوار کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح پاکستان پیپلز پارٹی کی آئندہ قیادت کے خدوخال کچھ نہ کچھ واضح ہو گئے ہیں۔

خاندانی سیاست کی روایت

چیئرمین شپ کو بھٹو خاندان میں رکھنا ہمارے خطے کی روایتی مجبوری ہے کہ مغرب کی طرز کی خالص جمہوریت ہمیں راس نہیں آتی اور خاندانی عقیدت اور وابستگی کا پیوند لگائے بغیر ہمارے ہاں جمہوری اور عوامی قیادت بھی مکمل نہیں ہو پاتی۔ بھارت میں نہرو خاندان اور پاکستان میں بھٹو خاندان اس کی واضح مثالیں ہیں اور ان کے علاوہ مولانا فضل الرحمٰن، اسفندیار ولی اور محمود اچکزئی جیسے سیاسی قائدین کے نام بھی اس روایت کے تسلسل کے لیے پیش کیے جا سکتے ہیں۔

جناب اعتزاز احسن کا استحقاق

ہمیں پی پی کے داخلی معاملات میں دخل اندازی کا حق نہیں ہے لیکن ایک ہمدرد کے طور پر رائے تو دے سکتے ہیں اور اس حوالے سے ہماری رائے یہ ہے کہ اگر پیپلز پارٹی کی قیادت کے خانے میں بھٹو خاندان، زرداری خاندان اور مخدوم امین فہیم کے ساتھ جناب اعتزاز احسن کو بھی فٹ کر لیا جاتا یا اب کر لیا جائے تو خود پی پی کے لیے بھی یہ بہت فائدے کی بات ہے۔ بھٹو خاندان کے ساتھ بے لچک اور مسلسل سیاسی وفاداری کے ساتھ ساتھ ملک میں دستور کی بالادستی کے لیے جدوجہد نے جناب اعتزاز احسن کے لیے یہ استحقاق پیدا کر دیا ہے کہ انہیں ان کی سیاسی جماعت کی قیادت میں باقاعدہ شریک کیا جائے اور اس معروضی حقیقت کو یکسر نظر انداز کر دینا کسی طرح بھی قرینِ انصاف نہیں ہو گا۔

نام میں ''بھٹو'' کا اضافہ

بلاول زرداری نے اپنے نام کے ساتھ بھٹو کا لفظ بھی شامل کر لیا ہے اور اب وہ بلاول بھٹو زرداری کہلائیں گے تاکہ بھٹو خاندان کے ساتھ ان کی نسبت واضح رہے، اس پر بعض حلقوں میں چہ میگوئیاں کی جا رہی ہیں لیکن ہمارے خیال میں یہ کوئی زیادہ تعجب کی بات نہیں ہے:

- حضرت امام جعفر صادقؒ سے کسی نے سوال کیا تھا کہ جناب آپ کا خاندان اولادِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کہلاتا ہے حالانکہ آپ حضرات کا جناب نبی اکرمؐ کے ساتھ رشتے کا تعلق حضرت فاطمہؓ کے حوالے سے ہے، جبکہ نسب تو باپ کے ذریعے قائم ہوتا ہے۔ حضرت امام جعفر صادقؒ نے جواب میں فرمایا کہ قرآن کریم نے حضرت عیسیٰؑ کو اولادِ آدم میں شمار کیا ہے حالانکہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے اور ان کا آدم کے ساتھ رشتہ ان کی والدہ محترمہ حضرت مریم علیہا السلام کے ذریعے ہے، اس لیے حضرت عیسیٰؑ اگر حضرت آدمؑ کی اولاد میں شمار ہوتے ہیں تو ہمیں بھی اولادِ رسولؐ کہلانے کا حق ہے۔
- علاوہ ازیں ایک حدیث مبارکہ میں بھی یہ آتا ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر ایک خاندان کے لوگوں سے بات کرنے کے لیے انہیں ایک جگہ جمع ہونے کو کہا اور فرمایا کہ صرف اس خاندان کے افراد جمع ہوں۔ اور جب وہ ایک چاردیواری میں جمع ہو گئے تو نبی اکرمؐ نے پھر دریافت کیا کہ کیا خاندان سے باہر سے کوئی شخص تو تمہارے اندر موجود نہیں ہے؟ لوگوں نے کہا کہ اور تو کوئی نہیں ہے لیکن ہمارا ایک بھانجا یہاں بیٹھا ہے جو دوسرے خاندان سے ہے۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ کوئی بات نہیں "ابن اخت القوم منہم"، بھانجا بھی قوم میں شمار ہوتا ہے۔

اس لیے اگر بلاول زرداری نے اپنی نسبت بھٹو خاندان کے ساتھ مستقل طور پر رکھنے کا فیصلہ کیا ہے تو اس میں ہمارے خیال میں کوئی زیادہ اشکال کی بات نہیں ہے۔

بلاول بھٹو زرداری ۱۹ سالہ نوجوان ہیں، انہوں نے ابھی اپنی تعلیم مکمل کرنی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی سیاسی تربیت بھی ہونی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دوران پارٹی کے معاملات آصف زرداری ہی چلائیں گے اور اپنی تعلیم اور تربیت مکمل کرنے کے بعد بلاول اپنی نئی ذمہ داری سنبھالیں گے۔

بلاول زرداری بھٹو سے گزارشات

ہم اس موقع پر عزیز بلاول کے ساتھ ان والدہ محترمہ کی المناک شہادت پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے ان کا جانشین منتخب ہونے پر انہیں مبارکباد پیش کرتے ہیں اور ان کے ایک بہی خواہ اور ہمدرد ہونے کے ناتے سے ایک دو گزارشات ان سے کرنا چاہتے ہیں۔

بھٹو مرحوم کے ورثہ کو پیشِ نظر رکھیں

ایک بات تو یہ ہے کہ وہ اس بات کو ہمیشہ سامنے رکھیں کہ بھٹو خاندان کے موجودہ سیاسی قد کاٹھ، ملکی و بین الاقوامی تعارف اور لیڈرشپ کی ساکھ کا اصل سرچشمہ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی شخصیت ہے۔ ان کی فکر و جدوجہد کے باعث پاکستانی عوام کی ایک بڑی تعداد کی ہمدردیاں اور سیاسی وابستگی اس خاندان کو حاصل ہے۔ بھٹو مرحوم کی جن خدمات اور کارناموں نے انہیں قومی اور بین الاقوامی سیاست میں یہ مقام بخشا ہے، ملک کے عام لوگوں کی نظر میں اس کا نقشہ کچھ اس طرح ہے:

- انہوں نے مزدور، کسان اور دیگر محنت کش اور معاشرے کے پسے ہوئے طبقات کو حقوق کا شعور دیا اور ان میں اس کے لیے آواز بلند کرنے کا حوصلہ پیدا کیا۔
- مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد باقی ماندہ پاکستان کو سنبھالا اور ملک کے تمام سیاسی حلقوں کو اعتماد میں لے کر ملک کی تعمیرِ نو کا آغاز کیا۔
- ملک کے تمام دینی، سیاسی اور علاقائی گروہوں کو اعتماد کی لڑی میں پرو کر ۱۹۷۳ء کا متفقہ دستور دیا جو آج بھی ملک کے تمام طبقوں کا متفقہ دستور ہے اور قومی وحدت کا ضامن ہے۔
- اسلام، جمہوریت یا سوشلزم کی بحث میں ملک کی اعلیٰ ترین قیادت کو اپنے ساتھ رکھتے ہوئے ۱۹۷۳ء کے دستور میں سمو کر ہمیشہ کے لیے یہ بات طے کرا دی کہ ملک میں جمہوری حکومت ہوگی جو قرآن و سنت کے دائرے میں رہتے ہوئے ملک کا نظام چلائے گی۔
- ایک صدی سے لاینحل چلا آنے والا قادیانی مسئلہ حل کیا اور اس سلسلے میں پوری دنیا کی امتِ مسلمہ کا اعتماد حاصل کیا۔
- لاہور میں اسلامی سربراہ کانفرنس منعقد کر کے عالمِ اسلام کی وحدت کے ساتھ پاکستان کی عملی وابستگی کا اظہار کیا۔
- پاکستان کو ایٹمی طاقت بنانے کی طرف پیشرفت کی اور اسے پاکستان اور عالمِ اسلام کی ضرورت قرار دیتے ہوئے عالمی استعمار کی دھمکیوں کے باوجود ایٹمی پروگرام کو پروان چڑھایا۔

یہ وہ کارنامے ہیں جن کا پاکستان پیپلز پارٹی کے باشعور رہنماؤں اور کارکنوں کی زبان پر اکثر تذکرہ رہتا ہے اور جن کا بھٹو مرحوم کے سیاسی مخالفین بھی اعتراف کرتے ہیں۔ اس لیے ہمارے خیال میں یہی بھٹو مرحوم کا ورثہ ہے جس کی حفاظت کی ذمہ داری اب بلاول بھٹو زرداری پر آپڑی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ پی پی پی کی نئی قیادت اور اپنا وقت آنے پر بلاول بھٹو زرداری اپنی سیاسی پالیسیاں اور ترجیحات طے کرتے وقت ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے ان کارناموں اور اصولوں کو ضرور پیشِ نظر رکھیں گے جن کی وجہ سے بھٹو خاندان اور پی پی پی کو قومی اور بین الاقوامی سیاست میں یہ مقام حاصل ہوا ہے۔

اسلامی معلومات اسلامی ذرائع سے حاصل کریں

عزیز بلاول سے دوسری گزارش ہم یہ کرنا چاہتے ہیں کہ ان کے دبئی پہنچنے کے بعد ان سے منسوب ایک انٹرویو ان کی ویب سائٹ کے حوالے سے سامنے آیا ہے جس میں انہوں نے دوسری بہت سی باتوں کے علاوہ یہ بھی کہا ہے کہ وہ لبرل مسلمان ہیں اور اس انتہا پسندی کے خلاف ہیں جو اسلام کے بارے میں سترہویں صدی کی مخصوص تشریح کو زبردستی مسلمانوں پر مسلط کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے نماز اور ڈاڑھی کے لیے زبردستی کرنے کا بھی ذکر کیا ہے۔ اگرچہ ان کے والد محترم جناب آصف علی زرداری نے ایک بیان میں اس ویب سائٹ کے بارے میں تحفظات کا اظہار کر دیا ہے اور کہا ہے کہ ایسی ویب سائٹ بلاول بھٹو زرداری کا امیج خراب کرنے کے لیے سازش کے تحت بنائی گئی ہے۔

لیکن اس کے باوجود چونکہ بلاول بھٹو زرداری کی عمر اور ان کے معاشرتی طبقے اور کلاس کے نوجوانوں کا عام ذہن اسی نوعیت کا ہے اور اس میں ان کا کوئی قصور بھی نہیں ہے کہ انہیں اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے جو ذرائع میسر ہیں، ان سے اسلام کے بارے میں اسی طرح کا تاثر قائم ہو سکتا ہے۔ چنانچہ مسلم دنیا کے جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کی اکثریت، جن کی اسلامی تعلیمات کے اصل سورسز تک رسائی نہیں ہے، اسلام کے بارے میں یہی ذہن رکھتی ہے، اس لیے اگر بلاول بھٹو زرداری نے یہ بات کہہ دی ہے تو اس میں ہمارے لیے کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اور اس میں ہم ایسے نوجوانوں کو قصوروار نہیں سمجھتے کہ اصل قصور ہمارے تعلیمی نظام اور تربیتی سسٹم کا ہے جو اسلامی تعلیمات کے اصل سورسز تک آج کے نوجوانوں کی رسائی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ یہ قصور عصری تعلیمی نظام کا بھی ہے کہ اس کا ایجنڈا ہی یہی ہے، اور دینی نظام تعلیم کا بھی ہے کہ وہ آج کے ان جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں تک اپروچ کی سرے سے ضرورت ہی محسوس نہیں کر رہا جنہوں نے کل اس قوم کی باگ ڈور سنبھالنی ہے۔

اس لیے ہم عزیز بلاول سے اس مسئلہ کی تمام جزئیات و تفصیلات کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ وہ سترہویں صدی یا اکیسویں صدی کے چکر میں نہ پڑیں اور اسلام کو اس کے اصل سورسز (۱) قرآن کریم، (۲) سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم (۳) اسوۂ خلفائے راشدینؓ کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں، انہیں ان شاء اللہ کسی الجھن کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ برطانوی ولی عہد شہزادہ چارلس نے کچھ عرصہ قبل اپنے دانشوروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ اسلام کو اسٹڈی کریں اور یہ بات بھول جائیں کہ اسلام کے بارے میں ان کے بڑوں نے کیا کہا ہے اور موجودہ مسلمان کیسے نظر آرہے ہیں، بلکہ اسلام کو اس کے اصل سورسز سے اسٹڈی کریں۔ شہزادہ چارلس کا یہی مشورہ عزیز بلاول کے سامنے پیش کرتے ہوئے ہم ان کی بہتر زندگی اور کامیابی کے لیے دعاگو ہیں۔

پاکستان پیپلز پارٹی کا قادیانی امیدوار

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ ــ جنوری ۲۰۰۸ء)

روزنامہ پاکستان لاہور ۲۰ دسمبر ۲۰۰۷ء کی ایک خبر کے مطابق عالمی مجلس تحفظِ ختمِ نبوت کے امیر حضرت مولانا خواجہ خان محمد دامت برکاتہم، نائب امیر حضرت مولانا سید نفیس الحسینی دامت برکاتہم اور ناظمِ اعلیٰ حضرت مولانا عزیز الرحمٰن جالندھری نے تونسہ شریف ضلع ڈیرہ غازی خان کی صوبائی سیٹ پر ایک قادیانی امام بخش قیصرانی کو پاکستان پیپلز پارٹی کی طرف سے ٹکٹ دیے جانے کی مذمت کی ہے اور ایک مشترکہ بیان میں کہا ہے کہ پی پی کی مرکزی اور صوبائی قیادت تک احتجاج پہنچائے جانے کے باوجود مسلم سیٹ پر قادیانی کا ٹکٹ بحال رکھنا بدترین نوعیت کی قادیانیت نوازی ہے۔

قادیانیوں کو پاکستان پیپلز پارٹی کے بانی چیئرمین جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے دور حکومت میں پارلیمنٹ کے متفقہ فیصلے کے مطابق غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا تھا۔ جسے پاکستان پیپلز پارٹی کے قائدین اپنے کارناموں میں اکثر بیان کرتے رہتے ہیں اور بھٹو مرحوم کی زندگی کے آخری ایام کے حوالہ سے جیل میں ان کے فوجی نگران کرنل رفیع الدین نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ بھٹو مرحوم بھی آخری دنوں میں قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے بارے میں اپنے اس فیصلے کا اس انداز سے ذکر کیا کرتے تھے کہ یہ آخرت میں ان کی نجات کا باعث ہوگا۔

قادیانیوں نے تب سے اس دستوری فیصلے کو تسلیم کرنے سے انکار کر رکھا ہے وہ پوری دنیا کی امتِ مسلمہ کے اجماعی فتویٰ اور پاکستان کی منتخب پارلیمنٹ کے متفقہ دستوری فیصلے کو مسترد کرتے ہوئے خود کو زبردستی مسلمانوں میں شمار کرانے کی ضد پر اب تک قائم ہیں۔ اور اسی وجہ سے انتخابی فہرستوں کی تیاری کا بائیکاٹ کرتے ہوئے ان میں غیر مسلم ووٹروں کے طور پر وہ اپنے نام درج نہیں کراتے اور نہ ہی اقلیتی نشست کے طور پر اسمبلی میں نمائندگی قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔ مگر ایک طرف یہ بائیکاٹ جاری رکھتے ہوئے دوسری طرف وہ مسلمانوں کی نشستوں پر مسلمان نمائندے کے طور پر منتخب ہونے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں۔

اس پس منظر میں پاکستان پیپلز پارٹی کا ایک قادیانی کو ٹکٹ دینا مسلمانوں کے دینی جذبات کو مجروح کرنے کے ساتھ ساتھ دستور پاکستان کے تقاضوں سے انحراف اور خود بھٹو مرحوم کی پالیسی اور جذبات کی

نفی کے مترادف ہے جس پر عالمی مجلسِ تحفظِ ختمِ نبوت کے بزرگ راہنماؤں کا یہ احتجاج بر وقت اور درست ہے اور پاکستان پیپلز پارٹی کی قیادت کو اس پر سنجیدگی کے ساتھ توجہ دینی چاہیے۔

نومنتخب وزیراعظم جناب یوسف رضا گیلانی کو درپیش چیلنجز

(روزنامہ پاکستان، لاہور — ۲۸ مارچ ۲۰۰۸ء)

جناب یوسف رضا گیلانی کے وزیراعظم منتخب ہونے کے ساتھ ہی ۱۸ فروری ۲۰۰۸ء کو ہونے والے عام انتخابات کے نتیجے میں تبدیلیوں کا عملی آغاز ہو گیا ہے اور عدلیہ کے قابلِ صد احترام جج صاحبان کی رہائی کے حکم کے ساتھ یوسف رضا گیلانی نے اپنی حکومتی ترجیحات کا اظہار کر دیا ہے۔ اس سے عام شہریوں کو اطمینان حاصل ہوا ہے کہ ملک کے عوام نے ۱۸ فروری کو اپنے ووٹ کے ذریعے رائے عامہ کے اجتماعی رجحانات کی جو جھلک دنیا کے سامنے پیش کی ہے اسے احترام کا عملی درجہ حاصل ہونے والا ہے۔

یوسف رضا گیلانی پاکستان پیپلز پارٹی کے اہم رہنماؤں میں سے ہیں۔ انہوں نے کئی برس جیل میں گزار کر پارٹی کے ساتھ اپنی وفاداری کا ثبوت دیا ہے اور پارٹی کی قیادت اور پالیسیوں کے ساتھ ان کی وفاداری کا تسلسل انہیں اس مقام تک لے آیا ہے کہ وہ نہ صرف پاکستان پیپلز پارٹی کے نمائندے کے طور پر اسلامی جمہوریہ پاکستان کے وزیراعظم کے منصب پر فائز ہوئے ہیں بلکہ پاکستان مسلم لیگ (ن)، نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیۃ علماء اسلام کے ساتھ ساتھ متحدہ قومی موومنٹ نے بھی انہیں اپنے اعتماد سے نوازا ہے۔ اس طرح وہ ملک کی بہت سی سیاسی پارٹیوں کے مشترکہ نمائندہ کے طور پر اپنے اقتدار کا دور شروع کر رہے ہیں۔ یہ ان پر قوم کی غالب اکثریت کے اعتماد کا مظہر ہے اور ایک عظیم چیلنج کی حیثیت بھی رکھتا ہے کہ وہ متنوع مزاجوں اور مختلف خیالات کی حامل جماعتوں اور طبقات کو کس طرح ساتھ لے کر چلتے ہیں۔

وزارتِ عظمیٰ کے لیے ان کے انتخاب میں تنوع کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ان کا تعلق ملتان سے ہے اور گزشتہ ۸ برس کے دوران یہ اعزاز ملتان کے حصے میں آیا ہے کہ اس کے دو سپوتوں مخدوم جاوید ہاشمی اور یوسف رضا گیلانی نے آمریت کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کی بجائے عزیمت اور قربانی کا راستہ اختیار کیا اور ڈکٹیٹر شپ کو پورے حوصلہ کے ساتھ یہ پیغام دیا کہ آج کی سیاست میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو مفادات اور اقتدار کی سیاست کرنے کی بجائے اصولوں اور اقدار کے ساتھ وابستہ رہنے اور ان کے لیے قربانیاں دینے کی ہمت رکھتے ہیں۔ اس لیے گزشتہ ۸ سالہ سیاسی دور کی تاریخ میں جب ایثار اور قربانی کے باب میں آصف علی زرداری، محترمہ بے نظیر بھٹو مرحومہ، میاں نواز شریف، میاں شہباز شریف اور ان کے دیگر رفقاء کے نام نمایاں ہوں گے تو جاوید ہاشمی اور یوسف رضا گیلانی کے نام بھی مستقل عنوانات کے ساتھ تاریخ کا حصہ بنیں گے۔

ملک کے نئے وزیراعظم کا ملتان کے ساتھ تعلق قومی سیاست میں اس نئی سیاسی کروٹ کا بھی عنوان ہے کہ پنجاب کی سرائیکی پٹی میں ایک عرصہ سے جس محرومی کا سیاسی حلقوں میں تذکرہ چل رہا ہے اور اس محرومی کے احساس کو کیش کرانے کی مختلف اطراف سے مسلسل کوششیں بھی ہو رہی ہیں، اس کے مداوے کی صورت سامنے آئی ہے۔ اور یوسف رضا گیلانی کا ایک امتحان یہ بھی ہے کہ وہ سرائیکی پٹی کے اس مبینہ احساسِ محرومی کی تلافی کے لیے اپنے دورِ اقتدار میں کیا کچھ کر پاتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر وہ اپنی پالیسیوں اور طرزِ عمل سے اس احساس کو کم کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو ان کی یہ کامیابی سیاسی اور نظریاتی دونوں حوالوں سے قومی وحدت کے استحکام کا باعث بنے گی اور انہیں بے شمار اصحابِ دل کی دعائیں ملیں گی۔

قومی سیاست میں اس پیشرفت پر جناب یوسف رضا گیلانی کے ساتھ ساتھ انہیں آگے لانے والی سیاسی پارٹیوں پاکستان پیپلز پارٹی، پاکستان مسلم لیگ (ن)، نیشنل عوامی پارٹی، جمعیۃ علماء اسلام پاکستان اور ایم کیو ایم کے قائدین بھی مبارکباد کے مستحق ہیں اور ہم اس اجتماعی سیاسی قیادت بالخصوص جناب یوسف رضا گیلانی کو دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتے ہوئے ان کی کامیابی کے لیے دعاگو ہیں اور اس مرحلہ میں ملک کے ایک عام شہری کے طور پر یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ بلاشبہ ان کے سامنے مسائل کا انبار ہے اور مشکلات کا اس قدر ہجوم ہے کہ

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

کا منظر دکھائی دے رہا ہے، اس لیے انہیں ان مسائل و مشکلات کے حل کی ترجیحات طے کرنے میں یقیناً وقت لگے گا اور ان ترجیحات کے مطابق عملی پیشرفت میں بھی دیدہ اور نادیدہ رکاوٹوں سے قدم قدم پر سابقہ پیش آئے گا۔ مگر ملک کا ایک عام شہری اس فضا میں ان سے کیا توقعات رکھتا ہے اس کا ایک ہلکا سا نقشہ ہمارے خیال میں اس طرح سامنے آتا ہے کہ:

- اس وقت سب سے بڑا مسئلہ ہمارے خیال میں یہ ہے کہ ہم قومی سطح پر اپنے فیصلے خود کرنے کا اختیار بحال کریں۔ بدقسمتی سے اس وقت عام تاثر یہی ہے اور یہ خلافِ واقعہ نہیں ہے کہ ہم اپنے فیصلے اور پالیسیاں طے کرنے میں خود مختار نہیں ہیں۔ اس لیے جب تک ہم اپنا یہ اختیار اور اس پر عوام کا اعتماد بحال نہیں کر لیتے قومی سطح پر جتنی اچھی پالیسیاں بھی بنا لی جائیں اور جتنے عمدہ فیصلے بھی کر لیے جائیں ان کے گرد شکوک و شبہات کی دھند ڈیرہ ڈالے رہے گی۔ اور شکوک و شبہات کی فضا میں اچھے سے اچھا فیصلہ بھی مطلوبہ نتائج اور مقاصد حاصل نہیں کر سکتا۔

- دستور کی بالادستی اور قانون کی حکمرانی کا اہتمام ہمارا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ یہ بھی بدقسمتی کی بات ہے کہ دستور اور قانون کو ہمارے ہاں اب تک حکمرانی کا درجہ حاصل نہیں ہو سکا۔ بلکہ یہ دو ہتھیار ہیں جنہیں ہم ہر سطح پر اپنے مقاصد اور مفادات کے حصول کے لیے استعمال کر لیتے ہیں اور اس طرز عمل میں ہمارا کوئی طبقہ اور فرد (اکا دکا مستثنیات کے ساتھ) پیچھے نہیں ہے، جس کا جب اور جہاں داؤ لگتا ہے وہ اس سے گریز نہیں کرتا۔ اس لیے جب تک ہم دستور اور قانون کو ہتھیار اور حربے کے دائرے سے نکال کر حکمرانی کا درجہ نہیں دیتے اور اس کے لیے خلوصِ دل کے ساتھ قربانی دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے ہم قوم کے بہتر مستقبل بلکہ اسے مزید خلفشار، انارکی اور بربادی سے بچانے کے لیے بھی کچھ نہیں کر پائیں گے۔
- کرپشن ہمارا تیسرا بڑا مسئلہ ہے۔ بدعنوانی ہمارے قومی مزاج اور کلچر کی علامت بن کر رہ گئی ہے۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بار پوچھا گیا کہ قیامت کب آئے گی؟ آپؐ نے فرمایا کہ جب امانت ضائع ہونے لگے تو قیامت کا انتظار کرنا۔ سوال کرنے والے نے دریافت کیا کہ امانت کے ضائع ہونے کی عملی صورت کیا ہوگی؟ آقائے نامدارؐ نے فرمایا کہ جب معاملات نااہل لوگوں کے سپرد کر دیے جائیں گے تو پھر قیامت ہی کا انتظار کرنا۔ یہ کرپشن کی سب سے بدترین شکل ہے کہ مناصب اور عہدے اہلیت، دیانت اور صلاحیت کے بجائے دیگر ترجیحات کے حوالے سے سپرد کر دیے جائیں۔ اور اس کرپشن کے نتیجے میں ہم صرف قیامت کا انتظار ہی نہیں کر رہے بلکہ دنیا کی قیامت بھگت بھی رہے ہیں لیکن اپنے کسی سطح کے معاملات کے لیے اہلیت، دیانت، صلاحیت اور قومی ضرورت کو بنیاد بنانے کے لیے تیار نہیں۔ کرپشن کا دوسرا بڑا پہلو قومی خزانے کی لوٹ مار ہے جو ہر سطح اور ہر انداز سے جاری ہے۔ جس کو بھی موقع ملتا ہے وہ اس لوٹ مار میں اپنا حصہ وصول کرنے میں حجاب محسوس نہیں کرتا اور قومی ترقی اور عوام کی فلاح و بہبود کا ہر منصوبہ اس دلدل میں پھنس کر اپنے وجود تک سے محروم ہو جاتا ہے۔

ہمیں اس وقت قوم کو درپیش عملی مسائل کے اہمیت سے انکار نہیں ہے۔ عدلیہ کی بحالی کا مسئلہ ہو، ملک کے مختلف حصوں میں اپنے ہی بھائیوں کے خلاف فوجی آپریشن روکنے کی بات ہو، مہنگائی کے عفریت کو قابو میں لانے کا معاملہ ہو، دہشت گردی کو کنٹرول کرنے کا قضیہ ہو، جامعہ حفصہ کی بحالی کا مطالبہ ہو، خفیہ اداروں کے ذریعے غائب کیے جانے والے شہریوں کا المیہ ہو، صوبائی خود مختاری کی بحالی کا سوال ہو، یا غریب اور نظر انداز طبقات کی زندگی اجیرن ہو جانے کا مسئلہ ہو۔ یہ اور ان جیسے دیگر مسائل ہمارے عملی مسائل ہیں اور ان میں سے کوئی بھی اپنی اہمیت اور سنگینی میں کم نہیں ہے۔ لیکن ہم نے جن تین اصولی

مسئلوں کا ذکر کیا ہے ان سب عملی مسائل نے انہی کی کوکھ سے جنم لیا ہے اور جب تک ہم (۱) قومی خود مختاری کے تحفظ (۲) دستور و قانون کی بالادستی (۳) اور کرپشن کے خاتمہ کے لیے قومی سطح پر کوئی واضح لائحہ عمل اور دوٹوک پالیسی طے نہیں کرتے اور حکومتی اقدامات کے دائرہ سے باہر نکل کر ان کے لیے قومی مہم کی کوئی مشترکہ صورت اختیار نہیں کر لیتے یہ مسائل جنم لیتے رہتے ہیں گے اور ان کی سنگینی میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ گندگی کے ڈھیر موجود رہیں گے تو جراثیم پیدا ہوتے رہیں گے اور بیماریاں پھیلتی رہیں گی۔ ہم نے اب تک گندگی کے ڈھیروں کو باقی رکھتے ہوئے ان پر وقتاً فوقتاً چونا یا دیگر جراثیم کش ادویات چھڑکتے رہنے کی جو روش اپنا رکھی ہے یہ مسائل کا حل نہیں ہے۔ اور اگر نئی حکومت نے بھی یہی روش اختیار کی تو نرم سے نرم الفاظ میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس میں اور اس کی پیش رو حکومت میں ایک عام شہری کی نظر میں کوئی فرق نہیں رہے گا اور یہ ملک و قوم کی ایک اور بڑی بدقسمتی ہوگی۔

جناب یوسف رضا گیلانی اور ان کی ٹیم کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے ہم ان سے گزارش کر رہے ہیں کہ قومی اہداف کی طرف حوصلہ سے آگے بڑھیے، قوم تو ساتھ ہی ہے، یقیناً اللہ تعالیٰ کی رحمتیں بھی آپ پر سایہ فگن ہوں گی۔

بھٹومرحوم کے وارث اور قادیانیت

(روزنامہ نوائے وقت، لاہور — ۲۶مئی ۲۰۰۸ء)

...... ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی یادداشتوں میں ملتا ہے کہ ان کی شہادت سے قبل ان کے آخری ایام میں اڈیالہ جیل میں ان کی نگرانی کرنے والے فوجی آفیسر کرنل رفیع الدین نے ''بھٹو کے آخری ۳۲۳ دن'' کے نام سے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ بھٹو صاحب مرحوم اس دوران ان سے ملاقاتوں میں قادیانیوں کا اور ان کے بارے میں اپنے فیصلے کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے اسی موقع پر جہاں ایک بات یہ کہی کہ قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے اور عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ کے بارے میں ان کا فیصلہ آخرت میں ان کی نجات اور گناہوں کی معافی کا باعث ہوگا، وہاں یہ بھی کہا کہ رفیع! یہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ہم ان کو پاکستان میں وہ مرتبہ دیں جو یہودیوں کو امریکہ میں حاصل ہے، یعنی ہماری ہر پالیسی ان کی مرضی کے مطابق چلے۔

بھٹو صاحب مرحوم انتہائی ذہین اور معاملہ فہم سیاسی راہنما تھے اور میرا ذاتی تاثر یہ ہے کہ اگر بعض ذاتی قسم کی کمزوریاں ان پر غالب نہ آجاتیں تو قائداعظمؒ کے بعد ان سے زیادہ باشعور، حوصلہ مند، قومی حمیت سے بہرہ ور لیڈر قوم کو میسر نہیں آیا۔ انہوں نے قادیانیوں کی نفسیات کا بالکل صحیح اندازہ کر لیا تھا کہ یہ مختصر سا مذہبی گروہ پاکستان میں وہی حیثیت حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے جو امریکہ میں یہودیوں نے حاصل کر رکھی ہے کہ تمام فیصلہ ساز اداروں میں یہودی کلیدی مقام پر فائز ہیں اور امریکہ کی تمام پالیسیوں کا کنٹرول ان کے ہاتھ میں ہے۔ قادیانیوں نے پاکستان بننے کے بعد مسلسل اس بات کی کوشش کی ہے کہ قومی اداروں اور پالیسی ساز حلقوں میں وہ کلیدی پوزیشن حاصل کر لیں اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ''کی پوسٹوں'' پر ہر طرف قادیانی ہی قادیانی نظر آتے تھے۔ اس کے لیے سابق وزیر خارجہ چودھری ظفر اللہ خان اور یحییٰ خان کے دست راست ایم ایم احمد (میاں مظفر احمد) نے اپنے اپنے دور میں انتہائی متحرک کردار ادا کیا۔ لیکن ملک کے دینی اور سیاسی حلقوں کی بیداری اور بروقت اقدامات کے باعث قادیانیوں کو اس میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔

قادیانی گروہ اس ناکامی پر مسلسل پیچ و تاب کھا رہا ہے اور اسے ایک بار پھر کامیابی میں بدلنے کے لیے متحرک ہے۔ ان کے استعماری سرپرست مسلسل ان کی پشت پناہی کر رہے ہیں اور قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے دستوری فیصلے کو غیر مؤثر بنانے کے لیے بین الاقوامی طاقتیں پاکستان کی نئی حکومت پر دباؤ

بڑھاتی چلی جا رہی ہیں۔ لیکن کیا ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے پیروکاروں کی حکومت میں ایسا ہو سکے گا؟ میرا
خیال ہے کہ اس محاذ پر ایک اور ناکامی قادیانیوں کا بڑی شدت کے ساتھ انتظار کر رہی ہے۔

سزائے موت کے قیدیوں کو عمر قید کی سزا

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ ــ جولائی ۲۰۰۸ء)

وزیر اعظم سید یوسف رضا گیلانی نے محترمہ بے نظیر بھٹو کی سالگرہ کے موقع پر ملک بھر میں سزائے موت کے قیدیوں کی سزاؤں کو عمر قید میں تبدیل کر دیا ہے اور بتایا ہے کہ اس سلسلہ میں سمری صدر کو بھجوائی جا رہی ہے۔ اس پر ایک طرف سزائے موت کے قیدیوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے لیکن دوسری طرف ان مقتولین کے گھروں میں ایک بار پھر صفِ ماتم بچھ گئی ہے جن کے جگر گوشوں کے قتل کے جرم میں سزائے موت کے ان قیدیوں کو ملک کی باقاعدہ عدالتوں نے سزائے موت سنائی تھی۔

روزنامہ پاکستان لاہور میں ۲۲ جون ۲۰۰۸ء کو شائع ہونے والی خبر کے مطابق ملک کی بہت سی دینی جماعتوں کے راہنماؤں نے وزیر اعظم کے اس اعلان کو ہدفِ تنقید بنایا ہے اور کہا ہے کہ اسلامی قانون کی رو سے قاتل کی سزائے موت کو معاف کرنا صرف مقتولین کے ورثاء کا حق ہے اور انہیں اعتماد میں لیے بغیر سزائے موت کو ختم کرنا مقتولین کے ورثاء کی حق تلفی ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ دینی راہنماؤں کا یہ ردعمل نا روا نہیں ہے بلکہ قرآن و سنت کے قانون کے مطابق ہے۔ حکومت اگر ان قیدیوں کی سزائے موت کو ختم کرنا چاہتی ہے تو اسے اس سلسلہ میں مقتولین کے وارثوں کو اعتماد میں لینا چاہیے اور انہیں اس فیصلے میں شریک کرنا چاہیے، ورنہ یہ فیصلہ اسلامی اصولوں کی خلاف ورزی کے ساتھ ساتھ مقتولین کے ورثاء کی حق تلفی بھی ہو گا۔

عدلیہ کی بحالی اور وکلاء کی تحریک اور مرحومہ بے نظیر بھٹو

(روزنامہ پاکستان، لاہور — ۳۰ جولائی ۲۰۰۸ء)

......جناب اعتزاز احسن کے ساتھ اس سفر کے دوران میں ان سے خود تو کوئی بات نہ کر سکا البتہ جیو ٹی وی کے ساتھ ہونے والی گفتگو قریب سے سنی، اس لیے کہ میں بالکل پیچھے والی نشست پر بیٹھا تھا۔ ان سے کیے جانے والے سوالات میں سب سے اہم سوال معزول ججوں کی بحالی کے سلسلے میں پاکستان پیپلز پارٹی کی جماعتی پالیسی کے حوالے سے تھا۔ انہوں نے کہا کہ ان کی پارٹی کی پالیسی بالکل واضح ہے کہ

- چیف جسٹس سمیت تمام ججوں کو ۳ نومبر سے پہلے کی پوزیشن پر فی الفور بحال ہونا چاہیے اس لیے کہ مرحومہ بے نظیر بھٹو نے واضح طور پر اعلان کیا تھا کہ وہ جناب افتخار محمد چودھری کو بدستور سپریم کورٹ کا چیف جسٹس سمجھتی ہیں اور ان کی پارٹی برسراقتدار آکر ان کی رہائش گاہ پر چیف جسٹس کا جھنڈا دوبارہ لہرائے گی۔
- اس طرح ججوں کی بحالی کے بارے میں بھوربن ڈیکلیریشن پر پاکستان پیپلز پارٹی کے شریک چیئرپرسن جناب آصف علی زرداری نے خود دستخط کیے ہیں،

اس لیے پارٹی پالیسی یہی ہے کہ تمام ججوں کو بحال ہونا چاہیے اور سابقہ پوزیشن پر بحال ہونا چاہیے۔ جناب اعتزاز احسن نے تحریک کے بارے میں بھرپور اعتماد کا اظہار کیا اور کہا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ یہ تحریک آگے بڑھے گی، کامیاب ہوگی اور اس کے نتیجے میں عدلیہ کی خود مختاری قائم ہوگی اور چیف جسٹس سمیت تمام جج صاحبان بحال ہوں گے۔......

''وار آن ٹیرر'' کی قانونی و اخلاقی پوزیشن کا سوال

(روزنامہ اسلام، لاہور — ۲۶ ستمبر ۲۰۰۸ء)

میں امریکہ سے حسبِ معمول رمضان المبارک کے دوسرے جمعۃ المبارک کو گوجرانوالہ واپس پہنچ گیا تھا۔ امریکہ میں اپنے چالیس روزہ قیام کے دوران وہاں کے دوستوں کے تاثرات سے اس کالم میں قارئین کو آگاہ کر تا رہا ہوں۔ آخری چار روز میں نیویارک میں رہا، یہ دن وہ تھے جب جناب آصف علی زرداری ملک کے صدر منتخب ہو چکے تھے اور ان کی حلف برداری ہو رہی تھی۔ امریکہ میں مقیم پاکستانیوں کے تاثرات بھی اسی طرح کے ہیں جیسے یہاں ہیں، البتہ ایک فرق ہے کہ وہاں ملکی سیاسیات اور اس میں بیرونی دلچسپیوں اور مداخلت کا منظر زیادہ واضح دکھائی دیتا ہے۔

نو منتخب صدر جناب آصف علی زرداری: خدشات اور امیدیں

مجھے جتنے دوست بھی ملے کم و بیش سب ہی نے منفی تاثر کا اظہار کیا، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میرا میل جول زیادہ تر مذہبی حلقوں اور افراد سے رہا ہے اور مذہبی حلقے گزشتہ انتخابات کے بعد پاکستان کی قومی سیاست اور ملکی پالیسیوں میں جن تبدیلیوں کی خواہش یا توقع کر رہے تھے، زرداری صاحب اور پیپلز پارٹی کی طرف سے ان کے بارے میں مثبت اور حوصلہ افزا رویہ سامنے نہیں آیا۔ ایک مجلس میں بعض دوستوں نے کہا کہ ہمیں تو اس کے سوا کوئی تبدیلی نظر نہیں آ رہی کہ تھکے ہوئے گھوڑے کی جگہ تازہ دم گھوڑا آ گیا ہے جبکہ سوار وہی ہے اور اس کا رخ بھی اسی جانب ہے جدھر پہلے تھا۔ ایک صاحب نے یہی بات دوسرے انداز میں کہی کہ ایجنڈا وہی ہے صرف ٹیم تبدیل ہوئی ہے۔

بہر حال ابھی تک تو حالات کا رخ اسی جانب ہے اور رفتار بھی قدرے تیز ہو گئی ہے لیکن بعض حلقوں میں امید کی یہ شمع ابھی تک روشن ہے کہ چونکہ آصف علی زرداری صاحب منتخب صدر ہیں، جمہوری و دستوری راستے سے آئے ہیں، ایک واضح منشور رکھنے والی قومی سیاسی پارٹی کی نمائندگی کرتے ہیں، انہیں معلوم ہے کہ حالیہ انتخابات میں عوام نے سابق صدر پرویز مشرف کی پالیسیوں کو اکثریت کے ساتھ مسترد کر دیا ہے اور ان کے ساتھ حکمران اتحاد میں دوسری سیاسی جماعتیں بھی شریک ہیں، اس لیے انہیں کچھ نہ کچھ تبدیلی تو لانا ہی ہو گی اور عوام کو بہر حال کسی نہ کسی انداز میں یہ بتانا ہو گا کہ وہ جنرل پرویز مشرف سے مختلف طرز کے صدر ہیں اور ان کی پالیسیاں اور ترجیحات بھی جنرل پرویز مشرف سے الگ ہیں۔ دیکھیں

صدر زرداری اس کے لیے کیا کرتے ہیں اور ان کے اتحادی عوامی انتخابات میں کھلم کھلا ظاہر ہونے والے عوامی مینڈیٹ کے ساتھ چلنے کے لیے انہیں کس حد تک تیار کر پاتے ہیں۔ ہماری دعا تو یہی ہے کہ خدا کرے کہ صدر زرداری عوامی امیدوں، دستوری تقاضوں اور قومی مفادات کی بہتر طور پر پاسداری کر سکیں اور اللہ تعالیٰ اور پاکستانی قوم کے سامنے سرخرو ہوں، آمین یارب العالمین۔

''دہشت گردی'' کی تعریف؟

جناب آصف علی زرداری کے صدارت سنبھالنے کے بعد ملک کے اندر خودکش حملوں اور ملک کی سرحدوں کے اندر ڈرون حملوں اور رات کی تاریکی میں جاسوس امریکی طیاروں کی خلاف ورزیوں میں تیزی آئی ہے۔

- گورنر سرحد جناب اویس غنی نے گزشتہ روز ایک پریس بریفنگ میں کہا ہے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں نظریاتی محاذ پر خاموشی ہے۔
- اور ہمارے ایک محترم دانشور جناب مجیب الرحمٰن شامی صاحب نے فرمایا ہے کہ علماء کرام کو خودکش حملوں کے حرام ہونے کا فتویٰ دینا چاہیے۔

مجھے ان دونوں بزرگوں کی بات سے اتفاق ہے اور میں بھی یہ چاہتا ہوں کہ ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' کے نام پر لڑی جانے والی اس جنگ کا نظریاتی منظر واضح ہونا چاہیے اور ملک کے پرامن شہریوں اور نہتے عوام کا خودکش حملوں کے ذریعے قتل عام کرنے کے عمل کی سختی کے ساتھ مذمت کی جانی چاہیے۔ لیکن دونوں بزرگوں سے یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ دونوں باتیں درست ہونے کے باوجود یکطرفہ اور ثانوی ہیں جبکہ ان سے قبل یہ ضروری ہے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ لڑنے والی قوتیں ''دہشت گردی'' کی تعریف متعیّن کریں اور اس کی حدود واضح کریں۔ انہوں نے تو دہشت گردی کی تعریف اور اس کی حدود کے تعین کا مطالبہ مسترد کرتے ہوئے خود ہی ابہام قائم رکھا ہوا ہے۔ اس لیے جب ایک طرف سے لڑنے والے اندھیرے میں لڑنے کو ترجیح دے رہے ہیں تو دوسری طرف کے لڑنے والوں سے روشنی میں آنے کا مطالبہ کیوں کیا جا رہا ہے؟

جناب اویس غنی صاحب سے گزارش ہے کہ وہ بااختیار ہیں، اقوام متحدہ سے رجوع کریں اور اس سے مطالبہ کریں کہ وہ دہشت گردی کی تعریف طے کرے اور دہشت گردی اور جنگ آزادی کی حدود میں فرق واضح کرے۔ اس کے بعد اقوام متحدہ ہی ایک بین الاقوامی کمیشن قائم کر کے تحقیقات کرائے کہ دہشت گردی کے خلاف لڑی جانے والی اس جنگ کی قانونی اور اخلاقی حیثیت کیا ہے؟ جناب اویس غنی اگر اس

جنگ کے نظریاتی منظر کو واضح کرنے کے لیے دونوں فریقوں سے بات کریں اور دونوں کو اپنی اپنی نظریاتی اور اخلاقی پوزیشن واضح کرنے کے لیے کہیں تو یہ بات زیادہ قرینِ انصاف ہوگی۔

خودکش حملوں کا معاملہ

اسی طرح خودکش حملوں کا مسئلہ بھی ہے۔ بلاشبہ خودکش حملوں میں بے گناہ اور معصوم اور نہتے شہریوں کی ہلاکت انتہائی قابلِ مذمت ہے، اس کی کسی درجہ میں بھی حمایت نہیں کی جا سکتی لیکن دہشت گردوں کو کچلنے کے نام پر بے گناہ شہریوں کی ہلاکت اور غیر متعلقہ لوگوں پر آگ برسانے کا عمل بھی اس درجہ میں قابلِ مذمت ہے اور عقل و دانش کا تقاضا ہے کہ اس معاملہ میں بھی توازن اور اعتدال کو برقرار رکھا جائے اور کسی بھی حوالہ سے یکطرفہ بات سے گریز کیا جائے۔

آصف علی زرداری، منتخب آئینی صدر

(روزنامہ پاکستان، لاہور — ۳۰ ستمبر ۲۰۰۸ء)

جناب آصف علی زرداری جن دنوں اسلامی جمہوریہ پاکستان کے صدر منتخب ہوئے میں امریکہ میں تھا، اور اب جبکہ وہ جنرل اسمبلی سے خطاب کے لیے امریکہ پہنچے ہیں تو میں پاکستان میں ہوں۔ صدارت کے لیے ان کی نامزدگی، انتخابی مہم، الیکشن، اور پھر ان کی حلف برداری کے مناظر میں نے نیویارک میں ٹی وی چینلز اور قومی اخبارات کے ذریعے دیکھے۔ میری مجبوری یہ ہے کہ پہلے سے طے شدہ شیڈول سے انحراف میرے لیے عام حالات میں مشکل ترین ہوتا ہے، ورنہ جی یہ چاہتا تھا کہ صدر پاکستان کے دورۂ امریکہ کے موقع پر میں بھی نیویارک میں موجود رہوں، ان سے ملنے کی کوشش کروں، اور اگر ممکن ہو تو جنرل اسمبلی سے ان کے خطاب کا منظر براہ راست دیکھنے کی کوئی صورت نکالوں مگر ایسا نہ ہو سکا۔ اب ان کے خطاب کی تفصیلات قومی اخبارات کے ذریعے معلوم ہوئی ہیں۔

امریکہ میں میرے چالیس روزہ قیام کے دوران اکثر مجالس میں پاکستان کے حالات، بالخصوص جناب آصف علی زرداری اور میاں محمد نواز شریف کے سیاسی روابط ہی زیر بحث رہے۔ میری سرگرمیوں کا دائرہ زیادہ تر پاکستانی کمیونٹی ہوتی ہے اور اس کا بھی وہ حصہ جس کا تعلق کسی دینی مدرسے یا مسجد سے ہے۔ کیونکہ "ملّا کی دوڑ مسجد تک" کے مصداق میری جولا نگاہ پاکستان کی طرح امریکہ، برطانیہ، اور دیگر ممالک میں بھی مسجد و مدرسہ ہی ہے۔ کسی مسجد میں درس کے عنوان سے گفتگو ہو جاتی ہے، کسی مدرسہ والوں کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے طلبہ کی تعلیمی حالت چیک کر کے اسے بہتر بنانے کے لیے انہیں مشورہ دوں، اور کہیں چند پاکستانی دوست چائے یا کھانے پر جمع ہو کر پاکستان کے حالات و مسائل پر تبصرے کی فرمائش کر دیتے ہیں۔ اسی قسم کی سرگرمیوں میں وقت گزر جاتا ہے اور اگر کوئی باذوق دوست مل جائے اور کچھ وقت بھی دے سکے تو امریکہ کے کسی تاریخی مقام کو دیکھنے اور اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا موقع بھی میسر آجاتا ہے۔......

جنرل پرویز مشرف اور آصف علی زرداری میں موازنہ

اسلامی جمہوریہ پاکستان کی صدارت کے لیے جناب آصف علی زرداری کی نامزدگی اور انتخاب ان حلقوں اور دوستوں کے لیے بہر حال آسانی سے قبول کی جانے والی بات نہیں تھی جن سے میری ملاقاتیں

ہوتی رہیں، اس لیے اکثر تاثرات منفی ہی سننے میں آئے۔ ایک مجلس میں دوستوں نے کہا کہ ایجنڈا وہی ہے صرف ٹیم تبدیل ہوئی ہے، امریکہ نے تھکے ہوئے گھوڑے کی بجائے تازہ دم گھوڑے کا اہتمام کر لیا ہے، اس لیے اب وہ ایجنڈا زیادہ قوت کے ساتھ آگے بڑھے گا۔ ایک محفل میں بحث چل پڑی کہ جنرل پرویز مشرف میں اور آصف زرداری میں کیا فرق ہے؟ ایک دوست نے مجھ سے یہ سوال کیا تو میں نے انہی سے الٹا سوال کر دیا کہ آپ کا کیا خیال ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہمارے نزدیک تو کوئی فرق نہیں ہے، سوائے اس کے جو تھکے ہوئے گھوڑے اور تازہ دم گھوڑے میں ہوتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ میرا یہ خیال نہیں ہے اور میں ان دونوں میں بہت بڑا فرق دیکھ رہا ہوں۔ دوستوں نے تجسس سے پوچھا کہ وہ فرق کیا ہے؟

میں نے کہا جنرل پرویز مشرف سے بات کرنے کے لیے ان کی ذات کے سوا کوئی حوالہ ہمارے پاس نہیں ہوتا تھا، مگر آصف علی زرداری سے بات کرنے کے لیے ہمیں بہت سے حوالے میسر ہیں:

- جنرل پرویز مشرف سے اسلام کے حوالے سے بات نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ اپنے اسلام کے خود ہی شارح اور ترجمان تھے اور اسلام کی کسی بات کی وضاحت کے لیے ان کے ذہن میں خود ان کی ذات کے سوا کوئی اتھارٹی موجود نہیں تھی۔
- ان سے دستورِ پاکستان کے حوالے سے بات کرنا بھی مشکل تھا کہ اسی کو پامال کر کے تو وہ مسندِ اقتدار پر فائز ہوئے تھے۔
- اور انہیں ان کی اپنی بات، کمٹمنٹ اور وعدے کا حوالہ بھی نہیں دیا جا سکتا تھا کہ ان کے نزدیک کمٹمنٹ اور عہد سے کہیں زیادہ ”قوم کے وسیع تر مفاد“ کے لیے ان کی ذاتی سوچ اتھارٹی کا درجہ رکھتی تھی۔

مگر جناب آصف علی زرداری سے ہم

- پاکستان پیپلز پارٹی کے منشور اور دستور کی بنیاد پر بات کر سکتے ہیں کہ وہ قومی سیاست میں اسی کی نمائندگی کرتے ہیں۔
- ہم انہیں دستورِ پاکستان کے حوالے سے کسی کام سے رکنے کا کہہ سکتے ہیں کہ وہ دستور کو نظر انداز کر کے یا اس میں چور دروازہ تلاش کر کے ایوانِ صدر میں داخل نہیں ہوئے بلکہ دستور کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اور اس کے طے کردہ اصولوں کے مطابق صدرِ پاکستان کے منصب پر فائز ہوئے ہیں۔

- ہم انہیں جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی پالیسیوں اور فیصلوں کے دائرے میں رہنے کے لیے بھی کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان پیپلز پارٹی آج بھی بھٹو مرحوم کی سیاسی فکر، انقلابی سوچ، اور عوام دوست نعروں کی علمبردار کہلاتی ہے۔
- اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میں پاکستان پیپلز پارٹی کے اندر ایسی شخصیات اور حلقوں کو دیکھ رہا ہوں جو وطنِ عزیز کے سیاسی، بین الاقوامی، اور نظریاتی تشخص کے تناظر میں بہت سے غلط کاموں میں رکاوٹ بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اس لیے اگر کسی دوست کے جناب آصف علی زرداری کے بارے میں ذاتی طور پر تحفظات بھی ہوں تو ان کے گرد ایک ایسا حصار موجود ہے جو ان تحفظات کی تلافی کر سکتا ہے۔ لہٰذا میری رائے یہ ہے کہ ہمیں جناب آصف علی زرداری کی صدارت کے ساتھ اپنے تعلقات کا آغاز محض تحفظات کے اظہار اور تکرار کے ساتھ نہیں کرنا چاہیے بلکہ اچھی توقعات، اعتماد، اور امید کو اس کا نقطۂ آغاز بنانا چاہیے۔ اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہیے کہ وہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے اس نئے منتخب اور جائز جمہوری صدر کو دستورِ پاکستان کے تقاضوں اور عوام کی توقعات کے مطابق اس نازک مرحلے میں ملک و قوم کی بہتر رہنمائی کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

بیرونی ایجنڈا آگے بڑھانے کے محرکات

جناب آصف علی زرداری کو صدارت سنبھالنے کے بعد خودکش حملوں اور پاکستان کی سرحدوں میں بیرونی مداخلت کے واقعات میں اضافے کی جس صورتحال کا سامنا ہے وہ غیر متوقع نہیں ہے۔ اس جنگ کے مذکورہ دونوں فریقوں کا مفاد اور خواہش یہ ہے کہ صورتحال میں کوئی تبدیلی نہ آئے اور پاکستان کی نئی منتخب حکومت اپنی پالیسیوں اور فیصلوں میں پاکستانی عوام کے انتخابی فیصلے اور مینڈیٹ کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی بنیادی تبدیلی نہ لا سکے۔ اس لیے ایسے واقعات کی کسی بھی فریق کی جانب سے ہر وقت توقع کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اس گھمبیر صورتحال میں عوام کی اکثریت کے رجحانات اور مینڈیٹ کی پاسداری کے لیے حکومت اور اپوزیشن دونوں کو مل کر کچھ کرنا ہوگا۔ میرے خیال میں سابق صدر پرویز مشرف نے قومی پالیسیوں پر تمام سیاسی پارٹیوں کی گول میز کانفرنس کی جو تجویز پیش کی تھی اور جو اُن کی طرف سے پیش ہونے کی وجہ سے ملک کے سیاسی حلقوں کے لیے قابلِ قبول نہیں تھی، اس کا اب وقت آگیا ہے۔

پاکستان کی خود مختاری کے تحفظ کے لیے بیرونی مداخلت کی روک تھام اور داخلی امن و سلامتی کے تحفظ کے لیے خودکش حملوں کا سدباب دونوں امور ہماری قومی ضرورت اور اہم ترین مسائل ہیں۔ اس

کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہوئی مہنگائی اور لوڈ شیڈنگ کا عذاب بھی ہمارے سرفہرست قومی مسائل ہیں۔ ہم صدر محترم جناب آصف علی زرداری سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ ان قومی مسائل پر اپنی اتحادی جماعتوں کے ساتھ ساتھ اپوزیشن کو بھی اعتماد میں لیں گے۔ کیونکہ قوم کے سب حلقوں کے اعتماد کے ساتھ وہ جو بات کہیں گے اور جو قدم اٹھائیں گے اس میں یقیناً زیادہ وزن ہو گا۔ اور قومی اعتماد میں اضافے کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی حلقے بھی اس کی اہمیت محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔

بلوچستان میں شرعی عدالتیں: پیپلز پارٹی کا مستحسن اقدام

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ — فروری ۲۰۰۹ء)

روزنامہ پاکستان لاہور ۱۳ جنوری ۲۰۰۹ء کی خبر کے مطابق بلوچستان کے بعض علاقوں میں شرعی عدالتیں بحال کر دی گئی ہیں، اور بلوچستان کی پاکستان پیپلز پارٹی کے صدر جناب لشکری رئیسانی نے وائس آف امریکہ کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے کہا ہے کہ عوام دیوانی کیسوں کے متعلق جلد اقدامات اٹھانے کے خواہاں ہیں اس لیے عوام کی خواہش پر بلوچستان کے بعض علاقوں میں شرعی عدالتوں کو بحال کیا گیا ہے۔ خبر میں اس سے زیادہ کوئی تفصیل بیان نہیں کی گئی، اس لیے ان شرعی عدالتوں کی ہیئت اور طریق کار کیا ہے اس کے بارے میں سر دست کچھ نہیں کہا جا سکتا، البتہ اس سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ بلوچستان کے عوام دیوانی مقدمات کے جلد تصفیہ کی خاطر شرعی عدالتوں کی بحالی پر زور دے رہے تھے جس پر حکومت نے یہ قدم اٹھایا ہے۔

مقدمات کی بھرمار کے باعث شام کی عدالتوں کی تجویز

دوسری طرف روزنامہ پاکستان لاہور ۱۴ جنوری ۲۰۰۹ء میں شائع شدہ خبر میں بتایا گیا ہے کہ وفاقی حکومت نے ملک بھر میں مقدمات کی حد سے زیادہ کثرت کے باعث شام کی عدالتیں قائم کرنے پر غور شروع کر دیا ہے، اور اس سلسلہ میں وفاقی وزیر قانون فاروق ایچ نائیک کی صدارت میں ایک اعلیٰ سطحی اجلاس کے بعد صوبائی حکومتوں سے شام کی عدالتوں کے بارے میں تجاویز طلب کی گئی ہیں، جن پر پنجاب کی حکومت نے بعض تحفظات کا اظہار کیا ہے۔ خبر میں بتایا گیا ہے کہ ملک بھر کی عدالتوں میں لاکھوں مقدمات زیر سماعت ہونے کی وجہ سے شام کی عدالتوں کا قیام ضروری ہو گیا ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق صرف پنجاب میں آٹھ لاکھ فوجداری اور بارہ لاکھ دیوانی مقدمات زیر سماعت ہیں اور عدلیہ کے ججوں کی تعداد کم ہونے کے باعث ان مقدمات کی تعداد میں مزید اضافہ ہو رہا ہے، مگر پاکستان بار کونسل نے ایک اعلامیہ کے ذریعے شام کا عدالتوں کا منصوبہ مسترد کر دیا ہے۔

جہاں تک مقدمات کی تعداد میں مسلسل اضافہ اور عدالتوں پر کام کے روز افزوں بوجھ کا تعلق ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ملک بھر کی عدالتوں میں عجیب افراتفری کی صورتحال ہے، غریب عوام چھوٹے چھوٹے تنازعات میں بے پناہ اخراجات اور سالہا سال کے انتظار کے باعث ان عدالتوں سے مایوس

ہوتے جا رہے ہیں۔ بالخصوص ان علاقوں میں جہاں قیامِ پاکستان سے قبل انگریزی دور میں شرعی قضا کا نظام نافذ تھا اور عوام کو جلد اور سستے انصاف کی سہولت حاصل تھی، وہاں کے لوگوں کا اضطراب ملک کے دوسرے حصوں کے عوام سے کئی گنا زیادہ ہے اور وہ اپنے نصف صدی قبل کے دور کو یاد کر کے زیادہ بے چین ہو جاتے ہیں جب انہیں اپنے تنازعات کا حل شرعی عدالتوں کے ذریعہ جلد اور بلا اخراجات مل جایا کرتا تھا۔ جبکہ اب انہیں ایک ایک مقدمہ کے لیے سالہا سال تک عدالتوں کے چکر لگانے پڑتے ہیں اور اس پر ہونے والے ہوشربا اخراجات مستزاد ہیں۔

شرعی عدالتیں، ملک بھر کی ضرورت

ان حالات میں اگر صوبہ بلوچستان کے عوام نے صوبائی حکومت کو شرعی عدالتوں کی بحالی پر آمادہ کر لیا ہے اور صوبہ سرحد کے بعض خطوں کے عوام اس کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں تو یہ خوش آئند بات ہے۔ لیکن ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ یہ صرف سرحد اور بلوچستان کے عوام کا مسئلہ نہیں بلکہ ملک بھر کے عوام کی ضرورت ہے کہ انہیں موجودہ عدالتوں کے پیچیدہ نظام کے چکروں سے نجات دلائی جائے اور شریعتِ اسلامیہ کے سادہ قوانین اور فطری طریق کار کے ذریعہ سستا اور جلد انصاف مہیا کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ یہ صرف ہمارا خیال نہیں بلکہ گزشتہ نصف صدی کے تجربات اس پر شاہد ہیں کہ عوام کو سستا اور جلد انصاف مہیا کرنے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ عدالتوں میں شرعی قوانین اور شرعی طریق کار کی عملداری قائم کی جائے اور لوگوں کو طویل انتظار اور بھاری اخراجات کی دلدل سے نکالا جائے۔

اس لیے اگر وفاقی حکومت ملک بھر کی عدالتوں میں فیصلوں کے انتظار میں پڑے لاکھوں مقدمات کا جلد تصفیہ چاہتی ہے تو اس کا حل شام کی عدالتوں کا قیام نہیں بلکہ شرعی عدالتوں کی طرف عملی پیشرفت ہے کیونکہ شرعی عدالتوں کے ذریعے نہ صرف یہ کہ عام لوگوں کو جلد اور سستا انصاف میسر آئے گا بلکہ ان کے عقیدہ، کلچر اور ذہنی رجحانات سے ہم آہنگی کی وجہ سے یہ فیصلے ان کے لیے ذہنی سکون اور قلبی اطمینان کا باعث بھی ہوں گے۔

سوات میں معاہدۂ امن اور شرعی نظامِ عدل

(روزنامہ اسلام، لاہور ــــ ۱۷ اپریل ۲۰۰۹ء)

قومی اسمبلی سے سوات کے معاہدۂ امن کی منظوری کی خوش کن خبر مجھے لندن پہنچنے پر ملی۔ ۱۴ اپریل کو صبح ساڑھے چھ بجے کے لگ بھگ ہیتھرو ایئرپورٹ پر اترا تو سفر شروع کیے مجھے تقریبًا بائیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ سعودیہ ایئرلائن کی فلائٹ تھی، ۱۳ اپریل کو ساڑھے بارہ بجے دن لاہور سے پرواز کی اور ریاض سے ہوتے ہوئے جدہ پہنچا۔ رات کو ڈیڑھ بجے دوسری پرواز سے روانہ ہوئے اور لندن کے وقت کے مطابق صبح ساڑھے چھ بجے جبکہ پاکستان میں ساڑھے دس بجے کا وقت تھا ہم لندن پہنچے۔ ورلڈ اسلامک فورم کے چیئرمین مولانا محمد عیسیٰ منصوری ایئرپورٹ پر مجھے لینے کے لیے تشریف لائے ہوئے تھے، انہوں نے ملاقات کے بعد پہلی خبر یہ سنائی کہ قومی اسمبلی نے معاہدۂ امن کی منظوری دے دی ہے اور صدر آصف علی زرداری نے بھی دستخط کر دیے ہیں جس سے پورے سوات میں جشن کا سماں ہے۔ یہ خوشخبری ملتے ہی دل و دماغ میں اضطراب کی ان لہروں نے کچھ سکون پکڑا جو اس معاہدہ پر دستخط میں مسلسل تاخیر کی وجہ سے مستقبل کے خدشات و خطرات کے حوالہ سے پریشانی اور بے چینی کا باعث بنی ہوئی تھیں۔

۱۱ اپریل کو بادشاہی مسجد لاہور میں عالمی مجلسِ ختمِ نبوت کے زیراہتمام منعقد ہونے والی قومی ختمِ نبوت کانفرنس میں مجھے خطاب کی دعوت دی گئی تو میرے ذہن پر اس وقت بھی سوات کی صورتحال اور معاہدۂ امن کے مستقبل کے سوال کا غلبہ تھا۔ چنانچہ میں عالمی مجلسِ تحفظِ ختمِ نبوت کی قیادت کو کانفرنس کی کامیابی پر مبارکباد دینے کے سوا کانفرنس کے موضوع پر کچھ نہ کہہ سکا اور پندرہ بیس منٹ کی گفتگو سوات کے حوالہ سے ہی کی۔ اتفاق سے وفاقی وزیر مذہبی امور صاحبزادہ سید حامد سعید کاظمی بھی اسٹیج پر تشریف فرما تھے اس لیے میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سوات کا مقدمہ پیش کیا جس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

سوات کے عوام کا مقدمہ

سوات کے مظلوم عوام کے ساتھ بار بار زیادتی اور ظلم ہو رہا ہے، باقی سارے ملک کے ساتھ تو ساٹھ سال سے یہ ظلم ہو رہا ہے کہ وعدہ، اعلان اور دستوری ضمانت کے باوجود ملک کے عوام کو شرعی نظام سے مسلسل محروم رکھا جا رہا ہے مگر سوات کے عوام کے ساتھ یہ ظلم ہوا کہ پاکستان کے ساتھ الحاق سے پہلے ریاست سوات میں شرعی عدالتوں کا نظام موجود تھا اور لوگوں کے مقدمات کے فیصلے قاضی حضرات قرآن

و سنت کے مطابق کرتے تھے، اس نظام کو ختم کر دیا گیا۔ حالانکہ برطانوی استعمار کے دور میں سوات کے عوام کو شرعی عدالتوں کی سہولت حاصل تھی اور صرف سوات نہیں بلکہ پنجاب میں بہاولپور کی ریاست، سندھ میں خیر پور کی ریاست اور بلوچستان میں قلات کی ریاست میں بھی شرعی عدالتوں کا یہ نظام موجود تھا جو پاکستان کے ساتھ الحاق کے بعد ختم کر دیا گیا۔

سوات کے عوام کے ساتھ دوسرا ظلم اس وقت ہوا جب وہ ۱۹۹۴ء میں یہ مطالبہ لے کر سڑکوں پر آئے کہ نیا عدالتی نظام ان کے حالات سے مطابقت نہیں رکھتا، مقدمات کے فیصلوں میں وقت بہت لگتا ہے اور اخراجات بھی بہت زیادہ ہو جاتے ہیں، اس لیے انہیں فوری اور سستا انصاف مہیا کرنے کے لیے شرعی عدالتوں کا سابقہ نظام واپس کیا جائے۔ عوام کے اس مطالبہ اور پرجوش تحریک پر انہیں اس وقت کی حکومت نے ''نفاذِ شریعت ریگولیشن'' کے نام سے جو نظام دیا اس میں ان کے ساتھ دھوکہ ہوا کہ اصطلاحات کے ہیر پھیر اور الفاظ کے ردوبدل کے ساتھ ان پر وہی نظام مسلط کر دیا گیا جس سے وہ نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس کے بعد وہ پھر سڑکوں پر آ گئے اور اس میں جبر و تشدد کی وہ افسوسناک صورتحال پیدا ہوئی جس نے ملک کے ہر شہری کو پریشان کر کے رکھ دیا۔ چنانچہ ان سے وعدہ کیا گیا کہ وہ ہتھیار ڈال دیں اور تشدد کا راستہ ترک کر دیں تو انہیں شرعی عدالتوں کا نظام دے دیا جائے گا، اور اب جبکہ صوبائی حکومت کے ساتھ ایک ''معاہدۂ امن'' کے تحت سوات میں امن بحال ہو گیا ہے اور حالات بہتری کی طرف گامزن ہو گئے ہیں تو اس معاہدۂ امن کی توثیق میں ٹال مٹول سے کام لیا جا رہا ہے اور حالات میں پہلے سے زیادہ بگاڑ کے خطرات منڈلا رہے ہیں۔

راقم الحروف نے اس تمہید کے بعد یہ عرض کیا کہ نظامِ عدل یا نظامِ شریعت، اسے کوئی بھی عنوان دے دیں، شرعی عدالتوں کا نظام سوات کے عوام کا مطالبہ ہے اور یہ بات مشاہدات کی بنیاد پر واضح ہو گئی ہے کہ یہ نہ صرف سوات کے عوام کا جمہوری حق ہے بلکہ امن کی ضمانت بھی اسی میں ہے۔ اس لیے وفاقی حکومت کو اس معاہدہ کی بلا تاخیر توثیق کرنی چاہیے کیونکہ اب اس کے سوا کوئی دوسرا آپشن اس کے پاس باقی نہیں رہا۔ دوسری گزارش میں نے یہ کی کہ فوری اور سستا انصاف صرف سوات کے عوام کا حق اور ضرورت نہیں بلکہ پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کے دوسرے علاقوں کی بھی ضرورت ہے۔ یہ کراچی، لاہور، ملتان، گوجرانوالہ، پشاور اور کوئٹہ کی بھی ضرورت ہے اور حکومت کی دستوری ذمہ داری ہے کہ وہ ملک بھر کے عوام کو قرآن و سنت کے احکام و قوانین پر مبنی ایسا عدالتی نظام فراہم کرے جو فوری اور سستے انصاف کی ضمانت دے سکے۔

یہ توان گزارشات کا خلاصہ ہے جو میں نے بادشاہی مسجد لاہور کی قومی ختم نبوت کانفرنس میں پیش کیں اور اب جبکہ قومی اسمبلی اور صدر مملکت نے سوات کے عوام کے اس مطالبہ کو منظور کر لیا ہے تو اس پر میں صدر زرداری اور حکومتی اتحاد کے تمام قائدین کو مبارکباد پیش کرنا چاہتا ہوں اور خاص طور پر صوبہ سرحد میں عوامی نیشنل پارٹی کی حکومت کو مبارکباد کا سب سے زیادہ مستحق سمجھتا ہوں اس لیے کہ اس کی اصول پسندی اور استقامت نے اس معاملہ میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔

عوامی نیشنل پارٹی کا کردار، مولانا سمیع الحق کی نظر میں

۱۰ اپریل کو جمعیۃ علماء اسلام کے راہنما مولانا سمیع الحق لاہور تشریف لے جاتے ہوئے تھوڑی دیر کے لیے گکھڑ رکے اور والد محترم شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دامت برکاتہم سے ملاقات کی تو اس موقع پر راقم الحروف بھی موجود تھا۔ انہوں نے اس سلسلہ میں اے این پی کے رویہ کی بہت تعریف کی اور کہا کہ اے این پی کی قیادت اور صوبائی حکومت پورے حوصلہ اور استقامت کے ساتھ اس کیس کی پیروی کر رہی ہے اور قومی اسمبلی اور وفاقی حکومت کو بریف کرنے میں بھی پوری طرح سرگرم عمل ہے۔

مجھے یہ سن کر ۱۹۷۲ء یاد آگیا جب صوبہ سرحد میں عوامی نیشنل پارٹی کے ساتھ جو اس وقت نیشنل عوامی پارٹی کہلاتی تھی، کولیشن کی صورت میں حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے وزارت اعلیٰ کا منصب سنبھالا تھا تو کولیشن کے معاہدہ میں یہ بات بھی شامل تھی کہ وفاق میں دستور سازی کے موقع پر اسلامائزیشن کے حوالہ سے نیشنل عوامی پارٹی جمعیۃ علماء اسلام کے ساتھ تعاون کی پابند ہوگی۔ اور پھر یہ بات پاکستان کی پارلیمانی تاریخ کا حصہ ہے کہ نیشنل عوامی پارٹی نے ایک قوم پرست اور سیکولر پارٹی ہونے کے باوجود اس عہد کو نبھایا اور اس کے تعاون سے دستور میں اسلامی دفعات شامل ہوئیں۔

بہرحال وہ تمام فریق اور افراد اس معاہدۂ امن کی توثیق اور نفاذ پر مبارکباد کے مستحق ہیں جن کا اس میں کسی بھی درجہ میں کردار موجود ہے۔

ایم کیو ایم کے جناب الطاف حسین سے گزارش

البتہ ایم کیو ایم اور جناب الطاف حسین کے طرز عمل پر افسوس ہوا کہ امن اور شریعت دونوں حوالوں سے انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا، جناب الطاف حسین نے ایک حالیہ بیان میں کہا ہے کہ وہ ڈنڈا بردار اور کلاشنکوف شریعت کے نفاذ کے حق میں نہیں ہیں۔ لیکن یہ بات الطاف حسین صاحب کے منہ سے کچھ عجیب سی لگتی ہے اور میں الطاف بھائی سے بطور خاص یہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ جناب اگر ڈنڈا بردار اور کلاشنکوف بکف "قومی موومنٹ" ہو سکتی ہے تو ڈنڈا بردار شریعت پر انہیں آخر کیوں اعتراض ہے؟

اٹھارہویں آئینی ترمیم کے حوالے سے چند گزارشات

(روزنامہ پاکستان، لاہور — ۱۹ اپریل ۲۰۱۰ء)

قومی اسمبلی نے اٹھارہویں آئینی ترمیم کی منظوری دے دی ہے۔ اس سے قبل صدر آصف علی زرداری نے اس کے حوالے سے پارلیمنٹ میں خطاب بھی فرمادیا ہے۔ اٹھارہویں آئینی ترمیمی بل کے اس مسودہ کے بارے میں کہا جارہا ہے کہ ۱۹۷۳ء کے دستوری اتفاق کے بعد یہ دوسرا قومی اتفاق ہے جس پر کم و بیش سب سیاسی حلقوں نے اطمینان کا سانس لیا ہے اور کہا ہے کہ اس اتفاق کے بعد قوم ایک بڑے بحران سے نکل آئی ہے۔ بادی النظر میں ایسا ہی دکھائی دیتا ہے اور ہماری خواہش اور دعا ہے کہ خدا کرے ایسا ہی ہو، آمین یارب العالمین۔

آئینی ترمیم پر ایک نظر

- اس بات کو باعثِ اطمینان قرار دیا جارہا ہے کہ سترہویں آئینی ترمیم کے ذریعے دستور میں آمریت کی جو علامتیں شامل کرلی گئی تھیں، اٹھارہویں ترمیم کے اس بل کی منظوری کی صورت میں دستور ان سے پاک ہوجائے گا اور ۱۹۷۳ء کا دستور اپنے اصلی تناظر میں اور اصل روح کے ساتھ بحال ہوجائے گا۔
- وزیراعظم اور صدر کے اختیارات میں توازن قائم ہونے کی خوشخبری بھی اس میں شامل ہے۔
- صوبوں کے اختیارات میں اضافے کی نوید بھی اس کا حصہ ہے۔
- تیسری بار وزیراعظم بننے پر پابندی کا خاتمہ بعض سیاسی رہنماؤں کی ذہنی الجھن کے خاتمے کا باعث بنا ہے۔
- دستور سے جنرل ضیاء الحق مرحوم کا نام نکال دینے کی بات بھی بعض سیاستدانوں کی نفسیاتی تسکین کا ذریعہ بنتی دکھائی دے رہی ہے۔
- صوبہ سرحد کے نئے نام ''خیبر پختون خوا'' پر آئینی کمیٹی کا اتفاق بہت سے لوگوں کے لیے باعثِ مسرت ہے۔
- اور سینٹ کے ارکان کی تعداد میں اضافے کے ساتھ اس میں اقلیتوں کی نمائندگی شامل کرنے کو بھی جمہوریت کی طرف پیشرفت قرار دیا جارہا ہے۔

دستور کی اسلامی حیثیت برقرار رہنے پر اطمینان

خود ہم نے یکم اپریل کو چیچہ وطنی اور ۱۴ اپریل کو سیالکوٹ میں عالمی مجلسِ احرار اور عالمی مجلس تحفظِ ختمِ نبوت کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی ختمِ نبوت کانفرنسوں میں گفتگو کرتے ہوئے اس بات پر اطمینان کا اظہار کیا کہ ملک کے اسلامی تشخص، اسلامی جمہوریہ پاکستان کے نام، تحفظِ ناموس رسالتؐ اور عقیدۂ ختمِ نبوتؐ کے تحفظ، وفاقی شرعی عدالت، قراردادِ مقاصد اور دیگر اسلامی دفعات کو دستور میں بے اثر بنانے کے لیے بعض ملکی اور بین الاقوامی حلقوں کی طرف سے جو تجاویز دستوری کمیٹی کے سامنے رکھی گئی تھیں اور جن کے لیے مختلف اطراف سے مسلسل دباؤ ڈالا جا رہا تھا، دستوری کمیٹی نے انہیں درخور اعتناء نہیں سمجھا اور ایسی تجاویز کو قبول نہ کر کے پاکستان کے اسلامی تشخص اور دستور کی اسلامی بنیادوں کے ساتھ پارلیمنٹ کی کمٹمنٹ کا ایک بار پھر اظہار کر دیا ہے۔ یہ بات شاید بعض دوستوں کے لیے اہم نہ ہو اور کچھ حضرات کو اس سے مایوسی بھی ہوئی ہو مگر پاکستان میں نفاذِ اسلام کے ایک شعوری کارکن کی حیثیت سے میرے نزدیک یہ بہت اہم بات ہے اور دستوری اصلاحات کی پارلیمانی کمیٹی کے تمام ارکان اس پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

عوامی مسائل کے حوالے سے تحفظات

اس سب کچھ کے باوجود کچھ خلا خلا سا محسوس ہو رہا ہے اور لگتا ہے کہ جو کچھ ہونا چاہیے تھا وہ نہیں ہوا۔ اور قوم کی خاموش نگاہیں جن سوالات کا جواب تلاش کرنے کے لیے بار بار اٹھ رہی تھیں وہ سوالات جوں کے توں موجود ہیں اور انہیں ایک بار پھر مستقبل کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ ایک بات تو عمران خان نے کہی ہے کہ دستوری ترامیم میں عام آدمی کے لیے کچھ نہیں ہے اور اس کے روزمرہ مسائل و مشکلات کا کوئی حل ان ترامیم میں شامل نہیں ہے۔ یہ بات کچھ غلط بھی نہیں ہے اس لیے کہ عام آدمی کا مسئلہ غربت، مہنگائی، لوڈشیڈنگ، بے روزگاری، بدامنی، لاقانونیت، کرپشن، ہوشربا طبقاتی تفاوت و امتیاز، اور قومی وسائل پر بعض طبقوں کی اجارہ داری ہے۔ ان کے بارے میں کسی سنجیدہ اور مؤثر قومی پالیسی کے بغیر عام آدمی کو ریلیف ملنے کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ کہا جا سکتا ہے اور شاید یہی کہا جائے گا کہ دستوری ترامیم کا مقصد ملکی نظام کی اصلاح ہے اور جب نظام ٹھیک طرح سے کام کرنے لگے گا تو عام آدمی کے مسائل بھی حل ہونا شروع ہو جائیں گے، لیکن یہ۔

تا تریاق از عراق آوردہ شود
مار گزیدہ مردہ شود

والی بات ہے اور ”کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک“ کا معاملہ ہے۔ بے چارے نظام کو کوئی صحیح رخ پر کام کرنے کا موقع دے گا تو عام آدمی کے مسائل حل ہونا شروع ہوں گے، جبکہ اس کے بغیر عام شہری کے لیے ”نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی“ کا ورد کرتے رہنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہوگا۔

اسی ۱۹۷۳ء کے دستور کی تدوین و تشکیل کے دوران قومی اسمبلی میں قائد حزب اختلاف مولانا مفتی محمودؒ نے قائد ایوان ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی، اور یہ بات مفتی صاحبؒ سے میں نے براہِ راست سنی ہے، کہ عام آدمی کی بنیادی ضروریات بالخصوص روٹی، کپڑا اور مکان کی حد کا تعین کر کے اس کے لیے قانونی ضمانت فراہم کی جائے اور دستوری طور پر اس کا یہ حق تسلیم کیا جائے کہ وہ اپنی بنیادی ضروریات کے لیے عدالت سے رجوع کر سکے۔ مفتی صاحبؒ کا کہنا تھا کہ یہ بات سن کر بھٹو مرحوم نے کانوں کو ہاتھ لگا لیے کہ ایسا کرنا ممکن نہیں ہے۔ مفتی صاحبؒ نے کہا کہ دستوری طور پر یہ حق تسلیم کر کے حالات کو اس حد تک تیار کرنے کے لیے پانچ یا دس سال کا استثناء اس میں شامل کر دیا جائے مگر بھٹو مرحوم نے یہ تجویز بھی قبول نہیں کی تھی۔

ہمارے نزدیک آج بھی اس کا حل یہی ہے کہ طبقاتی معیشت پر نظر ثانی کی جائے اور خلافتِ راشدہ کی طرز پر بیت المال کا نظام قائم کر کے عام آدمی کو اس کی تسلیم شدہ بنیادی ضروریات کے لیے قانونی تحفظ فراہم کیا جائے، اس کے بغیر اس کا کوئی حل نہیں ہے۔ کسی سیاستدان کو تیسری بار وزیراعظم بننے کا موقع ملتا ہے یا نہیں، اس کا غریب آدمی کے ساتھ (براہ راست) کیا تعلق ہے؟ غریب شخص کو تو اپنی ضروریات درکار ہیں اور اپنی مشکلات سے نجات ہی اس کا سب سے بڑا ہدف ہے۔ اسے اگر نظام کے صحیح طور پر کام کرنے تک ٹالا جاتا رہے گا تو اگلی نسلیں بھی شاید ان دستوری ترامیم سے کوئی ریلیف حاصل نہ کر سکیں۔

اسلامی دفعات پر عملداری کا معاملہ

ہمارے ایک صاحبِ قلم دوست مولانا محمد ازہر (خیر المدارس، ملتان) نے اپنے ایک حالیہ کالم میں آئینی ترامیم کے حوالے سے یہ بات کہی ہے کہ اس ترمیمی بل میں دستور کی اسلامی دفعات پر عملدرآمد اور اس سلسلہ میں پائی جانے والی خامیوں کی اصلاح کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ ان کی یہ بات درست لگتی ہے، اس لیے کہ اگر پاکستان کو ایک آئیڈیل رفاہی اسلامی ریاست بنانا فی الواقع مقصود ہے تو اس کے لیے

دستور میں اسلامی دفعات کی صرف موجودگی کافی نہیں بلکہ ان پر عملدرآمد کا اہتمام بھی ضروری ہے اور اس سلسلہ میں دستور میں پائے جانے والے خلا یا خامیوں کو دور کرنا بھی ضروری ہے۔

صدر اور وزیراعظم کے اختیارات میں توازن اور قومی خود مختاری

اس کے علاوہ دو باتیں خود ہمیں کھٹکتی ہیں جن کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے:

۱. ایک یہ کہ صدر اور وزیراعظم کے اختیارات میں توازن کی بات کی گئی ہے، جو اچھی بات ہے، اور اس کے ساتھ عدالتِ عظمیٰ کے وقار اور اختیارات کے تحفظ کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ مگر ہمارے ہاں اختیارات کے استعمال میں کشمکش صرف صدر، وزیراعظم اور چیف جسٹس کے مابین تو نہیں ہوتی، ان کے علاوہ ''اَن دیکھے'' اختیارات کا سرچشمہ بھی موجود ہے جو ہمیشہ حاوی ہوتا ہے اور فیصلہ کن پوزیشن میں رہتا ہے، اسے دستور کے دائرے میں لانے اور بیلنس کرنے کی کوئی بات ہمیں ان ترامیم میں دکھائی نہیں دی۔

۲. دوسری بات یہ کہ قومی خود مختاری اس وقت ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ہے کیونکہ داخلی معاملات میں بڑھتی ہوئی غیر ملکی مداخلت نے ہمارے تمام قومی اداروں کو مفلوج کر رکھا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اس بیرونی مداخلت کا ذریعہ ہم خود ہی بنتے ہیں اور اس کا راستہ ہموار کرنے والے بھی ہم میں سے ہی ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے ہماری بے بسی کی انتہا یہ ہے کہ پارلیمنٹ کسی قومی مسئلہ پر ایک متفقہ موقف طے کرتی ہے مگر وہ بعض افراد یا طبقات کے مفادات کی ترجیحات کے فریزر میں منجمد ہو کر رہ جاتا ہے۔ دستوری اصلاحات کی پارلیمانی کمیٹی کو اس سلسلہ میں بھی کوئی حل تلاش کرنا چاہیے تھا اور ملکی معاملات میں غیر ملکی مداخلت کا ذریعہ بننے والوں کا راستہ روکنے کے لیے کوئی ٹھوس طریق کار پارلیمنٹ کے سامنے رکھنا چاہیے۔ اس لیے کہ اگر پارلیمنٹ خود اپنے فیصلوں کا تحفظ نہ کر سکے تو اس ساری تگ و دو کا کیا فائدہ؟

گورنر پنجاب سلمان تاثیر کا قتل

(روزنامہ پاکستان، لاہور — ۹ جنوری ۲۰۱۱ء)

گورنر پنجاب سلمان تاثیر کے قتل پر میرا فوری ردعمل وہی تھا جو سابق صدر فاروق احمد لغاری مرحوم کی وفات پر صدر آصف علی زرداری کا تھا۔ اخباری رپورٹوں کے مطابق ایوانِ صدر کے عملے سے جب دریافت کیا گیا کہ فاروق احمد لغاری مرحوم کی وفات کی خبر پر صدر پاکستان کا ردعمل کیا تھا، جواب ملا کہ انہوں نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا پھر خاموشی اختیار کر لی۔ میں الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں اپنے معمول کے کاموں میں مصروف تھا کہ عالمی مجلسِ تحفظِ ختمِ نبوت (گوجرانوالہ) کے رہنما جناب عثمان عمر ہاشمی نے فون پر اطلاع دی کہ ٹی وی چینلز پر بریکنگ نیوز کے عنوان سے پٹی چل رہی ہے کہ گورنر پنجاب سلمان تاثیر کو اسلام آباد میں ان کے اپنے ہی ایک محافظ نے قتل کر دیا ہے۔ میں نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور خبر کی تفصیلات معلوم کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اگلے روز صبح جامعہ نصرۃ العلوم میں ترجمہ قرآن کریم کی کلاس کے بعد طلبہ نے گورنر پنجاب کے قتل پر میرا تاثر معلوم کرنا چاہا تو میں نے پنجابی کا ایک مصرعہ پڑھنے پر اکتفا کیا

ع دشمن مرے تے خوشی نہ کریے، سجناں وی مرجانا ہو

چند عوامی سوالات

تھوڑی دیر کے بعد ایک صاحب نے فون پر پوچھا کہ گورنر سلمان تاثیر کے جنازے میں شریک ہونا جائز ہے یا نہیں؟ میں نے جواب دیا کہ میں مفتی نہیں ہوں اور نہ ہی فتویٰ دینا میرا معمول ہے اس لیے یہ بات کسی مفتی صاحب سے دریافت کیجئے۔ اس پر مجھے ان صاحب کی طرف سے تند و تیز جملوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ شام کو ایک اور صاحب نے فون پر پوچھا کہ کیا قانون کو ہاتھ میں لینا جائز ہے؟ میں نے عرض کیا کہ نہیں قانون کو ہاتھ میں لینا درست نہیں ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ پھر ملک ممتاز قادری نے قانون کا راستہ کیوں اختیار نہیں کیا اور خود ہی گورنر کو قتل کرنے کی کاروائی کیوں کر ڈالی ہے؟ میں نے عرض کیا کہ اس بات کا جواب تو خود ملک ممتاز قادری ہی دے سکتا ہے لیکن ہو سکتا ہے اس کے ذہن میں یہ ہو کہ گورنر کے خلاف کوئی قانونی کاروائی تو ہو نہیں سکتی اس لیے اس نے اپنے جذبات کی تسکین کے لیے خود ہی کاروائی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہو۔

پاکستان میں سیکولر نظریات کے پرچار کا معاملہ

گورنر پنجاب سیکولر ذہن کے آدمی تھے جس کے اظہار میں انہیں کبھی کوئی باک نہیں رہا۔ جبکہ اے پی پی کے حوالے سے شائع ہونے والی ایک خبر کے مطابق برطانیہ میں پاکستان کے ہائی کمشنر جناب واجد شمس الحسن نے کہا ہے کہ سلمان تاثیر نے سیکولر جمہوریت، غریبوں کو بااختیار بنانے اور عورتوں و دیگر مظلوم طبقات کے حقوق کے لیے جان دی ہے۔

سیکولر ذہن اور سیکولر جمہوریت کا پرچار کرنے والے دانشور اور سیاسی رہنما اس ملک میں اور بھی ہیں اور ہمیشہ رہے ہیں۔ آبادی میں ان کا تناسب کتنا ہی کم کیوں نہ ہو مگر انہیں اپنی بات کہنے اور اپنے موقف کے لیے مہم چلانے کا حق ہمیشہ حاصل رہا ہے۔ قومی سیاسی منظر اور قومی پریس اس بات کا گواہ ہے کہ یہاں سیکولر جمہوریت کا پرچار اور سوسائٹی کے اجتماعی معاملات میں مذہب کے کردار کی نفی کرنے والے ہر دور میں اپنے موقف کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ سوسائٹی نے ان کی اس بات کو کبھی قبول نہیں کیا اور جب بھی سیکولر جمہوریت اور قومی و معاشرتی معاملات میں اسلام کے کردار کی ضرورت پر بات ہوئی ہے قوم کی غالب اکثریت نے فیصلہ اسلام کے معاشرتی کردار کی حمایت میں ہی دیا ہے۔ لیکن ذوق و سلیقے اور احترام و آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے سیکولر جمہوریت کی بات کرنے والوں کا راستہ کبھی نہیں روکا گیا اور انہیں ہر فورم پر اپنی بات کہنے کا موقع دیا گیا ہے۔

البتہ سلمان تاثیر صاحب کا معاملہ اس سے مختلف تھا کہ انہوں نے اختلاف کی حدود کا لحاظ نہیں رکھا۔ آسیہ مسیح کیس میں ان کا جیل میں جاکر ملزمہ سے ملنا اور پورے قانونی اور عدالتی پراسیس کو کراس کرتے ہوئے ملزمہ کو سیشن کورٹ کے فیصلے کے علی الرغم بری قرار دینا اور اس کی رہائی کے لیے کوشش کا اعلان کرنا لوگوں کو ہضم نہیں ہوا۔ اس پر عوام کے شدید ردِعمل کا اظہار نہ صرف سلمان تاثیر کی زندگی میں احتجاجی ریلیوں کی صورت میں ہوتا رہا بلکہ ان کے قتل کے بعد انہیں قتل کرنے والے ان کے اپنے ہی محافظ ملک ممتاز قادری کو جو عوامی پذیرائی ملی ہے وہ اس بات کی کھلی گواہی ہے کہ گورنر سلمان تاثیر کے اس عمل کو عوام میں قابلِ قبول بلکہ قابلِ برداشت نہیں سمجھا گیا۔ خاص طور پر یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اس اشتعال اور ردعمل کا اظہار صرف مذہبی حلقوں کی طرف سے نہیں ہوا بلکہ دیگر طبقات خاص طور پر وکلاء برادری بھی اس میں پیش پیش ہے۔

واقعہ کا پس منظر اور پیش منظر

تحفظِ ناموسِ رسالتؐ کے قانون کی حمایت و دفاع میں مختلف سطح کی بار کونسلوں نے قراردادیں پاس کی ہیں اور احتجاجی ریلیاں نکالی ہیں۔ اور ملک ممتاز قادری کو جس طرح اسلام آباد اور اس کے بعد ساہیوال بار نے حمایت اور کیس کی پیروی کا یقین دلایا ہے اس سے اس مسئلہ پر عوامی جذبات کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اسلام آباد بار ایسوسی ایشن نے ملک ممتاز قادری کا کیس خود لڑنے کا اعلان کیا ہے اور ساہیوال بار ایسوسی ایشن کی طرف سے وکلاء برادری کے معروف رہنما عبدالمتین چودھری ایڈووکیٹ نے اعلان کیا ہے کہ ملک ممتاز قادری کے خاندان کی کفالت ساہیوال کی وکلاء برادری کرے گی۔

جناب سلمان تاثیر کی طرف سے آسیہ مسیح کیس کے سلسلہ میں قانون کو ہاتھ میں لینے کے اس عمل کے بعد ان کے یہ ریمارکس بھی عوام کے اشتعال کو بڑھانے کا باعث بنے ہیں جن میں انہوں نے توہین رسالتؐ پر سزا کے قانون کو ''کالا قانون'' کہا ہے۔ مجھ سے اس سلسلہ میں پوچھا گیا کہ اس قانون کو ''کالا قانون'' کہنا توہین رسالتؐ کے زمرے میں آتا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ قانون کے مبینہ طور پر غلط استعمال کو روکنے کے لیے مناسب تدابیر و ترامیم کی بات ہو تو اس پر توہین رسالتؐ کا الزام لگانا غلط بات ہے۔ بلکہ بہت سے دینی حلقے بھی قانون کے مبینہ طور پر غلط استعمال کو روکنے کے لیے ایسی ترامیم کی حمایت کرتے ہیں جن سے نفسِ قانون متاثر نہ ہو اور توہینِ رسالتؐ پر موت کی شرعی سزا بحال اور مؤثر رہے۔ البتہ اصل قانون کو اور توہینِ رسالتؐ پر موت کی سزا بلکہ نفسِ سزا کو ''کالا قانون'' کہنا بہرحال توہینِ رسالتؐ ہی کے زمرے میں آتا ہے۔

بدقسمتی سے ملک میں ایسے افراد موجود ہیں جو توہینِ مذہب اور توہینِ رسالتؐ کو سرے سے جرم ہی تصور نہیں کرتے، اس پر سزا کو آزادیٔ رائے اور آزادیٔ مذہب کے حوالے سے انسانی حقوق کے منافی قرار دیتے ہیں اور اس پر ظالمانہ قانون اور کالا قانون ہونے کی پھبتی کستے رہتے ہیں۔ قانون کے غلط استعمال کو روکنے کے نام پر نفسِ قانون کی مخالفت اور اس پر طنز و استہزاء کو آزادیٔ رائے کے حوالے سے توہینِ رسالتؐ کی حوصلہ افزائی اور گستاخانِ رسالتؐ کو قانونی سرٹیفکیٹ مہیا کرنے کے علاوہ آخر اور کس عنوان سے تعبیر کیا جا سکتا ہے؟

جہاں تک قانون کو ہاتھ میں لینے کا تعلق ہے کوئی ذی شعور شہری اس کی حمایت نہیں کر سکتا اور اس حوالہ سے یہ واقعہ بہرحال افسوسناک اور لمحۂ فکریہ ہے جس کے اسباب و محرکات کو سامنے لانا حکومت کی ذمہ داری ہے۔ اس کے ساتھ اس کا یہ پہلو بھی سب کے سامنے رہنا چاہیے کہ مسلمانوں کا اسلام کے ساتھ تعلق صرف رسمی نہیں ہے بلکہ وہ اپنی تمام تر عملی کمزوریوں کے باوجود اسلام کے معاشرتی کردار پر

ایمان رکھتے ہیں اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ ان کی عقیدت و محبت ہر دور میں شک و شبہ سے بالاتر رہی ہے۔ اس لیے سیکولر حلقے اپنے موقف کا اظہار ضرور کریں مگر مسلمانوں کے جذبات کو بار بار آزمانے سے بہر حال گریز کریں کہ اس کا نتیجہ ہمیشہ ایک جیسا ہی رہے گا۔

تحفظِ ناموسِ رسالتؐ: شکریہ پیپلز پارٹی

(روزنامہ پاکستان، لاہور — ۲۲ فروری ۲۰۱۱ء)

پاکستان پیپلز پارٹی ایک بار پھر بازی لیتی دکھائی دے رہی ہے اور ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی روح دوبارہ اپنی پارٹی کے قلب و دماغ کو متوجہ کرتی نظر آ رہی ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کا کریڈٹ

ذوالفقار علی بھٹو مرحوم سے تمام تر اختلافات کے باوجود ان کا یہ کریڈٹ ہمیشہ غیر متنازعہ رہا ہے کہ انہوں نے

- ۱۹۷۳ء کے دستور میں پاکستان کی اسلامی نظریاتی شناخت کو قائم رکھا،
- قوم سے نفاذِ اسلام کا دستوری عہد کیا،
- عقیدۂ ختمِ نبوت کے تحفظ کا دیرینہ مسئلہ حل کیا،
- اسلامی سربراہ کانفرنس کا اہتمام کر کے عالمِ اسلام کو وحدت اور یکجہتی کا پیغام دیا،
- اور ایٹمی توانائی کے مسئلہ پر عالمی دباؤ کی پروا نہ کرتے ہوئے قومی خود مختاری اور ملی حمیت کا مظاہرہ کیا۔

پاکستان پیپلز پارٹی کے رجحانات اور سرگرمیاں

تحفظِ ناموسِ رسالتؐ کے مسئلہ پر پاکستان پیپلز پارٹی کے بعض رہنماؤں کے بیانات اور اس کے خلاف ان کی کمپین دیکھ کر ڈر لگ رہا تھا کہ شاید پی پی پی اپنے مرحوم بانی اور قائد کے اس کردار سے منحرف ہونے جا رہی ہے، لیکن ریمنڈ ڈیوس کے مسئلہ پر شاہ محمود قریشی اور تحفظِ ناموسِ رسالتؐ کے قانون کے بارے میں وزیر قانون بابر اعوان کے دوٹوک موقف نے ہمارے خوف اور خدشے کو دور کر دیا ہے اور دل کو تسلی ہونے لگی ہے کہ پی پی پی میں ابھی ایسے رہنما موجود ہیں جو ملی جذبات کو محسوس کرتے ہیں اور نہ صرف ان سے ہم آہنگ ہیں بلکہ ان کی ترجمانی کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔ آج کے گھمبیر حالات میں میرے جیسے نظریاتی کارکن کے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔

تحفظِ ناموسِ رسالتؐ کے قانون کے مسئلہ پر وزیراعظم کی خدمت میں وزیر قانون جناب بابر اعوان کی طرف سے پیش کی جانے والی سمری کی شہرت بہت دنوں سے سن رہا تھا اور مسلسل اس کی تلاش میں تھا،

گزشتہ روز چناب نگر میں مجلسِ احرارِ اسلام کی کانفرنس میں شرکت کے لیے حاضر ہوا تو ایک دوست سے اس کی کاپی مل گئی۔ بابر اعوان کے بارے میں یہ اطمینان تو تھا کہ وہ دینی معاملات میں ایک حد سے آگے جانے والے نہیں ہیں مگر یہ سمری پڑھ کر خوشی ہوئی کہ ناموسِ رسالتؐ کے حوالے سے ان کی آخری حد بھی وہی ہے جو پاکستان کے عام مسلمانوں اور دینی جدوجہد کرنے والے کارکنوں کی ہے، اور انہوں نے یہ حد کراس کرنے سے انکار کے ساتھ ساتھ وفاقی حکومت کو بھی اسی دائرے میں رکھنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔ جس پر سمری پیش کرنے والے وزیرِ قانون جناب بابر اعوان اور اسے منظور کرنے والے وزیراعظم سید یوسف رضا گیلانی پوری قوم کی طرف سے شکریہ اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔ یقیناً ان کے اس عمل سے جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی روحِ مبارک بھی خوش ہوگی۔ سمری میں جن امور کا جائزہ لیا گیا ہے وہ درج ذیل ہیں:

- تحفظِ ناموسِ رسالتؐ کے قانون کے سلسلہ میں مختلف شہریوں، اداروں اور غیر ملکیوں کی طرف سے وزیراعظم پاکستان کو موصول ہونے والے خطوط جو وزارتِ قانون قانون کو بھجوا دیے گئے۔
- وزارتِ داخلہ کی جانب سے بھیجا جانے والا ریفرنس۔
- قومی اسمبلی کے سیکرٹریٹ کی طرف سے بھیجا جانے والا ریفرنس۔
- اور توہینِ رسالتؐ کے قانون میں ترمیم کے لیے محترمہ شیری رحمان کی طرف سے قومی اسمبلی کے سیکرٹریٹ میں جمع کرایا جانے والا پرائیویٹ بل۔

تحفظِ ناموسِ رسالتؐ: وزارتِ قانون کی سمری

ان تمام ریفرنسز میں وزارت قانون سے اپنا موقف واضح کرنے اور اس سلسلہ میں پیشرفت کا تقاضا کیا گیا تھا جس کے جواب میں وزارت قانون نے تفصیل کے ساتھ اپنا موقف پیش کیا ہے۔ وزارتِ قانون کی طرف سے جوابی طور پر پیش کیے جانے والے اس ریفرنس میں تحفظِ ناموسِ رسالتؐ کے قانون کا مختلف حوالوں سے جائزہ لیا گیا ہے۔

۱. سب سے پہلے قرآن و سنت اور اسلامی روایات کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ کا فیصلہ یہی رہا ہے کہ گستاخِ رسالت کی سزا موت ہے اور مختلف مواقع پر آنحضرتؐ کے حکم سے یہ سزا دی گئی ہے۔

۲. پھر مختلف ممالک کے قوانین کا حوالہ دیا گیا ہے جن میں توہینِ مذہب اور مذہبی شخصیات کی بے حرمتی کو جرم قرار دیتے ہوئے ان پر سزا نافذ کی گئی ہے۔ ان ممالک میں افغانستان، آسٹریلیا، بنگلہ دیش، برازیل، کینیڈا، مصر، کویت، ملائیشیا، مالٹا، ہالینڈ، نیوزی لینڈ، نائجیریا، سعودی عرب، سوڈان، متحدہ عرب امارات، برطانیہ، یمن اور امریکہ کی بعض ریاستیں شامل ہیں۔ مثلاً برطانیہ کے قوانین کا تفصیل کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ توہینِ رسالتؐ کے قانون کے تحت ۱۹۷۷ء میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں توہین آمیز خاکہ شائع کرنے پر اخبار کے ایڈیٹر ڈینس لیمن کو سزا سنائی گئی اور اسے جرمانہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ جیل بھی جانا پڑا تھا۔ اسی طرح نیوزی لینڈ میں کرائم ایکٹ کی دفعہ ۱۲۳ کے تحت گستاخیٔ رسولؐ کو جرم قرار دیا گیا ہے اور جان لگوور نامی ایک ایڈیٹر کو اس کے تحت سزا دی جاچکی ہے۔ مذکورہ بالا تمام ممالک میں مذہب اور مذہبی شخصیات کی توہین جرم ہے اور اس جرم پر مختلف نوعیت کی سزائیں تجویز کی گئی ہیں، اس لیے پاکستان میں ناموس رسالتؐ کی توہین کو جرم قرار دینے اور اس پر سزا مقرر کرنے کا قانون عالمی روایات کے خلاف نہیں ہے۔

۳. اس کے بعد اس سمری میں پاکستان کے دستور و قانون کے حوالے سے تحفظِ ناموسِ رسالتؐ کے قانون کا جائزہ لیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ یہ قانون مکمل طور پر دستور کے مطابق ہے۔ اس سلسلہ میں سمری میں بیان کی گئی تمہید بطور خاص قابلِ توجہ ہے کہ پاکستان آئینی طور پر ایک اسلامی ریاست ہے اور ۱۲/اپریل ۱۹۷۳ء کو منظور کیے جانے والے آئین کے تحت ملک کا نام ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' ہے۔ آئین میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ صرف پاکستان میں نہیں بلکہ پوری کائنات میں حاکمیتِ اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کی ہے اور مملکتِ خداداد میں اللہ کے قانون کی حکمرانی کی ذمہ داری ریاست کی ہے۔ پاکستان میں کوئی قانون قرآن و سنت کے خلاف نہیں بنایا جاسکتا، حکومتِ وقت لوگوں کے جمہوری حقوق اور آئین کی پاسداری کے لیے تمام ایسے قانون بنانے کا حق رکھتی ہے جو قرآن و سنت سے مطابقت رکھتے ہوں۔ آئینِ پاکستان تقاضا کرتا ہے کہ پاکستان میں ایسا معاشرہ تشکیل دیا جائے جو قرآن و سنت کے مطابق زندگی بسر کرے اور اسلامی روح کے مطابق ملک کے اقلیتی طبقے اور غیر مسلموں کے حقوق کے تحفظ کی ذمہ دار بھی ریاست ہے۔

۴. جبکہ سمری کا اختتام اس پیراگراف پر ہوتا ہے کہ ان تمام حقائق کی روشنی میں توہینِ رسالتؐ کی سزا موت آئین کے آرٹیکل ۲۹۵ سی پاکستان پینل کوڈ ۱۸۶۰ اور قرآن و سنت کے عین مطابق ہے

اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی یا ترمیم کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے ایسے تمام پیراگراف جو مختلف ریفرنسز میں بیان کیے گئے ہیں وہ تمام قانون کی غلط تشریح پر مبنی ہیں جبکہ اس قانون پر عملدرآمد کے لیے پاکستان میں مؤثر عدالتی انصاف بھی موجود ہے جو آئینِ پاکستان، قرآن و سنت اور انصاف کے تمام تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔

۵. اس تفصیلی جائزہ کے ساتھ وزارتِ قانون نے وزارتِ اقلیتی امور کے ریفرنس اور محترمہ شیری رحمان کے پرائیویٹ بل سے اختلاف کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ تحفظِ ناموسِ رسالتؐ کے قانون میں کسی قسم کی تبدیلی یا ترمیم کی سرے سے کوئی ضرورت نہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ وزارتِ قانون نے اس ریفرنس کی صورت میں پاکستان کے کروڑوں مسلمانوں کے عقائد و جذبات کا تحفظ و ترجمانی کی ہے۔

اور اس کے ساتھ ہی سابق وزیر خارجہ جناب شاہ محمود قریشی نے بھی ریمنڈ ڈیوس کیس کے بارے میں زمینی حقائق کے خلاف موقف اختیار کرنے سے انکار کر دیا ہے اور کسی بھی قسم کے ملکی و غیر ملکی دباؤ کو مسترد کرتے ہوئے وہ پاکستانی عوام کے جذبات اور قومی حمیت کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ ہم ملکی صورتحال میں اس مثبت تبدیلی پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے ساتھ ساتھ وزیراعظم، وزیر قانون اور سابق وزیر خارجہ کا شکریہ ادا کرتے ہیں:

شکریہ جناب وزیراعظم سید یوسف رضا گیلانی۔
شکریہ جناب وزیر قانون بابر اعوان۔
شکریہ جناب شاہ محمود قریشی، سابق وزیر خارجہ۔

صدر مملکت کا ارشاد اور مبینہ دہشت گردی کے اصل اسباب

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ ـــ مارچ ۲۰۱۱ء)

روزنامہ پاکستان لاہور ۲۳ فروری ۲۰۱۱ء کی خبر کے مطابق صدر پاکستان جناب آصف علی زرداری نے جاپان کے تین روزہ سرکاری دورے کے موقع پر جاپانی سرمایہ کاروں کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ

> ''پاکستان میں کی جانے والی سرمایہ کاری سے دہشت گردی کے خاتمہ میں مدد ملے گی اور عالمی امن کو تقویت حاصل ہوگی۔''

جہاں تک پاکستان میں سرمایہ کاری کے لیے بیرونی سرمایہ کاروں کو توجہ دلانے کا مسئلہ ہے یہ ملکی معیشت کی ایک اہم ضرورت ہے اور اس کے لیے حکمرانوں کی کوششوں کو ہم سراہتے ہیں لیکن سرمایہ کاری کو دہشت گردی کے ساتھ نتھی کرنے کی بات ہمارے لیے ہمیشہ ناقابلِ فہم رہی ہے۔

عالمی قوتوں کی دھاندلی اور مغالطہ

دراصل عالمی قوتوں کو یہ مغالطہ ہے کہ جسے وہ دہشت گردی قرار دیتے ہیں اور اس کے خلاف جنگ کا بگل بجا کر انہوں نے اپنے سارے وسائل میدان جنگ میں جھونک دیے ہیں، اس کی اصل وجہ غربت ہے اور یہ فقر و فاقہ کے مارے ہوئے لوگ ہیں جو دولت کی تلاش میں دہشت گردی کا ارتکاب کرتے ہیں، اس لیے اگر پاکستان میں سرمایہ کاری کے ذریعے روزگار کی فراہمی کی صورت عام ہو جائے اور لوگوں میں خوشحالی کا ماحول پیدا کیا جا سکے تو اس مبینہ دہشت گردی کا زور کم کیا جا سکتا ہے اور لوگوں کو دہشت گردی اختیار کرنے سے روکا جا سکتا ہے۔

ہم نے متعدّد بار یہ عرض کیا ہے کہ یہ بات خود فریبی کے سوا کچھ نہیں ہے، اس لیے کہ مبینہ دہشت گردی کے اسباب میں غربت کا کوئی قابلِ ذکر کردار نہیں ہے بلکہ جس عمل کو دہشت گردی قرار دے کر اس کے خاتمہ کے لیے عالمی قوتیں کوشاں ہیں اس کی وجہ عقیدہ و ثقافت ہے اور عالمی قوتوں کی وعدہ خلافیاں اور فریب کاریاں اس کا اصل سبب ہیں۔

جن لوگوں کو دہشت گرد قرار دیا جا رہا ہے ان کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنی معاشرتی زندگی کو اپنے عقیدہ و ثقافت کے مطابق استوار کرنا چاہتے ہیں اور ریاستی و معاشرتی معاملات سے مذہب کی بے دخلی

کے مغربی فلسفہ کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، جبکہ ان کے ساتھ تاریخ کی یہ سب سے بڑی دھاندلی ہوئی ہے کہ افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف ان کی قوت سے بھرپور استفادہ کرنے کے بعد جب جہادِ افغانستان کے اصل ایجنڈے یعنی ملک میں نفاذِ شریعت کو بروئے کار لانے کا مرحلہ آیا تو مغربی قوتوں نے نہ صرف انہیں یہ حق دینے سے انکار کر دیا بلکہ مغربی ممالک پوری قوت کے ساتھ ان پر چڑھ دوڑے۔ اس شرمناک دھاندلی کے ردعمل میں افغانستان کے لوگ آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں جبکہ اردگرد کے بہت سے گروہوں نے غصے اور نفرت سے بھرپور اسی ردعمل میں ہتھیار اٹھا لیے ہیں جسے دہشت گردی قرار دے کر ان کے خلاف عالمی سطح پر جنگ لڑی جا رہی ہے۔ ان کے طریق کار سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے لیے اس صورتحال کے اصل اسباب و عوامل پر پردہ ڈال کر ہتھیار اٹھانے والے گروہوں کے جذبات کو معاشی اسباب کے ساتھ نتھی کرنا اور ان کے عقیدہ و ثقافت کو نظر انداز کر دینا سراسر ناانصافی اور ظلم کی بات ہے اور ہمارے خیال میں مغربی ملکوں کو مبینہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اب تک کوئی قابلِ ذکر کامیابی حاصل نہ ہونے کی ایک وجہ اصل حقائق اور اسباب کو ڈھٹائی کے ساتھ نظر انداز کر دینا بھی ہے۔

صدر جناب آصف علی سے گزارش

صدر پاکستان سے ہم یہ گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ مبینہ دہشت گردی کو غربت کے ساتھ نتھی کر کے معاشی سہولتوں کی فراہمی کو اس مسئلہ کا حل بتانا مغرب کی خود فریبی اور مغالطہ کاری ہے، اسلامی جمہوریہ پاکستان کے حکمرانوں کو توکم از کم اس فریب کاری کا شکار نہیں ہونا چاہیے اور شترمرغ کی طرح ریت میں سر دے کر معروضی حقائق سے منہ نہیں پھیرنا چاہیے۔ پاکستان کے حکمرانوں سے زیادہ اس حقیقت سے کون واقف ہے کہ جن لوگوں کو دہشت گرد قرار دیا جا رہا ہے، ان کا اصل مسئلہ غربت اور افلاس نہیں بلکہ عقیدہ و ثقافت ہے اور ان کے عقیدہ و ثقافت کو تحفظ و احترام فراہم کیے بغیر مبینہ دہشت گردی کے کمزور پڑنے کا سرے سے کوئی امکان نہیں ہے، اس حقیقت کو عالمی طاقتیں اور ان کے ہمنوا جتنی جلدی سمجھ لیں خود ان کے لیے بہتر ہو گا۔

خواتین کے حقوق کا بل

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ — جنوری ۲۰۱۲ء)

روزنامہ اسلام لاہور (۲۳ دسمبر ۲۰۱۱ء) کی ایک خبر کے مطابق صدر آصف علی زرداری نے قومی اسمبلی اور سینٹ کے منظور کردہ خواتین کے حقوق کے بل پر دستخط کر دیے ہیں جس سے یہ بل قانون کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ یہ قانون پارلیمنٹ کے منظور کردہ دو مسودوں پر مشتمل ہے جس کے مطابق:

- خواتین کی جبری شادی پر ۳ سے ۷ سال کی سزا ہوگی۔
- خواتین کو وراثت سے محروم کرنے پر ۵ سے ۱۰ سال سزا ہوگی اور دس لاکھ روپے جرمانہ ہوگا۔
- خواتین پر تیزاب پھینکنے کی سزا ۱۴ سال قید اور دس لاکھ روپے جرمانہ مقرر کی گئی ہے۔
- قرآن سے شادی کرانے پر ۳ سے ۷ سال سزا اور پانچ لاکھ روپے جرمانہ ہوگا، وغیر ذلک۔

خواتین کے حقوق کے حوالہ سے ایک عرصہ سے ملک میں بحث و تمحیص کا سلسلہ جاری ہے اور پارلیمنٹ اس سلسلہ میں متعدد قوانین کی مختلف ادوار میں منظوری دے چکی ہے جن میں اسلامی حوالوں سے مثبت اور منفی دونوں قسم کے قوانین شامل ہیں۔

جنرل پرویز مشرف کے دور میں ”حدود آرڈیننس“ میں ترامیم

جنرل پرویز مشرف کے دور میں جب ”حدود آرڈیننس“ میں ترامیم کی گئیں تو سرکردہ علماء کرام کی ایک کمیٹی قائم ہوئی تھی جس میں راقم الحروف بھی شامل تھا، ہم نے اس ترمیمی مسودہ میں شامل بعض شقوں کو اپنی تحریری سفارشات میں قرآن و سنت کے منافی قرار دیا تھا مگر ان سفارشات کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے وہ بل منظور کر لیا گیا اور حدودِ شرعیہ کا حلیہ بگاڑ دیا گیا۔ اس موقع پر ہم نے اپنی سفارشات میں یہ بھی لکھا تھا کہ پاکستانی عورت کی مظلومیت اور حقوق و مسائل کو مغربی معاشرہ کے تناظر میں دیکھا جا رہا ہے جو غیر منطقی بات ہے، پاکستانی خواتین کے حقوق و مسائل کو پاکستانی معاشرے کے تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے اور اسے جو حقیقی مسائل و مشکلات درپیش ہیں ان کو حل کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔

پاکستانی ماحول اور معاشرے میں خواتین کی مظلومیت اور ان کو درپیش مسائل و مشکلات کے حوالہ سے ہماری گزارش یہ تھی کہ یہاں عورت کو وراثت میں اس کا حصہ عام طور پر نہیں ملتا بلکہ اکثر اوقات مہر بھی نہیں ملتا، بالغ عورت کا نکاح اس کی مرضی کے بغیر جبراً کر دیا جاتا ہے، قرآن کریم کے ساتھ شادی کے

عنوان سے اسے شادی کے حق سے محروم کر دیا جاتا ہے اور بعض علاقوں میں اس کی خرید و فروخت بھی ہوتی ہے، وغیر ذلک۔

حقوقِ نسواں کے حوالے سے تمام قوانین پر نظرِ ثانی کی ضرورت

ہم سمجھتے ہیں کہ اس پس منظر میں پارلیمنٹ کا حال ہی میں منظور کیا جانے والا قانون خوش آئند ہے جس سے خواتین کو در پیش حقیقی مشکلات کو کم کرنے میں مدد ملے گی، لیکن بات ابھی مکمل نہیں ہوئی اور ہمارے نزدیک عائلی قوانین اور خواتین کے حقوق کے بارے میں اب تک منظور کیے جانے والے تمام قوانین پر اس از سرِ نو غور کرنے کی ضرورت ہے، خصوصاً دو حوالوں سے ان کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

- وہ قوانین جو مغربی معاشرے کے تناظر کو سامنے رکھ کر پاکستانی عورت کے حقوق کے عنوان سے منظور کیے گئے ہیں اور ان میں قرآن و سنت کی تعلیمات اور شرعی احکام کو نظر انداز کر کے مغربی لابیوں اور حکومتوں کے بے جا تقاضوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے، ان پر نظر ثانی خود پاکستان کے ریاستی مذہبِ اسلام کی تعلیمات کا تقاضہ ہے۔
- جبکہ پاکستانی معاشرہ اور قبائلی و علاقائی روایات کے تناظر میں عورتوں کی مظلومیت اور حقوق و مسائل کا شرعی نقطۂ نظر سے بھرپور جائزہ لے کر قرآن و سنت کی روشنی میں ایک جامع رپورٹ مرتب کرنے اور اس کی بنیاد پر قانون سازی کا اہتمام کرنے کی ضرورت ہے۔

خواتین کے حوالے سے معاشرتی رویوں کی اصلاح کی ضرورت

ہمارے معاشرہ میں عورت کی مظلومیت کے بہت سے پہلو ہیں جن کی نشاندہی ہونی چاہیے، مثلاً ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں عورت کا لفظ گالی کا عنوان بن گیا ہے اور ایک دوسرے کو دی جانے والی گالیوں کا پچانوے فیصد حصہ عورت کے حوالہ سے ہوتا ہے۔ گالی بذاتِ خود جرم اور گناہ ہے مگر ماں، بہن، بیٹی اور بھانجی جیسے مقدس رشتوں کو گالی کا عنوان بنا دینا تو گناہ در گناہ ہے کہ اس سے عورت کی تذلیل اور توہین بھی ہوتی ہے، اس قسم کی اور بھی بہت سی باتیں ہیں جو عورت کی مظلومیت اور تذلیل کا باعث ہیں۔

قومی سیاست میں حصہ لینے والی دینی جماعتیں اور علمی و دینی مراکز اگر اس قسم کے مسائل پر ہوم ورک اور تحقیق و تجزیہ کا اہتمام کر سکیں تو بہت سے ایسے مسائل کی نشاندہی ہو سکتی ہے جن کو حل کرنے سے ہم پاکستان کو عملی طور پر ایک اسلامی ریاست کی حیثیت دینے کی طرف پیشرفت کر سکتے ہیں۔

مواخذہ سے استثنا اور اسلامی تعلیمات

(روزنامہ پاکستان، لاہور — ۱۹ مارچ ۲۰۱۲ء)

وزیراعظم سید یوسف رضا گیلانی نے کہا ہے کہ سوئس عدالت کو خط لکھنا آئین کے آرٹیکل ۶ کی خلاف ورزی ہوگی جس کی سزا موت ہے، اس لیے وہ توہینِ عدالت میں سزا پانے کو ترجیح دیں گے جو چھ ماہ قید ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ وہ پی پی سے بے وفائی نہیں کریں گے اور اپنے ہی صدر کی پیٹھ میں چھرا نہیں گھونپیں گے۔

سوئس عدالت کو خط لکھنے کا معاملہ عجیب سی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ سپریم کورٹ کی واضح ہدایت کے باوجود وزیراعظم پاکستان، صدر آصف علی زرداری کے مقدمات کے حوالے سے سوئس عدالت کو خط لکھنے کے لیے تیار نظر نہیں آتے اور صدر کو آئینی طور پر حاصل مبینہ استثنا کو عنوان بناتے ہوئے اسے دستور کی خلاف ورزی قرار دے رہے ہیں۔

سپریم کورٹ کی ہدایت پر سوئس عدالت کو خط لکھنا دستور کی اس شق کی خلافت ورزی ہے یا نہیں، اس کے بارے میں دستوری ماہرین ہی کچھ کہہ سکتے ہیں اور خود سپریم کورٹ سے زیادہ دستور کے تقاضوں کو اور کون سمجھ سکتا ہے؟ اس لیے اس پہلو پر کچھ عرض کرنے کی بجائے ہم اس مسئلہ کے ایک اور پہلو کے بارے میں گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ عوام کے سامنے اپنی پوزیشن کو صاف رکھنا اور شکوک و شبہات کا ازالہ کر کے لوگوں کو مطمئن کرنا ایک اخلاقی تقاضا ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیمات اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و ہدایات کا منشا بھی ہے۔ کیونکہ کسی بھی معزز شخص کے لیے مناسب بات یہی ہوتی ہے کہ وہ جرم پر مواخذہ سے حاصل کسی استثنا کی آڑ لینے کی بجائے اصل جرم کے بارے میں اپنی پوزیشن صاف کرے کہ وہ مبینہ جرم اس سے سرزد ہوا ہے یا نہیں؟

عوامی بدگمانی کے حوالے سے سنتِ نبویؐ

جہاں تک اپنی پوزیشن کو لوگوں کی نظروں میں صاف رکھنے کا تعلق ہے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ گرامی ہماری رہنمائی کے لیے کافی ہے کہ "اتقوا مواضع التہم" تہمت کے مقامات سے بچو اور اپنے آپ کو خواہ مخواہ تہمت، الزام اور شک کا نشانہ بننے سے بچاؤ۔ خود آنحضرتؐ کا یہ واقعہ احادیثِ صحیحہ میں مذکور ہے کہ آپؐ ایک بار رمضان المبارک میں مسجد میں اعتکاف بیٹھے ہوئے تھے کہ آپؐ کی اہلیہ

محترمہ ام المؤمنین حضرت صفیہؓ عشاء کے وقت آپ سے ملاقات کے لیے آئیں اور ضروری بات چیت کے بعد جب واپس جانے لگیں تو حضورؐ انہیں رخصت کرنے کے لیے مسجد کے دروازے تک گئے جہاں دو حضرات نے ان دونوں کو کھڑے دیکھ لیا۔ نبی کریمؐ نے انہیں آواز دے کر بلایا اور فرمایا کہ یہ میری بیوی صفیہؓ ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہمیں تو نعوذ باللہ کسی اور بات کا وہم بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ نہیں ہوگا مگر شیطان ہر شخص کے ساتھ ہوتا ہے، وہ تمہیں کسی بھی وسوسے کا شکار بنا سکتا ہے، اس لیے میں نے تمہیں بدگمانی کے امکان سے بچانے کے لیے یہ وضاحت کرنا ضروری سمجھی ہے کہ جس خاتون کو تم نے اندھیرے میں میرے ساتھ کھڑے دیکھا ہے وہ میری اپنی بیوی صفیہؓ ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی اور عمل مبارک میں ہم سب کے لیے یہ سبق اور ہدایت موجود ہے کہ کسی شک یا بدگمانی کا امکان نظر آنے پر اس سے بے پروا ہو جانا درست طرز عمل نہیں ہے بلکہ شک کے ماحول سے نکلنا اور اپنی پوزیشن کو واضح کرنا ہی سنتِ نبویؐ ہے۔

مواخذہ سے استثنا اور سنتِ نبویؐ

جرم کے مواخذے سے استثنا اور اس کا سہارا لینا بھی اسلامی تعلیمات اور جناب رسول اکرمؐ کی سنتِ مبارکہ سے مطابقت نہیں رکھتا۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ جب بنو مخزوم کی خاتون فاطمہؓ کے چوری کرنے پر اسے ہاتھ کاٹنے کی سزا سے بچانے کے لیے حضرت اسامہ بن زیدؓ نے حضورؐ سے اس خاتون کی سفارش کی تو آپؐ نے سخت غصے کا اظہار فرمایا اور حضرت اسامہؓ کو یہ کہہ کر ڈانٹ دیا کہ اللہ تعالیٰ کی حدود میں سے ایک حد کے معاملے میں سفارش کر رہے ہو؟ اس موقع پر جناب نبی اکرمؐ نے مسجد نبویؐ میں خطبہ ارشاد فرمایا اور کہا کہ تم سے پہلی قوموں کی بربادی کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ سوسائٹی کے بڑے لوگ جرم کرتے تھے تو انہیں سزا نہیں دی جاتی تھی لیکن عام اور غریب لوگ جرم کی سزا کے حقدار قرار پاتے تھے۔ اس لیے جرم پر مواخذہ اور اس کی سزا سے کسی بڑے سے بڑے شخص کے استثنا کو اسلامی تعلیمات میں جواز کا درجہ حاصل نہیں ہے۔

خود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ یہ ہے کہ ایک موقع پر رسول اکرمؐ نے اپنے ایک صحابی کے ننگے بدن پر کھجور کی ٹہنی سے ضرب لگائی تو اس کے جسم پر خراش آگئی۔ اس نے آنحضرتؐ سے بدلے کا تقاضا کیا تو کسی استثنا اور پروٹوکول کا سہارا لیے بغیر اسی مجلس میں آپؐ نے وہی کھجور کی ٹہنی اس صحابیؓ کے ہاتھ میں دے کر اپنی کمر بدلے کے لیے اس کے آگے کر دی۔ حضرات خلفائے راشدینؓ کا طرز عمل بھی یہی رہا ہے کہ انہوں نے کسی مقدمہ میں مطلوب ہونے پر پروٹوکول یا استثنا کا حوالہ دینے کے بجائے

خود کو عدالت کے حوالے کر دیا۔ امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قاضی شریح کی عدالت میں خود پیش ہونا ایک مشہور واقعہ ہے۔

’’چاہِ یوسف کی صدا‘‘

پھر ’’چاہ یوسف کی صدا‘‘ کے مصنف جناب سید یوسف رضا گیلانی یقیناً اس بات سے بے خبر نہیں ہوں گے کہ سیدنا حضرت یوسف علیہ السلام کے سالہا سال جیل میں رہنے کے بعد جب عزیز مصر کی طرف سے انہیں رہا کر دینے کا حکم جاری ہوا اور سرکاری کارندے حضرت یوسف علیہ السلام کو رہا کرانے کے لیے جیل میں پہنچے تو قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام نے رہا ہونے سے انکار کر دیا۔ فرمایا کہ رہائی سے پہلے اس معاملہ میں میری پوزیشن صاف کرو جس کے الزام میں مجھے جیل میں ڈالا گیا تھا، چنانچہ ان عورتوں کو طلب کیا گیا اور حضرت یوسف علیہ السلام کو جیل میں ڈالنے کا سبب بننے والے کیس کی از سر نو انکوائری ہوئی جس میں عزیزِ مصر کی بیوی زلیخا نے واضح اعتراف کیا کہ اس معاملہ میں قصور اس کا تھا اور حضرت یوسفؑ بالکل بے قصور تھے، تب حضرت یوسفؑ نے جیل سے رہائی قبول کی۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ کسی جرم پر مواخذے سے استثنا حاصل ہونے کی رٹ لگائے چلے جانا نہ تو اسلامی تعلیمات سے مطابقت رکھتا ہے اور نہ ایسا کرنے والے حضرات دنیا کو پاکستان کے دستور کے بارے میں کوئی اچھا پیغام دے رہے ہیں۔ دنیا کے سامنے یہ بات بار بار دہرانا کہ دستور پاکستان کسی جرم پر مواخذہ کرنے کے بجائے بڑی شخصیات کے جرائم پر پردہ ڈالنے اور انہیں مواخذے سے بچانے میں معاون بنتا ہے، بہرحال کوئی اچھا پیغام نہیں ہے۔

سزائے موت کا مسئلہ: پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ کا موقف

(روزنامہ اسلام، لاہور —۵ ستمبر ۲۰۱۳ء)

ثناء نیوز کے حوالہ سے شائع ہونے والی ایک خبر کے مطابق سندھ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس جناب جسٹس مشیر عالم نے قانون نافذ کرنے والے اداروں کی جانب سے ماتحت عدالتوں سے انصاف نہ ملنے کے تاثر کو مسترد کرتے ہوئے کہا ہے کہ سزائے قید کے قیدیوں کو سزا ضرور ملنی چاہیے۔ کراچی کے نجی سکول کی تقریب کے بعد میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے چیف جسٹس سندھ ہائی کورٹ نے کہا کہ اعلیٰ اور ماتحت عدالتیں اپنی ذمہ داریاں بخوبی سرانجام دے رہی ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اگر تفتیش صحیح خطوط پر ہو تو ملزمان سزا سے نہیں بچ سکتے۔

سزائے موت کے قیدیوں کو سزا ملنی چاہیے یا نہیں، یہ مسئلہ آج کل قومی اور عالمی سطح پر زیر بحث ہے اور عالمی فورم پر سزائے موت کو سرے سے ختم کر دینے کی مہم کے پس منظر میں ہمارے ہاں بھی نہ صرف یہ کہ سزائے موت کو تمام قوانین سے نکال دینے کی بات ہو رہی ہے بلکہ عملاً بھی کم و بیش ایک عشرہ سے سزائے موت پر عملدرآمد معطل ہے اور سزائے موت کے کسی ثابت شدہ مجرم کو بھی یہ سزا نہیں دی جا رہی۔

گزشتہ دنوں یہ خبر منظر عام پر آئی تھی کہ صدر آصف علی زرداری نے موجودہ حکومت سے کہا ہے کہ پچھلے پانچ سال کے دوران پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت نے پارٹی پالیسی کے تحت سزائے موت پر عملدرآمد روکے رکھا تھا، اس بنا پر وہ نہیں چاہتے کہ ان کی صدارت کے دوران کسی مجرم کو سزائے موت دی جائے، اس لیے موجودہ حکومت اگر کسی مجرم کو پھانسی دینا چاہتی ہے تو وہ نئے صدر کے حلف اٹھانے کا انتظار کرے۔ جبکہ موجودہ حکومت کی طرف سے بھی یہ خبر آچکی ہے کہ وہ سزائے موت پر عملدرآمد پر پابندی کو جاری رکھے گی۔

سزائے موت ختم کرنے کے سلسلہ میں اقوامِ متحدہ کی قرارداد

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے کچھ عرصہ قبل ایک اکثریتی قرارداد کے ذریعہ دنیا کے ممالک سے کہا تھا کہ وہ اپنے قوانین میں سزائے موت کو ختم کر دیں۔ جبکہ یہ مہم اس سے قبل بھی ایک عرصہ سے جاری ہے جس پر بعض ممالک نے پیشرفت بھی کی ہے لیکن بہت سے ممالک میں جن میں پاکستان بھی شامل ہے، متعدّد

جرائم میں موت کی سزا مقرر ہے۔ مثلاً پاکستان میں قتلِ عمد، توہینِ رسالتؐ اور بغاوت جیسے سنگین جرائم پر موت کی سزا کا قانون نافذ ہے اور ان سزاؤں کی بنیاد قرآن و سنت کے صریح احکام پر ہے جن میں مذکورہ اور اس نوعیت کے دیگر جرائم میں موت کی سزا کا حکم دیا گیا ہے۔

سزائے موت، اسلامی تعلیمات کی روشنی میں

قصاص کے قانون کے تحت جان کے بدلے جان کا ضابطہ قرآن کریم نے صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور یہ قانون بائبل میں بھی اسی طرح موجود ہے جس طرح قرآن کریم نے اس کا ذکر کیا ہے بلکہ قرآن کریم نے اسے حکم کے طور پر بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۸ میں ہے کہ:

"اے ایمان والو! تم پر قصاص کا قانون فرض کیا گیا ہے۔"

اس سلسلہ میں یہ بات بطور خاص قابلِ توجہ ہے کہ یہ حکم انہی آیات کے ساتھ بیان ہوا ہے جن میں مسلمانوں پر روزے فرض کیے گئے ہیں اور دونوں حکموں کے الفاظ ایک جیسے ہیں کہ:

"اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں۔"

اس کا مطلب واضح ہے کہ مسلمانوں کے لیے قصاص کا قانون اسی طرح فرض کا درجہ رکھتا ہے جس طرح رمضان المبارک کے روزے ان پر فرض کیے گئے ہیں اور اس کے ضمن میں قرآن کریم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ:

"اے اہل دانش! تمہارے لیے قصاص کے قانون میں زندگی ہے۔"

یعنی معاشرے میں امن کی ضمانت اس سے حاصل ہوگی کہ جان کے بدلے جان کا قانون نافذ کیا جائے، اسی طرح بغاوت کے جرم میں موت کی سزا ہمارے ملک کے قانون کا حصہ ہے جو بہت سے دیگر ملکوں میں بھی اسی طرح دستور و قانون کا حصہ ہے۔

ہمارے ہاں ایک عرصہ سے یہ مہم جاری ہے کہ توہینِ رسالتؐ کے سنگین جرم پر موت کی سزا کو ختم کر دیا جائے۔ حتیٰ کہ بہت سے مغربی حلقے توہینِ رسالتؐ کو سرے سے "جرم" تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں بلکہ اس جرم کی سرپرستی کے لیے انسانی حقوق کا ٹائٹل استعمال کر کے اسے حقوق کی فہرست میں شمار کیا جا رہا ہے۔ لیکن پاکستانی قوم نے مکمل اتحاد کے ساتھ اس ناروا مطالبے کو متعدّد بار مسترد کیا ہے جس کا اظہار ایک سے زیادہ مرتبہ قومی یکجہتی کی صورت میں ہو چکا ہے۔ چنانچہ ان حلقوں نے پینترا بدل کر سرے سے سزائے موت کے قانون کو ہی ختم کرنے کی مہم شروع کر رکھی ہے جو قومی حلقوں کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔

پاکستان پیپلزپارٹی اور پاکستان مسلم لیگ (ن) کا موقف

اس سلسلہ میں ہمارے لیے دو باتیں انتہائی فکر انگیز اور قابلِ توجہ ہیں:

۱. ایک یہ کہ صدر آصف علی زرداری کا یہ ارشاد کہ ان کے دور میں سزائے موت پر عملدرآمد معطل رہا ہے، یہاں تک تو بات قابلِ فہم تھی کہ بین الاقوامی دباؤ کے تحت حکومتی مجبوریوں میں یہ بات شامل تھی، لیکن ان کا یہ ارشاد مستقل سوالیہ نشان ہے کہ ایسا "پارٹی پالیسی" کے تحت ہوتا رہا ہے۔ پاکستان پیپلزپارٹی اسلام کو اپنا دین کہتی ہے اور دین کی سب سے بڑی بنیاد قرآن کریم میں قصاص کے قانون کا صراحت کے ساتھ حکم دیا گیا ہے۔ کیا پاکستان پیپلزپارٹی نے خدانخواستہ اسلام سے دستبرداری اور قرآن کریم کے صریح احکام سے انحراف کو پارٹی پالیسی کے طور پر اختیار کر لیا ہے؟ اس سوال کا جواب پاکستان پیپلزپارٹی کی قیادت کے ذمہ ہے اور اسے زور یا بدیر عوامی سطح پر اس سوال کا سامنا کرنا ہوگا۔

۲. جبکہ اس سے کہیں زیادہ حیرت انگیز بیان پاکستان مسلم لیگ (ن) کی حکومت کے ایک سرکاری ترجمان کا ہے کہ "سزائے موت پر پابندی کی پالیسی جاری رہے گی"۔ پاکستان مسلم لیگ تحریکِ پاکستان کی علمبردار کہلاتی ہے اور پاکستان کی بانی جماعت ہونے کا ٹائٹل رکھتی ہے، جبکہ پاکستان مسلم لیگ نے ہی خان لیاقت علی خان مرحوم کے دور میں دستورِ ساز اسمبلی سے قراردادِ مقاصد منظور کرا کے قوم سے وعدہ کیا تھا کہ پاکستان میں وہی قوانین نافذ ہوں گے جو اللہ تعالیٰ اور ان کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے مطابق ہوں گے۔

اس لیے سزائے موت پر پابندی کو جاری رکھنے کے سرکاری اعلان پر دو اصولی سوالات پیدا ہوتے ہیں:

۱. ایک یہ کہ اگر سزائے موت پر پابندی، ڈرون حملوں اور دیگر بہت سے معاملات پر مشرف دور کی پالیسیوں کا تسلسل ہی جاری رہنا ہے تو پھر انتخابات، عوامی مینڈیٹ اور حکومت کی تبدیلی کے اس تکلف بلکہ ڈھونگ کی کیا ضرورت تھی جو گزشتہ دونوں انتخابات میں روا رکھا گیا ہے۔

۲. اور دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا پاکستان مسلم لیگ بھی "قراردادِ مقاصد" سے انحراف کی راہ پر چل نکلی ہے؟

لاہور کے ممتاز وکلاء کا بیان

اس پس منظر میں ہمیں لاہور کے ممتاز وکلاء جناب شہزاد حسن شیخ، سید اسد عباس زیدی، جناب ساجد بشیر شیخ، جناب قاسم حسن بٹر، کامران بشیر مغل، چودھری ندیم احمد اور محترمہ فضائلہ فرحین رانا کے اس بیان سے مکمل اتفاق ہے جو ۱۹اگست کو ایک قومی اخبار نے ان الفاظ میں شائع کیا ہے کہ:

> ''پاکستان میں سزائے موت کو ختم کرنے اور پھانسی کی سزاؤں پر عملدرآمد کو روکنے کے لیے انٹرنیشنل ہیومن رائٹس کے صدر کی جانب سے حکومت پاکستان کو لکھے جانے والے خط پر اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے ممتاز وکلاء نے کہا ہے کہ اسلام نے جان کے بدلے جان کا حکم دیا ہے اور قاتل کو سزائے موت دینا فساد فی الأرض کو روکنا ہے اور قرآن ہمیں جان کے بدلے جان اور خون کے بدلے خون کا قانون دیتا ہے۔ لہٰذا کسی بھی غیر ملکی این جی او، اور غیر اسلامی این جی اوز کے کہنے پر ملک میں سزائے موت ختم کرنا اور پھانسی کی سزا کو روکنا قرآن و حدیث کے منافی اقدام ہوگا جس کی اسلام ہمیں ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ اسلام کے بتائے ہوئے اصولوں پر عمل کرنے والے کا نام ہی مسلمان ہے اور اگر ہم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے بتائے ہوئے اصولوں کی خلاف ورزی کریں گے تو پھر ہمیں مسلمان کہلوانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ لہٰذا ملک سے سزائے موت کو ختم کرنا نہ صرف فساد فی الارض کو تحفظ دینا ہے بلکہ اللہ کے قانون اور شریعت سے انحراف کرنا ہے جو کسی حال میں بھی کسی اسلامی مملکت کو زیب نہیں دیتا۔''

ہماری پاکستان مسلم لیگ اور پاکستان پیپلز پارٹی کی قیادتوں سے گزارش ہے کہ وہ ''مولویوں'' کی بات بے شک نہ سنیں کہ اس سے بین الاقوامی چودھریوں کی پیشانیاں شکن آلود ہوجاتی ہیں لیکن جسٹس مشیر عالم اور لاہور کے ممتاز وکلاء کی بات تو کم از کم سن لیں جو ملک کے نظریاتی تشخص کے تحفظ اور فساد فی الارض کو روکنے کی دہائی دے رہے ہیں۔

اسلامی نظریاتی کونسل:
پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کے راہنماؤں کا مطالبہ

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ ــ فروری ۲۰۱۴ء)

گزشتہ دنوں سینٹ آف پاکستان میں پاکستان پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کے راہنماؤں نے اسلامی نظریاتی کونسل کو غیر ضروری قرار دیتے ہوئے اسے ختم کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ روزنامہ پاکستان لاہور میں ۲۱ جنوری کو شائع ہونے والی رپورٹ کے مطابق ان دونوں سیاسی جماعتوں کی طرف سے کہا گیا ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل جنرل ضیاء الحق مرحوم کے دور کی باقیات میں سے ہے اور اپنا کام مکمل کر چکی ہے اس لیے اس کے باقی رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

دستورِ پاکستان ۱۹۷۳ء کے تحت کونسل کا قیام اور مقاصد

اسلامی نظریاتی کونسل ۱۹۷۳ء کے دستور کے مطابق اس لیے وجود میں آئی تھی کہ اسلامی علوم اور جدید قانونی تعلیم کے ماہرین پر مشتمل ایک ایسا آئینی فورم موجود ہونا چاہیے جو حکومت اور عوام کو درپیش مختلف مسائل میں تحقیق اور مطالعہ کے بعد اسلامی تعلیمات کی روشنی میں راہنمائی فراہم کرے اور ملک میں مروجہ قوانین کا جائزہ لے کر انہیں اسلامی تعلیمات کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے سفارشات مرتب کرے۔

اسلامی نظریاتی کونسل میں ہر دور میں ملک کے ممتاز علماء کرام، مختلف مکاتبِ فکر کے فقہی ماہرین اور جدید قانون کے نامور اسکالرز شامل رہے ہیں اور انہوں نے مختلف ادوار میں قومی و معاشرتی مسائل میں حکومت اور عوام کی راہنمائی کا فریضہ مسلسل سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ ملک میں مروجہ قوانین کا جائزہ لے کر انہیں اسلامی تعلیمات کے مطابق بنانے کے لیے سفارشات کی ایک جامع رپورٹ حکومت کو پیش کی ہے۔ اس لیے کسی مسئلہ پر اسلامی نظریاتی کونسل کی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے آئینی کردار اور محنت و کاوش سے صَرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔

کونسل کی سفارشات کے مطابق قانون سازی کا مطالبہ

یہی وجہ ہے کہ ملک کے دینی حلقوں کی طرف سے مسلسل یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ دستور کے مطابق اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کو قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں پیش کر کے ان کے مطابق قانون سازی کی جائے جس کے لیے دستور خود حکومت کو پابند بناتا ہے۔ مگر اس دستوری تقاضے کو پورا کرنے کی بجائے سرے سے اسلامی نظریاتی کونسل کے وجود اور اس کی ضرورت و افادیت کو ہی متنازعہ بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے جو انتہائی افسوسناک بات ہے۔

یہ کہنا کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی ضرورت نہیں رہی، زمینی حقائق سے انحراف کے مترادف ہے، اس لیے کہ جب تک کونسل کی سفارشات کو متعلقہ منتخب ایوانوں میں پیش کر کے ان کے مطابق قانون سازی کا کام مکمل نہیں کر لیا جاتا اس وقت تک کونسل کا وجود اس دستوری ضروریات کے ناگزیر تقاضے کی حیثیت رکھتا ہے۔ جبکہ ملک کے قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے علاوہ پیش آمدہ مسائل میں حکومت اور عوام کی راہنمائی کا کام ایک مستقل قومی ضرورت ہے، اس لیے جب تک دستور موجود ہے یہ ضرورت بھی باقی رہے گی اور اسلامی نظریاتی کونسل کی ضرورت اور کردار سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

کونسل کے خلاف افسوسناک مہم

اسی طرح اسلامی نظریاتی کونسل کو جنرل ضیاء الحق مرحوم کی باقیات قرار دینا حقائق کے یکسر منافی ہے، اس لیے جنرل ضیاء الحق مرحوم کے برسراقتدار آنے سے پہلے بھی یہ دستوری ادارہ موجود تھا کیونکہ اس کا آغاز ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی حکومت کے دور میں ۱۹۷۳ء کے دستور کے نفاذ کے ساتھ ہی ہو گیا تھا۔

اس بنا پر ہم پاکستان پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کے راہنماؤں سے گزارش کریں گے کہ وہ دستور اور اس کے ناگزیر تقاضوں سے انحراف کی راہ اختیار نہ کریں بلکہ اسلامی نظریاتی کونسل نے اب تک ملکی قوانین کو اسلامی تعلیمات کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے جو سفارشات پیش کی ہیں انہیں اسمبلیوں میں لا کر ان کے مطابق قانون سازی کا اہتمام کریں۔ خاص طور پر ہم عرض کریں گے کہ پیپلز پارٹی اگر اپنے بانی جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے دورِ حکومت میں بننے والے دستور اور اس کے تحت قائم ہونے والے اداروں کی نفی شروع کر دے گی تو خود اس کا سیاسی تسلسل اور بھٹو مرحوم کے ساتھ اس کی وفاداری سوالیہ نشان بن کر رہ جائے گی، اس لیے اسلامی نظریاتی کونسل کو ختم کرنے کا مطالبہ پی پی پی کے فورم سے قطعی طور پر ناقابلِ فہم ہے اور پی پی پی کی قیادت کو اس سلسلہ میں اپنی پوزیشن واضح کرنی چاہیے۔

دستورِ پاکستان:
بلاول بھٹو اور شاہد اللہ شاہد کے بیانات پر ایک نظر

(روزنامہ اسلام، لاہور — ۲۳ فروری ۲۰۱۴ء)

پاکستان پیپلز پارٹی کے سرپرستِ اعلیٰ بلاول بھٹو کا کہنا ہے کہ دستورِ پاکستان کی کوئی شق غیر اسلامی نہیں ہے۔ جبکہ کالعدم تحریکِ طالبان کے ترجمان شاہد اللہ شاہد کہہ رہے ہیں کہ آئین کی کوئی شق اسلامی نہیں ہے۔

انتہا پسندانہ موقف سے گریز کی ضرورت

ہمارے خیال میں یہ دونوں موقف انتہا پسندانہ ہیں اور اصل بات ان دونوں کے درمیان درمیان ہے۔ اول تو کسی چیز کو اسلامی یا غیر اسلامی قرار دینے کی اتھارٹی نہ بلاول بھٹو ہیں اور نہ ہی شاہد اللہ شاہد ہیں، بلکہ اس کی اتھارٹی ملک کے جمہور علماء کرام ہیں۔ اور اگر کوئی ابہام یا کنفیوژن پایا جاتا ہے تو اس سلسلہ میں اتحادِ تنظیماتِ مدارسِ دینیہ کو یہ کردار ادا کرنا چاہیے کہ وہ تمام مکاتبِ فکر کے ذمہ دار مفتیان کرام کو جمع کر کے کنفیوژن کو دور کرنے کی کوشش کرے۔ اس سے ہٹ کر شخصی، گروہی، جماعتی حتیٰ کہ مسلکی طور پر اختیار کیا جانے والا کوئی موقف بھی محض ایک رائے کی حیثیت رکھتا ہے اور ایسی کسی بھی رائے پر اصرار یا اسے بہر حال منوانے کی کوشش کنفیوژن کو بڑھانے اور ایک نئے خلفشار کو جنم دینے کا باعث بن سکتی ہے جس سے ہر اسلام پسند، محبِ وطن اور باشعور شخص کو گریز کرنا چاہیے۔

دستورِ پاکستان کی اسلامی حیثیت

جہاں تک دستورِ پاکستان کی اسلامی حیثیت کا تعلق ہے، ہم متعدد بار یہ عرض کر چکے ہیں کہ اس کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی حاکمیتِ اعلیٰ پر ہے اور قرآن و سنت کی بالادستی کو دستوری طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ قرآن و سنت کے احکام و قوانین کے نفاذ کا وعدہ کرتے ہوئے پارلیمنٹ کو قرآن و سنت کے منافی قانون سازی سے روک دیا گیا ہے۔ اس لیے اس نظریاتی اساس کے ہوتے ہوئے اسے غیر اسلامی دستور کہنا درست نہیں ہے۔ بالخصوص اس وجہ سے بھی کہ اس دستور کی تدوین میں مولانا مفتی محمودؒ، مولانا عبد الحقؒ، مولانا غلام غوث ہزارویؒ، مولانا عبد الحکیمؒ، مولانا نعمت اللہؒ، مولانا صدر الشہیدؒ، مولانا شاہ احمد نورانیؒ،

مولانا عبد المصطفیٰ ازہریؒ، مولانا محمد ذاکرؒ، مولانا ظفر احمد انصاریؒ اور پروفیسر غفور احمدؒ شریک رہے ہیں۔ جبکہ اس کے تحت حلف اٹھانے اور مختلف دستوری اداروں میں خدمات سرانجام دینے والوں میں مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ، علامہ شمس الحق افغانیؒ، مولانا حسن جانؒ، مولانا نور محمدؒ، مولانا محمد عبد اللہ شہیدؒ، پروفیسر ساجد میر، مولانا قاضی عبد اللطیفؒ، مولانا عبد الستار خان نیازیؒ، مولانا معین الدین لکھویؒ، قاضی حسین احمدؒ، مولانا گوہر رحمانؒ اور مولانا قاری سعید الرحمٰنؒ، جیسے اکابر علماء کرام شامل ہیں۔

دستور کی تعبیر اور اطلاق پر تحفظات

البتہ دستور کی مختلف تعبیرات اور ملکی نظام پر ان کے اطلاق کا مسئلہ ضرور غور طلب ہے اور اس کے حوالہ سے تحفظات کا ہر دور میں اظہار کیا جاتا رہا ہے۔ یہ تحفظات تعبیر اور اطلاق و تطبیق کے دائرہ کے ہیں جس کی ذمہ داری دستور کی اساس و بنیاد پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ بلکہ دستور کو استعمال کرنے والے اور اسے اس کی صحیح روح کے مطابق کردار ادا کرنے میں رکاوٹ پیدا کرنے والے طبقات اور اشخاص اس کے ذمہ دار ہیں۔

دستوری دفعات کی تعبیر اور ملکی نظام و قوانین پر ان کے اطلاق و تطبیق کے ضمن میں خود ہم نے متعدّد بار تحفظات کا اظہار کیا ہے جن میں سے مثال کے طور پر صرف دو کا ذکر اس مرحلہ میں مناسب سمجھتا ہوں:

”قرار دادِ مقاصد“ کی دستوری حیثیت

قرار دادِ مقاصد کو جب جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے اپنے دورِ حکومت میں دستور کا واجب العمل حصہ قرار دیا اور وہ دستور کا باقاعدہ حصہ بن گئی تو بہت سے قوانین کے بارے میں عدالتوں سے رجوع کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ان میں سے ایک یہ تھا کہ قصاص کے قانون میں قاتل کی سزا معاف کرنے کا اختیار صرف مقتول کے ورثاء کو ہے جبکہ ہمارے دستور میں یہ حق صدرِ مملکت کو بھی دیا گیا ہے۔ ہائی کورٹ میں اس قانون کے خلاف اپیل دائر ہوئی کہ صدر کو قاتل کی سزا معاف کرنے کا اختیار دینا غیر شرعی ہے اور چونکہ قرار دادِ مقاصد کی صورت میں شرعی قوانین کی بالادستی قبول کر لی گئی ہے اس لیے صدر کا یہ اختیار ختم کیا جائے۔

ہائی کورٹ نے یہ موقف تسلیم کر کے صدر کے اختیار کو ختم کر دیا لیکن جب اس کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر ہوئی تو یہ نکتہ زیر بحث آیا کہ کیا قرار دادِ مقاصد کو دستور کی باقی شقوں پر بالادستی حاصل ہے؟ اگر ہے تو پھر ہائی کورٹ کا یہ فیصلہ درست ہے اور اگر قرار دادِ مقاصد بھی دستور کی دیگر دفعات کے

برابر دفعہ ہے تو پھر ہائی کورٹ کا مذکورہ فیصلہ درست نہیں ہے۔ اس پر سپریم کورٹ کے فل بینچ نے جناب جسٹس (ر) ڈاکٹر نسیم حسن شاہ کی سربراہی میں یہ فیصلہ دے دیا کہ قراردادِ مقاصد بھی دستور کی ایک عام دفعہ ہے جسے دوسری دستوری دفعات پر کوئی فوقیت حاصل نہیں ہے۔ اس لیے ہائی کورٹ کا فیصلہ کالعدم قرار دے دیا گیا۔

اب صورتحال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیتِ اعلیٰ والی قراردادِ مقاصد دستور کی ایک عام دفعہ تو ہے مگر اسے دستور کی دیگر دفعات پر کوئی برتری حاصل نہیں ہے اور یہ صورتحال ایک اسلامی دستور کے حوالہ سے قابلِ قبول نہیں ہے۔ یہ کیس قانونی دستاویزات میں ''حاکم علی بنام سرکار'' کے عنوان سے موجود ہے اور ہم نے اس کا خلاصہ اردو زبان میں اس دور میں ''قراردادِ مقاصد بنام سپریم کورٹ آف پاکستان'' کے نام سے الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ کی طرف سے کتابچہ کی صورت میں شائع کیا تھا۔

''شریعت بل'' میں قرآن و سنت کی بالادستی کے حوالے سے استثنا

اسی طرح میاں محمد نواز شریف نے اپنے پہلے دورِ حکومت میں پارلیمنٹ سے جو ''شریعت بل'' منظور کرایا تھا اس کی بنیاد قرآن و سنت کی بالادستی پر تھی لیکن اس میں قرآن و سنت کو ملک کا سپریم لاء تسلیم کرتے ہوئے اس شرط کے ساتھ مشروط کر دیا گیا تھا کہ

''بشرطیکہ سیاسی نظام اور حکومتی ڈھانچہ متاثر نہ ہو''۔

یہ استثنا قرآن و سنت کی بالادستی کو محدود کرنے کے مترادف تھی اور ہم نے اس وقت ملک کے سرکردہ علماء کرام سے اس سلسلہ میں استفسار کیا تھا جس کے جواب میں اکابر علماء کرام نے اس استثنا کو شریعت کے تقاضوں کے منافی قرار دیا تھا اور یہ استفسار اور اس کے جوابات بھی اس دور میں ماہنامہ ''الشریعہ'' گوجرانوالہ میں شائع ہو گئے تھے۔

یہ دو حوالے صرف مثال کے طور پر دیے گئے ہیں، ان کے علاوہ اور تحفظات بھی ہیں جو بدستور موجود اور قائم ہیں لیکن ان کا تعلق دستور کی تعبیر اور اطلاق سے ہے، اس کی اساس کے ساتھ نہیں ہے اور نہ ہی ان اقدامات سے دستور کی اصل اساس متاثر ہوتی ہے۔

اس لیے ہماری گزارش یہ ہے کہ دستور اور اس کی تعبیرات کے درمیان فرق کو ملحوظ رکھنا ہی قرینِ انصاف بات ہے اور ملک میں رائج قوانین و نظام کو دستور کے دائرے سے ہٹ کر دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ اگر دستور ہمیں ملک میں نفاذِ اسلام کی بنیاد فراہم کرتا ہے اور اس کے لیے راستہ اور مواقع مہیا

کرتا ہے تو اپنی کوتاہیوں کو دستور کے کھاتے میں ڈال کر اس کی نفی کرنا زیب نہیں دیتا۔ ہم اگر دستور پر صحیح عمل نہیں کر سکے یا نہیں کرا سکے تو اس کا قصوروار دستور نہیں ہے۔

جناب شاہد اللہ شاہد اور جناب بلاول بھٹو دونوں کو اپنے موقف کا از سر نو جائزہ لینا چاہیے اور دستورِ پاکستان کو متنازعہ بنانے کی بجائے اس کی تعبیر و اطلاق کی کمزوریوں کو دور کرنے اور اس پر مکمل عملدرآمد کی بات کو آگے بڑھانا چاہیے۔

پاکستان پیپلز پارٹی گکھڑ کا تحفظِ ختمِ نبوت سیمینار

(روزنامہ اسلام، لاہور — ۲۶ ستمبر ۲۰۱۷ء)

ماہ ستمبر کے دوران ملک بھر میں جہاں وطنِ عزیز کے جغرافیائی دفاع و استحکام کے حوالہ سے مختلف تقریبات اور پروگراموں کا اہتمام ہوا وہاں تحفظِ ختمِ نبوت کے عنوان سے بھی ملک کے نظریاتی دفاع و استحکام کے فروغ کے موضوع پر متنوع تقریبات منعقد کی گئیں۔ ۶ ستمبر کو ۱۹۶۵ء کی جنگ کی یاد میں ”یومِ دفاع“ کے طور پر منایا جاتا ہے جبکہ ۷ ستمبر کو ”یومِ فضائیہ“ کے علاوہ ”یومِ تحفظِ ختمِ نبوت“ کا عنوان بھی دیا جاتا ہے کیونکہ اس روز ۱۹۷۴ء میں پارلیمنٹ نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا تاریخی دستوری فیصلہ کیا تھا۔ مجھے اس حوالہ سے دو تقریبات میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔

۲۱ ستمبر جمعرات کو مجلسِ احرارِ اسلام پاکستان کے مرکز لاہور میں ”تحفظِ ختمِ نبوت کانفرنس“ منعقد ہوئی جس کی صدارت جمعیت علماء پاکستان کے سربراہ جناب پیر اعجاز احمد ہاشمی نے کی اور اس سے مولانا محمد امجد خان، مولانا پیر سید کفیل شاہ بخاری، مولانا حافظ زبیر احمد ظہیر، مولانا عبد الرؤف فاروقی، حافظ عاکف سعید، حاجی عبد اللطیف چیمہ اور دیگر سرکردہ زعماء کے علاوہ پاکستان مسلم لیگ (ن) کے سرگرم راہ نما حافظ میاں محمد نعمان نے خطاب کیا اور راقم الحروف نے بھی کچھ معروضات پیش کیں۔ مقررین نے پاکستان کے نظریاتی تشخص کے تحفظ اور عقیدۂ ختمِ نبوت و ناموسِ رسالتؐ کی پاسداری کے عزم کی تجدید کی۔

میاں محمد طفیل مرحوم کے خاندان سے مراسم

جبکہ ۲۳ ستمبر ہفتہ کو اپنے آبائی شہر گکھڑ میں پاکستان پیپلز پارٹی کے زیر اہتمام منعقدہ ”تحفظِ ختمِ نبوت سیمینار“ میں حاضری زندگی کا ایک خوشگوار تجربہ ثابت ہوئی۔ پاکستان پیپلز پارٹی گکھڑ کے صدر میاں راشد طفیل کے والد گرامی میاں محمد طفیل مرحوم مجاہدِ ختمِ نبوت آغا شورش کاشمیریؒ کے حلقۂ احباب میں شامل اور تحفظِ ختمِ نبوت کی جدوجہد میں ان کے سرگرم معاون تھے۔ جبکہ میاں محمد طفیل مرحوم کے بڑے بھائی میاں فاضل رشیدی مرحوم پاکستان پیپلز پارٹی کے بانی ارکان میں شمار ہوتے تھے اور ایک عرصہ تک پیپلز پارٹی گوجرانوالہ کے چیئرمین رہے ہیں۔ اور ان کے والد محترم ماسٹر کرم دین مرحوم میرے والد گرامی حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کے ابتدائی ساتھیوں میں سے تھے۔ اس حوالہ سے یہ خاندان پاکستان پیپلز پارٹی میں متحرک ہونے کے ساتھ ساتھ دینی معاملات میں شروع سے ہمارا معاون چلا آرہا ہے۔

میاں راشد طفیل نے چند روز قبل مجھے بتایا کہ وہ گکھڑ میں تحفظِ ختمِ نبوت کے سلسلہ میں سیمینار منعقد کرنے کا پروگرام بنا رہے ہیں تو بے حد خوشی ہوئی اور حاضری کا وعدہ کر لیا۔ وہاں حاضر ہو کر پتہ چلا کہ یہ کوئی رسمی سا پروگرام نہیں بلکہ باقاعدہ "کُل جماعتی ختمِ نبوت کانفرنس" تھی جو ایک بڑے شادی ہال میں منعقد ہوئی جس میں پورے علاقہ سے مختلف مذہبی مکاتبِ فکر اور سیاسی جماعتوں کے راہنما و کارکن بڑی تعداد میں شریک تھے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی صوبائی اور ضلعی قیادت بھی موجود تھی، پارٹی کے صوبائی صدر جناب قمر الزمان کائرہ مہمان خصوصی تھے اور ان کے علاوہ جناب تنویر اشرف کائرہ، میاں اظہر حسن ڈار، چودھری محمد اشرف سندھو، راؤ اکرام علی خان اور دیگر پارٹی راہنما بھی شریک محفل تھے۔ مختلف مکاتبِ فکر کے راہنماؤں میں مولانا شاہ نواز فاروقی، مولانا پروفیسر عبد الرحمٰن جامی، مولانا قاری محمود اختر عابد، مولانا فہیم الرحمٰن، قاری خالد محمود اور دیگر حضرات نے خطاب کیا۔

میں نے پاکستان پیپلز پارٹی کی صوبائی اور ضلعی قیادت کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قادیانی مسئلہ کے حل میں پاکستان پیپلز پارٹی کے سربراہ جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم اور دیگر راہنماؤں کے کردار کا قدرے تفصیل کے ساتھ ذکر کیا اور کہا کہ پاکستان کو دستوری طور پر اسلامی ریاست کا درجہ دینے اور قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے کر ختمِ نبوت کے مسئلہ کو حل کرنے میں بھٹو مرحوم اور ان کی پارٹی کا کردار بہت اہم ہے جو تاریخ کا حصہ ہے۔ اور صرف ایک بار نہیں بلکہ دوسری بار پاکستان پیپلز پارٹی کے دورِ حکومت میں ہی پورے دستور پر نظر ثانی کے دوران ان فیصلوں کا تحفظ کر کے اور انہیں بعینہٖ برقرار رکھ کر پاکستان کے اسلامی تشخص کے تسلسل اور عقیدۂ ختمِ نبوت کے تحفظ کے لیے پارلیمنٹ نے پوری قوم کی طرف سے اس موقف کی جو تجدید کی تھی اس کا سہرا بھی پاکستان پیپلز پارٹی کے سر ہے۔

مگر آج قومی اور بین الاقوامی سطح پر ان قومی فیصلوں کو بہت سے چیلنجز درپیش ہیں۔ قادیانیوں نے ان فیصلوں کو آج تک تسلیم نہیں کیا بلکہ بین الاقوامی فورمز پر وہ ان دستوری اور جمہوری فیصلوں کو مسترد کرتے ہوئے ان خلاف مورچہ بندی جاری رکھے ہوئے ہیں۔ جبکہ دستورِ پاکستان کی اسلامی اساس اور دفعات کو بھی مختلف دائروں میں چیلنج کیا جا رہا ہے۔ اس لیے ہم پاکستان پیپلز پارٹی سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ان اہم قومی، جمہوری اور دستوری فیصلوں کے تحفظ کے لیے بھی سرگرم کردار ادا کرے گی۔

صوبائی صدر جناب قمر الزمان کائرہ کی پر مغز گفتگو

پاکستان پیپلز پارٹی کے صوبائی صدر جناب قمر الزمان کائرہ نے اس حوالہ سے پُر مغز اور بامقصد گفتگو کی جس سے مجھے یہ اطمینان ہوا کہ پارٹی میں ایسے حضرات موجود اور مؤثر ہیں جو ان مسائل کا ادراک

رکھتے ہیں اور انہیں حل کرنے کا عزم بھی رکھتے ہیں۔ کائرہ صاحب نے ملکی و عالمی صورتحال پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور کہا کہ ہمیں ایک ملت اور قوم کے طور پر وطنِ عزیز اور عالمِ اسلام کو درپیش چیلنجز کا مقابلہ کرنا ہوگا اور گروہی و فرقہ وارانہ تقسیم سے بالاتر ہو کر قومی جذبہ کے ساتھ ملی وحدت اور قومی سلامتی کے لیے کام کرنا ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ وہ دستورِ پاکستان کے اسلامی تشخص اور عقیدۂ ختمِ نبوت کے تحفظ کے قانون کے خلاف مختلف حلقوں میں جاری منفی سرگرمیوں سے آگاہ ہیں اور قوم کے ان تاریخی فیصلوں کی پاسداری کے لیے کردار ادا کرنے کے لیے تیار ہیں۔

پاکستان پیپلز پارٹی کے دیگر راہنماؤں نے بھی اپنے خطابات میں اسی قسم کے جذبات پیش کیے اور اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ گکھڑ کی پیپلز پارٹی نے ایک اہم دینی و قومی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے اس مشترکہ سیمینار کا اہتمام کیا ہے۔ سیمینار میں پاکستان مسلم لیگ (ن) گکھڑ کے صدر اور بلدیہ گکھڑ کے چیئرمین میر مظہر بشیر نے علالت کے باعث اپنے نمائندہ کے ذریعے سیمینار کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کیا اور اس اہم سیمینار کے انعقاد پر مبارکباد پیش کی۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد — ۳۰ ستمبر ۲۰۱۸ء)

پاکستان پیپلز پارٹی گکھڑ نے اپنی روایت قائم رکھتے ہوئے اس سال بھی ''تحفظِ ختمِ نبوت سیمینار'' کا اہتمام کیا جو ۲۸ ستمبر کو ایک شادی ہال میں منعقد ہوا اور اس میں مختلف مکاتبِ فکر کے سرکردہ علماء کرام، پیپلز پارٹی کی ضلعی و مقامی قیادت، پاکستان مسلم لیگ (ن) اور پاکستان تحریکِ انصاف کے راہنماؤں سمیت متعدد سیاسی جماعتوں کے ذمہ دار حضرات اور عوام کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔ مجھے بطور مہمان خصوصی اس میں شرکت کا اعزاز بخشا گیا اور میں اپنے ذوق و مزاج کے خلاف ساڑھے تین چار گھنٹے تک مسلسل اس مسند پر براجمان رہا۔

پی پی گکھڑ کے صدر میاں راشد طفیل ایک ایسے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں جو تین پشتوں سے تحریکِ ختمِ نبوت اور دیگر دینی تحریکات کے ساتھ مسلسل وابستگی کے ساتھ ساتھ پاکستان پیپلز پارٹی میں بھی پوری سرگرمی کے ساتھ شریک چلا آرہا ہے۔ اور اس سیمینار میں میاں راشد طفیل کے دو بیٹوں حافظ عبد اللہ اور حافظ بلال کی تقاریر سن کر اندازہ ہوا کہ اگلی نسل بھی اس تسلسل کو جاری رکھنے کے لیے تیار ہے۔

گزشتہ سال اس سیمینار میں پی پی کے صوبائی صدر جناب قمر الزمان کائرہ مہمان خصوصی تھے، اس سال بھی انہوں نے آنا تھا مگر کسی اچانک مجبوری کے باعث نہ پہنچ سکے۔ سیمینار میں درجن بھر علماء کرام اور

راہنماؤں نے خطاب کیا جن کا الگ الگ تذکرہ مختصر کالم میں مشکل ہے البتہ سب کی مشترکہ بات تحفظِ ختمِ نبوت کی جدوجہد کے ساتھ بے لچک وابستگی کا اظہار، جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حرمت و ناموس کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کا عزم، اور سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی اس سلسلہ میں خدمات پر خراج عقیدت پیش کرنا تھی۔ جبکہ سابق قادیانی مبلغ جناب شمس الدین کا خطاب بڑی توجہ کے ساتھ سنا گیا جس میں انہوں نے قادیانیت سے تائب ہونے کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا۔

مولانا قاری محمود اختر عابد نے، جو گکھڑ کی مسجد شاہ جمال کے خطیب ہیں اور بٹ فیملی سے تعلق رکھتے ہیں، اپنے خطاب میں بتایا کہ انہیں خواب میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر کے اندر جانے کی سعادت حاصل ہوئی اور انہوں نے دیکھا کہ آنحضرتؐ آرام فرما ہیں اور آپؐ کے پاؤں مبارک کے تلوؤں کے ساتھ ایک صاحب اپنے سینے کو چمٹائے ہوئے ہیں، غور سے دیکھا تو وہ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم تھے۔ مجھے یہ خواب سن کر کوئی تعجب نہ ہوا، اس لیے کہ میں بھٹو مرحوم کے آخری ایام کے بارے میں جیل میں ان کے نگران کرنل رفیع الدین کی یادداشتوں میں بھٹو مرحوم کی یہ بات پڑھ چکا ہوں کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے فیصلے پر انہیں کوئی ندامت نہیں ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ فیصلہ قیامت کے دن ان کی نجات اور سرخروئی کا باعث بنے گا۔

بھٹو مرحوم کا جرأتمندانہ کردار

میں نے اپنی گفتگو میں تحریکِ ختمِ نبوت کے دوران تحریک کے قائدین مولانا محمد یوسف بنوریؒ، مولانا مفتی محمودؒ، مولانا شاہ احمد نورانیؒ، علامہ محمود احمد رضویؒ، علامہ احسان الٰہی ظہیرؒ، پروفیسر غفور احمدؒ، مولانا غلام غوث ہزارویؒ اور دیگر اکابرین کے ساتھ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے جرأتمندانہ کردار کا بھی تفصیل کے ساتھ تذکرہ کیا اور گزارش کی کہ میں اس حوالہ سے دو باتوں پر بطور خاص بھٹو مرحوم کو خراج تحسین پیش کروں گا:

۱۔ ایک یہ کہ انہوں نے بطور وزیراعظم اس مسئلہ کو سرسری طور پر نہیں لیا بلکہ اسے ایوان میں تین ہفتوں سے زائد کے تفصیلی مباحثہ کا موضوع بنایا تاکہ اس کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہ جائے۔ وہ چاہتے تو ایک دو گھنٹے کی مختصر بحث کے بعد کسی بل یا قرارداد کی صورت میں کوئی فیصلہ پارلیمنٹ سے منظور کرا سکتے تھے۔ مگر انہوں نے نہ صرف تمام ارکانِ اسمبلی کو بحث میں شریک کیا بلکہ قادیانی جماعت کے دونوں گروہوں کے سربراہوں مرزا ناصر احمد اور مولوی صدر الدین کو ایوان میں آنے اور اپنا موقف پیش کرنے کی دعوت دی جو کئی روز تک اپنا موقف پیش کرنے کے ساتھ

ساتھ ارکان آسمبلی کے سوالات کا جواب بھی دیتے رہے۔ جبکہ اس سلسلہ میں اٹارنی جنرل یحیٰی بختیار مرحوم نے بھی سرگرم کردار ادا کیا اور ایوان کے اس طویل مباحثہ کو بامقصد بنا دیا۔ یہ ساری کارروائی نیٹ پر قومی آسمبلی کے ریکارڈ میں موجود ہے اور الگ کتابی شکل میں بھی شائع ہو چکی ہے جسے دیکھ کر بھٹو مرحوم کی فراست کا اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے قومی اور بین الاقوامی تناظر کو سامنے رکھتے ہوئے اس مسئلہ کو باقاعدہ ایک مکمل اور جامع مقدمہ کی شکل دے کر قومی آسمبلی کے دستوری فیصلے کو اس طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا کہ کسی کے لیے اس کے کسی پہلو پر سوال اٹھانے کی گنجائش نہیں رہنے دی۔

۲. دوسری بات یہ کہ قادیانی مسئلہ ہمارے عقیدہ و ایمان کا مسئلہ ہے اور مذہبی مسئلہ ہے، مگر بھٹو مرحوم نے اسے مذہبی اور شرعی مسئلہ کے ساتھ ساتھ ایک قومی مسئلہ کے طور پر متعارف کرایا اور پارلیمنٹ کے فیصلے کو کسی مذہبی مطالبہ کی منظوری کے دائرے میں رکھنے کی بجائے یہ کہہ کر اسے قوم کے تمام طبقات اور پارٹیوں کے متفقہ قومی فیصلے کی حیثیت دے دی کہ قادیانی جماعت پاکستان میں وہی پوزیشن حاصل کرنے کے درپے ہے جو امریکہ میں یہودیوں کو حاصل ہے کہ کوئی قومی فیصلہ اور پالیسی ان کے منشا کے بغیر طے نہ ہو سکے۔

پاکستان پیپلز پارٹی کا کریڈٹ اور ذمہ داری

میں نے عرض کیا کہ پاکستان پیپلز پارٹی کے بعض حلقوں کا یہ احساس و ادراک جو پارٹی کے بعض راہنماؤں کی آج کی تقاریر میں مجھے نظر آیا ہے بہت خوش آئند ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی کو اس فیصلے کا کریڈٹ جاتا ہے۔ لیکن کریڈٹ اور فخر کے بجا اظہار کے ساتھ ساتھ اس فیصلہ کا تحفظ بھی اس کی ذمہ داری بنتا ہے اس لیے کہ ہمارے بڑوں نے تو عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ کا معرکہ سر کیا تھا مگر ہمیں ان کے اس فیصلے کے تحفظ کا معرکہ درپیش ہے۔ قادیانیوں نے اس فیصلے کو چیلنج کر رکھا ہے، بہت سے بین الاقوامی اور قومی حلقے ان کی پشت پناہی کر رہے ہیں اور اس سلسلہ میں وقتاً فوقتاً سازشیں سامنے آتی رہتی ہیں جن سے خبردار رہنے کی ضرورت ہے۔

میں پاکستان پیپلز پارٹی سے توقع رکھتا ہوں کہ جس طرح اس نے قادیانی مسئلہ کو حل کرانے اور متفقہ دستوری فیصلہ کرانے میں قائدانہ کردار ادا کیا تھا، عالمی سطح پر اور قومی دائرہ میں اس فیصلہ کے تحفظ بلکہ پاکستان کی اسلامی نظریاتی شناخت، ناموس رسالتؐ کے تحفظ اور دستور کی اسلامی دفعات کی بقا و نفاذ میں وہ سرگرم کردار ادا کرے گی کیونکہ یہ اس کی قومی، ملی اور جماعتی ذمہ داری بنتی ہے۔